

ہندوستان

ہندوستان

میں

وہابی تحریک

مصنف

ڈاکٹر قیام الدین احمد

ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی
پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی

مترجم

پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی
ایم۔ اے

نفسی سے اکیڈمی

سٹریچن روڈ، کراچی

**Collection of Prof. Muhammad Iqbal Mujaddidi
Preserved in Punjab University Library.**

پروفیسر محمد اقبال مجددی کا مجموعہ
پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں محفوظ شدہ





ہندوستان میں وہابی تحریک

مُصَنَّف

ڈاکٹر قیام الدین احمد
ایم، اے۔ پی، ایچ، ڈی
پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی

مترجم
پروفیسر محمد مسلم عظیم آبادی
ایم۔ اے



نَجِيسَ اَكْبَارِی

سٹریچن روڈ ————— کراچی

قیمتے اٹھارہ روپے مجید
(۱۸۶۰۰)

۲
جلد حقوق اشاعت و طباعت اردو ترجمہ

بجق
۱۸۸۴

چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندی

مالک

نفس اکیڈمی و مسعود پبلشنگ ہاؤس

اسٹریٹ روڈ کراچی۔ محفوظ ہے

بد اہتمام _____ خالد اقبال گاہندی

اشاعت اول _____ دسمبر ۱۹۴۲ء

ٹیلیفون _____ ۵۱۳۳۵

مطبوعہ

(انٹرنیشنل پریس، کراچی)

مضامین

وہابی تحریک حوالہ

۵۹	دولہ، ابتدائی زندگی اور تبلیغی کام	۴۸	حضرت شاہ ولی اللہ	۲۳	تہبید
۶۰	فوج میں ملازمت	۴۸	میر قاسم و شیخ سلطان	۲۶	تعارف (ماخذ کا جائزہ)
۶۰	فوج میں شمولیت کا مقدمہ	۵۰	دہابیت کی کچھ نمایاں خصوصیتیں		باب
۶۱	شاہ اسماعیل و عبدالحی کی بیعت تبلیغی دورے -	۵۰	سید احمد کا طریقہ محمدی اصلاحی تحریک	۳۵	وہابی تحریک کی بنا اور اس کے خاص پہلو
۶۳	بیوگان کا عقد ثانی	۵۱	وہابی تحریک کی تعلیمات	۳۵	دولہ، پس منظر
۶۴	سید احمد کا سفر حج	۵۳	نجدی اور ہندوستانی تحریکات	۳۵	مغل سلطنت کا زوال
۶۵	خاندان صادق پور کی شمولیت تحریک	۵۳	وہابیت کا تقابلی موازنہ	۳۶	جنگ پلاسی
۶۶	ولایت علی کی بیعت	۵۴	محمد بن عبد الوہاب	۳۷	تجارت پر انگریزوں کی اجازت داری
۶۶	منظہر علی کی بیعت	۵۴	محمد بن مسعود	۳۸	اخلاقی انحطاط
۶۷	مذہبی مذاکرے	۵۴	وہابی تحریک کا عروج	۳۹	اشاعت اسلام میں صوفیائے کرام کا حصہ
۶۷	معتقدین میں اضافہ	۵۵	عثمانی خلیفہ کی مخالفت	۴۰	مذہبی بے راہ روی
۶۷	بکسر میں قیام	۵۵	وہابیوں کی سیاسی طاقت کا خاتمہ	۴۳	مکرہ رسم و رواج
۶۸	پھلواری شریف میں مذہبی مباحثہ	۵۶	ہندوستانی اور عربی وہابیت کا موازنہ	۴۴	دب، ہندوستان میں وہابیت کی بنا و ارتقاء
۶۸	پٹنہ میں قیام	۵۶	نقطہ مماثلت	۴۴	ایرانی اور ترک اثرات
۶۹	تبت کے کچھ مسلمانوں سے ملاقات	۵۷	نقطہ اختلاف	۴۵	مغل حکمرانوں کی دین سے بے نیازی
۷۰	قصبہ بارڈھ اور سورن گڑھ میں قیام	۵۹	باب سید احمد بریلوی کی زندگی اور کارنامے	۴۶	حضرت مجدد الف ثانی کی دینی خدمات

۱۰۲	سکھوں کی پسپائی	۸۸	فتح ہند	۷۲	راج محل میں قیام
۱۰۲	مجاہدین کی شہادت	۸۹	یار محمد کا خاتمہ	۷۳	کلکتہ میں قیام و روانگی
۱۰۳	سید احمد کی لاش کی شناخت	۹۰	تسخیر کشمیر کے منصوبہ کی ناکامی	۷۳	مراجعت ہند
۱۰۵	ویڈ کی روایت	۹۰	سرداران ستخانہ کا ایثار	۷۴	احمد اللہ کا عقد
۱۰۵	وقائع نویس کی رپورٹ	۹۱	پانڈہ خاں کی ٹکٹ و اطاعت	۷۴	خانہ ان صا و قپور کی اہمیت
۱۰۸	سید احمد کی سرحدی جنگوں کے سیاسی نتائج	۹۲	رنجیت سنگھ کی پیشکش	۷۴	شاہ محمد حسین خلیفہ اول
۱۰۹	سید احمد کی شہادت پر رنجیت سنگھ کا اظہار مسرت	۹۳	فتح پشاور	۷۵	سند خلافت
۱۱۰	نظریہ غیوبیت سید احمد	۹۳	سلطان محمد حسن سلوک	۷۷	سند خلافت کی مہر کی تاریخ میں اختلاف
۱۱۱	عقیدہ ظہور ثانی	۹۴	پشاور میں دینی حکومت کا قیام	۷۷	شاہ محمد حسین کی خدمات ہجرت کی تیاری
۱۱۱	شیخ محمد چولہی کی قیادت	۹۵	مجاہدین کے خلاف سازش	۷۸	(ب) مہاجر ت اود شمالی مغربی سرحد کی جنگی مہمیں
۱۱۲	وہابیوں کو پانڈہ خاں کی پیشکش		منظر آباد پر حملہ	۷۹	مجاہدین کی روانگی
۱۱۳	وہابیوں کا ستخانہ میں قیام		باب ۳	۷۹	شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے سیاسی حالات
۱۱۳	وہابیوں اور فتح خاں کی لڑائی	۹۶	جنگ بالاکوٹ اور	۷۹	پنجاب کے سیاسی حالات
۱۱۵	(ج) نصیر الدین دہلوی کے زیر قیادت سندھ کی فوج	۹۶	فرائضی تحریک	۸۰	سرحدی سرداروں کے نام خطوط
۱۱۶	سندھ مرکز جہاد	۹۶	جنگ بالاکوٹ کے متعلق	۸۲	جنرل بدھ سنگھ کی پیشقدمی سکھوں سے پہلی جھڑپ
۱۱۶	سندھ کے سیاسی حالات	۹۶	اہم دستاویز	۸۲	ترہیں زر قبائل
۱۱۷	رنجیت سنگھ کا امرائے سندھ سے خراج کا مطالبہ	۹۷	بالاکوٹ کا محل وقوع	۸۳	امامت کا اعلان
۱۱۷	مزاری قبیلہ	۹۸	سید احمد کی فوجی حکمت عملی	۸۳	قبائلیوں کی بیعت
۱۱۸	سندھ پر انگریزوں کی نظر	۹۸	سید احمد کی شہادت	۸۳	سرداران پشاور کی علیحدگی
۱۱۹	برنس کے مشن کی مخالفت	۹۹	تواریخ ہزارہ کی روایت	۸۴	قبائلی علاقوں میں تبلیغی دورے
۱۱۹	روس اور برطانیہ کی سندھ پر نظر	۹۹	سکھوں کی بدحواسی	۸۵	کشمیر پر قبضہ کرنے کا منصوبہ
۱۲۰	نصیر الدین اور مزاری قبیلہ	۱۰۰	شیر سنگھ کی گڑھی حبیب اللہ کی جانب پیش قدمی	۸۵	درانی سرداروں کا متخاصمانہ رویہ
۱۲۰	مزاریوں کی سکھوں سے صلح	۱۰۰	سید احمد کی ایک جنگی چال	۸۶	پنجتار میں دینی اجتماع
۱۲۱	نصیر الدین کی روانگی افغانستان	۱۰۱	سکھ فوج کا مالی ٹکٹ پر قیام	۸۷	
	انگریز افغان جنگ میں	۱۰۲	آغاز جنگ	۸۸	

۱۵۲	عبدالرحیم کے بیان پر تنقید	۱۳۶	ہند میں تبلیغی تنظیمی سرگرمیاں	۱۲۱	نصیر الدین کی شکست
۱۵۳	عبداللہ کا چشم دید بیان	۱۳۷	پٹنہ میں وہابی تحریک کی تنظیم نو	۱۲۲	خلفائے عظیم آباد
۱۵۴	مسٹر ابوٹ اور ولایت علی کی گفتگو	۱۳۷	عنایت علی کا دورہ بنگال	۱۲۳	فرائضی تحریک
۱۵۵	ولایت علی و عنایت علی کی مراجعت پٹنہ	۱۳۸	عنایت علی کے متعلق پرنٹرز کی رپورٹ	۱۲۳	حاجی شریف اللہ
۱۵۶	ولایت علی و عنایت علی پر پابندی	۱۳۹	انگریزی حکومت کی پولس کو ہدایت	۱۲۳	بنگالی مسلمانوں پر جبر و ستم
۱۵۷	عنایت علی کی بنگال سے طلبی	۱۴۰	بنگال میں عنایت علی کی حکمت عملی	۱۲۳	دادومیاں
۱۵۸	آغاز سفر	۱۴۱	ولایت علی کا دورہ بنگال	۱۲۳	تیتو میر
۱۵۹	بہادر شاہ دوم اور ولایت علی کی ملاقات	۱۴۲	سکھوں کے مقبوضات کی انگریزوں کو منتقلی	۱۲۴	تیتو میر کی اصلاحی سرگرمیاں
۱۶۰	ولایت علی کی دہلی سے روانگی	۱۴۲	ولایت علی کی روانگی سرحد	۱۲۵	اجتماعی جرمانے کے خلاف
۱۶۱	ولایت علی عنایت علی میں اختلاف رائے	۱۴۳	فتح خاں کی شراہنگیزی	۱۲۵	بنگالی مسلمانوں کا عملی اقدام
۱۶۲	عنایت علی کی مزاجی کیفیت	۱۴۴	بالاکوٹ سے سکھوں کا احسراج	۱۲۶	پورنا گاؤ پر حملہ
۱۶۳	اختلاف کا بنیادی سبب	۱۴۵	رضاکاروں کو تحریک میں شرکت کی دعوت	۱۲۶	فرائضیوں کا خروج
۱۶۴	ولایت علی کا انتقال	۱۴۵	امارت عنایت علی	۱۲۷	انگریزی دستہ کی شکست
۱۶۴	عنایت علی کی وفات	۱۴۶	معرکہ نوشہرہ	۱۲۷	غلام معصوم کی شکست و خاتمہ
۱۶۴	رفقائے عنایت علی کی مراجعت پٹنہ	۱۴۷	منافق سرداروں کو معافی	۱۲۸	فرائضیوں کی سرفروشی پر اظہار تعجب
۱۶۵	رب (ب) حیدرآباد میں وہابی سازش	۱۴۷	امارت و ولایت علی	۱۲۹	فرائضی اور وہابی تحریک پر اوکنیل کی رائے
۱۶۵	ولایت علی کی دکن میں تبلیغی سرگرمیاں	۱۴۸	وہابی ریاست کا دارالخلافہ اسلام گڑھ	۱۳۰	فرائضی خروج کی اصل وجہ
۱۶۶	مبارز الدولہ کے خلاف رزیڈنٹ فریزر کی رپورٹ	۱۴۸	ہندوستانی مسلمانوں کو سرحد آنے کی دعوت		
۱۶۷	منصوبہ کا انکشاف	۱۴۹	معرکہ درہ دوب		
۱۶۸	مبارز الدولہ کے بارے میں تحقیقات	۱۵۱	سکھوں کی انگریزوں سے امداد طلبی		

باب

ولایت علی و عنایت علی

۱) ولایت علی اور عنایت علی

کے کردار اور جدوجہد

ولایت علی کے ابتدائی حالات

ولایت علی کی بیوہ سے شادی

عنایت علی کے ابتدائی حالات

ولایت علی اور عنایت علی کی

مراجعت ہند

۲۰۲	منشی پیر بخش کی گرفتاری	۱۸۵	مال کی تحصیل	۱۶۸	مبارز الدولہ کو جس دوام کی سزا
۲۰۳	خواجہ حسن علی کی رہائی	۱۸۶	وہابی فنڈ کے چندے		
۲۰۴	وہابی تحریک میں پٹنہ کی اہمیت	۱۸۶	زکوٰۃ	۱۷۰	(ج) سرحد پر وہابی امارت
۲۰۵	لکشنر پٹنہ کی رپورٹ	۱۸۶	صدقات	۱۷۰	وہابی ریاست کا حدود و اربعہ
۲۰۶	سیف علی	۱۸۷	عمومی لگان	۱۷۱	سپاہیوں کی تنخواہیں
۲۰۷	راحت علی	۱۸۷	عطیات	۱۷۱	سرکاری ملازمین
۲۰۸	سازش ۱۸۳۵ء کے بانی	۱۸۸	مال کی ترسیل	۱۷۲	عدلیہ
۲۰۹	اہم خطوط کی ضابطی	۱۸۹	تحریک کے خفیہ کارکن	۱۷۲	دربارہ کی روداد
۲۰۹	عباسی علی کی گرفتاری	۱۸۹	خفیہ کارکنوں کا طریقہ عمل	۱۷۳	حسراج
۲۱۰	حسین علی کی قمانہ تلاش	۱۹۰	امینوں کی دیانت	۱۷۳	مسجد ریاست کی شان و شکوہ کی وجہ
۲۱۰	احمد اللہ کی دھمکی	۱۹۱	ترسیل زر کا طریقہ کار		
۲۱۱	شمالی ہند میں وہابی تحریک	۱۹۲	خفیہ اور مرز پینچامات	۱۷۴	جدید انتظامی تجربہ کے حامی
۲۱۱	پشاور میں وہابیوں کے خطوط کی ضابطی	۱۹۲	وہابیوں کے متعلق جمیس بلوٹ کی رپورٹ	۱۷۴	وہابی ریاست کا نظم و نسق
۲۱۲	ہزارہ کے سیاسی حالات	۱۹۳	جمیس بلوٹ کی بسکدوشی		
۲۱۲	جنگ ۱۸۵۷ء	۱۹۳	وہابیوں کی نقل و حرکت پر نظر	۱۷۶	(۱) وہابی تحریک کی اندونی تنظیم
۲۱۳	برطانوی دفاعی نوٹوں کا بیان	۱۹۴	جنگ امیبہ کے بعد انگریزوں کی کارروائیاں	۱۷۷	(۲) پٹنہ کی مرکزی تنظیم
۲۱۴	اکبر شاہ کا انتقال	۱۹۵	وہابیوں کا ہندوستانی فوج میں تداخل	۱۷۷	قافلہ
	دوسرا حصہ				
	باب				
۲۱۵	معرکہ سرحد (۱۸۵۲ تا ۱۸۶۳ء)	۱۹۶	ڈوپے کی حکمت عملی	۱۷۸	زنگر و لوٹوں کی تعلیم و تربیت
۲۱۵	معرکہ ۱۸۵۲ء	۱۹۷	وہابی قائدین کا عسکری تدبیر	۱۷۸	خلفاء کا تقرر
۲۱۵	ہزارہ پرائگریزوں کا قبضہ	۱۹۸	دکن میں وہابیوں کی کارگزاری	۱۸۰	مجلس اعلیٰ
۲۱۶	دادی کاغان پرائگریزوں کا قبضہ	۱۹۹	وہابیوں کی بہار میں سرگرمیاں	۱۸۰	خلیفہ کبھی علی
۲۱۶	حسن زئی قبائلیوں کا سرحدی چوکیوں پر قبضہ	۲۰۰	خواجہ حسن علی کی انگریزوں کے خلاف کارروائیاں	۱۸۱	دورہ کرنے والے مبلغین
				۱۸۱	وہابی مبلغین کی اہمیت
				۱۸۲	مبلغین کا محتاط رویہ
				۱۸۳	مبلغین کی کارگزاریاں
				۱۸۴	ضلع دار مراکز
				۱۸۴	مبلغین کا طریقہ کار

۲۱۷	کوہ سیاہ کی پہلی ہم	۲۳۱	معرکہ ستخانہ	۲۱۷	کوہ سیاہ کی پہلی ہم
۲۱۸	انگریزوں کے خلاف عنایت علی کی کوششیں	۲۳۲	وہابیوں کی سرفروشی	۲۱۸	انگریزوں کے خلاف عنایت علی کی کوششیں
۲۱۹	قلعہ کوٹلا پر انگریزوں کا قبضہ	۲۳۳	ستخانہ کی تباہی	۲۱۹	قلعہ کوٹلا پر انگریزوں کا قبضہ
۲۲۰	سرجن لائل کا وہابیوں کو خراج تحسین	۲۳۴	نور اللہ کی وفات	۲۲۰	سرجن لائل کا وہابیوں کو خراج تحسین
۲۲۱	افزونہ کی وہابیوں سے سرد مہری	۲۳۵	معرکہ امبیلہ ۱۸۶۳ء	۲۲۱	افزونہ کی وہابیوں سے سرد مہری
۲۲۲	عنایت علی کا منگل ستخانہ میں قیام	۲۳۶	اسباب جنگ	۲۲۲	عنایت علی کا منگل ستخانہ میں قیام
۲۲۳	انگریزوں کی وہابیوں کو تنبیہ	۲۳۷	محمود شاہ	۲۲۳	انگریزوں کی وہابیوں کو تنبیہ
۲۲۴	مبارک شاہ کا سوات سے احسراج	۲۳۸	محمود شاہ کی ستخانہ میں آمد	۲۲۴	مبارک شاہ کا سوات سے احسراج
۲۲۵	انگریزی علاقے پر حملے	۲۳۹	وہابیوں کے خلاف افواہیں	۲۲۵	انگریزی علاقے پر حملے
۲۲۶	عنایت علی کا نارنجی پر قبضہ	۲۴۰	مبارک شاہ	۲۲۶	عنایت علی کا نارنجی پر قبضہ
۲۲۷	عنایت علی کی شکست دلپائی	۲۴۱	وہابیوں کا اعلیٰ کردار	۲۲۷	عنایت علی کی شکست دلپائی
۲۲۸	نارنجی کی تباہی	۲۴۲	سادات کا ستخانہ پر قبضہ	۲۲۸	نارنجی کی تباہی
۲۲۹	احمد اللہ اور محمد حسین کی نظر بندی	۲۴۳	وہابیوں کے فوجی دستے	۲۲۹	احمد اللہ اور محمد حسین کی نظر بندی
۲۳۰	انگریزوں سے عنایت علی کا آخری محاربہ	۲۴۴	وہابیوں پر حملہ کا منصوبہ	۲۳۰	انگریزوں سے عنایت علی کا آخری محاربہ
		۲۴۵	انگریزوں کی پیش قدمی		
		۲۴۶	ٹیلر کا قبیلہ بنیر کو پروانہ		
		۲۴۷	انگریزی فوج محصور		
		۲۴۸	جنرل چمبرلین کی امداد طلبی		
		۲۴۹	غظیم سرحدی جنگ		
		۲۵۰	وہابیوں کی داد شجاعت		
		۲۵۱	سرحد کی تعمیر و اہتمام		
		۲۵۲	انگریزی سپاہ کی بد حالی		
		۲۵۳	برطانوی حکام کا قبائلیوں کے ساتھ گٹھ جوڑ		
		۲۵۴	وہابیوں کا جذبہ شہادت		
		۲۵۵	ملکہ کی تباہی		
		۲۵۶	انگریزی سپاہ کو بھاری نقصان		
		۲۵۷	جنگ امبیلہ انگریزوں کی نظر میں		
		۲۵۸	وہابی تحریک کا مقصد		
		۲۵۹	خانہ صاوق پور کا ایشیا		
		۲۶۰	وہابیوں کی سیاسی بصیرت		
		۲۶۱	۱۸۵۷ء کی تحریک میں		
		۲۶۲	وہابیوں کی حکمت عملی		
		۲۶۳	۱۸۵۷ء کی تحریک میں		
		۲۶۴	اہل پنجاب کی عدم شمولیت		
		۲۶۵	وہابی تحریک کے متعلق ایک غلط خیال		

۲۸۵	زندگی جزائر انڈمان میں قیدیوں کے لئے قواعد وضوابط	۲۴۵ ۲۴۵ ۲۴۶	احمد اللہ احمد اللہ پر الزامات احمد اللہ کے خلاف شکایات	۲۶۳ ۲۶۴ ۲۶۴	قائدین پٹنہ کا ایشادو استقامت باب ۱۸۶۳-۶۵ء میں کچھ وہابیوں پر سرکاری مقدمات ۱۸۶۴ء کا مقدمہ
۲۸۶	غیر انسانی رواج کا خاتمہ	۲۴۶	احمد اللہ کا وہابی تحریک میں حصہ	۲۶۴	انبالہ
۲۸۶	یورپی قیدیوں کے ساتھ ترجمی سلوک	۲۴۶	احمد اللہ کی گرفتاری	۲۶۴	جعفر تھانیسری کی گرفتاری
۲۸۶	احمد اللہ کی پورٹ بلیر میں آمد	۲۴۸	احمد اللہ کے خلاف جرائم کی فہرست	۲۶۶	الہی بخش اور محی الدین الہی بخش کی خانہ تلاشی
۲۸۷	یحییٰ علی کی وفات	۲۴۹	احمد اللہ کے خلاف عدالت کا فیصلہ	۲۶۷	خاندان صادق پور کی خانہ تلاشی
۲۸۷	لارڈ سیو کے قتل کا وہابیوں پر الزام	۲۸۰	احمد اللہ کو جس دوام کی سزا	۲۶۷	عبدالرحیم اور عبدالغفار کی گرفتاری
۲۸۸	ایشری پر شاد کی روانگی انڈمان	۲۸۰	احمد اللہ کی جزائر انڈمان روانگی	۲۶۸	یحییٰ علی کی گرفتاری
۲۸۸	جنرل اسٹوارٹ کا غیر جانبدارانہ رویہ	۲۸۱	مقدمہ انبالہ کے نمایاں پہلو	۲۶۸	قیدیوں سے انسانیت سوز سلوک
۲۸۸	احمد اللہ کی حالت زار	۲۸۱	نمایاں پہلو	۲۶۹	قیدیوں کے اسمائے گرامی مقدمہ کا آغاز
۲۸۹	احمد اللہ کی حسرت ناک موت	۲۸۲	قیدیوں کے خاندانوں کو دھمکیاں	۲۶۹	قیدیوں کے وکلاء عدالت کا فیصلہ
۲۹۰	وہابیوں کی جائیداد کی ضبطی	۲۸۲	سرکاری گواہوں پر لوازشات	۲۶۹	عدالتی فیصلہ کی توثیق ہنزہ کا قیدیوں کو حسراج تحسین
۲۹۰	وہابیوں کا سماجی رتبہ	۲۸۲	ایک گواہ سے پہچانہ سلوک	۲۷۰	قیدیوں پر ظلم و تعدی (دب) ۱۸۶۵ء کا مقدمہ پٹنہ
۲۹۱	خاندان صادق پور کی املاک کی ضبطی	۲۸۳	بیچ کا انتقامی رویہ	۲۷۰	
۲۹۲	خاندان پٹنہ کی املاک کا حشر	۲۸۳	بیچ کا انتقامی رویہ	۲۷۱	
۲۹۳	احمد اللہ کے خاندان کی تباہی	۲۸۳	بیچ کا انتقامی رویہ	۲۷۱	
۲۹۵	وہابی فنڈ کا مصرف	۲۸۴	بیچ کا انتقامی رویہ	۲۷۱	
۲۹۵	قبروں کا انہدام	۲۸۴	بیچ کا انتقامی رویہ	۲۷۱	
۲۹۶	خاندان صادق پور کی نشاۃ ثانیہ	۲۸۴	بیچ کا انتقامی رویہ	۲۷۱	
۲۹۷	وہابی قیدیوں کی رہائی	۲۸۵	بیچ کا انتقامی رویہ	۲۷۱	
			جعفر تھانیسری کی صاف گوئی	۲۷۳	
			الہی بخش پر غیر معمولی ہجرانی	۲۷۳	
			راجہ (رح) سہرا رسیدگان کی	۲۷۴	

۳۱۹	دانا پور۔ مالہ اور کلکتہ	۳۰۸	ایشری پرشاد کی تحقیقات	۳۹۹	وہابیوں کی رہائی اور پابندیاں
	میں گرفتاریاں	۳۰۸	وہابیوں کی کاروائیاں	۳۹۹	عبدالرحیم کی مراجعت پٹنہ
۳۱۹	کرامت علی کے نام	۳۰۹	مدراں اور بمبئی کے صوبوں میں	۳۰۰	جعفر تھانیسری کی رہائی
	خطوط کی جانچ پڑتال		وہابی مبلغ اسمعیل کی مدراس		
۳۲۰	واعظ الحق کی گرفتاری		میں خدمات		
۳۲۰	ریلی کی روانگی پنجاب	۳۱۰	وہابی مبلغ احمد اللہ کی بنگال	۳۰۱	تحریک کا آخری منظر
۳۲۱	مرفعی کی نشان دہی		میں کاروائیاں	۳۰۱	وہابی جدوجہد ہندوستان
۳۲۱	پشاور میں وہابیوں	۳۱۰	احمد اللہ مبلغ کی رائے پور		میں ۸۲-۱۸۶۸ء
	کی گرفتاری		میں گرفتاری	۳۰۳	احمد اللہ کی گرفتاری پر
۳۲۱	عبداللہ کی گواہی	۳۱۲	صوبہ بمبئی کے پوس کمشنری		وہابیوں میں بے چینی
۳۲۲	پنجاب میں وہابی کارکنوں		کی رپورٹیں	۳۰۲	راج محل کے ابراہیم منڈل
	کی گرفتاری	۳۱۳	خورشید علی اور مبارک علی	۳۰۳	ابراہیم منڈل کی گرفتاری
۳۲۳	غلام شاہ حاجی کی گرفتاری		کی گرفتاری	۳۰۴	وہابی تحریک کے متعلق
۳۲۳	رہی کی راج محل کے	۳۱۴	شاہزادہ فیروز شاہ		شہادتیں
	مذہبوں کے متعلق رپورٹ	۳۱۵	نذیر حسین مجریٹ دہلوی	۳۰۴	گرے کی تحقیقات
۳۲۴	موضع ہنس پوکھر کے متعلق		امید علی کی گرفتاری	۳۰۵	وہابی تحریک کے متعلق مسائل
	رپورٹ	۳۱۶	امیر الدین ساکن مالہ	۳۰۵	مقدمہ قائم کرنے میں حکومت
۳۲۴	مشتبہ وہابیوں کی نظر بندی	۳۱۷	پٹنہ اور دانا پور میں تحقیقات		کی بے بسی
۳۲۵	بکسر میں وہابیوں کے	۳۱۸	امیر خاں اور حسنت وادھاں	۳۰۶	ابراہیم منڈل سے ناروا سلوک
	متعلق تحقیقات	۳۱۸	ترسیل زر کے لئے وہابیوں	۳۰۷	عنايت اللہ ولد فیض اللہ
۳۲۶	محمد اسحاق کی مجری محمد عمر		کا طریقہ کار		کی شہادت
	کی گرفتاری و رہائی	۳۱۹	وہابی منصوبوں کی دسی	۳۰۸	ایشری پرشاد کی پٹنہ
۳۲۷	ہند میں وہابیوں کی دسی		رہنمونوں کا کردار		میں تقرری

باب ۹

تحریک کا آخری منظر

وہابی جدوجہد ہندوستان میں ۸۲-۱۸۶۸ء

احمد اللہ کی گرفتاری پر وہابیوں میں بے چینی

راج محل کے ابراہیم منڈل

ابراہیم منڈل کی گرفتاری وہابی تحریک کے متعلق

شہادتیں

گرے کی تحقیقات

وہابی تحریک کے متعلق مسائل

مقدمہ قائم کرنے میں حکومت کی بے بسی

ابراہیم منڈل سے ناروا سلوک

عنايت اللہ ولد فیض اللہ

کی شہادت

ایشری پرشاد کی پٹنہ

میں تقرری

۳۲۲	کوہ سیاہ کی مہابت میں دہائیوں کا کردار	۳۲۵	ابراہیم آردی کی تبلیغی مہم	۳۲۸	پیمانے پر گرفتاریاں امیر خاں اور حشمت داد
۳۲۵	امیر عبداللہ کی فیروز شاہ سے درخواست	۳۲۶	ابراہیم آردی کے خلاف تحقیقات	۳۲۸	خاں کا حکومت سے مطالبہ امیر خاں اور حشمت داد
۳۲۵	امیر عبداللہ کی عظیم قیادت	۳۲۷	دہائی تحریک کے خلاف موثر کارروائی	۳۲۹	خاں کے مقدمے کا آغاز جسٹس نارمن کے قتل
	باب ۱۰	۳۲۷	سرحد پر دہائی ریاست		کا واقعہ
		۳۲۹	۱۹۰۲ - ۱۸۶۳ء آخوند سوات	۳۲۹	امیرالین اور ابراہیم منڈل کو سزائیں
۳۲۷	دہائی تحریک کا جائزہ	۳۳۰	دہائیوں کا بیچ کٹاے اخسراج	۳۳۰	ملزماں پٹنہ کے مقدمہ کا آغاز
۳۲۷	(۱) دہائی تحریک کی نوعیت	۳۳۱	دہائیوں کا پلوسی میں قیام	۳۳۱	دہائیوں کے املاک کی ضبطی دسترائیں
۳۲۸	عقیدہ ہجرت کی توضیح	۳۳۲	دہائی نوآبادی	۳۳۲	امیر خاں و حشمت داد خاں کا انتقال
۳۲۸	شمال مغربی سرحد کو مرکز بنانے کی وجہ	۳۳۱	حسن زئیوں کی دہائیوں سے کشش	۳۳۲	۱۸۷۵ء دہائی بھوپال اور رنگون میں
۳۲۹	دہائی تحریک کا بنیادی مقصد	۳۳۲	فیض اللہ کی دہائیوں کے متعلق رپورٹ	۳۳۳	۱۸۸۲ء دہائیوں کی جدو جدہ شاہ آباد میں
۳۵۱	دہائی تحریک کا دینی پہلو	۳۳۲	دہائیوں کا حکومت سے مطالبہ	۳۳۲	کلکتہ پولیس کی دہائیوں کے متعلق رپورٹ
۳۵۱	دہائی تحریک کے متعلق ہنٹر کا نظریہ	۳۳۲	ایشوری پرشار کی مخالفت	۳۳۲	دہائیوں کے خفیہ اجلاس پر پولیس کا چھاپہ
۳۵۲	ہنٹر کے نظریہ کی تردید	۳۳۲	امیر عبداللہ		
۳۵۲	سر سید احمد خاں کا طرز اصلاح				

۳۵۳	۳۵۳	۳۵۳	۳۵۳	۳۵۳	۳۵۳
۳۵۴	۳۵۴	۳۵۴	۳۵۴	۳۵۴	۳۵۴
۳۵۵	۳۵۵	۳۵۵	۳۵۵	۳۵۵	۳۵۵
۳۵۶	۳۵۶	۳۵۶	۳۵۶	۳۵۶	۳۵۶
۳۵۷	۳۵۷	۳۵۷	۳۵۷	۳۵۷	۳۵۷
۳۵۸	۳۵۸	۳۵۸	۳۵۸	۳۵۸	۳۵۸
۳۵۹	۳۵۹	۳۵۹	۳۵۹	۳۵۹	۳۵۹
۳۶۰	۳۶۰	۳۶۰	۳۶۰	۳۶۰	۳۶۰
۳۶۱	۳۶۱	۳۶۱	۳۶۱	۳۶۱	۳۶۱
۳۶۲	۳۶۲	۳۶۲	۳۶۲	۳۶۲	۳۶۲
۳۶۳	۳۶۳	۳۶۳	۳۶۳	۳۶۳	۳۶۳
۳۶۴	۳۶۴	۳۶۴	۳۶۴	۳۶۴	۳۶۴
۳۶۵	۳۶۵	۳۶۵	۳۶۵	۳۶۵	۳۶۵
۳۶۶	۳۶۶	۳۶۶	۳۶۶	۳۶۶	۳۶۶
۳۶۷	۳۶۷	۳۶۷	۳۶۷	۳۶۷	۳۶۷
۳۶۸	۳۶۸	۳۶۸	۳۶۸	۳۶۸	۳۶۸
۳۶۹	۳۶۹	۳۶۹	۳۶۹	۳۶۹	۳۶۹
۳۷۰	۳۷۰	۳۷۰	۳۷۰	۳۷۰	۳۷۰
۳۷۱	۳۷۱	۳۷۱	۳۷۱	۳۷۱	۳۷۱
۳۷۲	۳۷۲	۳۷۲	۳۷۲	۳۷۲	۳۷۲
۳۷۳	۳۷۳	۳۷۳	۳۷۳	۳۷۳	۳۷۳
۳۷۴	۳۷۴	۳۷۴	۳۷۴	۳۷۴	۳۷۴
۳۷۵	۳۷۵	۳۷۵	۳۷۵	۳۷۵	۳۷۵
۳۷۶	۳۷۶	۳۷۶	۳۷۶	۳۷۶	۳۷۶
۳۷۷	۳۷۷	۳۷۷	۳۷۷	۳۷۷	۳۷۷
۳۷۸	۳۷۸	۳۷۸	۳۷۸	۳۷۸	۳۷۸
۳۷۹	۳۷۹	۳۷۹	۳۷۹	۳۷۹	۳۷۹
۳۸۰	۳۸۰	۳۸۰	۳۸۰	۳۸۰	۳۸۰
۳۸۱	۳۸۱	۳۸۱	۳۸۱	۳۸۱	۳۸۱
۳۸۲	۳۸۲	۳۸۲	۳۸۲	۳۸۲	۳۸۲
۳۸۳	۳۸۳	۳۸۳	۳۸۳	۳۸۳	۳۸۳
۳۸۴	۳۸۴	۳۸۴	۳۸۴	۳۸۴	۳۸۴
۳۸۵	۳۸۵	۳۸۵	۳۸۵	۳۸۵	۳۸۵
۳۸۶	۳۸۶	۳۸۶	۳۸۶	۳۸۶	۳۸۶
۳۸۷	۳۸۷	۳۸۷	۳۸۷	۳۸۷	۳۸۷
۳۸۸	۳۸۸	۳۸۸	۳۸۸	۳۸۸	۳۸۸
۳۸۹	۳۸۹	۳۸۹	۳۸۹	۳۸۹	۳۸۹
۳۹۰	۳۹۰	۳۹۰	۳۹۰	۳۹۰	۳۹۰
۳۹۱	۳۹۱	۳۹۱	۳۹۱	۳۹۱	۳۹۱
۳۹۲	۳۹۲	۳۹۲	۳۹۲	۳۹۲	۳۹۲
۳۹۳	۳۹۳	۳۹۳	۳۹۳	۳۹۳	۳۹۳
۳۹۴	۳۹۴	۳۹۴	۳۹۴	۳۹۴	۳۹۴
۳۹۵	۳۹۵	۳۹۵	۳۹۵	۳۹۵	۳۹۵
۳۹۶	۳۹۶	۳۹۶	۳۹۶	۳۹۶	۳۹۶
۳۹۷	۳۹۷	۳۹۷	۳۹۷	۳۹۷	۳۹۷
۳۹۸	۳۹۸	۳۹۸	۳۹۸	۳۹۸	۳۹۸
۳۹۹	۳۹۹	۳۹۹	۳۹۹	۳۹۹	۳۹۹
۴۰۰	۴۰۰	۴۰۰	۴۰۰	۴۰۰	۴۰۰

حیات اور مکتوبات سید احمد شہید کے بعد

ہندوستان میں وہابی تحریک

ازہ۔ چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندری

یہ کتاب جو اس وقت آپ کے سامنے پیش ہے، ڈاکٹر قیام الدین صاحب ایم اے پی ایچ ڈی کی گراں قدر اور بے مثال تصنیف "ہندوستان میں وہابی تحریک" (انگریزی) کا اردو ترجمہ ہے۔ یہ ترجمہ پروفیسر محمد مسلم صاحب ایم اے نے کیا ہے۔ اور خود پروفیسر صاحب کا نام نامی ترجمہ کی خوبی، سلاست اور عمدگی کے نئے نمائندہ ہے۔ پروفیسر صاحب حضرت شاد کے شاگرد رشید اور پختہ مشق ادیب و شاعر ہونے کے علاوہ انگریزی اور اردو دونوں زبانوں کے اداسناس ہیں۔ ان کے ترجمہ کی خوبیوں کا کیا کہنا۔ مصنف کتاب ڈاکٹر قیام الدین صاحب نے یہ کتاب اس وقت لکھی ہے جب کہ ہندوستان میں وہابی تحریک اسے متعلقہ مواد بہت کچھ ظاہر ہو چکا تھا اور جو ابھی تک عام نظروں سے پوشیدہ تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے بڑی جستجو سے حاصل کیا ہے۔ اردو میں اس موضوع پر متعدد کتابیں لکھی ہیں مولوی محمد حنیف کی تواریح عجیبہ۔ کالا پانی، غلام رسول مہر مرحوم کی تین ضخیم کتابیں۔ تحریک مجاہدین۔ سرگذشت مجاہدین۔ اور سید احمد شہید بولوی کے علاوہ مرحوم مولانا مسعود عالم ندوی کی کتاب ہندوستان کی پہلی سیاسی تحریک اور مولانا ابوالحسن سید علی ندوی کی کتاب سید احمد شہید، اس سلسلہ کی مشہور کتابیں ہیں۔ ڈاکٹر قیام الدین صاحب کی اس کتاب میں مذکورہ بالا تمام کتابوں کے علاوہ دوسرے متعدد ذرائع اور کاغذات سے حاصل شدہ اور بہت سا مواد موجود ہے جو کسی اور کتاب میں موجود نہیں ہے۔ اس لئے بلا خوف تردید یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع پر دنیا میں سب سے زیادہ مکمل کتاب ہے اور جدید ترین معلومات پوری طرز اس میں موجود ہیں۔

وہابی تحریک حقیقتاً اس تحریک کا نام ہے جو شیخ محمد بن عبدالوہاب نجدی المتوفی ۱۲۰۶ھ ۱۷۹۲ء نے نجد میں چلائی تھی۔ یہ ایک اصلاحی تحریک تھی جس کا مقصد یہ تھا کہ مسلمانوں میں جو غیر ضروری اوہام اور غیر شرعی اعمال و رسوم پیدا ہو گئے ہیں انہیں ختم کر کے دین کو اپنی قدیم سادگی پر واپس لایا جائے۔ اور دین پر مرثیے کی جو مناسی بہ کرام میں موجود تھی اسے پھر سے زندہ کر دیا جائے۔ ظاہر ہے کہ اس مقصد

میں وہابیوں کو مختلف طاقتوں سے ٹکرانا پڑا اور وہ ٹکرائے۔

ہندوستان کی وہابی تحریک کا اس سے حقیقتہً کوئی تعلق نہ تھا۔ مگر چونکہ یہ لوگ بھی دینی جذبات سے زینت تھے، ان میں بھی روح جہاد کا رشتہ مانتی اور یہ بھی دین کو عہد اول کی سادگی پر لانا چاہتے تھے اس لئے لوگ بھی وہابی مشہور ہو گئے یا دوسروں نے انکی تحریک کو وہابی تحریک کے نام سے موسوم کر دیا۔

ہندوستان کی وہابی تحریک جسکی ابتدا حضرت شاہ ولی اللہ محدث دہلوی کی تعلیمات سے ہوئی۔ انکی یاد ادا انکے شاگردوں نے اس درخت کی آبیاری کی اور حضرت سید احمد شہید بریلوی۔ حضرت مولانا اسماعیل شہید ان کے جاں نثار رفیقوں نے اسے اپنے خون سے سینچا۔ یہ ایک عوامی سیاسی تحریک تھی اور یقیناً پہلی عوامی تحریک تھی۔ اس کا مقصد کسی کو تخت و تاج دلوانا نہیں تھا۔ بلکہ غیر مسلموں کے اقتدار اور ان کے بے پناہ مظالم سے مسلمانوں کو نجات دلانا تھا۔ اگرچہ سید احمد بریلوی اور مولانا اسماعیل شہید اپنے چھ سو رفقاء کے ساتھ مئی ۱۸۳۱ء کو بالاکوٹ میں شہید ہو گئے۔

بنا کر دند فوش رسے بہ خاک و خون غلطیدن

نہد رحمت کند این عاشقان پاک طینت را

لیکن اس تحریک نے مظلوموں کے قلوب میں وہ آگ روشن کر دی جو بار بار بھڑکتی رہی اور وہ وقت بھی آ ہی گیا کہ

دیدم کہ خون ناحق پر دانہ شمع را

چندان امان نہ داد کہ شب را سحر کند

کہاں تو یہ حال تھا کہ سکھوں کے تسلط میں اذان دینا بھی حرام تھا۔ شاہی مسجد رنجیت سنگھ کے ڈروں کا اصل بنی ہوئی تھی، اور کہاں یہ وقت کہ ڈھونڈنے پر کبھی ہزار ہا اور لاکھوں میں کوئی سکھ طے نہیں آتا۔ سکھوں کے بعد انگریز جو دشمن ہوئے تو ایسے ہوئے کہ ہر بابند شرع آدمی پر دہابی ہونے کا لازم لگا کر کالا پانی بھیتے رہے۔ کتنی ہی بار پنجتارا اور ستھانہ پر جو مجاہدین کے مرکز تھے۔ انگریزی فوجوں نے جگ بوسائی اور ایسے ایسے مظالم کئے کہ ان کا ذکر بھی غصہ اور نفرت کی آگ بھڑکانے کے لئے کافی ہے لیکن اس سے کیا نتیجہ نکلا۔ ۱۹۲۶ء میں پاکستان کے قیام تک ان کا مرکز بھی قائم رہا اور انکی تنظیم بھی موجود رہی مگر یہ کبھی ان کو سرنگوں کرنے پر قادر نہ ہو سکے۔ ۱۹۴۷ء میں جب مسلمانوں کی ایک مملکت پاکستان قائم ہو گئی تو آخری امیر المجاہدین نے یہ اعلان کر دیا کہ اب اس تنظیم اور مرکز مجاہدین کی ضرورت باقی نہیں رہی۔ اس کا جواب پوری کتاب کو پوری توجہ سے پڑھ کر خود اپنے دل سے پوچھئے۔

سید احمد شہید کے حالات کو پڑھ کر جہاں اس بات پر حیرت ہوتی ہے کہ آج کے دور میں جو سو سال پہلے ہم میں اتنے مخلص بے خوف اور جفاکش مجاہدین موجود تھے وہاں یہ بات کہہ کر حیرت افزا نہیں کہ اس تحریک کے مقاصد میں کس قدر جاذبیت اور اس کے مقدس و محترم رہنما میں کس بلا کی مقناطیسی قوت موجود تھی کہ اسکی آواز پر مسلمان جنگل و صحراء کو عبور کر کے اور جھوک پیاس کی شدت کو برداشت

کرتے ہوئے۔ خطرات کو جھیلنے ہوئے، کفن بردوش اور سر بکھت انتہائی تکلیف دہ اور غیر دلچسپ پہاڑی علاقے میں کھینچے ہوئے چلے آتے تھے، اور کیا حاصل کرنے کے لئے چلے آتے تھے، دولت دنیا۔ محلات و اعزازات، وزیر می و مشیری، شہرت و ناموری؟ نہیں ان میں سے کچھ بھی نہیں۔ خالق ارض و سما کی رضامندی کے لئے۔ اور

شہادت ہے مقصود و مطلوب مومن
نہ مال غنیمت نہ کشور کشائی

سوچنا ہوں اور شرم سے سر جھکا کر خود اپنے دل سے پوچھتا ہوں کہ اب ہمارے علماء اور زعماء کی آوازوں میں وہ جاذبیت کیوں نہیں موجود ہے۔ کون دے اس کا جواب، اور کہاں سے ملے جواب۔ سچ ہے کہ
”و قومیں جب تباہ ہونے لگتی ہیں تو سب سے پہلے اس قوم کے
ارباب اقتدار اور ارباب علم بگڑ جاتے ہیں“
اس کتاب کی اشاعت سے ہمارا مقصد صرف کاروبار ڈی نہیں بلکہ اصل مقصد یہ ہے کہ ہمارے پورے
اور جوان، مرد اور عورت سب اس کو پڑھیں اور دیکھیں کہ کتنے حوصلہ شکن حالات میں دل والے ایمان اور یقین
والے اور جوش و عمل رکھنے والے کام کیا کرتے ہیں اور کتنے موانع اور رکاوٹوں کے باوجود دین و شریعت سے
وابستگی کو قائم رکھتے ہیں۔

لیجئے یہ کتاب آپ کے سامنے پیش ہے۔ ملاحظہ فرمائیے۔ ہماری دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کے مطالعہ
سے ہمارے سیاست دانوں اور عوام کو فائدہ اٹھانے کی توفیق عطا فرمائے۔
وما توفیقی الا باللہ

بِسْمِ اللّٰهِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ

پہلی نظر

نام کتاب میں نے جب اس کتاب کا مطالعہ شروع کیا تو پہلے ”وہابی موومنٹ“ کے نام سے بدخط ہوا۔ مگر تمہید میں ان کا یہ عندیہ دیکھ کر مطمئن ہو گیا کہ وہ جماعت مجاہدین ہند کے انگریزوں کے تھوپے ہوئے خطاب ”وہابی“ کے اختیار کرنے پر اس لئے مجبور ہو گئے کہ ان کے شاطرانہ پروگنڈے سے ایک طرف مسلمانان ہند فریب کھا کر ان کو نجدی وہابیوں کا پیرو سمجھے اور اسی نام سے پکارنے لگے، دوسری طرف انگریزوں اور ہندوستانیوں نے بھی اس موضوع پر جو کتابیں اور رسالے لکھے، یا سرکاری دفاتر میں ان سے متعلق جو رپورٹیں اور سٹاڈیز اور جتنے ماخذ ہیں سب میں ان کو اسی لقب سے یاد کیا گیا ہے۔ اس طرح یہ داغ ان کی پیشانی پر ایسا چپکا ہے کہ چھڑائے نہ چھوٹا۔

اس سلسلہ میں کچھ مزید توضیح مناسب سمجھتا ہوں۔ حضرت سید احمد شہید کا کوئی واسطہ بانی وہابیت محمد بن عبدالوہاب سے نہ تھا، نہ یہ دونوں معاصر تھے۔ محمد ۱۷۹۲ء میں وفات پا چکے تھے اور حضرت سید احمد ۱۸۲۱ء میں حج کو حجاز تشریف لے گئے تھے، اس لئے ان میں باہم ملاقات کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ پھر محمد بن عبدالوہاب کے پیرو وہابیوں کی کشمکش مسلمانوں سے تھی اور مجاہدین ہند کی کفار سے یہ بہت بڑا اصولی فرق تھا۔

مجاہدین کی سکھوں اور انگریزوں کے ساتھ آویزش سے بیکر آخری مجاہد امیر عبدالقدتک سرحدی قبائل اور سکھ بھی ان کو ”ہندوستانی“ کے نام سے موموم کرتے تھے۔

رہا بعض عقائد میں وہابیان نجد اور مجاہدین ہند کا اشتراک یا مماثلت، تو سبھی اصلاح عقائد میں یہ قدرتی اور اتفاقی ہے، جسے سیاسیات سے کوئی تعلق نہیں۔

وہابیان نجد سے انگریزوں کی عداوت کی وجہ یہ تھی کہ وہابیوں کی آدیش صرف ترکوں سے نہیں ہوتی بلکہ فارس میں وہابیوں کی مدافعانہ سرگرمی سے انگریزوں کے نوآبادیاتی مفاد اور جوع الارضی سے تصادم ہوا اور خونریز جھڑپیں ہوئیں۔ اسی لئے وہ وہابیوں سے سخت عداوت رکھتے تھے اور مزید جھڑپوں کا اندیشہ رہتا تھا۔ انگریزوں نے اپنی فطری عیارانہ حکمت عملی سے مجاہدین کو مسلمانان ہندوستان میں مبغوض و مردود کرنے کا یہ زبردست حربہ استعمال کیا کہ ان کو وہابی بنا دیا۔ یہ انگریزوں کا پرانا آزمودہ حربہ تھا جسے علمائے سوئے کے ہاتھوں میں دیکھ کر دور سے ہی اپنا کام نکالتے تھے۔ علمائے سوئے کی کمی نہ تھی۔ یہ ہمیشہ حکام وقت کے آلہ کار بنے رہے۔ ٹیپو سلطان شہید نے جب انگریزوں کے خلاف جہاد کا اعلان کیا اور شمالی ہند کے مسلمانوں کو بھی دعوت جہاد دی تو انگریزوں نے نام نہاد خلیفۃ المسلمین سلطان سلیم سے درخواست کی کہ وہ شیخ الاسلام سے ایک فتویٰ لکھوائے کہ انگریز مسلمانوں کے فرائض و شعائر اسلامی میں دخل انداز نہیں ہوتے اس لئے ان کے خلاف جہاد جائز نہیں۔ سلطان ٹیپو دکن میں فرانسیسی افواج سے مدد لینے اور ان کے افواج کی عسکری تربیت بھی فرانسیسی سپہ سالاروں کے ہاتھ میں تھی اور فرانس نپولین کے ماتحت لڑکی کا حریف تھا۔ اس نے فرانسیسیوں سے ٹیپو سلطان کا گٹھ جوڑا۔ سلطان سلیم کو سخت ناگوار تھا۔ اس نے انگریزوں کی خواہش پوری کر دی اور مطلوبہ فتویٰ مہیا کر دیا۔ انگریزوں نے علمائے ہند کی وساطت سے اس کی خوب تشہیر کی۔ ان سے جہاد کے خلاف رسالے لکھوائے اور وعظ کھلوائے۔ ٹیپو سلطان لڑتے لڑتے شہید ہو گئے مگر شمالی ہند کے مسلمانوں نے انگلی بھی نہ اٹھائی۔

مجاہدین شمالی ہند کے ساتھ بھی پیر بہ کامیابی کے ساتھ استعمال کیا گیا۔ اس موقع پر بھی انگریزوں نے اپنے اور لڑکی کے مشترک دشمن کے ساتھ مجاہدین ہند کو آسانی سے وہابی یا بے دین مشہور کر دیا، ورنہ اصلیت کچھ نہیں۔

رباعقائد میں کچھ اختلافات یا اجتہادات تو یہ دوسری ہی صدی میں معتزلہ کے ہاتھوں شدت سے رونما ہو چکے تھے۔ ان سے قطع نظر اب سے سات صدی پیشتر امام ابن تیمیہ اور علامہ ابن قیم نے استحداد بغیر اللہ، سمع موتی، ایصال ثواب، پیرپستی، تعظیم قبور، نذر و نیاز سے

تعلق مدلل بحثیں اور آواز بلند کی۔ بے شک اپنی تمیہ نے ان کی پاداش میں قید و بند
 ین زندگی گزار دی اور زندان میں ہی وفات پائی مگر مرتے ہی قوم نے ان کو مہر و
 نالیا اور ان کے خلاف فتارے کا سلسلہ ختم کر دیا۔ پھر عہد اکبری میں حضرت
 سید احمد سرہندی مجدد الف ثانی نے بھی حق گوئی کی پاداش میں ہی قید زندان میں
 زندگی گزار دی۔ اس کے دو صدی کے بعد شاہ ولی اللہ محدث دہلوی نے بھی عام
 نقاد پر بحث کی۔ شاہ عبدالعزیز محدث دہلوی بھی ان کے شریک رہے مگر آج یہ
 سب مجتہد اور فقہا تسلیم کئے جاتے ہیں، مگر ایسے ہی فردعی اختلافات کی
 بدولت مجاہدین ہندوستانی اور بے دین ٹھہرائے گئے۔ یہ امتیاز خاص اور وہابی
 کا لقب ان کو صرف جہاد کے انعام میں انگریزوں سے ویسے ہی عنایت ہوا جیسے
 جزیرہ انڈمان کی مہانی۔

وہابی تحریک اصلاً مذہبی تھی یا سیاسی؟ اس سوال پر ہمارے مورخین تحریک
 بہت الجھے ہیں۔ اصل یہ ہے کہ اسلام میں دین و سیاست کا چھوٹی دامن کا ساتھ ہے
 ان کو ایک دوسرے سے علیحدہ کرنا ممکن نہیں یہ اجتماع و اختلاط کس طرح ممکن ہے
 اسلام نے ایمان کے زور سے کر دکھایا۔ اسی عہد سے جب مسلمانوں کو پیٹ بھر
 روٹی بھی نصیب نہ تھی اپنی زنگ خورہ تلواروں تیرکٹوں اور معدود چند لاغر اور
 بے زین کے گھوڑوں پر ہزاروں بکتر بند گھوڑوں ہاتھیوں پر آزمودہ کار رومی اور
 ایرانی سوراؤں کے مقابلے میں ڈٹ گئے۔ نہ جان و مال کی پروا کی نہ ہزیمتوں سے
 بیدل ہوئے۔ آخر قیصریت و خسرویت کا خاتمہ کر دیا۔ کیا یہ سیاست نہ کھتی ضرور
 تھی مگر دین کا جز و لازمی اور ایمان کا کرشمہ۔

ہندوستان میں شجر جہاد نظر تو صرف زمین کے اوپر آتا ہے مگر اس کی بڑیں
 شاہ عبدالعزیز اور شاہ ولی اللہ سے اور گہری ہوتی ہوئی حضرت مجدد الف ثانی
 تک پہنچتی ہیں۔ ہندوستان میں اکبر کی الحاد پروری کے مقابلے میں جب سائے
 علما خاموش تماشائی تھے۔ حضرت مجدد نے سبر سے قید و بند کی مشقتیں تسلیم لیں اور

اکبر کی سیاسی طاقت کا مقابلہ نہ کر سکے۔ بالفعل ان کی آرزو دل میں گھٹکر رہ گئی مگر یہ آرزو ان کے ارادتمندوں کے دلوں میں کلبلاقی رہی اور عمل میں نہ آسکی، یہاں تک کہ دو صدی کے اندر اٹھارہویں صدی میں شاہ ولی اللہ نے بھی انگلیہوں کی قہر بانیت اور مسلمانوں کی محکومیت و بیچارگی محسوس کی۔ وہ مسلمانوں کی عام ذہنی و اقتصادی حالت دیکھ کر زبان ہلانے اور سیاست میں الجھنے کی ہمت نہ رکھتے تھے۔ علوم کلام اور اسلامی نظریات پر انھوں نے مجتہدانہ مضامین لکھ کر اصلاح عقائد کی انتہائی کوشش کی۔ علمائے وقت کے علی الرغم قرآن شریف کا فارسی ترجمہ کر دیا اور ان کے بیٹوں شاہ رفیع الدین اور شاہ عبدالقادر نے اردو ترجمے بھی کر دئے۔ اس طرح نظریات و اعتقادات کی اصلاح کی بنیاد ڈالی اور سیاسی جدوجہد کے لئے بھی میدان کھول دیا۔ مگر سیاسی کانٹے کی کھٹک نے بے چین رکھا۔ اپنے بیٹے شاہ عبدالعزیز کو یہ کاٹھا ماتہ سونپ گئے۔ وہ بھی اکیلے اپنے آپ میں اس بار کے اٹھانے کی طاقت نہ پاتے تھے۔

کہاں یہ تاب و طاقت ہے کہ یہ قفل دہن کھولیں خزانے کی طرح دل میں لئے بیٹھے ہیں راز اس کا شاہ عبدالعزیز تمام عمر اس تاک میں رہے کہ کوئی ایسا مرد مومن ہاتھ آئے جو اس (شاہ) تحریک اصلاح کا بار اٹھانے کی طاقت رکھتا ہو۔ اپنے بھتیجے اور شاگرد شاہ اسماعیل کو تیار کیا۔ وہ بڑے جیالے منچلے جید عالم نکالے پھر بھی ان کے معیار پر پورے نہیں اترتے تھے۔ ان کے داماد شاہ عبدالحی بھی نہایت قابل صاحب بصیرت، پرہیزگار عالم تھے، مگر وہ کسی کو اپنے مشن کے لائق نہ سمجھے۔ اسی زمانے میں سید احمد پھرتے پچھرتے تحصیل علم کے لئے ان کی خدمت میں حاضر ہوئے، ان کے شاگرد بھی ہونے اور مرید بھی۔ پیر نے مرید کی بعض باتیں (جیسے مسئلہ تصور شیخ پر اختلاف) سن کر اور درویشانہ اطوار دیکھ کر بھانپ لیا کہ آخر آذر لیس پردہ تقدیر پدید۔ سید احمد ٹونگ میں سپاہیانہ تجربہ بھی حاصل کر چکے تھے دین میں ان کی بصیرت کے قابل ہو گئے سب سے بڑھ کر ایک چیز اور تھی۔ ”بسیار شیوہ ہاست بقاں را کہ نام نیست“۔ وہ شیوہ جس کی تلاش تھی

سید احمد میں دیکھ لیا وہ کتنی ان کی روحانیت و مادہ وہی جسے ہم آپ تمیز نہیں کر سکتے۔
جہاں تک علم و دانش کا تعلق ہے سید احمد کو شاہ اسمعیل سے کوئی نسبت نہ تھی، مگر
شاہ عبدالعزیز نے شاہ اسمعیل اور شاہ عبدالحی کے ہاتھ سید احمد کے ہاتھ میں دیدئے۔
شاہ اسمعیل ایسے مرید ہوئے کہ تادم آخر مرشد کا دامن نہ چھوڑا اور مرگہ بھی میدان
بالاکوٹ میں ان کا خون مرشد کے خون سے مل گیا۔

علماء و فقہانے دین کی جو خدمتیں کی ہیں وہ اظہر منی الشمس ہیں مگر ان میں سے
امام ابن تیمیہ کے سوا شاید کسی نے جہاد کے لئے تلوار اٹھا کر جانا بازی نہیں دکھائی۔
تیرہویں صدی ہجری میں یہ سعادت سید احمد شہید، شاہ اسمعیل شہید اور ان کی جماعت
کے لئے مقدر تھی اے

یہ رتبہ بلند سلا جس کو مل گیا ہر شخص کے نصیب میں دار و رسن کہاں
خیر یہ تو بعد کی باتیں تھیں جو برسبیل تذکرہ پہلے زبانِ قلم سے نکل گئیں۔ شروع میں
شاہ عبدالعزیز کی تعلیمات کی روشنی میں ان کے شاگردوں اور مریدوں، شاہ اسمعیل، شاہ
عبدالحی، سید احمد وغیرہ نے اس مسئلہ پر غور و فکر کیا کہ کفار اور بالفعل سکھوں کے
مسلمانوں پر آئے دن لرزہ خیز مظالم و خونخواریوں کا مقابلہ اس بے سرو سامانی میں کس
طرح کیا جائے؟ مسئلہ ان کا سمجھا بوجھا ہوا تھا، آسانی سے حلے پار کیا کہ یہ مقابلہ و مدافعت
اسی طرح کیا جائے جس طرح قرونِ اولیٰ کے مسلمانوں نے ہم سے زیادہ بے سرو سامانی
کے باوجود کفار سے کیا اور کامیاب ہوئے۔ مسلمانوں کو غیر اسلامی زندگی سے روک کر
اسلامی زندگی اختیار کرنے پر تیار کیا جائے۔ ان کو غیر اسلامی رسوم سے جو اسلامی بنانی
گئی ہیں آگاہ و محترم کیا جائے۔ جلیے شادی، غمو کی مختلف نمود، اختتامِ عرس پر تبرج
اخراجات، اسراف و تبذیر، یہاں تک کہ بھاری بھاری قرضوں سے ان کا انجام۔ ان کو

لے گئے صوفیہ میں سے طوائف میں منوسیہ تحریک اور مالیہ میں مہدی سوڈانی کی قربانیاں بھی ناقابل فراموش ہیں لیکن
ان کا ظہور وہابی تحریک کے بعد اور دونوں کا تشریحی وجود وہابی تحریک کا عمل اللہ تعالیٰ نے بعد ذالک اہل

ترک کر کے کفایت شعاری و سادہ زندگی..... سے بچائی ہوئی دولت اور بہت تبلیغ دین اور جہاد پر صرف کی جاسکتی ہے۔

جہاد کا بھولا ہوا سبق پھر یاد کرایا جائے۔ ہر مسلمان عمر بھر اپنے آپ کو سپاہی سمجھے، مرنے مارنے کو تیار رہے۔ سپاہیانہ زندگی کے لئے نکاح بیوگان اور تعداد ازدواج بھی جاری کیا جائے۔ کیونکہ نکاح محض نفسانی و جنسی تقاضا نہیں، بلکہ گونا گوں اقتصادی، سماجی سیاسی و فوجی مسائل کا حل بھی ہے۔ خصوصاً اس زمانے میں جب کہ محامیہ کی کثرت تعداد فوجی کامیابی کا بہت قوی عنصر تھی۔

اسی طرح پیروں کی لوٹ کھسوٹ اور اس کے نتائج پر غور کیا گیا۔ اور طے پایا کہ قبروں کی آرائش، روضوں کی تعمیر، بزرگوں کے مزاروں کی بجا ترا، عرس، نذر و نیاز پر ضائع ہونے والی رقمیں بچائی جائیں۔ ازیں قبیل اپنی اور مردوں کی سکونت (مقبروں) مساجد مدارس کے لئے عالی شان عمارات کی تعمیر سے اجتناب کا فیصلہ کیا گیا۔ ایسے افعال کا نتیجہ مسلمانوں نے پاکستان کو ہجرت کرتے ہوئے دیکھ لیا۔ نیز مسلمانوں کے ذہن نشین کیا جائے کہ انکا کوئی ایک وطن نہیں۔ ”مسلم ہیں ہم وطن ہے سارا جہاں ہمارا“ اور مدفن کے لئے بھی مردہ عزیزوں اور بزرگوں کے قرب کی تلاش بھی خام خیالی ہے۔

ان تمام اصلاحات کو آپ مذہبی کہیں گے یا سیاسی؟ کچھ بھی نہیں اور سب کچھ۔ اسلام میں سیاست جدید معنوں میں کوئی اصطلاح ہی نہیں۔ مسلم لغت میں یہ لفظ موجود نہیں۔

تعارف ڈاکٹر قیام الدین احمد پروفیسر تاریخ پٹنہ یونیورسٹی کی یہ تالیف درحقیقت ان کی پی ایچ ڈی کا تحقیقاتی مقالہ ہے۔ ہر چند موضوعات پر کئی تالیفات لکھی گئی ہیں اور ان میں موجود ہیں جن میں مولانا غلام رسول مہر کی تالیف سید احمد شہید، جماعت مجاہدین و سر گذشت مجاہدین پر مشتمل چار جلدوں میں اتنی شرح و بسط، تحقیق و تدقیق اور ساتھ ہی انشا پر دازانہ قدرت سے لکھی گئی ہیں کہ اب تک وہ اس موضوع پر حرف آخر سمجھی جاتی ہیں۔ مگر تاریخ میں کوئی حرف آخر مشکل سے ہوتا ہے۔ یہ جنگل ناپیدا کنار ہے۔ ڈاکٹر صاحب کو اس تحقیقات کے دوران میں بہت سے ایسے موارد مل گئے جن تک اوروں

کی رسائی نہ تھی علاوہ برہمنوں کے خاندان صادق پور کے چشم و چراغ بھی ہیں۔ تحریک کے ایک عظیم قائد مولانا احمد اللہ کے بیٹے حکیم عبدالحمید کے نواسے ڈاکٹر عظیم الدین احمد صدر شعبہ عربی پٹنہ کالج کے پوتے ہیں۔ اسی طرح ان کو اپنی خاندانی روایات پر بھی بہت کچھ دسترس ہے۔ ان سہولتوں سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے تحریک سے متعلق مزید تحقیق اور بعض غلط فہمیوں کی اصلاح بھی کوی ہے۔ اب اس موضوع پر ان کی کتاب کم سے کم ہنگریزی میں احرف آخر ہے۔

اس لئے میں نے باوجود کبرسی وضعف بصارت اس کا ہو بہو مکمل ترجمہ پیش کر دیا۔ خاکسار مترجم بھی اسی خاندان کا ایک "بدنام کنڈہ نکونامے چند" ہے اور تحریک کے دوسرے بزرگتر قائد، سید احمد شہید کے خلیفہ ثانی مولانا عنایت علی کا پوتا ہے اس جہت سے اس کا تعلق قدیم تر ہے اور روایات خاندانی سے واقفیت میں کسی سے زیادہ نہیں تو کم بھی نہیں۔ اس لئے میں نے اتنی جسارت کی کہ جا بجا ذیلی حاشیہ (نوٹ نوٹ) میں مولف کے بعض تسامح یا غلط فہمی کی توضیح بھی کر دی۔ امید ہے کہ اب اردو میں یہ کتاب دہلوی تحریک کی مکمل روداد اور موجودہ اور آئندہ نسلوں کے لئے چراغ راہ ثابت ہوگی۔

مولف کے بعض ذیلی حواشی، خصوصاً دستاویزات کے کچھ حوالے میں نے ترک کر دیئے ہیں، اس لئے کہ ان حوالہ جات تک عام قارئین کی رسائی مشکل ہے۔ باقی تمام حوالے مع فہرست مآخذ اردو فارسی بھی نقل کر دیئے ہیں۔

اکثر مقامات ایسے ہیں جن سے اب اکثر قارئین کو شاید کوئی دل چسپی نہ ہو۔ مگر میں نے کسی کو نہیں تھپوڑا۔ ان ناموں میں سے کچھ مجاہدین و معاونین جہاد کی اولاد ہیں جو اپنے اسلاف کے کارناموں سے ناواقف یا غافل و بے پروا کر بے فکر زندگی گزار رہے ہیں ان کے لئے اپنے فراموش کردہ اسلاف کے کارناموں کا ذکر تازیانہ عبرت ہوگا۔ ان کی آواز اب بھی سن لینگے۔

دیکھو مجھے جو دیدہ عبرت نگاہ ہو میری سنو جو گویش نصیحت نبوش ہو

ہر مسلمان کو ہر زمانہ اور ہر زمین میں مجاہد رہنا ہے۔

تعظیمی خطاب مولف کتاب نے تمام مجاہدین و اکابر کے نام جن میں اکثر جلیل القدر علماء ہیں کسی تعظیمی خطاب مثلاً شہید، مولانا، مولوی یا حضرت کے بغیر لکھے ہیں۔ یہی انگریزی تاریخوں کا دستور بھی ہے۔ میں نے بھی ترجمہ بعینہ کر دیا ہے۔ اپنی طرف سے تعظیمی الفاظ نہیں بڑھائے۔ واقعہ بھی یہ ہے کہ یہ بزرگوار ہر تعظیمی توصیف سے مستغنی تھے۔

زمشقی ناما جمالی یار مستغنی ست

باب درنگ حال و خطبہ حاجت کے زیبارا

محمد مسلم - عظیم آبادی (پروفیسر)

کراچی ۱۳ جنوری ۱۹۶۱ء

تمہید

ڈاکٹر قیام الدین احمد

۱۹۵۲ء میں کے بی جی سوال انجمن تحقیقات پٹنہ میں ایک تحقیقاتی طالب علم کی حیثیت سے میرے تقرر کے فوراً بعد حکومت بہار نے مجھے ڈاکٹر کے کے دتا کے زیر نگرانی جو انجمن کے اعزازی جانیٹ ڈائریکٹر تھے، کنور سنگھ اور امر سنگھ کے سوانح حیات مرتب کرنے کے لئے مامور کیا۔ اس کام میں مجھے صرف بہار کے تقریباً تمام ضلعی اور ڈویژنل محافظ خانے ہی نہیں بلکہ پٹنہ، کلکتہ، الہ آباد اور دہلی کے محافظ خانے کنگانا پڑے۔ اُس وقت میری تحقیقات کا خاص موضوع بہار میں ۱۸۵۷ء کی تحریک تھا۔ لیکن اکثر دستاویزات جو میرے ہاتھ آئے اُس فساد کے زمانے میں وہابیوں اور ان کی جدوجہد سے بھی متعلق تھے۔ وہابیوں کے متعلق جزواً جزواً جو معلومات مجھے حاصل ہوئیں ان سے اسی موضوع پر میرا شوق تجسس بھڑک اٹھا۔

وہابی تحریک کی تاریخ کی تالیف و ترتیب ایک کٹھن اور بڑا محنت طلب کام تھا۔ مختلف سرکاری محافظ خانوں سے اہم معلومات جمع کرنا اور کاغذات پیرانی کتابوں اور مسودوں کی جانچ پڑتال اور مطالعہ کرنا تھا۔ ان کے علاوہ تحریک کی مکمل تصویر کشی کے لئے کچھ نادر و نایاب ممنوع الاشاعت وہابی رسالے گوشہ گنگا می سے کھود کر بہت کوشاں تھے اگرچہ لفظ وہابی غلط تسمیہ ہے مگر اس کی تشہیر استعمال عام کی وجہ سے میرے لئے اس کا کتب کے نام میں اسے اختیار کرنا ناگزیر ہو گیا۔ سید احمد بریلوی کے متبعین کو اہل حدیث، یا موحدین یا مسلمین سے تعبیر کرنا اور ہر جگہ قوسین میں "وہابی" کے لفظ کا اضافہ کرنا اور کچھ نہیں تو جھنجھٹ ضرور تھا۔ انگریزوں اور اکثر ہندوستانی

مفسفوں کا اس خطاب کے استعمال پر اصرار و ابرام عمدًا اور بد نیتی پر محمول معلوم ہوتا ہے۔ (اب نجدی وہابیوں نے شروع میں عوام کے بعض اعمال کو جن کو وہ غیر اسلامی تصور کرتے تھے روکنے کے لئے فراطحوش میں جن حرکات کا ارتکاب کیا ان کی بدولت یہ جمہور مسلمانان ہند اور دوسری جگہوں میں بہت بدنام اور انگشت نما رہے۔ حکومت برطانیہ کی نظر میں تو لفظ وہابی غدار اور باغی کا مترادف تھا۔ اس طرح سید احمد کے متبعین کو وہابی سے تعبیر کر کے اُس وقت کے سرکاری حکام ایک تیر سے دو چٹریوں کا شکار کرنے کا ارادہ رکھتے تھے ایک تو اعلیٰ حکام کے طبقے میں ان پر باغی ہونے کا داغ لگانا دوسرے عام مسلمانوں میں انتہا پسند متعصب اور مآثر کا غارتگر قرار دینا۔ یہ لفظ ایک مذہبی سیاسی و شناسام بن گیا۔ بہر حال اس کتاب میں وہابی کا خطاب برقرار رکھا گیا۔ اس لفظ کے غلط مفہوم سے جو اس میں پنہاں ہے مولف کو قطعاً کوئی سروکار نہیں۔

یہ کتاب دراصل پی۔ ایچ۔ ڈی کی ڈگری کے لئے میرے اُس مقالے پر مبنی ہے جو میں نے ۱۹۶۱ء میں پینہ یونیورسٹی میں پیش کیا تھا اس کے بعد بعض نئے مواد جو باہر سے دستیاب ہوئے ان کی مدد سے اس کی نظر ثانی کی گئی، نئی ترتیب دی گئی اور توسیع کی گئی۔ یہ ایک حد تک اس تاخیر اشاعت کا عذر ہے۔

یہ کتاب کئی اصحاب کے زیر بار منت ہے۔ میرے لئے اپنے دو واجب التعظیم استاد ڈاکٹر کے دنا و اُس چانسلر پینہ یونیورسٹی اور پروفیسر سید حسن عسکری کے شکریہ کے کا حق احساس کا اظہار ناممکن ہے۔ ڈاکٹر دتا کی عالمانہ رہنمائی، ترغیب اور دلچسپی کے بغیر میرا مقالہ اور یہ کتاب شاید تکمیل نہ پاسکتی۔ موضوع کے وسیع مطالعہ کے ساتھ پروفیسر عسکری کا مشورہ اور نہایت گراں بہا ثابت ہوئی جو ہر وقت مجھے حاصل رہی اور کام میں سہولت کا باعث ہوئی۔ میرے دوسرے واجب التعظیم استاد ڈاکٹر آرا لیس شرمہ نے میرا مسودہ مطالعہ فرما کر عام قیمتی مشوروں سے نوازا۔ شعبہ مسودات فارسی کتب خانہ پینہ یونیورسٹی سے متعلق مرحوم فصیح الدین بلخی بھی ایک قیمتی ذریعہ اعانت تھے۔ کے پی جیسوال کی تحقیقاتی انجمن کے ایک رکن (فیلو) ڈاکٹر جے ایس جھانے اس موضوع

پر کچھ دستاویزات کی نشان دہی کر کے میری مدد کی۔

سنٹرل ریکارڈز آفس پٹنہ، کلکتہ، الہ آباد، پٹیالہ کے قومی محافظ خانوں اور ڈویژنل کمشنر پٹنہ کے دفتر کے محافظین دستاویزات کے افسروں کا بھی شکر گزار ہوں۔ کلکتہ کے محافظ دستاویزات مسٹر جے سی گو سوامی بھی بالخصوص ہمیشہ اعانت کے لئے آمادہ رہے۔ میں نیشنل لیبریری، بہار ریسرچ سوسائٹی اور پٹنہ کالج کے کتب خانوں کا بھی تحقیقات کے دوران مختلف سہولتیں مہیا کرنے کے لئے ممنون ہوں۔

میرے بھائی ہشام نے ٹائپ شدہ مسودہ کی تصحیح اور تیاری میں میری مدد کی یہ خاص طور پر اپنی بیگم کا شکر گزار ہوں جنہوں نے ہمیشہ خاموشی کے ساتھ میری مدد کی اور اس کتاب کی تیاری کی طویل المدت اور کبھی کبھی کٹھن گھڑیوں میں میرا ہاتھ بٹایا۔ میں مسٹر کے اہل موکو پادھیہا کی اس توجہ اور صبر و استقلال کا اعتراف کئے بغیر بھی نہیں رہ سکتا جو انہوں نے کتاب کی طباعت میں دکھائی۔

قیام الدین احمد

۹ ستمبر ۱۹۶۶ء - نواجہ کلاں، پٹنہ سٹی

تعارف

(ماخذ کا جائزہ)

وہابی تحریک انگریزوں کے خلاف اُن شدید ترین قدیم ترین اور ممتد ترین تحریکوں میں سے تھی جو اٹھارہویں صدی کے نصف آخر اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ کا ایک مہتمم بالشان عنصر ہے۔ تاہم یہ افسوسناک امر ہے کہ اگرچہ اس عظیم تحریک پر ابھی ایک صدی بھی نہیں گزری مگر اب تک کسی تاریخی تالیف میں اس پر کما حقہ بحث کی گئی نہ صحیح نقطہ نگاہ سے نظر کی گئی ہے۔ آج تک وہابیوں پر ایک سرولیم ہنٹر کی کتاب مطبوعہ ۱۸۷۱ء کے سوا کوئی جامع تصنیف موجود نہ تھی۔ انیسویں صدی میں ہندوستان کی سماجی بیداری اور اصلاحات پر فی الحال بھی جو کچھ لکھا گیا ہے اس میں وہابی تحریک کا کوئی تذکرہ نہیں آتا۔ حالانکہ سیاسی حیثیت سے قطع نظر یہ تحریک ہندوستانی مسلم معاشرہ کی سماجی مذہبی اصلاح کی نہایت اہم جدوجہد کی نشان دہی کرتی ہے۔

تحریک کی ابتدائی تاریخ بالخصوص سید احمد کی وفات تک کے زمانے سے متعلق جستہ جستہ معلومات مخطوطات، مسودات، پرانی اور نایاب کتابوں اور فارسی اردو انگریزی رسالوں میں ادھر ادھر بکھری پڑی ہیں۔ ان بچے بچائے ذرائع معلومات کا جائزہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔ سید احمد کے سوانح حیات پر قدیم ترین تالیف حضرت شہید کے بھانجے، شاگرد اور قریب ترین رفیق سید محمد علی کی محزن احمدیؒ ہے اس میں اُن کی عرب سے مراجعت تک کا ایک عام بیان ہے اور بعد کے تمام تذکرہ نویسوں نے اسی سے استفادہ کیا ہے، یہ

۱۷ اور نیٹیل پیپک لائبریری (کتب خانہ شرقیہ پٹنہ) کا مخطوطہ مورخہ ۱۲۱۲ھ بقلم احسان علی۔ یہ اس تالیف کا قدیم ترین موجودہ نسخہ ہے جو سب سے پہلے ۱۲۱۲ھ میں لکھا گیا تھا۔ غلام رسول مہر کا بنیال (مذکورہ جلد ۱ صفحہ ۱۶) غلط معلوم ہوتا ہے کہ یہ تالیف ۱۲۸۳ھ میں مکمل ہوئی۔

نواب وزیر الدولہ (۱۸۳۴ء-۱۸۶۲ء) والی ٹونک کی فرمائش سے لکھی گئی اور انہیں کے نام پر معنون ہے۔ وزیر الدولہ اپنے والد نواب امیر خاں کے ساتھ وہابی تحریک کے ایک اہم سرپرست رہے اور اصل ٹونک وہابیوں کا ایک اہم مرکز رہا ہے، اور ریاست ٹونک کے قدیم کتب خانے میں اس موضوع پر مواد کا ایک قیمتی ذخیرہ موجود تھا۔ وزیر الدولہ خود بھی ایک کتاب مسمیٰ وھا یاغے وزیر کی کے مصنف تھے جس میں سید احمد اور ان کے بعض رفقا کا تذکرہ ہے۔ اسے نواب محمد علی خاں نے ۱۸۸۱ء میں مغیر عام پریس آگرہ سے شائع کیا۔

سید احمد کا ایک اور سوانحی تذکرہ جعفر علی نقوی کی تاریخ احمدیہ ہے۔ مؤلف ایک اچھے کاتب تھے اور سید احمد نے ان کو اپنا صدر منشی اور دفتری کاغذات کا ناظم مقرر کیا تھا۔ اس حیثیت سے ان کو وہابیوں پر لکھنے کا ایک مناسب موقع حاصل تھا۔ بہت سے واقعات میں جو انھوں نے بیان کئے ہیں انھوں نے خود حصہ لیا تھا۔ وہ سید احمد کے ساتھ شمالی مغربی سرحد پر رہے ان کی شہادت کے بعد ہندوستان لوٹ آئے اور ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۵ء) میں یہ کتاب تالیف کی۔ مہر اس کتاب کے ایک مخطوطے کی پنجاب یونیورسٹی لائبریری میں نشان دہی کرنے ہیں اور بتاتے ہیں کہ اس میں بنگال میں ٹیوٹور کی شورش کا ذکر بھی ہے، جو کسی اور فارسی تذکرے میں مذکور نہیں۔ بد قسمتی سے اس قیمتی مخطوطہ کا کوئی نسخہ مجھے دستیاب نہ ہوا۔

وقائع احمدی یا تاریخ کبیر ایک ضخیم تذکرہ ہے جس میں سید احمد کے بعض رفقا کی متعدد سرگذشتیں جمع کی گئی ہیں۔ یہ کتاب بھی نواب وزیر الدولہ کی سرپرستی میں تالیف ہوئی جنھوں نے سید احمد کے بہت سے رفقا کو جمع کیا اور ان کے بیانات قلمبند کئے اس کتاب کی پہلی جلد ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۹ء) میں تمام ہوئی۔ اس کتاب کے کئی نسخے مختلف مقامات میں موجود ہیں جن میں کتب خانہ ریاست راجپور بھی ہے۔ اس میں سید احمد کی زندگی کی اور سرحد کے معرکوں کی کچھ قیمتی تفصیلات ملتی ہیں، لیکن دراصل یہ روایات کا مجموعہ ہے اور خوش اعتقادی کے عناصر سے خالی نہیں۔

”تاریخ ہزارہ میں ہزارہ اور اس سے ملحق علاقہ جات جموں و کشمیر میں سکھ حکومت

کے قیام سے بیکر گلاب سنگھ کی تخت نشینی تک کے حالات بیان کئے گئے ہیں۔ یہ کتاب ضلع کانپور کے ایک کالیستھ مہتاب سنگھ نے علاقہ ہزارہ کے پہلے انگریز ناظم الامور جیمس ایبوٹ کی فرمائش سے لکھی۔ مہتاب سنگھ نوکری کی تلاش میں سرحد شمالی و مغربی کو گیا تھا۔ اور کچھ عرصہ تک کنور کھڑک سنگھ مفتوح سنگھ مان اور ہری سنگھ کے تحت خدمت کی تھی۔ بہت ۱۸۸۱ء (۱۲۶۷ھ) میں ہزارہ سرکار کے دفتر میں اس کا تقرر ہو گیا، ۱۸۵۲ء تک تیس سال اس عہدے پر رہا۔ اسی زمانے میں ایبوٹ نے اُسے علاقہ ہزارہ کے حالات لکھنے پر مامور کیا۔ موجودہ نسخہ لندن کے تعلقات ریاستہائے جمہوریہ کے دفتر کے کتب خانہ کی ملکیت ہے اور اس پر تاریخ ۱۸۵۲ء درج ہے۔ اس میں سید احمد اور سکھ جنرل شیر سنگھ کے درمیان اہم معرکہ بالاکوٹ کا تفصیلی بیان ہے۔ اس کی وقعت اس حقیقت سے بڑھ جاتی ہے کہ یہ اُس شخص کی تحریر ہے جسے ۱۸۲۷ء سے ۱۸۵۲ء تک کی پوری مدت میں جائے وقوع پر موجود ہونے کا نادر موقع حاصل ہوا اور جسے مالگذاری سے متعلق تمام کاغذات دستیاب تھے۔ مؤلف کا دعویٰ ہے کہ اس نے تمام واقعات جو بیان کئے ہیں ان میں سے اکثر اس کے چشم دید ہیں۔ چونکہ یہ کتاب..... ایک انگریز کی سرپرستی میں لکھی گئی اس لئے مؤلف کے لئے آسانی سے ممکن ہوا کہ وہ اُس وقت تک اپنے آقاؤں کے دو دشمنوں کے درمیان جنگ کے متعلق غیر متعصبانہ رائے کا اظہار کر سکے۔ اب تک اس کتاب کی طرف کسی نے اعتنا نہیں کیا تھی مہر نے سید احمد کے سرحدی محاذات پر تمام ممکن معلومات کا جائزہ لینے پر بہت محنت صرف کی ہے اس ماخذ سے اُن کی نظر بھی چوک گئی۔

صراط مستقیم سید احمد کے اقوال و افکار کی بنیاد پر شاہ اسمعیل اور عبدالحی کی مشترک تالیف ہے بعض لوگوں نے اسے وہابیوں کے قرآن کا نام دیا ہے۔ یہ سید احمد کی سماجی تعلیمات پر مشتمل ہے اور اس میں مسلمانوں میں مروجہ سماجی مذہبی اعمال و رسوم کا بیان بھی ہے۔ اسے تحریک کا سماجی مذہبی منصوبوں کا منشور تصور کیا جاسکتا ہے۔ بہت سے مطبوعہ نسخے اور اردو ترجمے بھی موجود ہیں۔ میں نے ایک نایاب نسخے سے استفادہ

کیا ہے جو سید احمد کے پہلے خلیفہ شاہ محمد حسین کے ذاتی مطالعہ کے لئے تیار کیا گیا تھا۔ اس نسخے کے آخر میں شاہ صاحب موصوف کو سید احمد کی بخشش ہوئی نایاب سند خلافت بھی موجود ہے۔ حوالے کے لئے میں نے اس کتاب کا ایک مطبوعہ نسخہ استعمال کیا ہے۔

سید احمد اور ان کے بعض رفقا کے مکتوبات کے کئی مجموعے ہیں۔ یہ مختلف مقامات میں موجود ہیں۔ سید احمد کے مکتوبات کا ایک بہت اہم نسخہ پٹنہ یونیورسٹی لائبریری کے شعبہ مخطوطات میں موجود ہے۔ اس میں ایک تہہ بھی ہے جس میں سرحد پرواہیوں کی قائم کی ہوئی آزاد ریاست کا حال بھی مذکور ہے۔

اُردو میں مطبوعہ نسخوں میں مندرجہ ذیل قابل ذکر ہیں۔

تواریخ عجیبہ یا سوانح احمدی مولفہ محمد جعفر تھانیسری۔ وہ ایک رقیع وہابی تھے اور انبالہ کے مقدمے میں بغاوت کے الزام میں سزا یاب ہوئے۔ ان کو جزائر انڈمان میں جس دوام کی سزا ملی تھی۔ لیکن اٹھارہ سال قید میں گزارنے کے بعد وطن واپس آکر انھوں نے یہ کتاب لکھی۔ اسی میں سید احمد اور ان کے بعض رفقا کی جامع سرگذشت بیان کی گئی ہے۔ اس میں سید احمد کے بہت سے مکتوب کے متن بھی نقل کئے گئے ہیں جو مختلف اشخاص کو لکھے گئے تھے۔

محمد جعفر نے دواور کتابیں بھی لکھیں: تواریخ عجیبہ معروف بہ کالا پانی اور تواریخ عجیبہ۔ ناموں میں یہ خفیف فرق قابل توجہ ہے۔ اسل میں یہ ماوہ تواریخ اشاعت اول الذکر جو ۱۸۸۲ء میں لکھی گئی۔ اس میں مقدمہ انبالہ کی روداد اور سزا انڈمان تک کے سفر میں قید لیو پور مظالم کے واقعات درج ہیں جن کا اورد فریج سن ۱۸۸۲ء علم دستیاب نہیں۔ آخر الذکر کتاب مولف نے دوران قید میں لکھی تھی اور یہ جزائر انڈمان کی جغرافیائی تصویر کشی کرتی ہے۔

سیرۃ سید احمد شہید مولف ابوالحسن علی ندوی۔ مہر کی جامع بسط الذیل کتاب کی اشاعت سے قبل تک سید احمد کے سوانح حیات پر یہی ایک مفصل ترین تالیف تھی۔

یہ زیادہ تر فارسی مآخذ پر مبنی ہے اور وقت کی سیاسی حالت کی طرف اعتنا نہیں کی گئی ہے۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تحریک مولفہ سید مسعود عالم ندوی۔ یہ زیادہ تر پٹنہ کے وہابیوں کے کرداروں سے متعلق ہے۔ مولف نے فارسی و عربی مآخذ کے علاوہ کچھ انگریزی تصنیفوں اور سرکاری دستاویزوں سے بھی کام لیا ہے۔ موضوع کا طرز نگارش منطقی اور تاریخی ہے۔ اور سید احمد کے ساتھ وہ مفرد تعظیمی اسلوب جو بدقسمتی سے بعض اور تالیفات متذکرہ بانا کی تاریخی قدر و قیمت کو بہت گھٹا دیتا ہے بہت کم اختیار کیا گیا ہے۔ ان دو مسلوں پر بھی بحث کی گئی ہے جن سے بالعموم غفلت برتی گئی ہے۔ ایک تو ۱۸۵۶-۵۹ء کی تحریک میں وہابیوں کا داخل۔ دوسرا نجدی وہابیوں کا ہندوستانی وہابیوں پر مفروضہ اثر۔

کئی تالیفات خاندان صادق پور کے ارکان کی ہیں۔ ان میں سب سے اہم تذکرہ صادق مولفہ عبدالرحیم ہے۔ جو جعفر تھانویسری کے ساتھ قید ہوئے اور انہیں کی طرح قید سے رہا ہونے کے بعد یہ کتاب لکھی۔ قارئین پٹنہ خصوصاً ولایت علی عنایت علی ایچی علی اور احمد اللہ کے کارناموں پر مشتمل خاندان کا یہ سوانحی تذکرہ بہت کارآمد ہے۔ خاندان کی روایت کے مطابق اس کتاب کے پہلے مسودہ میں زیادہ مواد جمع تھے مگر مصلحت وقت اور بعض احباب کے مشورے سے مولف نے اشاعت سے پہلے حکومت کے خلاف اجزا خارج کر دیئے۔ سب سے پہلے اسے مولف کے چھوٹے بیٹے نور الہدیٰ نے ۱۹۰۷ء میں شائع کیا۔ میں نے طبع دوم کا نسخہ استعمال کیا ہے جو عبدالغفار صاحب مرحوم صادق پوری کے پاس تھا۔ وہ مولف کے قریبی قرابت مند تھے اور تحریک کی تاریخ سے خاندان میں سے زیادہ باخبر تھے۔ ان کے مملوکہ نسخے میں ان کے ہاتھ کے بہت سے حواشی لکھے ہوئے ہیں جن میں ارکان خاندان اور مرکز پٹنہ کے نظم سے متعلق بہت ہی اہم تفصیلات ہیں۔ تیسرا ایڈیشن عبدالرحیم کے نواسے حکیم عبدالغنی صاحب نے ۱۹۶۴ء میں شائع کیا۔ اس ایڈیشن کے تتمے میں

لہ اس ایڈیشن میں کثرت سے الحاقات ہیں جو قیاسی اور غیر مصدق ہیں۔ اس کتاب میں مترجم نے ذیلی حواشی میں مناسب مقامات پر نشان دہی کر دی ہے۔

حکیم عبد الجبیر نے بعض امور پر مزید اطلاعات ضم کی ہیں۔

”رسالہ تعزیر“ یہ ولایت علی، عنایت علی اور فیاض علی کی کچھ تحریرات کا مجموعہ ہے جس میں کچھ دینی سماجی مسائل پر بحث کی گئی ہے۔ صراط مستقیم کی طرح یہ رسالہ بعض سماجی اور دینی مباحث پر ہمایوں کے نظریات کی توضیح کرتا ہے۔

مثنوی شہر آشوب از حکیم عبدالحمید اس کے مصنف احمد اللہ کے بڑے بیٹے ہیں۔ اور خاندان کے سردار کی حیثیت سے ۱۸۶۵ء میں گھروں سے نکالے جانے کے نتیجے میں اس کا سارا بار انھیں کے سر تھا۔ انھوں نے احمد اللہ کی سزایابی کے بعد خاندان کے مصائب کی داستان فارسی میں نظم کی۔ یہ یونانی دواخانہ پریس آہ آباد میں طبع ہوئی۔ میرے پاس اس نظم کا وہ قلمی مسودہ بھی موجود ہے جو مصنف کے زیر مطالعہ تھا۔

درمقال از عبدالحق آردی۔ یہ فارسی میں غرورہ امپیلہ کی منظوم داستان ہے۔ مصنف نے کئی سال شمالی مشرقی سرحد کے مرکز پر بسر کئے تھے۔ اس کے بعد ستھانہ کے سردار جبار شاہ کے ماتحت کسی عہدے پر مامور ہوئے، اس کے بعد وہیں پیوند خاک ہوئے۔ یہ ۱۲۸۰ھ (۱۸۶۹ء) میں تصنیف ہوئی۔ مہر (جلد ۱ صفحہ ۲۵-۲۶) سید جبار شاہ کے مملوکہ ایک نسخہ کا ذکر کرتے ہیں۔ وہ اس کتاب کی اشاعت کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ لیکن اس کا ایک مطبوعہ نسخہ پروفیسر محمد مسلم استاد سینٹ کولمباز کالج ہزاری باغ کا مملوکہ پٹنہ کالج لائبریری کے شعبہ مسودات میں محفوظ ہے۔ کہا جاتا ہے کہ یہ حکیم عبدالحمید کے مساعی سے طبع ہوا جن کو اس کتاب کا ایک کرم خوردہ مخطوطہ مل گیا تھا۔ چونکہ بہت سا حصہ ضائع ہو چکا تھا اور خالی حصے صحیح طور پر پر نہیں کئے جاسکے اس لئے جیسا ناقص تھا ویسا ہی طبع کر دیا گیا۔

۱۵۔ یہ دوسرے ایڈیشن کا بالکل چہرہ بے اور اسی کے ناقص سے مملو ہے۔ اور پہلا ایڈیشن سے ویسا ہی مختلف۔ افسوس ہے کہ پہلا ایڈیشن ڈاکٹر قیام الدین احمد کو دستیاب نہیں ہوا۔ مترجم کے پاس موجود ہے [۱۵] اصل یہ ہے کہ یہ ناقص مخطوطہ اوکھلی کو کہیں سے مل گیا تھا۔ اس کی اشاعت کے لئے اُس نے ۱۸۹۹ء کے قریب اسے صادق پور پریس میں اس درخواست کے ساتھ بھیج دیا تھا کہ صادق پور کے کسی عالم سے اس کے خلاؤں کو پر کر کے مخصوص حلقہ میں اشاعت کے لئے معدودہ چند نسخے کئے جائیں یہ کام حکیم عبدالحمید کے ذمہ کیا گیا تھا۔ اپنی طباعتی سے انھوں نے جا بجا غلطیاں کر دیا مگر زیادہ حصہ خالی رہ گیا دیکھا شائع کر دیا گیا۔ مالک طبع میرے خالو تھے جو میں طفل کتب تھا ایک نسخہ میں نے خلاف ہدایت اسے لیکر رکھ لیا تھا [مترجم۔

سید احمد اور وہابی تحریک پر غلام رسول مہر کی چار جلدیں جدید ترین اور اس موضوع پر سب سے زیادہ جامع تالیف ہے۔ یہ چار جلدیں جو دو ہزار سے زائد صفحات پر محیط ہیں ان کے مطالعہ سے مولف کی صبر آزما اور جانفشانی محنت اور خلوص ظاہر ہے پہلی دو جلدیں سید احمد شہید ایک ساٹھ مجلد ہیں۔ باقی دو جلدیں جماعت مجاہدین و سرگذشت مجاہدین کے ناموں سے موسوم ہیں۔ مولف نے جن مآخذ کو استعمال کیا ہے۔ ان میں سے مواد کی ایک کثیر مقدار سچن میں سے بعض پر پہلی بار نظر ڈالی گئی ہے، استفادہ کیا گیا ہے۔ مگر معاصر سرکاری دستاویزات پوری طرح کھنگالی نہیں گئیں۔ ۱۸۵۴-۵۹ء کی تحریک سے متعلق وہابی تحریک پر بحث نہیں کی گئی ہے۔ مولف نے ۱۸۱۸ء سے ۱۸۲۴ء تک وہابی تحریک کا پورا جائزہ لیا ہے اُس زمانے میں ۱۸۵۴-۵۹ء کی تحریک ایک مہتمم بالشان واقعہ تھا اور دوسری تحریک کے پہلو پہ پہلو اس پر بھی بحث کرنا تھی۔ پھر وہابی تحریک کی ناکامی کے اسباب یا مختلف میدانوں میں اس کی خدمات و اعانت کا کوئی ذکر نہیں۔

ایک نئے اردو ماہنامہ اشاعت سنت نبویہ (جلد ۴) لاہور نمبر ۱۸۸۱ء میں جو مطبع ریاض ہند امرتسر سے طبع ہوتا تھا واپسیت پر کسی گمنام اہل قلم کے نین مقالے شائع ہوئے تھے۔ پہلے دو میں اس دعوے پر کہ سید احمد کے پیرو وہابی ہیں قانونی دلائل سے بحث کر کے ثابت کیا گیا ہے کہ یہ لوگ فی الحقیقت حنفی مسلمان تھے۔ تیسرے مقالے میں ہندوستان میں وہابی تحریک کی مختصر تاریخ لکھی ہے جو مندرجہ ذیل چار حصوں میں تقسیم کی گئی ہے: (۱) ۱۸۲۳-۳۰ء سید احمد کے ابتدائی معرکے۔ (۲) ۱۸۳۱-۳۴ء ولایت علی اور عنایت علی کی کاروائیاں، پنجاب میں ان کی گرفتاری اور پٹنہ میں ان کے اخراج تک (۳) سرحد شمالی و مغربی کو ان کی مراجعت اور مابعد کی کاروائیاں۔

معارف کے پرانے شماروں میں بھی تحریک کے کئی پہلوؤں پر کارآمد مقالے بالخصوص مسعود عالم ندوی کے شائع ہوئے۔

انگریزی مطبوعہ مآخذ میں سے ہنٹر کی اور انڈین مسلمانس ایک تنہا قیمتی تصنیف ہے۔ تالیف ہذا میں اس پر علیحدہ بحث کی گئی ہے۔ جرنل آف رائل ایشیاٹک سوسائٹی لندن بمبئی

کلکتہ کی ابتدائی جلد میں بھی قابل ذکر ہیں۔ کلکتہ ریویو میں اکنسیلی کے طویل معلوماتی مقالے بھی اس موضوع کے طالب علموں کے لئے گراں قدر ہیں۔ جرنل اف رائل ایشیاٹک سوسائٹی بستی میں رہا تھیک نے عرب اور ہندوستان میں وہابیت کا ایک عام جائزہ پیش کیا ہے۔ شمالی مغربی سرحد پر وہابی مرکز کے خلاف فوجی معرکوں سے متعلق متعدد تحریریں ہیں، مثلاً ایچ ڈبلیو پیگٹ (کلکتہ ۱۸۴۲ء) کی شمالی مغربی سرحد کی قبائل سے خلاف مہتموں کی روداد، ایچ ڈبلیو پیگٹ (لاہور ۱۸۶۳ء) یوسف زئیوں پر ایک عام رپورٹ، اور کرنل ایڈائی لندن (۱۸۶۶ء) کی سنہانہ ان کے علاوہ کچھ فوجی حکام کی جنہوں نے وہابیوں کے خلاف ہمیں چلائیں، یادداشتیں اور سرگزشتیں ہیں یہ ساری تحریریں زیادہ تر وہابیوں کے خلاف کش مکش کے عسکری پہلو پر بحث کرتی ہیں۔ اُس زمانے کے انگریزی اور دیسی زبانوں کے اخبارات اور رسائل بھی تحریک کے بعض پہلوؤں کا تذکرہ کرتے ہیں۔ ہنٹر نے ۱۸۶۳ء میں انگلش مین اور پاپونیر میں عام ”محمد نزم“ (مسلمانی) اور انگریزی حکومت میں مسلمانوں کی معاشرتی حالت پر کئی مقالے شائع کئے۔ انگلش مین نے ۲ مئی ۱۸۶۳ء کو مقدمہ انبالہ پر ہر ہڈ ایڈورٹیز کے فیصلے پر ایک طویل تبصرہ کیا۔ وہابیوں کے خلاف مختلف فوجی مہتموں کی روز بروز کی کاروائیوں پر اخبار بنگال ہر کارو میں مضامین شائع ہوتے رہے۔

ماخذ متذکرہ بالا کے جائزے سے ظاہر ہوگا کہ ان کا تعلق زیادہ تر تحریک کی ابتدائی تاریخ (۱۸۳۱ء تک) اور سرحد پر جنگوں سے ہے۔ لیکن یہ کتاب زیادہ تر حکومت ہند اور حکومت بنگال کی اُس وقت کی سرکاری رپورٹوں اور دستاویزوں پر مبنی ہے، جو اس تحریک کے تمام پہلوؤں، اس کے قائدوں، ان کی کاروائیوں اور ان کے خلاف حکومت کے طریق کار اور اقدامات سے متعلق قیمتی معلومات مہیا کرتی ہیں۔ اگرچہ جابجا ان میں سبب کی آمیزش بھی ہے، پھر بھی وہ اس موضوع پر نہایت کارآمد اور نکتوں دستیاب مواد

۱۵ یہ فہرست جامع نہیں یہ دکھانے کے لئے کہ ان سے جو معلومات حاصل ہوئی ہیں ان کی نوعیت کیا ہے اور ان کا تعلق کس زمانے سے ہے، صرف چند اہم تحریرات سے اس کا گئی ہے۔

ہیں۔ یہ دستاویزات چھوٹے چھوٹے پرزوں پر یا حواشی پر پنسل سے لکھے ہوئے نوٹوں اور ہاتھ سے لکھے ہوئے مسودات سے بیکر طول، موثق اور مطبوعہ یادداشتوں تک پھیلی ہوئی ہیں۔ دراصل یہ ایک طرف مقامی افسروں جیسے مجسٹریٹوں، پولیس سپرنٹنڈنٹوں اور کمشنروں اور دوسری طرف صوبائی اور مرکزی حکومتوں کے درمیان مراسلات ہیں۔ ان میں کہیں فارسی اور اردو تحریرات یا رسائل کے ترجمے اور اقتباسات ہیں اور کہیں پولیس کے چھینے ہوئے رپورٹوں کے نجی مراسلے۔ ۱۸۵۹ء تک یہ ساری دستاویزی دست نوشتہ پائی جاتی ہیں جو یا تو پلندوں کی شکل میں محفوظ ہیں یا مجلہ رجسٹر ہیں۔ لیکن اس تاریخ کے بعد سے وہ حکومت بمکال کی مطبوعہ رپورٹوں کی جلدوں میں شامل ہیں۔

کاغذات کے نجی ذخیرے بھی خصوصاً خاندان صادق پور کے بعض ارکان کے، کارآمد ثابت ہوئے۔ احمد اللہ کی گراں لاٹبریری ۱۸۶۵ء میں خاندان کی اور املاک کے ساتھ ضبط کر لی گئی۔ مگر کچھ کاغذات بچ گئے۔ ان رویدہ و بوسیدہ کاغذات کے کریدنے سے کچھ اہم قیمتی دستاویزات کا نشان مل گیا، انہیں میں سے ایک شاہ محمد حسین کی سند خلافت ہے۔ اس سے اہم تر نشانی سید احمد کا ایک مکتوب ہے جو انہوں نے خاندان صادق پور کے کئی ارکان کے نام مشترک طور پر لکھا ہے اور آدھائی روپے کی وصولی پر شکر یہ ادا کیا ہے۔ اسی میں یہ ہدایت بھی ہے کہ کس طرح روپے سرحد شمالی مغربی کو دہلی کے راستے سے بھیجے جائیں جہاں ان کے ضبط ہونے کا کوئی خطرہ نہیں۔ اس امر کا سید احمد کے کسی اور مکتوب میں ذکر نہیں۔

۱۸۵۹ء ان دستاویزات کا مفصل ذکر اس کتاب میں جایا کر دیا گیا ہے۔ اور فہرست آخذ میں بھی ان کو

درج کر دیا گیا ہے (تمت)

باب

وہابی تحریک کی بنا اور اس کے خاص پہلو

پس منظر : عہد تحریک میں ہندوستان کے سیاسی سماجی اور مذہبی حالات

مغل سلطنت کا زوال اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کی سیاسی تاریخ میں سب سے بڑا سانحہ سلطنتِ مغلیہ کا تدریجی انتشار اور پراگندگی تھا۔ آخری باقاعدہ زوال ابھی باقی تھا۔ مگر گزشتہ دو صدیوں سے جو روشنی چمک رہی تھی وہ جھلملانے لگی تھی اور غورست کے بادل منڈلا رہے تھے۔ اس اختلال و انتشار کی رفتار صدی کے اختتام تک بہت تیز ہو چکی تھی۔ یہ وہ زمانہ تھا جب کہ اصل مرکز سے تین جدا جدا اور بظاہر آزاد ریاستیں پیدا ہو گئیں۔ ۱۷۱۳ء میں دکن میں آصف جاہ نظام الملک نے ۱۷۲۳ء میں اورچھ میں سعادت علی برہان الملک نے اور ۱۷۴۰ء میں بنگال میں علی وردی جہا پت جگ نے اپنی علیحدہ علیحدہ ریاستوں کی بنیادیں ڈالیں۔ ان صوبائی ریاستوں کی بنا اور استحکام سے مغلی حکومت کا خاتمہ ہو گیا۔ اس صورت حال نے ملک کے سیاسی میدان میں ایک خلا پیدا کر دیا جس کو پُر کرنے کے لئے تین مختلف متنازع طاقتیں مجتمع ہونے لگیں۔ مرہٹہ، سکھ اور انگریز۔ جو تین طاقتیں تھیں۔ اس وقت تک یورپ کی اور طاقتیں سیاسی زور آزمائی کے میدان سے پسپا ہو چکی تھیں اور کم و بیش انگریزوں کی برتری تسلیم کر لی تھی۔ اب انگریزوں کو باقی دو ملکی مدعیوں سے نمٹنا تھا۔ اٹھارویں صدی کے دوسرے نصف اور انیسویں صدی کے پہلے نصف میں ہندوستان میں سیاست کی ہیئت کی گئی۔ یہی تھی۔

جنگ پلاسی دوسرا نہایت نمایاں سیاسی پہلو انگریزوں کے بڑھتے ہوئے سیاسی عزائم اور طاقت تھا یا مخصوص مشرقی صوبہ جات بنگال اور بہار میں۔ دہائی اور اس کے اطراف میں نراج اور بدامنی کے ساتھ سیاسی ترکناز کا مرکز دھیرے دھیرے مگر باقاعدگی کے ساتھ اس مشرقی حصہ ملک میں منتقل ہوتا جاتا تھا۔ پچ تو یہ ہے کہ ہندوستان میں انگریزوں کی آئندہ سیاسی برتری کی بنیاد یہیں رکھی جا رہی تھی۔

نواب علی وردی خاں کی لائق اور نیم خود مختارانہ نوابی کے زیر اثران دونوں صوبوں کو مقابلہ بہت کچھ صلح و امن دور خوشحالی نصیب تھی۔ بنگال سے مالگزار کی معتد بہ باقاعدہ ترسیل گنتی کے ان دقیق ذرائع آمدنی میں سے تھی جو متزلزل مغلیہ سلطنت کے لئے رہ گئی تھی۔ لیکن بعض سیاسی حوادث نے جو ۱۷۵۷ء کی جنگ پلاسی پر منتج ہوئے مالی طاقت کا یہ تنہا ذریعہ بھی معرض خطر میں پڑ گیا۔

اس جنگ کو بجا طور پر تاریخ ہند کا ایک یادگار واقعہ قرار دیا گیا ہے۔ اس کا ایک واضح نتیجہ انگریزوں کا ملک میں ایک اہم سیاسی طاقت بن جانا تھا۔ میر جعفر ان کے ہاتھ میں عملاً ایک کاٹھ کا پتلا بن کر رہ گیا۔ اس جنگ کے فوراً بعد نواب کی ریاست کی بوٹ شروع ہو گئی۔ فاتح انگریز بے بس نواب پر ہر قسم کے ناقابل برداشت مالی مطالبات عائد کرنے لگے اور اس کا خزانہ قریب قریب خالی ہو گیا۔ میر قاسم کو مسند پر بٹھایا گیا، زیادہ تر اس لئے کہ اس سے امید تھی کہ سابق نواب سے جس مال و دولت کے فراہم کرنے کا بجز وعدہ لیا گیا تھا اور جسے وہ پورا نہ کر سکا تھا، یہ اسے پورا کر دیگا۔ مگر یہ نیا نواب کسی اور خمیر کا بنا ہوا تھا اور انگریز سرپرست کی خواہشات کا ویسا غلام نہ تھا جیسا اس کا سسر تھا۔ گہری سازشوں اور ڈپلومیٹک گفتگو و شنید کا ایک سلسلہ جاری ہو گیا جو آخر ۱۷۶۴ء میں بھسکر کی جنگ میں اور ۱۷۶۵ء میں دیوانی حوالہ کرنے پر تمام ہوا۔ اس طرح ایک بار پھر اقتصادی بے چینی اور استحصال کا ایک نیا دور شروع ہو گیا۔

تجارت پر انگریزوں کی اجارہ داری تجارت کے متفرق اقسام کو ایسٹ انڈیا کمپنی اور بالعموم انگریز تاجروں کے حق میں مخصوص کر دینا اس زمانہ کی اقتصادی پالیسی کی نمایاں اقتصادی اہمیت سے نہایت مہیب و شدید غربت و افلاس پھیل گیا۔ اٹھارہویں صدی کی مشہور تاریخ بہار و بنگال منظر نامہ کے مولف کرم علی نے اس کے تباہ کن نتائج کو جامع طور پر بیان کیلئے:-

”انگریزوں نے جمہور رعایا کے ایک اور اہم ذریعہ معاش یعنی مختلف اقسام کی اراضی پر بھی ضرب لگائی۔ یہ اراضی کی بازیابی کے لئے مسلسل کاروائیوں سے انجام دی گئی۔ یہ کاروائیاں تدریجی اور ممتد تھیں جو پورے صوبے پر عادی تھیں اور جن کا مقصد تھا مالگذاری سے مبرا حق تصرف کی بازیابی اور دوبارہ لگان عائد کرنا۔ مغل شاہنشاہوں اور صوبائی گورنروں اور دوسرے حکام اعلیٰ نے بہت سی معافیاں دے رکھی تھیں۔ صلے انعامات اور اعلیٰ عہدہ داروں کو تنخواہیں ادا کرنے کا یہ طریقہ عام تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ یہ رعایتیں ایسے وسیع پیمانے پر بخشی گئی تھیں کہ سب انگریزوں نے بہار و بنگال کے مالیات کا نظم اپنے ہاتھ میں لیا تو پورے علاقہ کی مالگذاری ریاست سے منتقل کر لی گئی۔ بے شبہہ اس کے نتیجے میں بڑا انتشار اور پراگندگی پھیلی۔ بہت سے لوگ جعلی وثیقوں اور سندوں سے معافیوں سے مستفید تھے۔ تاہم انگریز افسران ہندوستان نے ایسی اراضی پر لگان لگانے کے جو طریقے اختیار کئے تھے وہ نہایت بے رحمانہ اور بے باکانہ تھے خود ہنٹر کو تسلیم کرنا پڑا ہے کہ ”معافیوں کے لئے ہم نے ثبوت طلب کئے مگر بایادوں کے قبضہ و تصرف سے متعلق کسی واضح قانون کی غیر موجودگی میں وہ اپنی جاگیروں کے حق میں ثبوت پیش نہ کر سکے۔ ان کے وثیقوں اور سندوں کو مؤہم کی خرابی اور دیکھوں نے غارت کر دیا ہے۔“

قوانین بازیابی اراضی کے تحت بعض رودادوں کے معائنہ سے ناہر ہوتا ہے کہ اگرچہ بعض حالات میں جعلی معافیوں کو بجا طور پر قبضہ کر لیا گیا،

تھا، مگر بیشتر صورتوں میں کاروائیوں کا مقصد قانون کے ہلکے سے نقاب میں معافی داروں کو بے دخل کرنا ہوتا تھا۔ ایسی کاروائیاں ملک گیر معاشی مصیبت، سماجی انتشار اور سیاسی بے چینی کا باعث ہوئیں۔ بہتر نے نہایت رنج و افسوس کے ساتھ تبصرہ کیا کہ ان کے نتیجے میں جو گھبراہٹ اور نفرت پھیلی اس کا نقش دہی و نر تاریخ پر ہمیشہ کے لئے قائم ہو گیا، اس نے اس زمانہ میں وہابیوں کے خلاف مقدمات کے ذمہ دار افسر جیمس اوکنیلی کی رائے نقل کر کے ظاہر کیا ہے کہ یہ صورت حال مسلم قوم کے تنزل اور بے چینی کا دوسرا سبب تھی، اور بعد میں اسی نے ۱۸۵۷ء کی آتش فساد میں بہار میں ایندھن کا کام کیا ہے

یورپ کی تجارتی کمپنیوں کی آمد نے ملک کے قدیم اقتصادی نظام اور اقتدار کی جڑوں پر کاری ضرب لگائی۔ ان کے ورود نے تجارت کے نئے دروازے کھولے۔ پھر اس نے ایک جدید تاجر طبقے کو جنم دیا۔ اس مالدار، حریف اور ڈھیلے طبقہ نے پرانے طبقہ شرقی (جو سماج کے مختلف طبقات میں ایک مدت سے عزت آبرو کے مالک تھے) کے اخلاف و ورثا کا مقابلہ کیا۔ سماجی امتیاز کا معیار خاندان نہیں بلکہ دولت پایا۔ اس نئے تجارتی طبقہ کے مفاد انگیزیوں سے وابستہ اور اکثر و بیشتر انھیں پر دار و دار رکھتے تھے اس لئے وہ اپنے محسوسوں کے مفاد میں کام کرتے تھے یہاں تک کہ اپنے قومی مفاد کو بھی ان کے مفاد پر قربان کر دیتے۔ بنگال کے بیٹھوں کا خاندان اس حقیقت کی ایک مثال ہے۔ اس زمانہ میں یہ صورت حال ملک کی تاریخ پر بدنامی دھبوں میں سے ایک ہے۔

اخلاقی انحطاط: یہ ایک تکلیف اور قلب کا زمانہ تھا جب کہ وسطی معاشرہ مر رہا تھا اور جدید عہد اس کی جگہ لینے والا تھا۔ اس زمانہ میں وہ تمام معاشرتی زوال و تخریبات رونما ہوئیں جو اس حالت کا لازمہ ہوتے ہیں، تمام اخلاقی اقدار پاؤں تلے کچل دیئے

۱۸۵۷ء کے دہائی کی کتاب سیرۃ کنور سنگھ و امر سنگھ۔ پٹنہ ۱۹۵۷ء۔ ص ۹۱-۹۲

گئے۔ ذاتی عیش و عشرت اور مقامی اعزاز کی خاطر عظیم قومی مصالح ٹھکرا دئے جاتے۔ مستقبل تاریک اور بُرے شگونوں میں آلودہ نظر آتا تھا اس لئے ہر شخص اس فکر میں رہتا تھا کہ جہاں تک اس کے بس میں ہو وقت سے زیادہ سے زیادہ فائدہ اٹھائے۔ ایک اوسط درجہ کے شریف آدمی کی زندگی کے لئے تعیش، مینوشی اور رقص و سرود کی محفلیں لازمی جزو بن گئی تھیں، اور ان سے اونٹی ترطباقوں میں بھی ان سے نسبتاً پست تر پیمانے پر ان کی تقلید کی جاتی تھی۔ اُس زمانہ کی ادبیات بھی جن کی کثیر مثالیں ہمارے سامنے ہیں کاہلی اور عیاشی کے مروجہ عواطف و میلانات مہیا کرتی تھیں۔ ہاں یہ یا س انگیزہ تصویر ذرا مدہم پڑ جاتی تھی تو اس حقیقت سے کہ اگلے زمانے کے کچھ لطیف جذبات جیسے جرأت دلیری، وفا شعاری اور شعور عزت و آبرو اب بھی لوگوں میں موجود تھے، اگرچہ ان کا نشوونما غلط طریقوں پر ہوتا تھا۔ چنانچہ دلیری معمولی معمولی جھگڑوں، خانہ جنگیوں پر، وفاداری چھوٹے چھوٹے مقامی معاملوں پر، استقلال و استقامت فرسودہ اور تباہ کن رسم و رواج سے چمٹے رہنے پر سیرگشتی اسراف پر اور علم و دانش قدیم ذخیروں میں جدید معلومات کا اضافہ کرنے کی بجائے پرانے پرانے متنوں کی طویل الذیل شرحیں لکھنے پر صرف کی جاتی تھی۔

انشاعتِ اسلام میں صوفیائے کرام کا حصہ: اس زمانے کی مذہبی زندگی اور بھی حسرتناک تھی۔ ہندوستان میں اسلام کا نشوونما زیادہ تر اگلے صوفی درویشوں کی جانفشانیوں کا نتیجہ تھا۔ ان کی جدوجہد کا سنہرا زمانہ چودھویں اور پندرہویں صدی تک جب کہ ان خود فراموش بے غرض پر جوش مبلغوں کے گمراہ اپنے دین کی تبلیغ و اشاعت کے لئے تمام ملک میں مارے مارے پھرتے۔ ان کے اخلاقی اور ذہنی طرز معاشرت ان کی وسعت قلبی، انسان دوستی، خدمتِ خلق اور عوام کے منہ سے معالجہ و اعانت نے دیوں پر قبضہ کر لیا اور مقامی باشندوں کی ایک کثیر تعداد کو ان کا معتقد بنادیا۔ یہ مبلغین بڑے وسیع النظر تھے جن کی مثالی زندگی اور مخلصانہ خدمات ان کے دین کے اختیار کرنے والوں کی تعداد میں اضافہ کرنے میں بڑا حصہ رکھتی تھیں۔

امتداد زمانہ کے ساتھ وہ بھی رخصت ہو گئے۔ ان میں سے بعض کے نام پر صوفیانہ طریقے اور خانقاہیں قائم ہو گئیں۔ بیش تر ان فیاضانہ عطیات سے یہ مرکز مالدار ہو گئے اور صوفیوں کا سابق مبلغانہ جوش اور خدمت خلیق کی سرگرمی بہت کچھ ٹھنڈی پڑ گئی۔ یہ خانقاہیں ہی ستمیں جو اپنے ساتھ سامان اور رسومات کے ساتھ زیر نظر عہد میں ملک کی دینی زندگی پر حادی تھیں۔

مذہبی بے راہروی مختلف صوفیانہ طریقوں اور خانقاہوں کی تعلیمات کا ایک لازمی جزو معرفت و وصالِ حق کے لئے بیعت و ارادت کا اصول ہے۔ کسی پیرِ طریقت کے بغیر ان میں سے کوئی مطلوب حاصل نہیں ہو سکتا۔ مرشد پر کامل توکل اور تکریم اپنی جگہ کوئی بری بات تو نہیں مگر یہ اکثر غیر معقول حد تک عمل میں لائی جاتی تھی۔ وہاں نے اسے روح اسلام کے منافی قرار دیا جو پیغام الہی کو براہ راست سمجھنے کے اصول پر زور دیتی ہے جو ارشاد قرآنی پر مبنی ہے اور جس کی توضیح و تکمیل احادیث صحیحہ سے ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ امر قابل توجہ ہے کہ اسلام کے یہ دونوں ستون، حدیث اور قرآن عربی میں تھے۔ جمہور اہل ہند اس زبان سے ناواقف تھے۔ اس صورت حال نے عوام الناس کو علماء کا محتاج بنا رکھا تھا۔ ہندوستان میں قرآن مجید کا پہلا فارسی ترجمہ مشہور حضرت شاہ ولی اللہ (ؒ تا ۱۱۱۴ھ) نے کیا۔ حدیث اگرچہ ہندوستان میں اس سے بہت پہلے رونما ہو چکی تھی۔ لیکن حضرت عبدالحق (محرث دہلوی) نے سوٹھویں صدی ہی میں اسے روشناس کر دیا تھا۔

قوم کی دینی سماجی زندگی کے بعض حالات جو اس وقت صورت پذیر تھے کتاب صراط مستقیم میں اور احوال کے ساتھ یوں واضح کئے گئے اور ان پر سختی سے تنقید کی گئی ہے :-

۱) صوفی لباس میں ملاحدہ کی بدعات میں جو اس زمانہ میں جاری ہو گئی ہیں ایک خدا کی شان اور اس کے احکام سے متعلق کلمات کفر کا استعمال ہے۔ طالبِ حق کو

ان کے زبان پر لانے اور سننے سے پرہیز کرنا چاہئے اگرچہ ان کا کہنے والا نیکو کار آدمی سمجھا جاتا ہو اور خود بھی ایسے کلمات زبان پر نہ لانا چاہئیں۔ ایسی بے لگامی کبھی کوئی اچھا نتیجہ نہیں دکھا سکتی“

(۲) ”طریقہ وجودیہ کے ملاحظہ کی دوسری بدعت جو لوگوں میں پھیل گئی ہے اور جو صوفی طریقوں کے بڑے بڑے مرشدوں کے اقوال کے مطابق بتائی جاتی ہے وہ توحید و جوردی یعنی وحدۃ الوجود کا طحانہ قول ہے۔ یہ صوفیہ اپنے آپ کو خدا کا جزو لاینفک یا اصل بخدا سمجھتے ہیں اور اس اتحاد و وسائل سے لذت کا احساس کرتے ہیں۔ وہ شیطان کے فریب یا خود فریبی سے اپنے آپ کو حقیقت آلہیہ کے باطنی علم کا امر شناس سمجھتے ہیں اور یہودہ بکو اس میں اپنا قیمتی وقت ضائع کرتے ہیں“

(۳) محد صوفیوں کی ایک اور بدعت جو عام طور پر مسلمانوں میں پھیل گئی ہے وہ فنا و قدر کے مسئلہ پر بحث ہے۔ تقدیر پر اعتقاد دین اسلام کے اہم اعتقادات میں سے ہے اور شریعت کی رو سے واجب التسلیم ہے۔ اس لئے اس مسئلہ پر بحث و تمحیص نا واجب ہے۔ شریعت نے اس باریک اور عمیق موضوع پر مباحثہ سے منع کیا ہے، اس لئے تمام مسلمانوں پر اس کو کلیتہً مان لینے پر اکتفا کرنا اور اس سوال کی کرید میں طوفانی موجوں میں کودنے سے پرہیز کرنا لازم قرار دیا گیا ہے۔

(۴) صوفی مشرکوں کی بدعات میں سے جو ہمارے زمانہ میں بالخصوص ہندوستان

لہ صوفیوں میں جوردیہ اور شہودیہ دو نمایاں گروہ ہیں۔ ہندوستان کے زیادہ تر صوفیہ جوردیہ عقیدہ رکھتے ہیں۔ یہ خدا کے وحدۃ الوجودی عقیدہ سے کسی قدر متناجفعا عقیدہ ہے۔ یہ ہمراہ دست کے قائل ہیں یعنی ہر شے خدا ہی ہے۔ دوسرے گروہ کا عقیدہ ہم از دست ہے۔ اول الذکر کا عقیدہ ہے کہ خدا جزو ہر شے میں موجود ہے، آخر الذکر خالق و مخلوق کے وجود میں امتیاز کرتا ہے۔

میں، رائج ہیں وہ انتہائی تعظیم ہے جو مرشد کے لئے اس حد تک بجالائی جاتی ہے، کہ اسے درجہ خدائی یا نبوت تک پہنچا دیا جاتا ہے۔ اس بارے میں معتدل حدود کو سمجھنا ضرور ہے۔ ایک مرشد بے شک راہِ خدا کو پہچاننے کا ذریعہ ہوتا ہے..... اور کسی رہبر و مرشد کے بغیر اس راہِ حق کی دریافت مشکل سے ممکن ہوتی ہے۔ مگر مرشد ایسا ہونا چاہئے جو شریعت کے خلاف کوئی کام نہ کرے یعنی قرآن و حدیث پر پختہ ایمان کے ساتھ راہِ حق پر گامزن ہو لے۔“

(دہائی عقائد کا خلاصہ یہ ہے کہ اصل فریضہ قرآن حدیث اور شرع

کا اتباع ہے۔ مرشد کا اتباع اسی حد تک کرنا چاہئے کہ اس کے اعمال

شرع کے مطابق ہوں)

(۵) صوفی مشرکوں کی بدعات جو عوام کی نظروں میں خیر معلوم ہوتی ہیں، ان میں سے ایک پرہیزگار اور نیکو کار بزرگوں کی قبروں پر بیہودہ رسوم ادا کرنا ہے..... اسی سلسلہ میں مُردوں سے اعانت اور مرادیں مانگنا ہے..... ایسی التجاؤں سے لوگ شرم میں آلودہ ہو جاتے ہیں..... اللہ تعالیٰ نے واجب کر دیا ہے کہ ہدایت و ارشاد کا سلسلہ جاری رہے اور فیض انھیں سے حاصل کرنا چاہئے جو زندہ ہیں۔ اگر ایسا اتفاق ہو کہ کسی کو اپنے مقصد کے لئے کوئی زندہ شخص نہ ملے اُسے مزارات کی جاترا کے عوض قرآن و حدیث کی پیروی کرنا چاہئے جو تمام باریک مسائل کی کنجی ہیں۔“

(۶) ”صوفی مشرکوں کی بدعات میں سے جو مسلمانوں کے ہر طبقے اور عوام الناس میں جاری ہیں نذر و نیاز بھی ہے (یعنی مُردوں کی روجوں کو آرام دینے کے لئے اشعار خوانی اور کھانے کی چیزیں چڑھانا)۔ یہ شرم و الحاد کی ایک بدلی ہوئی شکل ہے۔ کہا جاسکتا ہے کہ اگرچہ اصولاً یہ جائز ہے اور اس کی صحیح بجا آوری شریعت پر مبنی ہے، عوام الناس نے اپنے تصورات و تعصبات اس میں ملاحظہ دئے ہیں اور خلاف نے نہ

صرف اسلاف کی پیروی کی ہے بلکہ جو چیزیں پہلے سے موجود تھیں ان پر اضافہ کر کے حدود سے تجاوز کیا ہے۔ اس طرح اصولِ حسنہ پس پشت ڈال دئے گئے اور ان کی مذموم فروعات جو کاوش سے گھڑ لی گئی ہیں چل پڑیں“

مکر وہ رسوم و رواج کچھ سماجی رسوم و رواج بھی جو اُس وقت جاری تھے بیان کئے گئے اور ان پر تنقید و تعریف کی گئی ہے۔

» شادی اور غمی کے مواقع پر جو مکر وہ رسوم ہندوستان میں جاری ہیں ان کی جڑیں اتنی گہری اور مضبوط ہیں کہ طنز و تشنیع اور دشنام طرازی کے خوف سے ان کا اکھیڑنا انتہائی دشوار کام سمجھا جاتا ہے۔ جہاں ان رسوم کو فرائض کی ادائیگی سے زیادہ اہم اور ان کے ترک کو شریعت کے ممنوعات و محرمات سے زیادہ دشوار سمجھتے ہیں۔ مثلاً ختنہ کے موقع پر جو رسوم دھام منائی جاتی ہے۔ اس پر اتنا کثیر روپیہ صرف ہوتا ہے۔ کہ اکثر ختنے ملتوی کر دیئے جاتے ہیں اور جب ختنہ ہوتا ہے تو بچہ کافی بڑا ہوتا ہے۔ یہ ایک شرمناک اور بیہودہ بات ہے۔ اسی طرح منگنی اور شادیوں میں التواء ہوتا رہتا ہے۔ شادی میں زیادہ تاخیر سے ایک نوجوان کے لئے گناہ میں ملوث ہوجانے کا خطرہ ہوتا ہے۔ غمی میں تو زیادہ التواء کی گنجائش نہیں ہوا کرتی لیکن قبروں کی تیاری اور تجہیز و تدفین کے رسمی افعال میں اتنی تاخیر ہو جاتی ہے کہ دوسرے ضروری کاموں میں خلل واقع ہو جاتا ہے۔ مرنے کے تیسرے اور چوتھے دن کے رسوم میں زبردستی کیا جاتا ہے۔ معاشرہ کے طنز و تشنیع اور دشنام کے خوف سے عوام اس حد تک مجبور ہو جاتے ہیں کہ ان رسوم کی بجا آوری کی خاطر ان کو اپنی جائداد و خست کرنا پڑتی ہے۔ ظاہر ہے کہ کوئی شخص نماز میں غیر حاضری سے اتنا ملزم نہیں ٹھہرایا جاتا جتنا کسی عرس کی غیر حاضری سے یا کسی شادی کی محلِ نفس و

سرور سے «

(ب) ہندوستان میں وراثیت کی بنا و ارتقا

وراثیت کی بنا اور ارتقا کو صحیح عینک سے دیکھنے کے لئے ہمیں ذرا پیچھے ہٹنا اور اسلام کے بعض نمایاں پہلوؤں، عہد بعہد ان کے ارتقا اور اٹھارویں صدی میں اسلامی دنیا پر ایک سرسری نگاہ ڈالنا ہوگی۔

اسلام ایک طرز زندگی ہے جو ایک فرد اور جماعت کی زندگی کے تمام پہلوؤں پر حاوی ہے۔ وہ محض رسوم و عقائد کا مجموعہ نہیں بلکہ ایک طرز معاشرت پیش کرتا ہے اسلام قبول کرنے کے معنی ہیں اپنی روح اور روزمرہ زندگی کی تربیت و تہذیب لفظ اسلام کے معنی ہیں (خدا کی مرضی پر) سر جھکا دینا اور فرمان بجالانا۔ شروع شروع میں رسول اسلام ﷺ اور سہل زندگی میں جس سے قبل اسلام کے عرب گرتے ایک عظیم تغیر رونما ہوا اور اس میں ایک حد تک اندرونی ضبط اور قوت برداشت شامل تھی۔ مگر جن لوگوں کو محمد رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صحبت نصیب تھی اور آپ کے مقرب صحابہ نے جو آپ کے اسوۂ حسنہ کے سرچشمہ سے سیراب ہوئے یہ تغیر لپو لپو اور قبول و اختیار کر لیا۔ جن لوگوں نے آپ کی پیروی کی ان میں بدتمتی سے یہ تغیر اتنا کامل نہ تھا کچھ قبل اسلام کے اور غیر اسلامی ممالک ان کے اندر کش مکش کرتے رہے اور آخر میں سطح پر آگئے۔ یہ میلانات طرح طرح سے ظہور پذیر ہوتے رہے اور سلطانی طرز حکومت کی آرنڈیا عربوں کے خلاف جو قرون اولیٰ میں اسلام کے مشعل بردار تھے نسلی و قبائلی رد عمل کی شکلوں میں ابل پڑے۔

ایرانی اور ترک اثرات اسلام کی سیاسی سرحدوں کی حیرت انگیز وسعت کے ساتھ عربوں کی مڈ بھیہر غیر عرب اقوام اور مختلف نئی تہذیب و تمدن سے ہوئی۔ نئی نئی تہذیبی روایات کے انجذاب سے اس ابتدائی عہد میں اسلام کی روح اور ترقی پر

ایک گہرا اثر پڑا۔ اس لحاظ سے عربوں پر مادی طور پر خوشحال اور تمدنی طور پر ترقی یافتہ ایرانیوں کا اثر نہایت مہتمم بالشان ہے۔ خلافت عباسی کے دور میں بہت سی ترقیات میں ایرانی اثر کے نشانات صاف نمایاں ہیں۔ ایک مکتبہ فکر کے مطابق تصوف جو ہندوستان کی دینی زندگی پر بھی چھایا رہا ہے ایرانی اثرات کے باعث تھا۔

اسلام کی ابتدائی تاریخ میں ایک اور اہم حادثہ سیاسی اقتدار کا عربوں سے ترکوں میں منتقل ہونا تھا۔ آٹھویں اور نویں صدی میں جب اسلام ترکوں کے وطن وسطی ایشیا تک جا پہنچا تو انھوں نے اسلام قبول کر لیا۔ ان کا قبول اسلام نسبتاً تازہ تھا۔ اسلامی حکومت کے صدیوں کے دور میں عربوں میں جو کامل تغیر عادات و کردار پیدا ہو گیا تھا وہ ترکوں کے لئے ناممکن تھا۔ ایک زبردست نسلی ملت کی حیثیت سے ترکوں نے سب سے زیادہ اسلام کی ڈوبتی ہوئی نادر توجہ سے نکال دی لیکن اسلام کا روحانی و اخلاقی زخم ویسا کا ویسا ہی رہا اور مندمل نہ ہوا۔

اسلام ہندوستان میں ترکوں ہی کے ذریعے سے پہنچا۔ ان سے پہلے سندھ پر عربوں کے حملے جو بالکل بے نتیجہ تو نہ تھے ہندوستان کی مغربی سرحدوں تک ہی پہنچ کر رہے تھے۔ ان سے قطع نظر کر کے دیکھا جائے تو اسلام کے سیاسی فاتحین عرب نہ تھے بلکہ نو مسلم ترک ہی تھے۔ اس لئے جو اسلام ہندوستان میں داخل ہوا وہ صرف یہی نہیں کہ غیر عرب اثرات سے متاثر ہو چکا تھا بلکہ اس سے بڑھ کر یہ تھا کہ ہندوستان میں اس کا مقابلہ ایک ایسی مستحکم و مستقل تہذیب و تمدن سے ہوا جو نمایاں طور پر اس سے مختلف و متضاد اور بہت زیادہ قدیم تھا۔ جب جنگوں کی گرہ دبھٹ گئی تو ہندی و اسلامی تہذیب و تمدن کے درمیان باہمی تاثر و تفاعل میں آنا شروع ہو گیا۔ اس میں دین کا صحیح گوشوارہ تیار کرنا تو دشوار ہے مگر اتنا واضح ہے کہ ہندوستان میں اسلام نئے ماحول سے بہت متاثر ہوا۔

مغل حکمرانوں کی دین سے بے نیازی: یہ خیال عام طور پر پھیلا ہوا ہے اگرچہ اس کی کوئی معقول بنیاد نہیں کہ ہندوستان کے مسلم حکمران اسلام کے حامی تھے اور اس کی اشاعت میں ان کا بہت کچھ ہاتھ تھا۔ مگر اس حقیقت کو نظر انداز کر دیا

جاتا ہے کہ ایک دینی حکومت کی کچھ رسمی نمائش اور ٹیم ٹام اور کسی فوجی یا دوسری مصلحت سے کبھی کبھار اس پہلو کو نمایاں کر دینے کے باوجود درحقیقت سلطنت کی پالیسی خالصتاً سیاسی، شکاری یا دوسرے مصالح سے بنتی اور چلتی تھی۔ مغل سلطنت کے عروج و غلو کے زمانے میں بھی مغل سلاطین خصوصاً اکبر کی مذہبی پالیسی کے بعض پہلوؤں سے نمایاں نارضا مندی اور بے چینی کا احساس عام تھا۔ یہ بے چینی تنگ نظری کی بنا پر ہو سکتی ہے مگر تھی ضرور۔ یہ محسوس کیا جاتا تھا کہ اسلام اپنی اصلی لنگر گاہ سے بہت کھسک گیا ہے اور اس کے اصلاح و احیاء کی ضرورت ہے۔ اور مذاہب کی طرح اسلام بھی ہندوستان میں اور ہندوستان سے باہر بھی حیاتی و اصلاحی تحریکوں میں اپنا حصہ رکھتا تھا۔ حیاتی حرکت میں سب سے پہلے مسیح موعود کے ظہور کا عقیدہ شامل تھا جو زمانہ کے موجودہ سیاسی، معاشرتی اور مذہبی مفسدات کا قلع قمع کر دیگا اور اسلام کو اس کی اصلی شان و شوکت پر لوٹا لائیگا۔ ایسی بعض تحریکوں میں اکثر سیاسی مقاصد بھی ملے جلتے ہوتے تھے۔

حضرت مجدد الف ثانی کی دینی خدمات پہلا شخص جس نے اصلاح و احیائے دین کا جھنڈا ہندوستان میں بلند کیا سید احمد سرہندی تھا یہ مجدد الف ثانی کے لقب سے مشہور ہیں اور اکبر کے معاصر تھے۔ ہمیں ان کے دینی خیالات و نظریات کی تفصیلات سے یہاں بحث نہیں۔ پھر بھی ان کے بعض خیالات کا محض خاکہ ذیل میں پیش کیا جاتا ہے۔

اس زمانے میں ہندوستان کی مذہبی زندگی کا مرکزی تصوف تھا جس کا لوگوں کی زندگیوں اور دماغوں پر انتہائی تسلط تھا۔ تصوف ایک مشرب ہے جو خدا سے رابطہ اور اس کی معرفت کے لئے باطنی جذبات کو بیدار کرنے کے عقیدے پر مبنی ہے۔ شریعت کے باطنی اور اندرونی پہلو پر زور دیتا ہے۔ خدا سے ربط و وصل طریقت پر چلکر کیا جاسکتا ہے جو روحانی ہدایت کے کئی مقامات پر مشتمل ہوتی ہے رفتہ رفتہ طریقت نے شریعت سے زیادہ وقعت حاصل کر لی اور ہمہ اوست کا عقیدہ جو وعدۃ الوجود کے مشہور نظریہ کی شکل میں ہوا زیادہ نمایاں

ہونے لگا۔ حضرت مجدد نے اس حقیقت پر زور دیا کہ باری تعالیٰ اپنی ذات سے موجود اور ظاہر و ثابت ہے۔ باقی تمام کائنات اس کی پیدا کردہ مخلوق ہے اور یہ کہ نجات خدا سے رابطہ پیدا کرنے کے باطنی طریقوں کی بجائے شریعت کی پیروی سے حاصل ہوتی ہے۔ ان کا خیال یہ بھی تھا کہ شریعت سے عام اعتنائی اور روگردانی علماء کی چشم پوشی و غفلت کا نتیجہ ہے۔ ان کے ایمان و اعتقاد میں زور اور ہمت نہیں، اور اپنے سیاسی آقاؤں کو ان معاملات میں جن سے ان کی ذاتی راحت و عافیت کا تعلق ہے بہت کچھ ڈھیل اور آزادی دے رکھی ہے۔ اور یہ فعل قرآن و حدیث کے الفاظ کو نئے معنی پہنا کر، اور بدعت حسد کے نام سے نئی قسم کی بدعات جاری کر کے ممکن بنایا گیا ہے، جو بدعت ہوتے ہوئے بھی معصیت نہیں اس لئے جائز قرار دی گئیں۔ حضرت مجدد کی نظر میں بدعت بدعت ہی ہے۔ اس میں مدارج قائم کرنے کی گنجائش نہیں۔ حضرت مجدد اس معاملہ میں بہت متشدد تھے اور ان کے مکتوبات میں اس کا بہت ذکر ہے۔

سید احمد سرہندی کا طریقہ کار ان کے زمانہ کے حالات سے متاثر و محدود تھا ان کی جدوجہد انفرادی تھی۔ انھوں نے اپنی تمام تر طاقت مذہبی رسالوں کے لکھنے اور اپنے زمانہ کے سربراہان و معاصرین سے مراسلت تک مرکوز رکھی۔ جدید ذرائع آمد و رفت و مراسلت کے فقدان اور غالباً وسیع تر مخالفت عوام کے عدم احساس نے ان کو بڑے پیمانے پر کسی عوامی تحریک کے قائم کرنے اور چلانے سے باز رکھا۔ مگر ایسے مواقع کے باوجود ان کی تحریک نہایت معنی خیز تھی۔ اس نے پہلی بار افغان، بہاؤ کو روک دیا اور ہندوستان میں سلطنت مغلیہ کے سیاسی عروج و نہایتی کے زمانے میں بھی جب کہ اس کی رگوں میں جوانی کی تیر نبض تڑپ رہی تھی اسلام کے احیاء و اصلاح کی ضرورت کا اعلان کر دیا۔

حضرت مجدد کے خیالات اور مساعی کو کسی قدر بسط سے بیان کیا گیا اس لئے کہ وہ بہت حد تک اس تحریک کے مماثل ہیں جس کی دوسری بعد ان کے ہمنام سید محمد بیوی

نے بنیاد رکھی۔ حضرت مجدد کے کاموں اور مساعی کو ان کے بیٹے اور خلفاء نے جاری رکھا۔

حضرت شاہ ولی اللہ بہر حال ان کے اصلی مشن کو شاہ ولی اللہ دہلوی نے اپنے ہاتھ میں لیا جو اٹھارہویں صدی میں ہندوستان کے ذہنی سو رماؤں میں سے تھے۔ اس صدی میں دو عظیم معاصر سلطنتوں، عثمانیہ اور مغلیہ، کا عام زوال شروع ہو چکا تھا۔ اس زوال نے زمانہ کے بعض مسلم حقیقت شناس علما کے دماغوں کو اس مرض کے اسباب کی جستجو کی طرف مائل کر دیا۔ ان میں عرب کے محمد بن عبدالوہاب اور ہندوستان کے شاہ ولی اللہ نمایاں تھے۔ حضرت شاہ ولی اللہ اس نتیجے پر پہنچے کہ ابتدائی جمہوری روایت اسلامی کے برخلاف شہنشاہی طرز حکومت کا نفاذ اور اجتہاد کا اختتام اس افسوس ناک صورت حال کا ایک بہت بڑا سبب ہے۔ انہیں دو علتوں نے مسلمانوں میں من حیث القوم خیالات کی آزادی اور نکتہ پر دازی کو ماؤف کیا۔ اسلام نبی نوع انسان کو طرح طرح کی عدم مساوات سے نجات دلانے کی ایک انقلابی تحریک کے عوض کچھ بندھے ٹکے عقائد و رسوم میں منتقل و پابند ہو کر رہ گیا۔ ان کے خیال کے مطابق اسلام کی پوری عمارت کی تعمیر تو ہوئی تھی اس کے پیروں کے کردار و صفات پر جو آگے چل کر قرآن و احادیث پر مبنی اخلاقی و روحانی اصول کے تابع ہو گئی۔ یہ عالی خیال بلند نظر شستہ و شایستہ افراد بنی نوع انسان کی ایک اخوت کے لئے ایک زبردست اور مضبوط نظام میں متحد و مجتمع ہو گئے۔ اعضاءے رئیسہ میں جب فتور ہو گیا تو سارا جسم ضعیف اور ضعیف ہو گیا تھا۔ ان حالات میں سیاسی انحطاط اور معاشرتی تنزل لازمی تھا۔ اس لئے صرف اعلیٰ طبقہ کے چند افراد پر زور دینا کافی نہ تھا بلکہ من حیث المجموع پوری ملت کی اصلاح پر زور لگانا تھا، اسی لئے ایک ہمہ گیر عمومی تحریک کی ضرورت پیش آئی۔ فکر و خیال کی اہم پرواز و حرکت معنی خیز اور قابل غور ہے۔ اُس زمانہ کے اور حالات سے بھی اس احساس کی تائید ہوئی۔

میر تقاسم و علیو سلطان، اسی زمانہ میں سیاسی سمندر میں مسلم سیاسی عمائدین درو سا

کی ڈوبتی ہوئی کشتیوں کو پھر ابھارنے کی کوششیں شروع ہوئیں۔ بہار میں میر تقاسم اور دکن میں ٹیپو سلطان اپنی اور فروگذاشتوں کے باوجود اس سیاسی اجیار کے زندہ نمونے تھے۔ ان دونوں نے متفق الرائے ہو کر انگریزوں سے ان کے اعلیٰ فوجی نظام کا مقابلہ کرنے کے لئے اپنی اپنی فوجوں کو مغربی طرز پر تربیت دلانے اور آراستہ کرنے پر زور دیا۔ مگر انہوں نے یہ نہیں سمجھا کہ کوئی فرد خواہ کیسا ہی ہمتور مگر ایک ایسے گروہ کا سردار ہو جو نامنظم ہو اور کسی فرد کا دفا دار ہو نہ کہ کسی اعلیٰ مقصد کا، اُس قوم کے مقابلے میں جو اعلیٰ تنظیم رکھتی ہو اور ایک قومی مقصد کے جوش سے سرشار ہو، اس کی ناکامی لازمی ہے۔ ان کی ناکامی ان کی ذاتی کوتاہیوں کے سبب نہیں تھی۔ اصلی اسباب بہت گہرے اور دور رس تھے، اور وہ تھے ہندی مسلم معاشرہ کی تمام معاشری دینی جڑوں کو گھن لگ جانا۔ سیاسی کشمکش کی جو شاہی طبقہ کی سربراہی میں چل رہی تھی، ناکامی نے عوام کی توجہ شاہی سرداری سے ہٹا کر دینی اجیار و اصلاح اور ملت کی تنظیم نو کی طرف منعطف کر دی۔

یہ تھا اس تحریک کا سیاسی، سماجی اور دینی پس منظر۔ اس تحریک کے پیچھے عام معاشرتی مذہبی زوال اور سیاسی طاقت کا غیر مسلموں کے ہاتھوں میں چلا جانا اس تحریک کے سر اٹھانے کے وہ اسباب تھے۔ دراصل اس تحریک کے لازمی پہلو معاشرہ کا سدھار اور یورپی کفار سے آزادی کی بازیابی تھے لہٰذا ان میں سے ایک کے حصول کے لئے مفرت رساں مذہبی بدعات سے احتراز اور دوسرے کے لئے جہاد کی طرف رجوع کرنا ضروری تھا جس کے فوائد اور برکات کا بار بار اعلان کیا گیا۔ اس جہاد کو بہر حال عام کشمکش اور جدوجہد کے وسیع مفہوم میں سمجھنا چاہئے نہ کہ دینی مفہوم میں۔

لہٰذا مکتوب مید احمد شہید از مخطوطات پینہ یونیورسٹی ص ۱۲۹

(۷۰) دہابیت کی کچھ نمایاں خصوصیتیں

سید احمد کا طریقہ محمدی: اس زمانہ میں تصوف کے چار متعارف و مستقل طریقے رائج تھے۔ چشتیہ، سہروردیہ اور نقشبندیہ۔ سید احمد بریلوی بیعت لینے کی ایک جدید ترکیب پر کاربند تھے۔ پہلے مذکورہ طریقوں پر پھر محمدی طریقے پر جو انہوں نے خود مقرر کیا تھا بیعت لیا کرتے۔ وہ اس کی تشریح یوں کیا کرتے کہ تبریت کے دو پہلو ہیں۔ ظاہری اور باطنی۔ باطنی پہلو روحانی راحت کے حصول کے لئے روح کی تربیت و تادیب سے تعلق رکھتا ہے، اور مذکورہ صوفی طریقے ہی اس مقصد کے لئے استعمال ہوتے تھے۔ ظاہری پہلو انسان کی روزمرہ کی زندگی میں صحیح اور دینی کردار بجالانا۔ اور محمدی طریقہ اسی کی نگہداشت کرتا ہے۔ اس

طرح ان دونوں طریقوں میں بیعت لینا روح کی باطنی تربیت اور روزمرہ کے کام کاج، دونوں پر محیط و مشتمل تھا۔ اس انوکھے طریقہ بیعت کی تشریح یوں بھی ہو سکتی ہے کہ صوفیانہ طریقے اگرچہ ابتداء کی سرمستی و سرشاری سے معرّا ہو چکے تھے پھر بھی عام دماغوں میں ان کی جڑیں گہری تھیں۔ لوگ انہیں طریقوں پر بیعت کے خوگر تھے۔ ان کا ایک بیک ترک کامل ایک غیر عملی یا ان ہوتی سی بات ہوتی۔ طریقہ محمدی میں جو صحیح طرز معاشرت ملحوظ رکھا گیا تھا اس کی تفصیلات خود صراطِ مستقیم اور مختلف دہائی تحریروں میں کافی شرح و بسط سے درج ہیں۔ ان میں سے دو اصول بہت نمایاں ہیں۔ باری تعالیٰ پر جس کی صفات اشارہ بھی کسی مخلوق سے منسوب نہیں کی جاسکتی ہیں، سختی سے بلا شرط و قید ایمان رکھنا اور اپنی شخصی زندگی میں عملی اخلاق پر کاربند رہنا۔

اصلاحی تحریک: یہ بات خاص طور پر ذہن میں رکھنے کے لائق ہے کہ سید احمد شہید نے جس دہابیت کا پرچار کیا تھا وہ کوئی علیحدہ مذہب نہ تھا جیسا کہ بعض انگریز

لہ نقشبندیہ کی ایک شاخ حضرت مجدد کی نسبت سے مجددیہ کہلاتی تھی

مصنفوں بالخصوص ہنٹر نے اشارہ کیا ہے۔ وہ بار بار دہائی تحریک کو ایک مذہب بتاتا ہے جس کا پیغمبر سید احمد اور جس کا نیا قرآن عراط مستقیم ہے۔ اس سے یہ ثابت ہو سکتا ہے کہ وہابیت دین اسلام میں خرابیوں کی اصلاح اور اس کی اگلی شان و عظمت کی بازیابی کی کوشش کے عوض ایک نیا مذہب ہے۔ جیسا کہ نایبور NIEBUHR اور ہنٹر نے غلط اشارہ کیا ہے۔ سید احمد بریلوی اور محمد بن عبدالوہاب نجدی کوئی بھی پیغمبری کا مدعی نہ تھا۔ یہاں عرب وہابیت پر اس کے بانی کے کردار سے متعلق ایک مستند مورخ رچے بی غلی کی ARABIA مطبوعہ لندن ۱۹۳۰ء کے صفحہ ۵۲ سے) کے تبصرہ کا ذکر دلچسپی سے خالی نہ ہوگا۔ محمد بن عبدالوہاب کی یاد اب تک ایک عرفی نام سے زندہ ہے جو اول اول اس کے مخالفین نے تحقیراً مشہور کیا اور بعد میں اس کے متبعین نے قبول کر لیا۔ گو آج تک وہ اپنے آپ کو اس نام سے موسوم نہیں کرتے، وہ اس مقصد کے لئے جس کی اُس نے بنا ڈالی تھی اور اب تک زندہ ہے پچاس سال کی انتھک محنت و جہاں فشانی کے بعد وفات پا گیا۔ اُس نے جس مشرب کی تعلیم دی اسے..... اسلام کی کوئی نئی تاویل قرار نہیں دیا۔ اس معلم نے کبھی پیغمبری کے رتبہ کا دعویٰ نہیں کیا۔ اگر محمد بن عبدالوہاب پیغمبر نہ تھا تو سید احمد تو اور بھی یہ رتبہ نہ رکھتے۔ دہائی تحریک کی تعلیمات: وہابی اور مسلمانوں سے حقیقتہً مختلف نہیں۔ جو اس کے کہ وہ بعض چیزوں پر زیادہ زور دیتے ہیں۔ ان میں سے کچھ یہ ہیں۔

(۱) توحید۔ خدا موجود بالذات اور تمام کائنات کا خالق ہے۔ وہ اپنی صفات

۱۰ OUR INDIAN MUSALMANS ہولڈ ڈپلو ڈپلو ہنٹر ص ۵۱-۵۲

۱۱ CARSTEN NIEBUHR ڈنمارک کے ایک سائنسی مشن کا جہدہ اور کمین میں

سربراہ تھا۔ ۱۶۶۲ء میں یورپ واپس آکر تشریح کے نام سے ایک کتاب شائع کی۔ یہ یورپی ہے جس نے وہابیوں کے ظہور اور ترقی کی خبریں شائع کیں۔

میں لاشریک ہے۔ روحانی بلندی اور نجات قرآن اور شریعت کے احکام کی پوری پوری سجا آوری میں مضمر ہے نہ کہ خدا کے وجود میں مخلوط ہو جانے کے متصوفاً نہ جذبات کے ابھارنے میں۔

(۲) اجتہاد۔ مسلم کو جو حق تاویل دیا گیا ہے وہابی اس کے قائل ہیں اور اس حق پر عمل کرنے کی مصلحت پر اصرار کرتے ہیں۔ ان کا خیال ہے کہ چاروں بزرگ اماموں (امام مالک امام شافعی امام حنبلی اور امام ابوحنیفہ) کے پیروعملاً اس حق سے دستبردار ہو گئے ہیں۔ محمد بن عبدالوہاب نے اس موضوع پر کئی رسالے لکھے ہیں جن میں اندھی تقلید کے حامیوں پر نکتہ چینی کی ہے۔

(۳) شفاعت۔ وہابی کسی کے لئے کسی درمیانی وسطہ کی خواہ وہ کتنا ہی بلند پایہ پرہیزگار ہو اور مقرب الہی سمجھا جاتا ہو شفاعت کے عقیدہ کے قائل نہیں۔ انسان خود خدا سے اپنی رگ گردن سے زیادہ قریب ہے اور ہر شخص تمنا ہے کہ وہ کسی واسطہ کے بغیر اللہ کی عبادت کرے۔ وہ عمل پر زور دیتے ہیں۔ اصول اسلام پر زبانی اعتقاد کافی نہیں۔

(۴) بدعت وہابی دور حاضر کے ان تمام مذہبی اور سماجی اعمال و رسوم کی مذمت کرتے ہیں جن کی شریعت میں کوئی نظیر یا جواز موجود نہیں۔ ان میں سب سے زیادہ قبر پرستی، پیروں کی تعظیم میں مبالغہ و افراط۔ شادیوں میں مہر کی انتہائی گران رقوم تقریباً جیسے ختنہ اور میلاد نبوی میں زیادہ دھوم دھام اور بیوہ کے نکاح ثانی کا امتناع وغیرہ وغیرہ۔

کچھ عمرہ اخلاق و عادات پر بھی زور دیا گیا ہے اسلام کے پانچ ارکان (نماز، روزہ، حج، زکوٰۃ اور جہاد) کی پابندی پر سختی سے عمل کرنے کی تاکید تو ہے ہی ان کے ساتھ اور نیکیاں بھی سائل کرنا ہیں جیسے انکساری قناعت اور صبر و استقلال،

لے سر حافظ دہبہ نے اپنے مقالہ "اسلامک کلچر" دسمبر ۱۹۲۱ء میں وہابیت کی خصوصیات پر تفصیل سے بحث کی ہے۔

اور حرص و طمع، حسد اور غرور کی بیخ کنی۔ سید احمد کی تعلیمات میں آغاز کار سے ہی جہاد بھی، جب دین و معاشرہ کی حفاظت کے لئے کوئی اور صورت باقی نہ رہ جائے، ایک اہم رکن ہے بلکہ

(د) نجدی اور ہندوستانی تحریکات و ہابیتہ کا تقابلی موازنہ

وہابیت کا انہام: حضرت سید احمد کا شاندار سفر حج ان کی زندگی کا ایک اہم اور فیصلہ کن واقعہ تھا۔ بعض انگریز مصنفوں نے زور دیا ہے کہ سید احمد کا سفر حج ان کی زندگی کا ایک انقلابی واقعہ تھا۔ ان کے خیال میں اسی دوران سفر میں ان کو عربی وہابیت سے زیادہ قریب کا رابطہ ہوا اس کے عقائد سے بہت متاثر ہوئے اور ہندوستان میں ان کی اشاعت کی۔ ایسا ہی ایک مصنف (فلپی لکھتا ہے۔ "یہی زمانہ تھا جب کہ ایک شخص سید احمد بریلوی مکہ کے سفر سے ہندوستان کو واپس بیچ لے گیا جس نے ... ۱۸۳۲ء میں ان کی شہادت کے بعد وہابیوں کو کوہ سیاہ کا رد عمل بخشا اور اطراف تک اس کی گونج یا جھٹکا پہنچا دیا۔ ہندوستانی وہابیت پر ایک اور مشہور تر مصنف (ہنٹر) لکھتا ہے۔ سید احمد کے قیام مکہ کے دوران میں وہاں کے حکام کی توجہ ان کی تعلیمات کی ان بدو قبائلیوں کے خیالات سے مماثلت کی طرف منقطع ہوئی جن کے ہاتھوں مکہ کے مقدس شہر نے اتنے مصائب اٹھائے تھے۔ علانیہ طور پر ان کی تحقیر کی گئی اور شہر بدر کر دئے گئے۔ اس جور و تعدی کا نتیجہ یہ ہوا کہ وہ ہندوستانی آئے تو ایک نازیخواب میں اور مشرکانہ بد اعمالیوں کے مصلح کی حیثیت سے نہیں بلکہ محمد بن عبدالوہاب کے معتقد و مرید کی حیثیت سے۔"

محمد بن عبدالوہاب؛ ان بیانات کی صداقت کے جانچنے کے لئے ضروری ہے۔ کہ عرب میں وہابیت کی رفتار کی تاریخ پر ایک سرسری نظر ڈال لی جائے۔ عرب میں وہابیت کا بانی محمد بن عبدالوہاب تھا جو ۱۷۰۳ء میں اعینہ میں پیدا ہوا۔ اس نے ابتدائی تعلیم بصرہ اور مدینہ میں پائی۔ اُس زمانہ کا عرب معاشرہ سماجی و معاشی بد اعمالیوں میں اس سے زیادہ نمایاں طور پر مبتلا تھا جتنا ہندوستان کا معاشرہ۔ اس حقیقت کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ عرب اسلام کا مولد تھا جس نے عربی معاشرہ کو زمانہ جاہلیت کے معاشرہ سے پاک کیا تھا یہ حالت زیادہ افسوسناک تھی۔ عہد قبل اسلام میں اور تفسیروں کے باوجود عربوں کے پاس ایک منظم تہذیب اور پختہ لٹریچر تھا۔ لیکن اب تو یہ چیز بھی باقی نہ رہی تھی۔

محمد بن سعود، محمد بن عبدالوہاب کی معاشرہ کی اصلاح کی ابتدائی کوششوں نے اُس کو مقامی حکام کی خفگی اور عداوت کا مورد بنا دیا جو اُس کی جلاوطنی پر منتج ہوا۔ اُس نے داربہ (نجد) کے ایک ہمسایہ حکمران امیر محمد بن سعود کے دربار میں پناہ لی ۱۷۶۵ء تک سعود نے نجد کا ایک بڑا حصہ فتح کر لیا تھا جس کا وہ دنیاوی حاکم بن گیا جب کہ محمد بن عبدالوہاب دینی پہلو کا نگران بنا۔ ان دونوں نے ملکر جو نظام حکومت قائم کیا وہ قرآن و حدیث کے احکام کی سخت اطاعت پر مبنی تھا۔ امیر محمد سعود نے اسی سال وفات پائی اور اس کا بیٹا عبدالعزیز اس کا جانشین ہوا۔ اس کے عہد میں بھی نظام حکومت محمد بن عبدالوہاب کی براہ راست نگرانی میں ۱۷۹۲ء میں اس کی وفات تک چلتا رہا۔

وہابی تحریک کا عروج: اس اثنا میں عبدالعزیز کی سرپرستی میں سیاسی توسیع جاری رہی۔ یہاں تک کہ پورے نجد پر قبضہ ہو گیا۔ حجاز پر بھی حملہ کیا گیا اور اپریل ۱۸۰۳ء میں مکہ کے مقدس شہر پر بھی قبضہ ہو گیا۔

۱۔ جے بی فلیمنی مذکورہ صدر صفحہ ۸

اسی زمانہ میں وہابیوں نے ان بلاد مقدسہ کو شرک و کفر کی بعض گندگیوں سے پاک کرنے کا تہیہ کر لیا اور اصلاح کی بعض حد سے بڑھی ہوئی پر جوش حرکات کا ارتکاب کیا جنھوں

نے جمہور مسلمانان ہند میں ان کو بدنام کر دیا۔ خلافت ترکیہ نے عرب کے بیشتر حصہ پر ان کی پڑھتی ہوئی ہلاوتی کوششوں کو نظر سے دیکھا اور اپنے متصل ترکی صوبہ جات بغداد و بصرہ کے لئے ایک سیاسی خطرہ تصور کیا۔ ۱۸۰۳ء میں ایک ایرانی شیعہ نے عبدالعزیز کو قتل کر دیا۔ اس کا بیٹا سعود بن عبدالعزیز اسی کا جانشین ہوا۔ ۱۸۰۳ء میں ایک بار پھر اس نے مکہ اور مدینہ پر قبضہ کر لیا جو پہلے ترک حکام نے اس کے قبضے سے نکال لیا تھا۔ سعود نے حجاز میں اپنی طاقت مستحکم کر کے اپنے دائرہ اثر کو شام، عراق اور خلیج فارس کے علاقوں تک وسعت دینے کی کوششیں شروع کر دی

عثمانی خلیفہ کی مخالفت: اس وقت تک ترک حکام عرب طاقت کے اس اجیا کے سیاسی خطرے سے پوری طرح منتہ ہو چکے تھے۔ عثمانی شہنشاہ نظری طور پر ملت مسلمہ

کا دینی سرور اور خلیفہ اور بلاد مقدسہ مکہ مدینہ کا محافظ و فرماں روا تھا۔ ان کا نکل کر وہابیوں کے قبضے میں چلا جانا خلیفہ کے دینی و دنیوی اقتدار پر ایک ضرب تھی۔ ہندوستان

میں انگریز حکام کے نزدیک بھی خلیج فارس میں وہابی اقتدار ایک شدید سیاسی خطرہ تھا۔ ۱۸۰۹ء میں

حکومت بمبئی کپتان ویں رائٹ اور کرنل (بعد میں جنرل) سر لیونل اسمتھ کے ماتحت

ایک پیرا بھیجا جنھوں نے امام مسقط سے ملکر اردائی کی اور وہابیوں کو شکست

دی۔ ترکوں نے وہابیوں کی سرکوبی کے لئے مصر کے محمد علی پاشا سے بھی مدد لی۔

یہ ترکوں کی ایک باریک دوڑ تھی۔ کیونکہ وہابیوں کو شکست دینے میں

خود پاشا کی طاقت کے گھٹ جانے کا احتمال تھا۔

وہابیوں کی سیاسی طاقت کا خاتمہ: محمد علی پاشا نے ۱۸۰۹ء میں اپنی تیاریاں

شروع کر دیں۔ حجاز کو اصلی مہم محمد علی کے بیٹے ابراہیم پاشا کے زیر کمان بھیجی

گئی جو ۱۸۱۶ء میں سوئیز سے روانہ ہوا۔ اس اثنا میں ۱۸۱۲ء سعود کا بیٹا عبداللہ باپ

کا جانشین ہوا۔ ۱۸۱۸ء میں اس نے ابراہیم پاشا سے شکست کھائی، گرفتار ہوا اور قسطنطنیہ بھیج دیا گیا جہاں سخت عذاب دینے کے بعد قتل کر دیا گیا، وہابی درحکومت لوٹ لیا گیا اور آگ لگادی گئی۔ یہ حکومت ہند نے اس موقع پر ابراہیم پاشا کو مبارکباد دینے کے لئے ایک خاص قاصد بھیجا۔ تاہم حکومت برطانیہ کو اس علاقہ میں جہاں مصریوں نے وہابیوں کو برقرار کر دیا تھا، مصریوں کے منصوبوں سے خدشہ پیدا ہو گیا اور کپتان جی ایف سیڈلر کو فوراً فریجہ DARIA جانے اور عرب کے نئے حکمرانوں سے ان کے منصوبوں پر گفتگو کرنے کے لئے تعینات کیا تاکہ ان کو خلیج فارس کے سواحل پر قدم جما نے کے کسی نئے عزم سے باز رکھا جائے۔ اس طرح وہابیوں کی سیاسی طاقت تو ٹوٹ گئی مگر جن اخلاقی اور سماجی اصلاحات کی انھوں نے بنا ڈالی تھی وہ زندہ و پایندہ رہ گئی۔ یہاں ان کی تفصیل سے ہمیں بحث نہیں۔

ہندوستانی اور عربی ولایت کا موازنہ رہا ہندوستانی ولایت پر عربی ولایت کے اثرات کا سوال۔ تو اس کی کوئی دستاویزی دلیل یا موثق ثبوت نہیں۔ حضرت سید احمد کی ابتدائی زندگی اس زمانہ میں گذری جب کہ عرب وہابیوں کی جدوجہد نجد تک محدود تھی۔ یہ لوگ عالمگیر روشنی میں بہت بعد میں نمایاں ہوئے۔ سید احمد کے سفر مکہ کے اکثر وہی موقع بتایا جاتا ہے جبکہ عربی اثر سے ان کا سابقہ ہوا اور متاثر ہوئے۔ اس سلسلہ میں ہنٹر کا قول اوپر نقل ہو چکا۔ لیکن اس امر سے قطع نظر کہ وہ بیان کو کسی دلیل سے ثابت نہ کر سکا، اس کے خلاف سید احمد کے دوران قیام مکہ میں عرب کے بعض علماء میں ان کی کیا عزت اور احترام تھا، مثبت دلیل موجود ہے۔ سید مولوی عبدالحی نے وہاں کے بہت سے مقامی علما کی درخواست پر صراط مستقیم کا

۱۔ فہمی مذکور الصدر صفحہ ۱۰۲-۱۰۳ ۲۔ ایضا صفحہ ۱۰۳

۳۔ غلام رسول مہر صفحہ ۲۳۲۔ سیرہ سید احمد شہید صفحہ ۲۶۶-۲۶۷

عربی میں ترجمہ کیا اور اس کے نئے تقسیم کئے گئے۔ یہ امر بھی قابل غور ہے۔ کہ سید احمدؒ کے سفر حج کے زمانے میں بلاد مقدسہ ترکوں کے قبضے میں تھا۔ تمام نجدی وہابی مشبہہ کی نظر سے دیکھے جاتے اور ان کی موجودگی گوارا نہ کی جاتی تھی۔ اس لئے ان سے ملنے جلنے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ اس کے علاوہ سید احمدؒ مرحومہ سماجی دینی صورت حال کا مقابلہ کرنے اور غیر ملکیتوں سے جہاد کرنے کی ضرورت کا احساس سفر حج سے پہلے کر چکے تھے۔ صراط مستقیم اس مسئلہ پر واضح دلیل ہے۔

نقطہ مماثلت: حقیقت یہ ہے کہ چونکہ دونوں تحریکوں کا مخرج و مبداء ایک ہی ہے قرآن و حدیث، دلوں کے درمیان کچھ مماثلتیں ضرور ہیں۔ ان دونوں تحریکوں کے ظہور کے وقت دونوں ملکوں میں ایک قسم کے حالات و کوائف درپیش تھے اور دونوں اسلام کے اصل اصول کو دوبارہ رائج و شائع کرنے کی ضرورت پر مصر تھے جن میں بنیادی چیز توحید اور ترک بدعات پر زور دینا تھا۔ محمد بن عبدالوہاب کی التوحید اور شاہ اسماعیل کی تقویۃ الایمان ان بنیادی امور پر زور دینے میں متفق انجیل ہیں۔

نقطہ اختلاف: مگر ساتھ ہی ان دونوں کے درمیان کچھ اہم نقاط اختلاف بھی موجود ہیں۔ ان میں سے ایک نمایاں طور پر ہندوستانی تحریک کا سیاسی پہلو ہے۔ جس کا نتیجہ یہ تھا کہ ملک کی سیاسی آزادی کے لئے جدوجہد پر زیادہ زور تھا۔ عرب میں دوسری صورت حال کی بنا پر یہ پہلو موجود نہ تھا۔ عرب میں سیاسی اقتدار ختم نہیں ہوا تھا اس لئے عرب کے وہابی زیادہ تر سماجی و مذہبی اصلاحات کے علم بردار تھے۔ ہندوستانی وہابیت کا دوسرا طرہ امتیاز ایک مرحلہ پر مہدوی تحریک سے اس کا اتفاق تھا۔ مہدوی موعود کے ظہور کے عقیدے پر ہندوستانی وہابیوں نے کثیر ترغیب فراہم کر لیا تھا اسی کے بعد سید احمد نے رحلت کی۔ مہدوی تحریکات سے یہ اتفاق و تماثل عرب میں کبھی رونما ہوا۔

۱۔ آئندہ ابواب میں اس نقطہ پر زیادہ وضاحت سے روشنی ڈالی گئی ہے

لہذا ظاہر ہے کہ دونوں تحریکوں میں ظاہری تشابہ ایک مشترک
 ماخذ استفاضہ اور یکساں حالات و کوائف کی موجودگی کا نتیجہ تھا نہ کہ ایک
 دوسرے کے نتیجے و تقلید کا۔

باب ۲

سید احمد بریلوی کی زندگی اور کارنامے

۱، ابتدائی زندگی اور تبلیغی کام

سید احمد بریلوی کے سکونت گزیں ایک معزز و معروف مقدس خاندان کے فرد تھے۔ وہ سید محمد عرفان کے فرزند تھے اور صفر ۱۲۱۰ھ (نومبر ۱۸۹۶ء) کو پیدا ہوئے۔ سوانح نگاروں کے بیان کے مطابق وہ دراز قامت، گورے چہرے، اور قوی الجہد تھے، بھنویں ملی ہوئی، پیشانی کشادہ، ڈاڑھی گھنی اور بشیرہ بٹاش تھا۔ ابتدائی تعلیم گھر ہی میں پائی۔ یہ خیال غلط ہے کہ انھوں نے ممتازوں کی تعلیم زیادہ نہیں پائی۔ صراط مستقیم کے علاوہ جو انھیں کے افکار و اقوال پر مبنی ہے، ہمیں ان کے لکھے ہوئے متعدد رسائل کا پتہ ہے۔ ان کے مکتوبات کا موجودہ مجموعہ جن میں سے کچھ ان کے املا کرائے ہوئے ہیں ان کے علم اور قدرتِ زبان کا واضح ثبوت ہیں۔ سید احمد کے والد کا انتقال ۱۲۱۰ھ کے لگ بھگ ہوا۔ اس کے فوراً بعد وہ روزگار کی تلاش میں نکھن گئے، وہاں سے دلی چلے گئے۔ جہاں شاہ ولی اللہ کے فرزند اور جانشین شاہ عبدالعزیز سے ملے اور ۱۲۱۲ھ (۱۸۹۷ء) کے قریب ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ وہابی تحریک کی بعض ممتاز خصوصیات اس زمانہ سے تعلق رکھتی ہیں۔

مخزن کی کے مولف سید احمد کی ابتدائی زندگی کے متعدد واقعات بیان کرتے

جن سے بعض مروجہ رسوم و عادات مثلاً اولیاء پرستی، ان کے مزارات پر مراد طلبی اور پیروں کی غیر معتدل تعظیم و تکریم وغیرہ سے ان کا اکراہ اور اختلاف ظاہر ہوتا ہے۔ وہ ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) کے شروع میں دہلی سے بریلی لوٹے اور وہاں دو برس مقیم رہے۔ اسی زمانہ میں ان کی شادی ہوئی اور ایک لڑکی مسماۃ سارہ پیدا ہوئی۔ مختصر یہ کہ پر وعظ و تبلیغ بھی شروع کر دی۔

فوج میں ملازمت: بریلی کے دو سال کے قیام میں سید احمد نے زیادہ وقت اپنے مشن اور اس کی کامیابی کے طریقوں پر غور و فکر میں صرف کیا، شروع ہی سے غیر ملکوں کے اجنبی لوگوں کو شکست دینے اور مسلمانوں میں پھیلی ہوئی بدعات کی غلطیوں کو صاف کرنے کیلئے ایک نظام کے قیام کی (جو فوجی ہو تو مرجح ہے) کی ضرورت محسوس کی، یہ احساس ہی ان کو ۱۲۲۴ھ (۱۸۰۹ء) میں دوبارہ دہلی لے گیا اور اسی نے پھر کچھ ہی بعد ٹونک میں نواب امیر خاں کی فوج میں شامل ہونے پر آمادہ کیا۔

سید احمد کے بڑے بھائی سید ابراہیم پہلے سے نواب کی فوج میں تھے۔ سید احمد کی پدمینرگاری اور علم و فضل کی بنا پر ان کو (فوج میں) پیش امام کے عہدے پر تعینات کیا گیا۔ اس عہدے نے ضمناً ان کو یہ موقع بھی دیا کہ اپنے اخلاقی اثر سے کام لیں، فوجیوں تک اپنی تعلیمات پھیلائیں اور اس طرح ان کے اعمال و کردار میں ایک انقلاب پیدا کرنے کی کوشش کریں۔ مولف مخزن نے اس زمانہ میں ان کی زندگی کے بہت سے واقعات اور سپاہیوں کی زندگی اور اعمال پر ان کی تاثیرات کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانہ میں کئی فوجی آویزشوں کے دوران ان کے محاربات کی بسم اللہ ہوئی۔

فوج میں شمولیت کا مقصد: امیر خاں کی فوج میں ان کی شمولیت کی ان کے بعض معترفین نے غلط تعبیر کی اور نامنصفانہ رائے زنی کی ہے۔ امیر خاں کی فوج

میں ان کے داخل ہونے کو ان کی مالی منفعت کی غرض پر محمول کیا اور الزام لگایا ہے مگر یہ بہر حال یاد رکھنا چاہیے کہ اپنے مشن کے لئے ایک فوجی نظام کی ضرورت کا فیصلہ کر چکے تھے۔ وہ امیر خاں کی فوج میں اس لئے شریک ہوئے تھے کہ یوں یہ نظام ایک مسلح اور تربیت یافتہ تنظیم بن سکتا تھا، اور اگر ان کے طرز فکر کے مطابق اس کا آغاز ہوتا تو یہ معمولی جھڑپوں اور خاص اپنی فوج کے قیام سے بہت بہتر تھا۔ اس طرز عمل کی تصدیق اس واقعہ سے بھی ہوتی ہے کہ انھوں نے امیر خاں کے انگریزوں سے مجوزہ اتحاد و ایتلاف سے اختلاف کیا اور آخر کار انگریزوں سے ان کے ایتلاف کے بعد کنارہ کش ہو گئے۔ اگر سید احمد کی نیت صرف مالی منفعت ہوتی تو وہ امیر خاں کی نوکری سے علیحدہ نہ ہوتے۔ انگریزوں کا حلیف ہو جانے کے بعد امیر خاں سے سید احمد کی امید منقطع ہو گئی اور وہ پھر واپس لوٹ گئے۔ وہاں کے قیام میں انھوں نے تبلیغ اور بیعت لینا شروع کر دی

شاہ اسماعیل و عبدالحی کی بیعت:

اُس زمانے کا ایک اہم واقعہ یہ ہے کہ شاہ عبدالعزیز کے داماد شاہ عبدالحی اور بھتیجے شاہ اسماعیل نے سید احمد سے بیعت کی۔ سید احمد کے بعد یہ دونوں بزرگ اس تحریک کے نہایت اہم سربراہ تھے۔ دونوں بڑے پائے کے علماء تھے اور اُس زمانے کے سب سے بڑے صاحب ارشاد و تقویٰ خاندان سے متعلق تھے۔ ان کے شمول نے تحریک کی وقعت کو بہت بلند کر دیا اور اس کی بعد کی تاریخ پر گہرا اثر ڈالا۔ سید احمد کے ساتھ ان کی مدیم المثال محبت و رفاقت اور ان کے ساتھ روز افزوں وفاداری اور تحریک میں جدوجہد ان کے مرتے دم تک جاری رہی۔ ان کے سوانح حیات علیحدہ و مفصل تذکرہ کے متقاضی ہیں۔ شاہ اسماعیل معروف یہ شہید ۱۸۳۱ء میں جنگ بالاکوٹ

لے تباہی و جبر شاہ اسماعیل کی زندگی کا تفصیلی بیان دیتی ہے وہ مزاجیت و دلہوی کی حیاتِ یکتا ہے مگر یہ زیادہ معتبر نہیں۔

میں سید احمد کے ساتھ لڑتے ہوئے شہید ہوئے۔ شاہ عبدالحی ان سے پہلے ۱۸۲۸ء میں وفات پا چکے تھے۔ یہ دونوں مشہور صراطِ مستقیم کے مشترک مؤلف تھے۔ شاہ اسماعیل بڑے کثیر التصنیف تھے، اور ان کے رسائل اور مکتوبات تحریک کے اغراض و مقاصد کی بہت واضح اور زور دار ترجمانی کرتے ہیں۔ تحریک کی مدافعت میں وہ قلم کے ویسے ہی مرد میدان تھے جیسے مصافِ جنگ میں تلوار کے سورما۔ جنگِ شگھاری میں جہاں انہوں نے صرف ایک درجن فاقہ زدہ مجاہدوں کے ساتھ ایک بہت بڑی سکھ فوج کا مقابلہ کیا اور بے مثال شجاعت کے کارنامے دکھائے، اس کی ایک دلیل ہے شاہ اسماعیل مذہبی عقائد میں انتہا پسندی کا رجحان رکھتے اور ایک غیر مقلد تھے۔ شاہ عبدالحی نسبتاً اعتدال پسند اور مقلد تھے یہ دونوں ایک دلچسپ تقابلی مطالعہ کے موضوع تھے۔ ایک جوشیلا زبردست دوسرا خاموش سادہ مزاج۔ تبلیغی دورے: دہلی میں مختصر قیام کے بعد سید احمد نے اپنے مرشد شاہ عبدالعزیز سے اجازت طلب کی کہ باہر کے لوگوں کی درخواست کی تعمیل میں جو بیعت کے خواہاں تھے مگر دلی نہ آسکتے تھے سفر کو نکلیں۔ ان کی سیاحت زیادہ تر گنگا اور جہنا کے درمیان دوآبہ کے علاقہ اور سہارنپور، شاہجہاں پور، پھلیت، رامپور، گنگیشور اور بہت سے دوسرے مقامات پر مشتمل تھی۔ یہ سفر جو دراصل ایک تبلیغی دورہ تھا۔ اس کی خصوصیت یہ تھی کہ ان کے ہاتھ پر ایک انبوہ کثیر نے بیعت کی اور ان کے متبعین میں ایک عظیم اشان اضافہ ہوا۔

سید احمد اپنا سفر تمام کر کے دہلی واپس آئے، اور اس کے فوراً بعد اپنے وطن بریلی چلے گئے اور سفر حج کو روانگی تک وہیں مقیم رہے۔ وہاں ان کے ساتھ ان کے خاص رفقاء جیسے شاہ اسماعیل، عبدالحی اور یوسف پھرتی بھی تھے۔ بعد کے چند سالوں میں شمالی ہند کے بعض شہروں کی دسی ہی سیاحت کی۔ ایسے ہی مختصر دورے میں ریاست اودھ کے وزیر نصیر الدولہ کی دعوت پر وہ لکھنؤ بھی گئے۔ عظیم آباد پٹنہ کے ولایت علی اس زمانے میں اشرف علی کے زیر

انگریزی لکھنؤ میں تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ دونوں صاحب بیعت کے ارادے سے نہیں بلکہ زیادہ تر استعجاباً و امتحاناً سید احمد سے ملے۔ مگر وہ ان کی شخصیت پہلے ایسے متاثر ہوئے کہ اسی وقت وہیں ان سے بیعت کر لی۔ دلایت علی کا یہ فعل بعد میں عظیم آباد پٹنہ کے خاندان صادقپور کی بیعتوں کا پیش نیچہ تھا۔ اور آگے چلکر تحریک کی تاریخ پر اتنا دور رس اثر ڈالا۔

بیوگان کا عقد ثانی: اس زمانے میں سید احمد نے مسلمانوں میں بیوگان کے نکاح ثانی کی مروجہ سماجی پابندی سے لاپرواہی برت کر ذاتی مثال قائم کی۔ کچھ دن ہوئے تھے۔ ان کے بڑے بھائی کا انتقال ہو گیا تھا۔ انھوں نے انکی بیوہ سے نکاح کر لیا۔ ہندوستانی مسلمانوں کے اعلیٰ طبقوں میں یہ پہلا فعل تھا اور یہ ان کی جرأت ایمانی کا نتیجہ تھا۔ بعد میں سید احمد کی اس مثال کی خاندان صادقپور کے ارکان نے پیروی کی اور گرجوٹی سے رانج کر دیار وہ بہار میں اس سماجی اصلاح کے سرگرم حامی رہے۔ اس زمانہ کی کارگزاریوں میں ایک اور مہتمم بالشان کار نامہ صراطِ مستقیم کی تالیف تھا۔ جو اس تحریک کا سماجی و دینی منشور کہا جاسکتا ہے۔ اس تالیف سے سید احمد کے خیالات منظم نظریوں میں صاف نمایاں ہو گئے۔ سید احمد کے تبلیغی سفر بظاہر دوسرے پیروں کے مروجہ سفر دن کے مانند تھے جن میں بیعتیں لی جاتیں اور مذہبی اذکار ہوتے۔ مگر ان کے سفروں کی نوعیت اور تھی۔ ان سے ان کو عوام الناس سے میل جول کا موقع ملتا تھا۔ اور ان برائیوں کو بھی اپنی آنکھوں سے دیکھنے کا موقع ملتا تھا جن میں مسلم معاشرہ مبتلا تھا۔ یہ چند سال خاموش مگر ٹھوس منظم تبلیغی کام کے تھے۔ متبعین کے ایک منتخب گروہ کو آنے والی کشمکش کے لئے فوجی تربیت بھی دی جاتی تھی۔

اسی موقع پر سید احمد نے سفر حج میں نکلنے کا عزم کیا۔ یہ فیصلہ کچھ غیر متوقع تھا، کیونکہ وہ دوسرے سفر کے لئے کافی تیاریاں کر چکے تھے، اور وہ تھا ہندوستان کے برطانوی علاقے سے ہجرت کے لئے اس عزم کا ایک سبب شاید یہ تھا

لہ غلام رسول مہر جلد ۱ صفحہ ۱۸

کہ اُس زمانے میں دین سے سرتابی کے جو واقعات رونما ہو رہے تھے ان میں سے سفر حج کی راہ میں ڈاک زنیوں کے ہاتھوں جان کے خطرے سے تنسیخ حج کا فتویٰ تھا۔ سید احمد شاید چاہتے تھے کہ جیسے انھوں نے بیوگان کے نکاح ثانی کے لئے کیا تھا اسی طرح اس بدعت کو توڑنے کے لئے بھی ذاتی مثال قائم کریں۔

سید احمد کا سفر حج: انہوں نے مجوزہ قافلہ میں شرکت کے لئے تمام ملک سے رضا کار طلب کئے۔ ان رضا کاروں کو بریلی میں جمع ہونا اور وہاں سے کشتیوں پر گنگا ندی سے کلکتہ جانا قرار پایا تھا۔ پورا گروہ چار سو افراد پر مشتمل تھا جو چھوٹے چھوٹے دستوں میں منقسم تھا۔ قافلہ آہستہ آہستہ گنگا سے سفر کرتا ہوا، اس کے ساحلوں پر اہم شہروں میں ٹھہرتا ہوا جہاں لوگوں کا بڑھتا ہوا ہجوم بیعت کے لئے جمع ہو جاتا، آگے بڑھتا گیا۔ راستے میں بہت سے عازمین حج آئے۔ یہ سفر شوال ۱۲۳۶ھ (۳۰ جولائی ۱۸۲۱ء) کی آخری تاریخ میں بریلی سے شروع ہوا۔ افسوس ہے کہ ہمیں سید احمد کے راہ میں مختلف مقامات میں قیام کی تاریخوں اور وقت کا علم نہیں۔ صرف بعض اہم مقامات مثلاً بنارس پٹنہ اور کلکتہ کی اقامتوں کی تاریخیں معلوم ہیں۔

چنانچہ ہمیں اتنا معلوم ہے کہ بریلی سے روانگی اور بعض معمولی اقامتوں کے بعد قافلہ بنارس پہنچا (۹۔ ۱۱ ستمبر ۱۸۲۱ء کے لگ بھگ ۱۲۔ ۱۰ ستمبر کو) بقرعید کا تہوار منایا گیا۔ ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ یہ بھری برسات تھی اس لئے وہ پوسے ایک مہینہ ٹھہر گئے۔ بنارس سے روانہ ہو کر وہ اسی روز زمانیہ پہنچے وہاں ایک رات ٹھہر کر غازی پور پہنچے جہاں کئی روز رہے۔ اسی جگہ سے وہ بہار میں داخل ہوئے۔

سید احمد کی کلکتہ کی دوبار آمد و رفت میں بہار سے گزرنے کے دوران کے

واقعات کسی قدر شرح و بسط سے بیان کئے گئے ہیں، اولاً اس لئے کہ تحریک کی تاریخ مابعد میں ان کی بڑی اہمیت ہے، ثانیاً اس لئے کہ سید احمد کے مستند سوانح نگاروں نے ان میں سے بعض واقعات کے متعلق متضاد بیانات کے استقصا کی کوشش کی ہے۔

خاندان صادقپور کی شمولیت تحریک: اسی سفر اور اسی زمانے میں پٹنہ کے مشہور خاندان صادقپور کی بیعت ہوئی یہ وہ خاندان ہے جس کی جدوجہد سید احمد کی شہادت کے بعد اس تحریک کی تاریخ پر حاوی و غالب ہے اور جس نے اپنی بے مثال تبلیغی جوش سے اس تحریک کو بنگال بہار

اور دکن تک پھیلا دیا۔ اور یہ پٹنہ عظیم آباد ہی تھا جہاں سب سے پہلے آئندہ گش مکش اور آویزشوں کے لئے مجاہدوں کو بھرتی کرنے اور سرمایہ جمع کرنے کی غرض سے مستقل تنظیم کی داغ بیل ڈالی گئی۔ پٹنہ کے درود سے پہلے سید احمد نے گنگا کے دوآبہ کے علاقے میں کئی تبلیغی سفر کئے تھے اور بہت سے لوگوں نے ان سے بیعت کی تھی لیکن اس وقت تک سید احمد کی طرف سے کام گھڑ جانے کے لئے کسی شخص کو کو باقاعدہ نائب یا خلیفہ مقرر کرنے کے متعلق کوئی واقعہ کسی تحریر میں مذکور نہیں۔ یہ واقعہ اول اول پٹنہ ہی میں ظہور پذیر ہوا جہاں ایک سند کے ذریعے سے محمد حسین خلیفہ یا نائب مقرر کئے گئے۔ یہ سند اس قسم کی تنہا دستاویز ہے جو موجود ہے، جس نے خاص طور پر ان کو مجاز و مختار کیا کہ نئے آدمی بھرتی کریں اور اس تحریک کو عام طور پر بہار میں منظم کریں۔ اس تحریک کی تاریخ کے ایک باریک بین مبصر نے ایک معنی نیکز تبصرہ کیا ہے: "سید احمد حج سے لوٹ کر پٹنہ میں سید محمد حسین اور مشتاقان جہاد کی ایک بڑی جماعت سے ملے۔ ان کے نائبین یا خلفا کی ایک عام مجلس منعقد ہوئی اور ایک عرصہ سے سوچی ہوئی مہم (سرحد میں جنگ)

میں مدافعت و اعانت میں آدمی اور روپے کی ترسیل کا ایک مستقل انتظام کیا گیا۔ اس تحریک کے ایک اور تذکرہ نگار لٹلے نے بھی سید احمدؒ کے سفر پٹنہ کے دوران میں ان کے انتظامی کام کی اہمیت پر زور دیا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ ”سید احمدؒ پٹنہ میں ایک مرکزی تنظیم قائم کر کے گنگا کے کنارے چکر کلکتہ پہنچے۔ اس طرح یہ امر واضح ہے کہ سرحد پر عملاً جنگ چھڑنے سے بہت پہلے خود سید احمدؒ نے پٹنہ کو تحریک کا پہلا منظم مرکز منتخب کر کے غیر معمولی امتیاز دے رکھا تھا۔ بعد کے چند سالوں میں پٹنہ کے وہابیوں نے اس اعتماد کی توثیق کر دی جو سید احمدؒ کو ان پر تھا۔ اور انہوں نے تحریک کی تاریخ میں زبردست حصہ لیا۔“

ولایت علی کی بیعت: خاندان صادق پور کے ایک رکن ولایت علی سید احمدؒ کے قیام لکھنؤ ہی کے زمانے میں ان سے بیعت کر چکے تھے۔ انہوں نے بیعت پر اکتفا نہیں کی بلکہ اس نے ان کے طرز زندگی کو بالکل بد لکر رکھ دیا۔ وہ ایک کھاتے پیتے خاندان کے فرد اور اعلیٰ معیار معاشرت کے پروردہ تھے۔ مگر اس بیعت کے بعد وہ سید احمدؒ کے ساتھ بریلی جا رہے جہاں وہ ایک ادنیٰ اور معمولی رضا کار کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ خاندان کا ایک پرانا ملازم پٹنہ سے ان کی خیریت دریافت کرنے کے لئے بھیجا گیا، اپنے آقا کو ایک کچے مکان کی تعمیر میں مزدور کی طرح مصروف دیکھ کر پہچان نہ سکا اور حیرت زدہ رہ گیا۔ مظہر علی کی بیعت ایک اور معزز شخص جو سید احمدؒ کے دورہ پٹنہ سے پہلے سے ان کے شناسا تھے شہر پٹنہ کے مظہر علی تھے۔ ان کے قیام پٹنہ کے دوران میں سید احمدؒ ان کے گھر گئے جہاں ان کے اور افراد خاندان نے بیعت حاصل کی

۱۸ کلکتہ ریویو جلد ۱۸۴ء صفحہ ۸۲-۸۳ ۱۵ جنرل آف روائل ایشیاٹک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۲ صفحہ ۱۸۸ء صفحہ

صفحہ ۳۵۳ ۱۵ غلام رسول مہر جلد ۱ صفحہ ۱۶۹-۱۷۰ اور تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۱۱-۱۱۲

وہ بھی سید احمدؒ کے ایک نائب مقرر ہوئے۔ بیعت کے ان دو مخصوص واقعات کے سوا سید احمدؒ کا پیام اب تک بنگال اور بہار کے کسی اور حصے تک نہیں پہنچا تھا اور شمالی ہند کے بیشتر کے سفروں میں یہ حصے شامل نہ تھے۔

مذہبی مذاکرے: سید احمدؒ کا اپنے دوروں میں بہار سے گزرنے اور وہاں قیام کرنے میں ایک ہی قسم کے حالات پیش آئے۔ مختلف مقامات میں مقامی لوگ ایک کثیر تعداد میں حاضر خدمت ہوئے اور بیعت سے مشرف ہوئے بعض مقامات پر مذہبی مذاکرے اور خطے قائم ہوئے۔ بعض جو شیلے اور وفا شعار مقامی اور ذی اثر اصحاب منتخب ہوئے اور خلیفہ مقرر کئے گئے جنہیں سید احمدؒ کی طرف سے بیعت لینے کا مجاز بنایا گیا، قافلہ آگے بڑھتا رہا اور یہ مقامی مرید نئے پیغامات پھیلاتے پھرے اور نئے نئے ممبر بناتے رہے۔

معتقدین میں اضافہ: اُس وقت کے حالات میں سید احمدؒ کے سامنے یہی ایک راستہ تھا۔ وہ کسی ایک جگہ زیادہ عرصہ تک ٹھہر نہ سکتے تھے اس لئے وہ اپنا پیغام عوام الناس کے وسیع تر حلقوں میں جو ان کے دورے کی راہ سے دور واقع تھے، یہ کام مقامی خلیفوں کے سپرد کر دیا گیا تھا جو کافی احتیاط اور توجہ سے منتخب کئے جاتے تھے۔ یہ امر تحریک کو پھیلانے اور معتقدوں کی بڑھتی ہوئی تعداد کو ہم خیال بنانے میں مقامی خلیفوں کی بے خطا اور کامیاب کوششوں سے عیاں ہے۔ یہ گویا گنگا کی تمام وادی میں بیچ بچے گئے تھے جو چند سالوں میں ایسے حیرتناک طور سے پینے والے تھے۔

بکسر میں قیام: بہار کے اندر سید احمدؒ کی جماعت کا پہلا پڑاؤ بکسر میں ہوا جہاں مقامی قاضی نے کچھ دن قیام کرنے کی درخواست کی۔ اس پاس کے گاؤں خصوصاً چوسا پڑا سے لوگ کثیر تعداد میں آئے اور بیعت کی۔ بعد میں یہ مقام تحریک کا ایک اہم مرکز بن گیا۔ ایک رات بکسر میں ٹھہر کر وہ چھپرہ چلے گئے۔ وہاں بھی مختصر قیام رہا۔ دوسرا پڑاؤ دانا پور میں ہوا

جہاں بہت سے مقامی لوگ اور ایسے لوگ بھی جو چھاوئی کے علاقے میں ملازم تھے ان کے وردو کے منتظر تھے۔ ان کی ایک ٹولی سید احمدؒ کے استقبال اور دانا پور تک لانے کے لئے بنارس جا پہنچی تھی۔ یہاں وہ نسبتاً زیادہ عرصہ تک، ایک ہفتہ، ٹھہر گئے۔ دو معزز مقامی اشخاص شیخ علی جان اور محمد صدیق نے اپنے خاندان کے ساتھ بیعت کی۔ مولانا اسماعیل و عبدالحی نے کئی خطبے دیئے جن کی تاثیر سے بہت لوگوں نے راہ ہدایت اختیار کی۔

پھلواری شریف میں مذہبی مباحثہ: اسی دانا پور کے قیام کے دوران میں سید احمدؒ نزدیک کی ایک مشہور خانقاہ پھلواری شریف میں تشریف لے گئے۔ اس وقت اس کے سجادہ نشین شاہ نعمتہ اللہ تھے۔ پہلے شاہ اسماعیل اور بعض دوسرے اصحاب ملنے گئے۔ ان کے بعد سید احمدؒ عبدالحی، عبدالحق اور کچھ دوسرے اصحاب پہنچے۔ شاہ ابوالحسن فرد خلیف رشید و جانشین نعمتہ اللہ نے ان کی پر تکلف ضیافت کی۔ دوسرے دن عبدالحی شاہ اسماعیل کے ہمراہ پھر خانقاہ آئے اور مذہبی مباحثہ منعقد ہوا۔ سید احمدؒ اور شاہ اسماعیل علمائے پھلواری شریف کے علم و دانش سے متاثر ہوئے اور اس خانقاہ کو اکثر مروجہ بدعات سے پاک پایا۔

پھلواری شریف کے اس وردو کی تاریخ میں کچھ اختلاف آرا ہے۔ سیرۃ سید احمدؒ شہید کے مؤلف اس ملاقات کو حج سے مراجعت کے دوران میں بتاتے ہیں۔ غلام رسول مہر کا بھی کہنا ہے کہ انھیں سید احمدؒ کے پھلواری شریف جانے کی کوئی شہادت نہیں ملی ہے سوائے ان کی مراجعت حج کے دوران کے۔ مگر وہ سید احمدؒ کے بیرونی سفر سے متعلق کچھ خاندان کے کاغذات اور روایات کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ آخر الذکر بیان صحیح معلوم ہوتا ہے۔ سید احمدؒ کی ملاقات سے متعلق اصلی کاغذات اور اس موقع پر جو مذہبی مذاکرے ہوئے وہ خانقاہ کے کتب خانے میں محفوظ ہیں اور دیوان

ابوالحسن فرد کے مرتب نے ان سے کام لیا تھا۔ اس دیوان کے تترے میں فرد کے سوانح حیات درج ہیں اور سید احمد کے ورود پھلواری کے واقعات کے ساتھ عبدالحق کا نام بھی مذکور ہے جو سید احمد کے ہمراہ تھے۔ ہم یہ جانتے ہیں کہ عبدالحق مدینہ سے یمن چلے گئے اور سید احمد کے ساتھ نہیں لوٹے، اس لئے بظاہر یہ ورود سفر میں جلتے ہوئے ہوا^۱ (انہ کہ واپسی میں)۔

پھلواری کے بعد دوسرا پڑاؤ پٹنہ میں ہوا جہاں قافلہ دو ہفتے ٹھہرا وہ مدرسہ گھاٹ پر اترا جو شہر پٹنہ کے مشہور مدرسہ سیف خاں کے سامنے ہے۔ نذیر حسین محدث کے سوانح نگار^۲ انہیں سے روایت کرتے ہیں کہ قافلہ گول گھر کے قریب شہر کی مغربی سرحد پر اترا تھا اور اس کے قریب کے میدان (لان) میں نماز پڑھی گئی۔ اس جماعت میں ایک جم غفیر شریک نماز تھا جس میں نذیر حسین بھی شریک تھے۔ بہر حال اس مسئلہ پر مؤلف محزن احمدی کی شہادت زیادہ معتبر ہے کیونکہ وہ خود اس قافلہ کا ایک فرد تھا اور اس کی کتاب اس واقعہ کے صرف بیس سال بعد تالیف ہوئی، حالانکہ دوسری کتاب اس کے بہت بعد تالیف ہوئی۔ اس کے علاوہ مدرسہ گھاٹ شہر کے مرکز میں واقع ہے اور گول گھر شہر کی اصلی حدود سے باہر مغربی حد پر ہے۔ شہر کی بیشتر آبادی مشرقی حصہ میں آباد تھی جسے اب پٹنہ سٹی کہتے ہیں۔ شہر کا مغربی اضافہ بہت بعد کی توسیع ہے۔ سید احمد زیادہ تر اس مشرقی حصہ میں ٹھہرتے اور کام کرتے تھے۔ اس لئے یہ زیادہ قریب قیاس ہے کہ قافلہ مدرسہ گھاٹ پر اترا ہوگا جہاں شہر کے علاقے میں جانا مخالف سمت گول گھر سے جلنے سے سہلتر اور قریب تر تھا۔ بہر حال یہ بالکل

^۱ غلام رسول مہر جلد ۲۰، صفحہ ۲۰۰۔ ^۲ فضل حسین مولف حیات بعد المات۔ آگرہ ۱۹۰۸ء۔ صفحہ ۲۵-۲۸

ممکن ہے کہ پٹنہ کے قیام کے دوران میں لاق میں نماز باجماعت ہوئی ہو۔ اس سے یہ لازم نہیں آتا کہ قافلہ گول گھر ہی میں کشتیوں سے اُترا ہو۔

پٹنہ میں سید احمدؒ کے پہلے ورود کے حالات میں جو ایک طرف سید احمدؒ کے دو معتبر تذکرہ نگاروں، اے ایچ ندوی اور غلام رسول مہرنے اور دوسری طرف جعفر تھانیسری اور عبدالرحیم نے بیان کئے ہیں نمایاں اختلاف ہے۔

خاص نقطہ اختلاف یہ ہے ایا سید احمدؒ سے خاندان صادقپور کی بیعت اُن کے پہلے ورود میں ہوئی یا ان کے مکہ معظمہ سے واپس آنے کے بعد دوسرے ورود میں۔ اس نقطے پر سید احمدؒ کا معاصر اور معتبر تذکرہ نگار

مولف مخزن خاموش ہے۔ ندوی اور مہر دونوں اس وقوع کو پہلے ورود میں بتاتے ہیں۔ مگر جعفر تھانیسری اور عبدالرحیم کا بیان ہے کہ اگرچہ خاندان

صادقپور کے دو معمر افراد شاہ محمد حسین اور فتح علی سید احمدؒ کے پہلے ورود میں ان سے ملے مگر ان کے مختصر قیام کی وجہ سے بیعت نہیں کی تھی

یہ بعد واپسی سفر حج انجام پائی۔ ان دونوں مولفوں نے وجہ بتائی

ہے وہ کچھ عجیب سی ہے، کیونکہ سید احمدؒ وہاں دو ہفتے قیام پذیر رہے اتنے عرصے میں آسانی سے بیعت ہو سکتی تھی۔ ایک ممکن تاویل خود ولایت

علی کی اُس وقت پٹنہ میں غیر موجودگی ہو سکتی ہے۔ مولف تذکرہ صادقپور کے

کے مطابق ولایت علی اس سے پہلے سید احمدؒ کے عظیم مشن اور پٹنہ کو مجوزہ روانگی

بارے میں اپنے خاندان کو لکھ چکے تھے اور ان سے بیعت کرنے کا مشورہ دیا تھا۔ مگر جب سید احمدؒ

پہنچے تو ولایت علی پٹنہ میں نہ تھے، شاید اسی لئے اس معاملہ کو بہت زیادہ

لہ ولایت علی کی سید احمدؒ کے قافلے اور اپنے گھر سے غیر حاضری بجائے خود ایک معنی ہے۔ تذکرہ صادقپور کے بیان کے مطابق لکھنؤ

بیعت کرنے کے بعد وہ سید احمد کے ہمراہ بریلی جا رہے۔ بہر حال وہ سید احمد کے اِن قافلے میں موجود نہ تھے جو بریلی سے چلا تھا۔

اس وقت پٹنہ ہی میں تھے۔ اس لئے قرین قیاس یہ معلوم ہوتا ہے کہ کچھ عرصہ بریلی میں رہنے کے بعد وہ اپنی تعلیم کی تکمیل

لئے لکھنؤ واپس چلے گئے جہاں سے وہ سید احمد سے ملاقات کے بعد یک بیک رحمت ہو گئے تھے۔

اہمیت نہیں دی گئی۔ جب ولایت علی کو یہ معلوم ہوا تو ان کو بڑی مایوسی ہوئی۔ سید احمدؒ کی مراجعت کے وقت تک ولایت علی پٹنہ واپس آچکے تھے اور انہوں نے اور شاہ محمد حسین نے پٹنہ سے آگے بڑھ کر مونگیر میں ان کا استقبال کیا اور اپنے صادق پور کے مکان میں ان کو لے آئے جہاں ان دونوں نے اور مولوی آہی بخش نے علیحدہ علیحدہ ان کی ضیافت کی۔ اس سے ظاہر ہوتا ہے کہ سید احمدؒ کے پہلے ورود کے وقت ولایت علی کی غیر موجودگی ہی اس وقت بیعت کے عدم وقوع کا باعث ہوئی۔

اس کے علاوہ اس امر خاص میں عبدالرحیم کی شہادت زیادہ ذمہ دار معلوم ہوتی ہے۔ وہ اسی خاندان کے فرد تھے اور اگرچہ وہ اس واقعہ کے سولہ سال بعد پیدا ہوئے تھے لیکن ان کے تعلقات ان اصحاب سے بہت قریب کے تھے جنہوں نے سید احمدؒ سے بیعت کی تھی۔ اپنے خاندان کے افراد کی جو اس تحریک کی تاریخ میں سربر آوردہ تھے تذکرہ نگاری میں ایسے مسئلہ پر غلطی نہیں کی ہوگی۔ اس کے علاوہ مہربانوں نے اپنے دعوے کے ثبوت میں نہ کوئی خاص سبب بتایا ہے نہ ذریعہ واقفیت کا اظہار کیا ہے۔

تبت کے کچھ مسلمانوں سے ملاقات: سید احمدؒ کے پٹنہ میں اقامت کے دوران ایک دلچسپ واقعہ یہ پیش آیا کہ تبت کے کچھ باشندوں کی ایک ٹولی سے ملاقات ہوئی جس میں چھ مرد اور تین عورتیں تھیں۔ یہ سب عازم سفر ج تھے مگر خرچ کے ٹھہر جانے سے پٹنہ میں رُکے ہوئے تھے۔ سید احمدؒ نے ان کو سمجھا دیا کہ حج ان پر واجب ہے جو اس کے سفر کی استطاعت رکھتے ہوں اور چونکہ ان کو مالی تنگی لاحق ہے وہ اپنے وطن واپس جائیں۔ (انہوں نے ان کو یہ صلاح بھی دی کہ ان کی

(سید احمدؒ کی) تعلیمات اپنے ملک میں شائع کریں۔ انہوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کر لی اور ان کی مراجعت وطن کے لئے روپے دئے گئے۔ انہوں نے ان کو تبت میں اپنے مشن کی تبلیغ کا مجاز بھی کیا۔

قصبہ ہاڑھ اور سورج گڑھ میں قیام؛ پٹنہ کے بعد دوسرا پڑاؤ قصبہ ہاڑھ میں ہوا۔ آس پاس سے بہت لوگوں نے آکر بیعت کی، ان میں سے جن کے نام لئے گئے ہیں خواجہ مولانا بخش، خواجہ افضل علی، واجد علی خاں۔ شیخ سوپن اور اکرم الحق تھے۔

سید احمدؒ ہاڑھ کے بعد سورج گڑھ (ضلع مونگیر) پہنچے جہاں سید اور پٹھان خاندان کے بہت سے افراد سکونت رکھتے تھے۔ وہاں بہت سے سربر آوردہ لوگوں نے بیعت کی۔ ان میں سے ایک عنایت حسینؒ تھے جو بہت بعد کے زمانوں تک وہابی فنڈ میں چندہ دیتے رہے۔ آس پاس کے گاؤں اکبر نگر، اڑین اور بیلھتو کے بہت سے لوگوں نے بیعت کی۔ راج محل میں قیام؛ سید احمدؒ سورج گڑھ سے مونگیر آئے اور وہاں ایک روز ٹھہرے۔ وہاں کے ایک معزز مختار زکی الدین نے بھی بیعت کی۔ پھر قافلہ بھاگلپور آیا۔ اور وہاں سامان اور رسد کی خریداری کے لئے ایک روز ٹھہرا۔ بہار میں آخری پڑاؤ راج محل میں ہوا۔ ایک شخص محمدی انصاری جس

۱۔ مہر جلد ۲۰ - ۲۰۹ - سیرۃ ص ۲۱۸ - ۲۱۹

۲۔ محزون؛ بھاگلپور میں ملا شہباز کے مشہور مزار کے موجودہ سجادہ نشین کے ماموں صادق صاحب کی شہادت کے مطابق سید احمدؒ کی جماعت براری گھاٹ پر ٹھہری رہی۔ صرف مولانا اسمعیل سجادہ نشین سے ملنے خانقاہ آئے کہ اپنے مشن کی تبلیغ کریں۔ مگر شاہ صاحب راضی نہ ہوئے اور قافلہ آگے بڑھ گیا۔ خانقاہ کے کاغذات میں ذکر موجود ہے۔

۳۔ ان کشتیوں میں دوسرے مسافر بھی تھے۔ ۴۔ آئندہ صفحہ کا فوٹو نوٹ ملاحظہ ہو

نے پہلے میرٹھ میں بیعت کی تھی سید احمدؒ کی خدمت میں حاضر ہوا اور اپنے گائوں جانے کے لئے آمادہ کیا جو راج محل سے کچھ فاصلے پر تھا۔ وہاں اسکے تمام افراد خاندان نے بیعت کی۔ ان میں سربراہ اور وہ منشی شاہ محمد، منشی رؤف الدین مخدوم بخش، حسن علی، فضل الرحمن اور عزیز الرحمن تھے۔ شاہ محمد سفر حج میں سید احمد کے ساتھ ہو گئے۔

کلکتہ میں قیام و روانگی: سید احمدؒ راج محل سے چلکر (صفر ۱۲۳۷ھ مطابق ستمبر ۱۸۲۱ء کو) مرشدآباد اور کٹوا (ضلع بردوان) میں مختصر قیام کرتے ہوئے کلکتہ پہنچے۔ کلکتہ میں ان کا قیام سب سے طویل تھا، تین ماہ سے زیادہ۔ وہاں بھی مضافاتی گاؤں اور دراز مقامات جیسے سلہٹ اور چائنگام سے لوگ بیعت کے لئے حاضر ہوئے۔

کلکتہ سے روانگی کے وقت قافلہ ۷۰ افراد تک پہنچ چکا تھا۔ یہ دس ٹوئوں میں تقسیم کر دیا گیا تھا اور ہر ایک ٹولی ایک ایک سردار کے ماتحت کر دی گئی تھی۔ متفرق ٹولیاں علیحدہ علیحدہ کشتیوں پر سوار ہوئیں۔ پوری جماعت گیارہ کشتیوں میں پھیل گئی۔ سید احمدؒ نے ان کا صرف کرایہ تیرہ ہزار روپے ادا کیا۔ اس میں سے زیادہ تر مختلف مداحوں اور متبعین نے بطور تحفہ عطیہ پیش کیا تھا۔

مراجعت ہند: حج ادا کرنے کے بعد سید احمد ہندوستان لوٹے۔ وہ بمبئی میں اترے اور چند دن وہاں مقام کر کے اسی جہاز سے صفر ۱۲۳۹ھ مطابق اکتوبر ۱۸۲۳ء کو کلکتہ پہنچے جہاں دو ماہ سے زیادہ ٹھہرے۔ ۲۹ شعبان ۱۲۳۹ھ کو وہ اپنے وطن بریلی پہنچے۔ واپسی میں وہ پھر ان جگہوں میں ٹھہرے

۷۵۔ یہ بزرگ ڈاکٹر اختر احمد ادنیوی بہرہ نیرسٹن یونیورسٹی کے پروفیسر تھے۔
 ۷۶۔ لکھنؤ رہے کہ محمد بن عبدالوہاب ۱۷۹۲ء میں وفات پا چکے تھے۔ سید احمد کی ان سے ملاقات یا استفاضہ خراج او بحث ہے (مترجم)

جہاں پہلے جا چکے تھے۔ ان میں مونگیر بھی تھا جہاں کی جامع مسجد میں جمعہ کی نماز ادا کی۔ مقامی بندوق ساز کارخانے توپ بندوق اور آتشیں اسلحہ کے لئے مشہور تھے۔ وہاں سے متعدد بندوقیں پٹنچے اور چار نالی توپیں خریدیں۔ ولایت علی اور محمد حسین جو سید احمدؒ کے استقبال کے لئے وہاں منتظر تھے ان کو پٹنچے لے آئے۔ احمد اللہؒ کا عقد! پٹنچے میں ولایت علی نے سید احمدؒ کو اپنے گھر مدعو کیا۔ وہاں بھی خاندان کے تمام لوہراد نے بیعت کی۔ تیسرے روز احمد اللہؒ کے والد الہی بخش نے اپنے بیٹے کی تقریب میں شادی میں سید احمدؒ کو اپنے ہاں مدعو کیا۔ خود سید احمدؒ نے نکاح پڑھایا۔ اس تقریب میں ایک عظیم الشان ضیافت کی گئی جس میں آٹھ سو سے نو سو آدمیوں نے حصہ لیا۔ احمد اللہؒ کا اصلی نام احمد بخش تھا مگر سید احمدؒ نے دوبارہ ان کا نام احمد اللہ رکھا اور اسی نام سے وہ ہمیشہ مشہور رہے۔ ان کے چھوٹے بھائی کا اصل نام ولی بخش تھا۔ انہوں نے بھی بیعت کی اور نیا نام ولی اللہ رکھا گیا۔

خاندان صادق پور کی اہمیت: خاندان صادق پور کے ارکان کی بیعت ان کے انفرادی اور خاندانی مستقبل کے لئے ایک نقطہ انقلاب تھا۔ تحریک کے مقاصد کی تکمیل اب ان کی تمام توجہات اور طاقتوں کا مرکز بن گئی۔ وہ شمالی و مغربی سرحد کے دور دراز سنگلاخ علاقوں میں فوجی خدمات بجالانے کے سبب خطرناک جدوجہد کے لئے اٹھ کھڑے ہوئے۔ اس تحریک سے بعض اولین اور اہم متبعین کے مختصر سوانح حیات علیحدہ علیحدہ بیان کئے گئے ہیں۔ اس مقام پر سید احمد کے اول خلیفہ پاناب شاہ محمد حسین کے حالات ایک باقاعدہ سند یا فرمان کی بنا پر جو اس قسم کی تنہا دستاویز ہے۔ اب تک موجود ہے۔

شاہ محمد حسین خلیفہ اول: شاہ محمد حسین شہر پٹنچے کے شاہ محمد معز کے بیٹے تھے اور ۱۲۰۳ھ (۱۷۸۸-۸۹ء) میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے ابتدائی تعلیم اپنے

چچا شاہ محمد کریم سے حاصل کی اور ان سے بیعت بھی کی۔ بعد میں اپنے پہلے
مرشد کی اجازت سے سید احمد کے ہاتھ پر بھی بیعت کی۔ ان کی شادی دیوڑہ
(ضلع گیا) کے غلام مجتبیٰ کی دختر سے ہوئی۔ اس شادی کے ذریعے سے وہ بھاگلپور
کے مشہور و معروف بزرگ ملا شہبازؒ کے خاندان سے بھی مربوط ہو گئے۔ وہ
سید احمدؒ کے اولین خلفا میں سے تھے۔

سند خلافت: وہ نایاب سند جو سید احمدؒ نے ان کو دی تھی اس کی ایک نقل
اب بھی موجود ہے۔

اس کے کچھ ضروری اجزا کا ترجمہ درج ذیل ہے۔

”بسم اللہ الرحمن الرحیم۔ اُن لوگوں کو جو راہ خدا کے جویاں ہیں بالعموم، اور اُن لوگوں
کو جو حاضر و غائب سید احمدؒ کے دوست ہیں بالخصوص، معلوم ہو کہ جو لوگ بیعت
کے ذریعے سے مقدس نفوس کے ہاتھوں پر بیعت کر کے مرید ہو جاتے ہیں ان
کا مقصد اللہ کی رضا حاصل کرنا ہے اور یہ موقوف ہے اس کے رسول کے احکام
کی پیروی پر۔ جو یہ اعتقاد رکھتا ہے کہ رضائے الہی کا راستہ شریعت رسول
کے اتباع کے بغیر بھی مل سکتا ہے وہ باطل پر ہے اور فریب خوردہ ہے۔
اس کا دعویٰ غلط اور ناقابل انتفات ہے۔ شریعت نبوی دو باتوں پر قائم ہے۔
اول کسی مخلوق سے خالق کی صفات منسوب نہ کرنا۔

دوم۔ ایسے رسوم و اطوار سے احتراز جو رسول اللہ ﷺ اور ان کے خلفا کے زمانے
میں رائج نہ تھے۔

پہلی شرط کے معنی ہیں (۱) عدم اعتقاد اس بات پر کہ فشتے، ارواح
پیرو مرشد، استاد، طالب علم، پیغمبر یا ولی کسی مشکل کو رفع کر سکتے ہیں (۲) ان
ہستیوں میں سے کسی کو کسی خواہش یا مراد کے حاصل کرنے کے لئے مدد طلب

لہ بھاگلپور کے ایک مشہور ولی اللہ شاہ جہاں کے معاصر تھے۔ ان کا بنا کر وہ مدرسہ آج تک موجود ہے۔

کرنے سے اجتناب (۳) اس بات سے انکار کہ ان میں سے کسی کو مدد دینے یا ضرر کو دفع کرنے کا اختیار ہے (۴) خدا کی قدرت میں ان کو ایسا ہی مجبور و بے خبر سمجھنا جیسا اپنے آپ کو..... بلکہ ان کو محض اللہ کا حبیب سمجھنا اور ان کو رضائے حق کی راہ کا محض راہنما سمجھنا۔

دوسری شرط یعنی مذہب میں کسی حدت طرازی کو دخل نہ دینے کے معنی

میں (۱) معاشرت میں ان تمام عبادات اور رسوم و عادات پر سختی سے پابند

رہنا جو عہد نبوی کے معمولات تھے (۲) ایسی بدعات سے احتراز کرنا جیسے رسوم

شادی، تعظیم قبور، قبروں پر بڑی بڑی عمارتیں تعمیر کرنا، مردوں کی برسبوں میں

صرف کثیر، تعزیرہ سازی وغیرہ (۳) جہاں تک ممکن العمل ہوں رسوم کو ہند کرنا...

”وہ سب لوگ جو اللہ کے طالب ہیں ان کے لئے مناسب ہے کہ ان باتوں

کو اپنے سامنے رکھیں اور ایک دوسرے سے ملکر ان پر عمل کریں۔ اور یہ عمل

..... بالخصوص شاہ محمد حسین کے تعاون سے کریں جنہوں نے مجھ سے

بیعت کر کے اس کا اقرار کیا ہے اور جن کو میں نے یہ ساری باتیں پوری

طرح بتادی ہیں۔ اور ان کو اختیار دیا ہے کہ وہ تم سے بھی ایسے اقرار لیں

اور میری جگہ یہ پاکیزہ عادات و اطوار تمہیں سکھائیں۔ اس لئے شاہ محمد حسین موصوف

کو مناسب ہے کہ ان احکام کو اختیار کریں جو ان کو بتاؤئے گئے ہیں، اپنے جسم

و جان سے خدا کی طرف رجوع کریں، اور ان احکام کے ظاہر و باطن پر

عمل کر کے شرک و بدعات کی ہر گرد کو جھاڑ دیں جو ان کے دامن پر پڑی

ہو۔ اور لوگوں کو راغب کریں کہ ان سے بیعت کر کے عہد و اقرار کریں۔ خدا

کرمے میں اور میرے سارے رفقا اس گروہ میں شامل ہو جائیں جو توحید

کے معتقد اور شریعت کے متبع ہیں“

مہر

اسمہ احمد ۱۲۲۵ھ

سند خلافت کی مہر کی تاریخ میں اختلاف: متذکرہ مہر میں جو تاریخ درج ہے وہ سید احمدؒ کی مراجعت حج کے دوران پٹنہ کے ورود کی عام تسلیم کردہ تاریخ سے مطابقت نہیں رکھتی۔ وہ شوال ۱۲۳۶ھ میں بریلی سے روانہ ہوئے تھے۔ پٹنہ کے اس ورود سے پہلے کبھی ان کا محمد حسین سے ملنا کہیں مذکور نہیں۔ اس لئے (۱۲۳۶ھ - ۱۸۲۰ء) کے اختتام سے پہلے ان کے بیعت لینے کا سوال پیدا نہیں ہوتا۔ یہاں یہ ذکر بھی بے موقع نہ ہوگا کہ سید احمدؒ کے پھلواری شریف جانے کی تاریخ بھی مولانا فرد کے سوانح نگار نے ۱۲۳۳ھ تحریر کی ہے۔ اگر یہ تاریخ صحیح ہے تو یہ سند کی تاریخ سے مطابقت رکھتی ہے، کیونکہ اگر سید احمدؒ اپنے بیرونی سفر میں ۱۲۳۳ھ میں پھلواری شریف گئے تو مراجعت جب کہ محمد حسین نے بیعت لی ۱۲۳۵ھ میں ہوئی ہوگی۔ مخزن کے زیادہ معتبر بیان کے مقابلے میں اس تاریخ کو قبول کرنے میں دشواری یہ ہے کہ فرد کے سوانح حیات بہت بعد کی تالیف ہے اور اس میں سید احمد کے ورود کی جو تاریخ مولف نے درج کی ہے اس کی کوئی سند نہیں لکھی۔ بہر حال مخزن اور واقع میں جو تاریخ مذکور ہے اسے زیادہ معتبر ماننا ہوگا۔ اس صورت میں سند خلافت کی تاریخ ۱۲۳۵ھ کی تادیل و توثیق کس طرح ہو؟ تاریخوں کی اس نامطابقت کی ایک ممکن تعبیر یہ حقیقت ہے کہ بعض ذاتی مہروں میں تاریخ کندہ ہوا کرتی تھی اور یہ کندہ تاریخیں دوسرے سال کے شروع ہوتے ہی اور اکثر کئی سال بعد تک بدلی نہ جاتی تھیں۔ اس طرح مہر اور متن کی تاریخوں میں فرق ہو جایا کرتا تھا۔

شاہ محمد حسین کی خدمات: شاہ محمد حسین نے تحریک کی تنظیم نو کا کام نہایت تن دہی سے شروع کر دیا۔ انھوں نے شہر کی متعدد مساجد میں نماز جماعت اور خطبہ باقاعدہ جاری کر دیا۔ انھوں نے شہر کی بہت سی غیر آباد مساجد

مسجد نموہیاں کو آباد کر دیا۔ وہ سید احمدؒ کی تعلیمات کے خاص خاص پہلوؤں کی تبلیغ و ترویج کیا کرتے اور ان میں سے بعض پر عمل کر کے ذاتی مثالیں قائم کرتے۔

۱۲۶۲ھ (۱۸۴۶ء) میں ساٹھ سال کی عمر میں حج کو گئے اور دو برس میں

واپس آئے انھوں نے ۷۴ سال کی عمر میں وفات پائی۔ اس کے کچھ ہی عرصہ بعد

ان کی بیوی کا انتقال ہوا۔ ان کے چھ بیٹیاں تھیں۔ ان میں سے چار الہی بخش کے

بیٹوں سے اور دو دوسروں سے بیابھی گئیں۔ دینیات میں عالم فاضل ہونے کے

علاوہ انھیں فوجی تربیت بھی حاصل تھی۔ وہ ممتاز شہسوار اور قادرانہ سپاہی

تھے۔ وہ شاعر بھی تھے (ہاشمی تخلص کرتے تھے) فارسی اور اردو میں شاعری کی تھی۔

پٹنہ سے چلکر سید احمدؒ نے مرزاپور بنارس اور آلہ آباد کے مختصر دورے کئے

آخر اپریل ۱۸۴۴ء میں وہ بریلی واپس آئے۔ اس طرح سفر حج اور مراجعت وطن

تک تین سال صرف ہوئے اور مجموعی صرفہ ایک لاکھ روپے کے قریب ہوا۔

ہجرت کی تیاری: سید احمدؒ اپنی مراجعت کے بعد تقریباً دو سال اپنی زندگی

کے ایک سخت ترین سفر کی تیاریوں میں دل و جان سے مصروف رہے۔ یعنی

برطانوی ہندوستان کی حدود سے نکلکر شمالی مغربی سرحد کے آزاد قبائلی

علاقوں کو مہاجرت، جہاں سے ان کو اپنی کشمکش اور آویزش کا آغاز کرنا تھا۔ دریائی

وقفہ سید احمدؒ کے بعض ممتاز نائبین کے تبلیغی دوروں پر صرف ہوا۔ وہ آس

پاس کے علاقوں میں دورے کرتے اور اپنے مشن کے اغراض و مقاصد بیان کرتے

اور ہجرت میں شرکت کے لئے رضا کار تلاش کرتے۔ رضا کاروں کی ایک

کثیر تعداد جو سید احمدؒ سے بریلی میں آئی اور بعد میں شمالی مغربی سرحد میں رضا

کاروں کی مسلسل آمد سے واضح ہو جاتا ہے کہ ان کی مساعی بہت کامیاب

ہوئیں۔

۱۔ مقامی دہائی اب تک وہاں نماز جمعہ ادا کرتے ہیں۔ ۲۔ مہر جلد ۱ صفحہ ۲۴۱

(ب) مہاجرت اور شمالی مغربی سرحد کی جنگی مہمیں

مجاہدین کی روانگی: حج سے واپسی کے بعد سید احمدؒ کی زندگی کا سب سے نمایاں پہلو ان کی سرحد کی ہجرت سے شروع ہوتا ہے۔ اس بخت آزما سفر کے لئے تمام سامان مکمل کر لینے کے بعد وہ جنوری ۱۸۲۶ء (جمادی الثانی ۱۲۳۱ھ) کو بریلی سے روانہ ہوئے۔ وہ دلاؤ، فقیور، گوالیار اور ٹونک کے راستے سے چلے۔ گوالیار کے دوران قیام میں مہاراجہ دولت رام سندھیانے اپنے محل پر مدعو کر کے ان کی ضیافت کی۔ سندھیانے نسبتی بھائی ہندو راو سے طویل گفتگو رہی۔ پھر سرحد سے بھی سید احمدؒ نے ہندو راو کو ایک معنی خیز خط بھیجا۔ نوابان ٹونک امیر خاں اور ان کے صاحبزادے وزیر الدولہ سید احمدؒ کے سرگرم متبع تھے۔ اور تحریک کی مختلف جہت سے مدد کی تھی۔ سید احمدؒ ٹونک سے نکل کر راجپوتانہ، سندھ اور بلوچستان کے رگزاروں سے ہوتے ہوئے نومبر ۱۸۲۶ء میں پشاور پہنچے۔

شمالی مغربی سرحدی صوبہ کے سیاسی حالات: احمد شاہ ابدالی کے تسلط کے بعد شمالی مغربی سرحد پر نراج کی سی کیفیت طاری تھی۔ اس کے بیٹے اور پوتے تیمور شاہ اور زماں شاہ کی پے درپے حکومتیں اندرونی نا اطمینانیوں بناوٹوں اور فنا و زوال کی نشاندہی کر رہی تھیں۔ پلیندا خاں بارک زئی کے زمانہ شاہ کے ہاتھ سے قتل نے طاقتور اور بااثر بارک زئی کو دشمن بنا لیا تھا۔ مقتول سردار کا بیٹا فتح خاں زماں شاہ کے بھائی محمود شاہ سے جا ملا جو کابل پر سکرائی کر رہا تھا دونوں ملکر زماں شاہ پر حملہ آور ہوئے اور اُسے شکست دی۔ اُس کے بھائی شاہ شجاع نے محمود شاہ سے کچھ دن جنگ جاری رکھی۔ آخر کار انگریزوں کے پاس پناہ لی۔ انگریزوں نے اس کو پنجاب میں بسا دیا جہاں اسے اُس کا بھائی زماں شاہ

بھی مل گیا۔ دونوں کو انگریزوں نے سیاسی پناہ اس لئے دی تھی کہ مناسب وقت آنے پر افغانستان میں قدم جمانے کیلئے ان کے اثر سے کام لیا جاسکے۔ محمود شاہ کی کامیابیاں زیادہ تر فتح خاں کی مدد اور تعاون کی بدولت تھیں اس لئے فتح خاں کو حکومت کے معاملات میں زبردست اثر حاصل تھا۔ محمود کے بیٹے کامران کو جس نے فتح خاں کو قتل کرایا تھا یہ بات ناپسند تھی۔ فتح خاں کے بھائی جو برادران بارک زئی کے نام سے مشہور تھے اور حکومت کے مختلف علاقے جن کے سپرد تھے باغی ہو گئے اور اپنی آزادی کا اعلان کر دیا۔ صرف ہرات اور اس کے کچھ مضافات محمود شاہ کے قبضے میں رہ گئے۔ ان بارک زئی سرداروں میں سب سے مشہور یار محمد خاں، پیر محمد خاں، سلطان محمد خاں اور عظیم خاں تھے۔ سید احمد کے ساتھ ان کا متحدہ تعاون اور بعد میں مخالفت آگے چل کر بیان کی جائیگی۔ ان سرداروں میں یار محمد اور سلطان محمود علاقہ پشاور کے حکمران اور رنجیت سنگھ کے باجگذار تھے۔ دل سے سکھوں کے علاقہ سرحد پر قبضے کے خلاف تھے لیکن ان کی اندرونی رقابتیں اور باہمی حسد و کینہ سکھوں کے خلاف مل جل کر کام کرنے میں مانع تھے۔

پنجاب کے سیاسی حالات: پکتان الکزینڈر برس کی سفارتِ کابل کے دوران اس کے سیاسی مراسلات، پنجاب کی سیاسی حالت اور اس زمانے میں سدھ کے مغرب سکھوں کی حالت سے متعلق قیمتی اطلاعات بہم پہنچاتے ہیں۔

باہمی قبائلی جنگ و جدال کے سبب سے ایک مدت کے انتشار و بد نظمی اور کمزوری کے بعد پنجاب کا زیادہ تر حصہ رنجیت سنگھ کے مضبوط قبضے میں آ گیا تھا۔ انگریزوں سے اس کے تعلقات دوستانہ تھے اور باہمی سیاسی مفادات کے رشتوں سے منسلک تھے۔ موٹی اور صاف بات یہ تھی کہ ہندوستان کے شمالی

شرقی سرحدوں پر روس کی چڑھائی کے خطرے سے رنجیت سنگھ کے ماتحت ایک مضبوط
 واپس پائیدار حکومت اس خطرے کی تنہا روک تھی۔ رنجیت سنگھ بھی اس فرضی خطرے کے عمل
 میں آنے سے اپنے قرار و قیام کے خطرے سے واقف تھا اور اچھی طرح جانتا تھا کہ وہ
 انگریزوں کی مدد کے بغیر اس خطرے کا مقابلہ نہیں کر سکتا۔ معاہدہ امرتسر مورخہ ۵ اپریل
 ۱۸۰۹ء کی رو سے رنجیت سنگھ نے انگریزوں سے صلح و ایلاف قائم رکھنا اور ستلج کے
 بائیں کنارے پر زیادہ لشکر نہ رکھنا اور سس ستلج کے امان دادہ سرداروں کے خلاف
 پورس نہ کرنا منظور کر لیا تھا۔ اس کے صلے میں اس کو ستلج کے پار علاقے میں توسیع کا
 لھلا میدان دیا گیا تھا۔ رنجیت سنگھ انگریزوں سے کھلی آمیزش کے خطرات سے واقف
 تھا، اس لئے زندگی بھر معاہدات کی دفعات کا احتیاط سے پابند رہا، اگرچہ فریقین کے
 اپنے اپنے حلقہ اثر کی توسیع کے لئے دونوں میں بہت کچھ بدگمانیاں موجود تھیں۔

ادراے ستلج کا علاقہ متفرق پٹھان سرداروں میں ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بٹا
 ہوا تھا جن کا حلقہ اثر اور وفاداری ہمیشہ بدلتی رہتی اور نہایت بیچپیہ، وقتی
 و عارضی ہوا کرتی۔ ان میں سب سے زیادہ طاقتور براوران بارک زئی مذکورہ سرد
 تھے۔ باقی اگرچہ برائے نام سکھوں کے ماتحت یا زیر دست تھے لیکن ہمیشہ ان
 کے ساتھ مارو اور بھاگ باؤ (گوریلا) کی پال پالا کرتے تھے۔ اس علاقے پر
 سکھوں کا قابو کسی پائیدار سول (ملکی) حکومت سے زیادہ خوبی قبضے کی قسم
 کا تھا۔ جب قبائلیوں سے ٹیکسوں یا جرمانوں کی تحصیل کے لئے کوئی مہم
 بھیجی جاتی تو یہ قبائل اپنی محفی پناہ گاہوں میں جا رہتے، اور سکھ ان کے گھاؤں
 کو آگ لگا کر اور برباد کر کے انتقام لیتے ان بفاکش جنگ آزمودہ قبائلیوں کی
 جنگی صلاحیت بہت اچھی تھی اور شاید سید احمد کا اس علاقے کو اپنی سرحدوں کا
 صدر مقام منتخب کرنے کا ایک سبب یہ بھی تھا۔ اس علاقے میں معاشی سکھوں

لے ایم گرگور کی تاریخ سکھ ۲۰۳-۲۰۴

کی سیاسی طاقت کی توسیع کا راستہ بیچ دربیچ اور لڑائیوں اور سازشوں سے مسوتھا۔

سرحدی سرداروں کے نام خطوط: سید احمد نے سفر پیروانہ ہونے سے پہلے کئی سرداروں کے نام مسلسل خطوط لکھ کر اپنے مشن میں شرکت کی دعوت دی تھی۔ ان خطوط کے مضامین اور منشا پر جو بڑی اہمیت رکھتے ہیں اور تحریک کے اس رخ کی اطلاع کے اولین ذریعے ہیں علیحدہ نظر و بحث کی جائیگی۔ یہاں صرف اتنا بتا دینا کافی ہوگا کہ بعض سرداروں کے پاس خاص قاصدوں کے وفد کے ساتھ ساتھ وقتاً فوقتاً مراسلات کے سلسلہ کا یہ نتیجہ ہوتا تھا کہ ان سرداروں میں حسب خواہ دلچسپی پیدا ہو جاتی تھی۔ ایک نظام عمومی سے وابستہ ہو کر سکھوں کے دستبرد سے اپنے وطن اور زمین کی بازیافت بے شبہہ ایک دل خوش کن خیال تھا۔ سید احمد کی لڑائیاں زیادہ تر ان علاقوں میں جواب اضلاع ہزارہ، پشاور پر مشتمل تھے اور سوات اور بنیر کے ملحقہ قبائلی علاقوں میں لڑی گئیں۔ یہ لڑائیاں درقسموں پر تقسیم کی جاسکتی ہیں (۱) سکھوں کے خلاف (۲) ان مقامی سرداروں کے خلاف جو غدار ہو گئے تھے۔ آسانی کے لئے ان پر ترتیب زمانی سے بحث کی گئی ہے۔

جنرل بدھ سنگھ کی پیشقدمی: پشاور میں مختصر قیام کے بعد سید احمد پڑوسی علاقے یوسف زئی جا رہے اور ہشت نجر ۱۵ میں ٹھہر گئے۔ اس علاقے میں ان کی آمد نے بڑا سیاسی جوش و خروش پیدا کر دیا جس نے سکھ دربار کو چونکا دیا۔ جنرل بدھ سنگھ کے ماتحت جو رنجیت سنگھ کا چچا زاد بھائی اور بہترین سکھ جنرلوں

۱۔ یوسف زئی کا رقبہ پشاور اور امب کی شمالی پہاڑیوں کی وادیوں تک وسیع تھا اور ان میں طاقتور افغان قبائل سکونت پذیر تھے۔ ان میں سے قبیلہ خورد خیل کا سردار فتح خاں پنجتاری رقبہ میں اور سکھ حکومت کی مخالفت میں سب سے نمایاں تھا۔ انہی فوج کا ایک باقاعدہ دستہ ایک شمال میں متعین کر کے اس علاقے کو قابو میں رکھتے تھے۔ ضلع پشاور کا یہ پرگنہ آہو گاؤں پر مشتمل ہے جس کا مرکز سید احمد نے اقامت کی وہ چار سدرہ تھا۔

اب دس ہزار فوج کے ساتھ حالات کے جائزہ کے لئے روانہ کیا گیا یہ سکھ جنرل دریائے سندھ سے تھلے پار کر کے دریائے کابل تک جا پہنچا۔ اگر اسے پار کر لیتا اور سیما (داوی) کے رقبہ میں داخل ہو جاتا تو قبائل میں عام گنہراہٹ پیدا ہو جاتی۔ اس لئے فیصلہ کیا گیا کہ اس سے دریا کے اُس پار ہی اٹھا جائے۔

سکھوں سے پہلی جھڑپ سکھوں سے پہلی جھڑپ نوشہرہ کے قریب ایک مقام اکورا پر ہوئی۔ بدھ سنگھ کی کمان میں سکھ فوج کی بہت کثیر تعداد تھی اس لئے شیخون مارنے کا فیصلہ کیا گیا۔ یہ جملہ ۲۰ دسمبر ۱۸۲۶ء کو ہوا جس میں سکھوں کے ۵۰۰ سپاہی کام آئے بلکہ مگر وہابیوں کی اس ابتدائی کامیابی کے باوجود سکھوں نے پھر دھاوا کر دیا اور وہابی سپاہی ہوتے۔

حرمیہس زر قبائل: اس کے کچھ ہی بعد ہنڈ کا سردار کھارے خاں سید احمد سے آملا، بیعت کی اور ان کو ہنڈ آنے کی دعوت دی جہاں ان کی جماعت کے قیام کے تمام انتظامات کر دینے کا وعدہ کیا۔ اس وقت تک سید احمد نے اپنی بددعوتی کے لئے کسی مستقل مرکز کا فیصلہ نہیں کیا تھا۔ معرکہ اکورا کے بعد وہ نوشہرہ میں اقامت گزریں تھے۔ چنانچہ انھوں نے کھارے خاں کی درخواست ان کی اور ہنڈ کو جارہے جو اس علاقے میں ان کی جدوجہد کا پہلا منظم مرکز بنا۔ کھارے خاں نے اور سرداروں کے ساتھ حضور پر شیخون مارنے کے لئے مشورہ کیا، یہ سکھوں کی ایک اہم تجارتی منڈی تھی۔ ان سرداروں کا اسل مقصد جیسا کہ بعد میں ظاہر ہو گیا لوٹ مار اور لاپٹ تھا۔ سید احمد کے مقاصد اور تمھے اور اعلیٰ درجے تھے۔ وہ اور ان کے متبعین مجوزہ تملہ سے بے تعلق ہو گئے۔ بہر حال قبائل اپنے منصوبے کے ساتھ آگے بڑھے اور قبائل نلرز کا ایک دعوای منظم کیا۔ سکھوں نے ان کا مقابلہ کر کے بھگا دیا۔ یہ سپاہی ایک ناقابل تلافی تباہی

سے اعلیٰ گریفن کی تالیف "ریجیت سنگھ" آکسفورڈ ۱۸۶۲ء ص ۲۱۱

ہوتی اگر سید احمدؒ کے متبعین اس پسپائی میں سہارا نہ دیتے اور ان قبائلیوں کو بہت زیادہ جانوں کے اتلاف سے نہ بچاتے۔ یہ وقوعہ سید احمدؒ کی سرگزشت سے براہ راست تعلق تو نہیں رکھتا مگر اس لئے یہاں اس کا ذکر کیا گیا کہ یہ سید احمدؒ کی جنگی مہمات کے منصوبے میں نقطہ انقلاب کا حکم رکھتا ہے۔ انہوں نے بڑے دُکھ اور مایوسی کے ساتھ اس حقیقت کو سمجھ لیا کہ یہ قبائلی جو ان سے آلے تھے ان کی نیت نہ اتنی صاف تھی نہ مطمح نظر میں وسعت و خلوص تھا۔ ان میں سے اکثر کا مقصد حقیر اور ذلیل تھا۔ وہ صرف تاخت و تاراج اور لوٹ مار کے خواہاں تھے۔ سچ تو یہ ہے کہ سید احمدؒ کی تمام جدوجہد میں یہ ایک زہر ثابت ہوا۔ سید احمدؒ کے جاں نثار متبعین کے گروہ جنہیں "ہندوستانی مجنون" کا لقب دیا گیا اور ان حریفوں کے قبائلیوں کے مطمح نظر اور نیتوں کے فرق نے ہمیشہ سید احمد کے فوجی موازنہ و مقابلہ کو محسوس کر کے رکھ دیا۔ ناچار وہ اس نتیجے پر پہنچے کہ تحریک کی پوری سیاسی اور فوجی نگرانی اور اختیار خود سنبھال لیں۔ اس کے معنی تھے ایک غایت درجے کا فنی مذہبی و سیاسی فیصلہ، یعنی امامت کا اعلان۔

امامت کا اعلان: اسلامی قانون کی رو سے جہاد کی نگرانی و رہنمائی کے لئے ایک امام کا انتخاب ضروری تھا۔ امام کو چند صفات سے متصف ہونا چاہئے جن کی تفصیلات سے ہمیں یہاں کوئی بحث نہیں۔ سرحد کی فوجی صورت حال ایک ایسے ہادی کی متقاضی تھی جسے کامل اور مطلق اختیارات حاصل ہوں۔ چنانچہ ۱۲۴۲ھ (فروری ۱۸۲۶ء) کو سید احمد امام منتخب کئے گئے۔ مسلمانان ہندوستان کے نام ایک گشتی چھٹی شائع کی گئی جس میں جنگ خضر تک کے تمام واقعات کا خلاصہ اور ان حالات کی شرح تھی جو امام کے انتخاب کے متقاضی تھے۔ یہ چھٹی ہندوستان

کے مختلف مراکز میں روانہ کی گئی۔ اس مکتوب میں سید احمدؒ نے لکھا تھا ”اس صورتِ حال میں سب سے عجیب بات یہ تھی کہ ان دونوں مواقع (اکوڑہ و حضرو) پر مجاہدین نے ایک بے سر کی فوج کا سا برتاؤ کیا اور کوچ کرنے اور لڑنے میں بھی غیر منظم طریقہ برتا۔ اس لئے اس وقت وفادار متبعین، سادات، علمائے شریعت، شرفاء و عمائدین اور جمہور مسلمانان میں سے جو لوگ حاضر تھے سب نے فیصلہ کیا کہ امام کے انتخاب کے بغیر جہاد کی کامیاب تنظیم اور بے اعتقادی و پراگندگی کا دفعیہ ناممکن ہے“ بعض علما اس تحریک کی تنقیص پر آمادہ ہو گئے اور گھر واپس جا کر اس فیصلے کو خود مختارانہ اقتدار پر قبضہ کرنے سے تعبیر کیا۔ لیکن جیسا کہ بیان ہوا تحریک کی اصل غرض کے لئے یہ ضروری تھا، ورنہ یہ غرض معمولی فروری جھگڑوں کی کھینچ تان میں کھو کر رہ جاتی۔

قبائلیوں کی بیعت: امامت کے اعلان کے ساتھ متعدد معتد سرداروں اور اسی ہزار قبائلیوں نے بیعت کی۔ پشاور علاقے کے کماندار برادران بابرک زئی نے بھی خطوط کے ذریعے بیعت کی اور اطاعت و تعاون کے پیغام بھیجے سید احمدؒ کے بعض متبعین شروع سے ہی ان دونوں بھائیوں کے خلوص نیت پر شبہہ کرتے تھے۔ مگر سید احمدؒ نے ان کی زبان پر اعتماد کر لیا۔ انہوں نے تصور کیا کہ یہ سردار برسوں کے داخلی جھگڑوں اور مسکھوں کے ہاتھوں شکنیں کھا کھا کر احساس کمتری اور کسی معین مقصد کے عام اہلکار کے احساس میں مبتلا تھے۔ اپنے دشمنوں کے خلاف فتحیابی حاصل کرنے کے لئے آپس میں متحد و منظم ہوجانے کے بعد ان میں عام خود اعتمادی پیدا ہوجانے کی اور ان کی فتنوں کی اطاعت مضبوط ہو جائیگی۔

سردارانِ پشاور کی علیحدگی: پشاور کے سردار اور دوسرے قبائلی سرداروں کے ایک جلسے میں طے پایا کہ قبائلیوں اور ہندوستانیوں کی متحدہ فوج کے ساتھ مسکھوں کے خلاف اقدام کیا جائے۔ چنانچہ وہ نوشہرہ کی طرف چل پڑے جہاں

اُس وقت تک بڈھ سنگھ نے اپنی چھاونی لگا رکھی تھی پھر شیدو کی جنگ میں پشاور کے سرداروں نے جن کو بڈھ سنگھ لے درغلا کر اپنی طرف ملا لیا تھا، سید احمد کے ساتھ غداری کی اور ان کو چھوڑ کر الگ ہو گئے۔ اس کے بعد ہندوستان سے آدمیوں اور سامان کی آمد میں زیادہ وقفہ ہو جانے سے فاقہ اور پریشانیوں کی نوبت آگئی۔ سید احمد نے اپنا پہلا صدر مقام ہند ترک کر دیا اور کچھ عرصہ تک ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہے۔ یہاں تک کہ آخر میں وہ پنجاب میں جا ٹھہرے۔ اسی ابتلا کے زمانے میں ولایت علی کے چھوٹے بھائی طالب علی جنھوں نے شیدو کی جنگ میں حصہ لیا تھا اور اٹھارہ سال کے نوجوان تھے چنگلائی میں وفات پائی۔

قبائلی علاقوں میں تبلیغی دورے: جنگ کے بعد سید احمد نے آس پاس کے قبائلی علاقے بینر اور سوات کے تبلیغی دورے کئے۔ انہوں نے لوگوں کو رغبت دلائی کہ ان کے مشن میں شریک ہوں اور اس علاقے میں جو سماجی و مذہبی بدعات پھیلی ہوئی ہیں ان سے تائب ہو جائیں۔ انھوں نے چترال، کشمیر، بخارا اور دوسرے ہمسایہ علاقوں کے حکمرانوں کو بھی خطوط لکھے۔ ان کو ہزارہ کے علاقے کے سردار کی طرف سے بھی تعاون کی سلسلہ جنبانی اور پیغام وصول ہوا جس میں مشہور سکھ جنرل ہر سنگھ نلوا اور گورنر ہزارہ کی ظالمانہ حکومت سے بے چینی کا اظہار تھا۔ ہزارہ کشمیر کی سرحد پر واقع ہے اور اگر اُس پر قبضہ کر لیا جائے تو کشمیر کا راستہ کھل جائے۔

کشمیر پر قبضہ کرنے کا منصوبہ: سید احمد کے نقشہ جنگ میں کشمیر کو نمایاں جگہ تھی۔ اس پر قبضہ ہو جانے سے ان کو کثیر سامان، مسلمانوں کی جمہوری آبادی اور قدرتی مدافعت کا ایک مضبوط خطہ ہاتھ آ جائیگا۔ جو سکھوں کی ماتحت و تاز سے محفوظ ہوگا، اور بعد کی فوجی کارروائیوں کے لئے ایک پابند بنیاد

ملہ یہ مردان کے شمالی مغرب میں خود فوجیں قبائلی علاقے کا مسند مقام اور فتح خان کا مقدر تھا۔ پرانے شہر کو انگریزوں نے ۱۸۵۷ء کی مہم میں کاملاً تباہ کر دیا تھا۔ موجودہ شہر میں آباد ہوا۔

ہوگی۔ اس سے پہلے ہی کا شجر کے شاہ سلیمان کے نام ایک خط میں اشارہ کیا تھا کہ وہ پشاور کے سرداروں کو ٹٹولنے کے بعد کشمیر کی طرف بڑھنے کا ارادہ رکھتے ہیں۔ انہوں نے اُس اعانت کے وعدے کا بھی ذکر کیا تھا جو انہیں اُس طرف بڑھنے کی صورت میں چترال کے حاکم اور دوسرے سرداروں سے وصول ہوتے تھے، چنانچہ انہوں نے کچھلی کے علاقے میں شاہ اسمعیل کے زیرِ کمان ایک دستہ بھیج دیا اور خود پنج تار میں ٹھہر گئے۔ شاہ اسمعیل نے اس علاقے میں کامیابی کے ساتھ تبلیغ و نشر اور فوجی معاینہ و تجسس کے کام انجام دئے، اور اس سلسلے میں امب اور ستھانہ کا دورہ بھی کیا۔ انہوں نے سکھوں کی بعض فوجی چوکیوں پر بھی کئی اچانک دھاوے کئے۔ ان میں سے نشکباری کی وہ جھڑپ جس میں اپنے مختصر سے فاقہ زدہ دستے سے سکھوں کی زیادہ زبردست فوج کو شکست دیکر تتر بتر کر دیا بہت مشہور ہے۔ اس زمانے میں ان کی جدوجہد ۱۸۲۷ء کے ربع آخر تک جاری رہی۔

درانی سرداروں کا مخاصمانہ رویہ: مگر اسکے فوراً بعد سید احمد نے ان کو واپس بلا لیا۔ اس واپس طلبی کا سبب واضح نہیں۔ شاید سید احمد چاہتے تھے کہ درانی سرداروں کے خطرے سے نمٹا جائے جو ہندوستان سے آنے والے رضا کاروں کے قافلوں کو دق کیا کرتے اور عام طور پر قبائل کو ان کے خلاف اکساتے رہتے۔ اس کے فوراً بعد سید احمد (دسمبر ۱۸۲۷ء کو) خابار منتقل ہو گئے۔ یہ زیریں سوات میں دریائے سوات کے مشرقی کنارے پر ایک اہم شہر ہے یہیں ۲۴ فروری ۱۸۲۸ء کو عبدالحی کی وفات واقع ہوئی۔

اس درمیان میں درانی سرداروں کی مخاصمت بڑھتی گئی۔ سید احمد سے اہلاف کے معاہدے میں یہ لوگ مخلص ثابت نہ ہوئے۔ سید احمد کو ان سے معاملہ کرنے میں ایک نازک صورت پیش آئی جو قسمت کی افسوسناک ستم ظریفی سے خالی نہیں۔ انہیں لوگوں سے بڑنا جن سے تعاون کی امید تھی اور

جن کی خوش حالی اور ترقی کے وہ خواہشمند تھے ان کو بہت ناپسند تھا مگر درآنی سرداروں کے عثمان زئی کی طرف بڑھنے سے ان کا ہاتھ قوی تر ہو گیا۔ انہوں نے اس متوقع خطرے کا مقابلہ کرنے اور آئے دن کی شرارتوں کی اس بنیاد کے ہمیشہ کے لئے استیصال کیلئے خیبر کے علاقے کے بعض قبائل کے تعاون سے درآنی سرداروں کے مرکز پشاور پر قبضہ کر لیا۔ کچھ قاصد جن میں پٹنہ کے منظر علی بھی شامل تھے ان کے پاس ان کا تعاون حاصل کرنے کے لئے روانہ کئے گئے۔ عثمان زئی کی جنگ (۱۸۲۸ء) میں درآنی سرداروں کو شکست ہوئی۔ مگر پشاور کی طرف پیش قدمی قبائلیوں کی بد عہدی کے سبب سے جن سے اعانت کی امید تھی ایک بار پھر ملتوی کرنا پڑی۔

پنجتار میں دینی اجتماع۔ قبائلی سرداروں کی بار بار بد عہدی اور سماجی مذہبی مفسدات کے جاری رہنے کے پیش نظر سید احمد کو یقینی ہو گیا کہ مقامی لوگوں کے چال چلن میں اخلاقی و مذہبی اصلاح جاری کرنا لازمی ہے۔ اس کے بغیر یہ لوگ تحریک کے صحیح معنی کبھی نہیں سمجھ سکتے، چہ جائیکہ تحریک کے مخلص و فادار ہوں۔ چنانچہ پنج تار میں (فروری ۱۸۲۹ء) ایک عظیم مذہبی مجمع منعقد ہوا جس میں اور دن کے ساتھ فتح خاں پنجتاری، زبیرا کے اشرف خاں اور کھادے خاں بھی موجود تھے۔ تمام حاضرین سے۔ از سر نو اس مضمون کا عہد لیا گیا کہ وہ اپنی اپنی تلمذ کو شریعت کے مطابق چلائیے اور مروجہ رسوم و عادات جیسے شراب نوشی، خاندانی جھگڑے، سود خواری کثرت ازواج، متوفی مورث کی بیوی اور بچوں کی اس کے بھائیوں میں تقسیم وغیرہ ختم کر دینگے۔ اسلام کے فرض احکام جیسے صوم و صلوة پر بھی بہت زور دیا گیا۔ مگر اس خصوص میں کامیابی کی وسعت محدود رہی۔

فتح ہند: اب پنج تار سید احمد کی جدوجہد کا صدر مقام ہو گیا تھا ہند کے کھادے خان کو یہ ناگوار ہوا۔ اس انتقال نکالی کو اس نے اپنی تحقیر تصور

کیا۔ وہ سید احمدؒ کے بعض اور کاموں سے غیر مطمئن تھا۔ ہندوستان سے آنے والی رضا کاروں کی جماعت کو جس کو اسکی قلمرو سے گذرنا پڑتا تھا، ستانا شروع کیا۔ اس نے سید احمدؒ کے دواہم اور زبردست حامیوں اشرف خاں اور فتح خاں سے بھی چھیڑ خانی شروع کی۔ آخر میں اس نے جنرل ونیٹورا سے نامہ و پیام شروع کیا جو سکھ دربار کی طرف سے مالگناریاں وصول کرنے کو سرحد بھیجا گیا تھا۔ کھادے خاں نے اُس کو پنجتار پر حملہ کرنے پر بھی آمادہ کیا۔ مگر یہ حملہ کامیاب نہ ہوا۔ اس کے فوراً بعد سید احمدؒ نے بالآخر کھادے خاں سے بیٹنے کا پختہ ارادہ کر لیا بعد میں ہونے والی ہند کی جنگ (اگست ۱۸۲۹ء) کھادے خاں نے شکست کھائی اور مارا گیا۔

یار محمد کا خاتمہ: یہ شدید اقدام سید احمدؒ کی مرضی کے خلاف کیا گیا۔ مگر کھادے خاں کی مسلسل ایادتیوں اور سینہ زوریوں اور دشمنوں کے ساتھ اس کے ساز باز نے کوئی اور چارہ کار باقی نہ چھوڑا تھا۔ چونکہ اسے دو سال بعد پشاور کی فتح کے وقت وقوع پذیر ہونا تھا، اس لئے سید احمدؒ نے ہند کا نظام حکومت اپنے ہاتھ میں لینے سے انکار کیا۔ اس کے برخلاف ان کی خواہش تھی کہ یہ نظام کھادے خاں کے کسی قراہتمند کو منتقل کر دیا جائے۔ مگر ان قراہتمندوں نے یار محمد خاں کے ساتھ الحاق کی کوشش کی مگر وہ بھی سید احمدؒ کی پالیسیوں سے رضامند نہ تھا۔ اُس نے دہلیوں کی موجودگی سے جت وہ ان وادیوں کو سید احمدؒ کے زیر اثر آجانے کا موجب سمجھتا تھا نجات حاصل کرنے کا ایک عمدہ موقع تصور کیا۔ یار محمد نے ہند کے غیر مطمئن سرداروں سے ملکر سید احمدؒ کے خلاف چڑھائی کی۔ مگر ان سلیٹیوں نے شکست کھائی اور یار محمد جنگ زیدہ (ستمبر ۱۸۲۹ء) میں مارا گیا۔ پشاور میں ونیٹورا کا

مایانہ اور مشہور گھوڑی بیٹی کے جس کا رنجیت سنگھ سخت دلدادہ تھا۔ مطالبہ کے مشن پر ناگہانی آمد نے اسے وہابیوں کے ہونے والے حملے سے بچا لیا۔

نسیخ کشمیر کے منصوبہ کی ناکامی: سید احمدؒ کا ایک منصوبہ یہ بھی تھا کہ کشمیر کو آزاد کرا کے اسے اپنا مستقل مستقر بنادیں۔ اس منصوبے کی تکمیل کے لئے شاہ اسماعیل کو جائزہ کی مہم پر ۱۸۲۷ء میں ہزارہ تعینات کیا گیا مگر سیما داوی کے علاقے کے سرداروں کی مخالفت نے ان کو فی الوقت اس مہم کو ملتوی کرنے پر مجبور کر دیا۔ یار محمد کی شکست کے بعد سید احمدؒ کے قدم وادیوں میں ایک حد تک مضبوط ہو گئے تو انہوں نے کشمیر کی طرف پھر توجہ مبذول کی۔ جنگ زیدہ کے فوراً بعد ہی ان کو کشمیر کے ایک مقامی سردار سے یہ پیغام موصول ہوا کہ تربیلا میں سکھوں کی فوجی چوکی میں کوئی فوج موجود نہیں اور آسانی سے اس پر حملہ کیا جاسکتا ہے۔ چنانچہ سید احمد کھابیل کی طرف بڑھے جہاں کے مقامی سردار نے ان سے آملنے کا وعدہ کیا تھا۔ مگر سکھ کماندار ہری سنگھ کو مجوزہ حملے کی بول گئی اور فوراً تربیلا واپس آ گیا، اس طرح حملہ کی تجویز دھری کی دھری رہ گئی۔

سردار ان سٹھانہ کا ایشارہ کھابیل کی اقامت کے دوران میں سید احمدؒ کی ملاقات سٹھانہ کے سید سرداروں سے ہوئی۔ اس مقام کو سرحد پر وہابیوں کا اہم ترین مرکز ہونا مقدر تھا۔ سید خاندان وہابیوں کی محبت اور وفاداری میں ثابت قدم رہا اور اپنی تمام مادی املاک ان پر سے قربان کر دی۔ خود غرضی اور تعصب و تنگ نظری کی پھیلی ہوئی فضا میں ان کی یہ وفاداری اور

۱۷ ایم گریگور جلد ۱ صفحہ ۱۹، ۲۷ سٹھانہ بنیر کے علاقے میں دریائے سندھ کے مغربی

کنارے پر واقع ہے۔ یہ سادات کے ایک مقدس خاندان کا مقام تھا یہ لوگ سرحد پر وہابیوں

کے بڑے سرگرم معاون سرپرست تھے۔ بعد میں یہ وہابی جدوجہد کا صدر مقام بن گیا۔

اور جان نثاری ایک روشن مثال تھی۔ سید اکبر شاہ جس سے سید احمد کی پہلے سے خط و کتابت تھی آپ سے ملنے کھابل آیا اور ستھانہ میں آپ کو مدعو کیا، جہاں پہنچ کر اس کے خاندان والوں نے آپ کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اس نے سید احمد کو مقامی سرداروں کے تعصب و تنگ نظری اور تلون مزاجی سے مطلع کر دیا اور مشورہ دیا کہ ان پر اعتماد نہ کریں۔

پانندہ خاں کی شکست و اطاعت: اس اثنا میں آمب کے سردار پانندہ خاں تناولی کی طرف سے پیغامات وصول ہوئے جن میں سید احمد سے ملنے کا اشتیاق ظاہر کیا گیا تھا۔ اس کا کردار بھی انقلابی حوادث سے تعمیر ہوا تھا۔ اس کی گدی نشینی بھی اس علاقے میں سکھوں کی آمد کے ساتھ ہی عمل میں آئی، اور ان کے مقابل اپنی گدی پر مضبوطی سے جما رہا۔ وہ بہادر اور جبری تھا مگر ایک چالاک موقع شناس دشمن کے مقابلے میں برسوں مسلسل اور غیر مساوی جنگوں نے اس کے لطیف پہلوؤں کو بہت مدہم کر دیا تھا، اور اسے ہر چیز اور ہر شخص سے مشتبہ بنا دیا تھا۔ اس کی ریاست کشمیر کے ایک فوجی اہمیت کے راستے پر واقع تھی، اس لئے سید احمد کشمیر کی طرف مجوزہ پیش قدمی میں اس کی حمایت حاصل کرنے کے خیال سے اس سے ملے، شاہ اسماعیل کے زیر کمان پہلے ایک ہراول دستہ بھیج دیا گیا۔ پانندہ خاں نے بہر حال آمب کے راستے سے کشمیر پر دھاوا کرنے کی تجویز سے اس لئے اختلاف کیا کہ ایسا کرنے سے سکھ خلاف ہو جائیگا۔ ایسے شخص کی طرف سے جس نے ساری زندگی سکھوں سے علانیہ لڑنے میں گذاری ہو یہ عذر سخت حیرتناک تھا۔ آخر سید احمد نے زبردستی ادھر ہی سے گذرنے کا فیصلہ کر لیا، اور آمب کی جنگ میں پانندہ خاں کو شکست ہوئی۔ تو ایک عہد نامہ مورخہ مارچ ۱۸۳۱ء کی رو سے وہ صرف راستہ دہنے ہی پر نہیں بلکہ ان کے ساتھ تعاون پر بھی راضی ہو گیا۔ دریائے سندھ کا مشرقی

علاقہ اسی کے قبضے میں چھوڑ دیا گیا اور کشمیر اور پشاور کی فتح کے بعد جاگیریں دینے کا وعدہ بھی کر لیا گیا۔ آئب کے سردار سے یہ شرائط قبول کرا کے سید احمد نے کشمیر کی طرف بڑھنے کی تیاریاں شروع کر دیں کشمیر سے متصل وادی کاغان میں کوئی کے ضامن شاہ سے بھی مدد اور تعاون کی پیشکشیں وصول ہوئیں۔ پھلیرا کی طرف بڑھنے کی رائے ٹھہری۔ یہ دستہ سید احمد کے بھتیجے سید احمد علی کی کمان میں تھا۔ سکھوں نے اس پر اچانک حملہ کر دیا۔ بھاری نقصان ہوا جس میں دستہ کے سردار بھی شامل تھے (۱۸۲۹ء)

رنجیت سنگھ کی پیشکش: متبعین سید احمد کی کاروائیاں اس وقت تک لاہور و دربار میں خاصی پریشانی کا باعث ہو چکی تھیں چنانچہ رنجیت سنگھ نے شیر سنگھ الارڈ اور نیچورالہ کے ماتحت ایک فوج روانہ کی ساتھ ہی سید احمد کے پاس ایک وزیر سنگھ اور عزیز الدین شامل تھے۔ اس نے دریائے سندھ کے پار کا علاقہ سید احمد کو پیش کیا اس شرط پر کہ وہ ویدیا کے جنوب و مشرق اپنی ترکناز موقوف کر دیں۔ مگر سید احمد نے یہ پیشکش نامنظور کر دی، کیونکہ اس کے رو سے ان کو اپنے اصل ارادہ یعنی انگریزوں کے خلاف اقدام میں تعہد و تخفیف سے کام لینا پڑتا۔

اس وقت تک پنج تار سے آئب تک سارا علاقہ سید احمد کی حلفی میں تھا یا ان کے قبضے میں محفوظ تھا۔ مگر مذہبی و سماجی اصلاح کے اقدامات نے سرداروں اور جاگیرداروں

۱۸۲۲ء میں رنجیت سنگھ کی ملازمت میں داخل ہوئے اور الذکر کو سوائے کی کمان دی گئی اور ان کے سپاہیوں کی ان کی تنخواہ پچاس ہزار سالانہ مقرر ہوئی۔ یہ ماہر سپاہی تھے اور سکھ فوج میں عربی تربیت اور نمایاں مہارت کا ذریعہ و آئب ہی تھے۔ وینچورالہ VE NTURAL کی ملازمت الارڈ ALLIARD کی علیحدگی کے بعد تک جاری رہی انگریزوں اور سکھوں کی پہلی جنگ کے بعد معاہدہ میں یہ شرط بھی داخل کی گئی کہ انگریزوں کی اجازت سے بغیر کوئی یورپی یا امریکی سکھ فوج میں نہیں رہے گا ایم گریجور جلیا ۱۹۱-۱۹۱۰ء فیروز علی الدین رنجیت سنگھ کے واقع ترمی درباریوں اور شیروں میں سے تھے۔ اور اکثر اہم خفیہ مشن پر بحیثیت سفر بار بھیجے جاتے تھے۔

میں بے چینی پیدا کر دی۔ وادیوں کے بعض سرداروں نے عشر (۱۰) کی موجودہ رقم بھی ارسال نہیں کی۔ لہذا بقایا عشر کی تحصیل اور احکام شریعت کی پابندی عائد کرنے کے لئے ایک مہم روانہ کی گئی۔ یہ بہت حد تک کامیاب رہی۔ مگر ہونی مروان کے احمد نے مخالفت کی لیکن جب اس کو قلعہ چھوڑنے پر مجبور کیا گیا تو پشاور بھاگ گیا جہاں سلطان محمد خاں سردار پشاور اور یار محمد کے بھائی کے ساتھ سید احمد کے خلاف فوج کشی کے لئے سازباز شروع کی۔

سلطان محمد کے دل میں اپنے بھائی یار محمد کی موت کے بعد سے اس کے فاتح کے خلاف ایک تلخی مخفی تھی۔ اس سے کچھ دن پہلے وہابیوں کے ایک چھوٹے سے دستہ پر جو قلعہ ہنڈ پر قابض تھا حملہ کر دیا تھا۔ پھر اس نے سید احمد کے مستقر پنج تار پر جو اس وقت غیر محفوظ تھا حملہ کرنے کی دھمکی دی۔ بہر حال سید احمد ہزارہ واپس آئے اور سلطان محمد واپس چلا گیا۔ احمد کے بہکانے سے وہ ایک بار اور سید احمد کے خلاف نکلا۔ چنانچہ تیسرے جنگ، سلطان محمد کی شکست اور بعد میں پشاور پر دھاوا اور قبضہ یہ تمام واقعات یکے بعد دیگرے وقوع میں آئے (اکتوبر ۱۸۳۳ء)۔

سلطان محمد سے حسن سلوک، فتح پشاور کے موقع پر سید احمد کا کردار بے غرضانہ بلند نظری کی ایک روشن مثال ہے وہ پشاور پر قبضہ کر کے اپنی چھوٹی سی فرماں روائی کی بنیاد ڈال سکتے تھے۔ مگر ان کا مقصد مختلف اور بلند تر تھا۔ اس نے پشاور کی حکومت سلطان محمد کو واپس کر دی۔ اس فیصلہ سے ان کے رفق میں اس وقت بھی بے اطمینانی پیدا کی اور اس کے بعد سے دوسرے بھی اس پر نکتہ چینی کرتے آئے۔ اگرچہ بعد کے واقعات نے سید احمد کے متبعین کی بے اطمینانی کا استصواب کیا، مگر ان کا فیصلہ ماحول اور حالت وقت کے لحاظ سے بالکل درست اور ان کے اعلیٰ اغراض و مقاصد کے مطابق تھا۔

کوئی اور طریق عمل سلطان محمد کے ساتھ طویل عداوت پر منتج ہوتا اور ایسی تباہ کن اور
دیر پا جنگ کا سلسلہ چھڑ جاتا جو اصل مقصد کو پس پشت ڈال دیتا۔

پشاور میں دینی حکومت کا قیام: حکومت پشاور پھر قائم ہو گئی۔ سید احمدؒ کے
متبعین میں سے چند اشخاص حکومت کو احکام شرع کے مطابق چلانے کے لئے
پشاور میں متعین کئے گئے۔ مظہر علی پشاور کے قاضی مقرر ہوئے اور بہار کے
چند اور اشخاص کا ایک گروہ جس میں قمر الدین بھی تھے ان کے ساتھ متعین
ہوا۔ مایر کی جنگ اور پشاور کی تسخیر وہابیوں کے اثر اور سید احمدؒ کے حسین
حیات میں سیاسی توسیع کی نشان دہی کرتی ہے۔ بڑے بڑے عالی مرتبت مقامی
سرداروں کی سرکوبی کی گئی، اور اب سید احمدؒ اطمینان سے سکھوں کی طرف اپنی
توجہ مبذول کر سکتے تھے۔

مجاہدین کے خلاف سازش: مگر وہابیوں پر ایک سخت مصیبت نازل ہونے
والی تھی۔ رقبہ اشرفی وسعت کے سبب سے وہابیوں کی چھوٹی چھوٹی ٹولیاں
مختلف جگہوں میں جن میں پشاور بھی تھا، تعینات کر دی گئی تھیں۔ سلطان
احمد اور بعض اور قبائلی سردار اپنی فطرت کے مطابق خفیہ طور پر انھیں لوگوں
پر حملہ کرنے کی سازش کر رہے تھے جنھوں نے اپنی عالی حوصلگی اور سیر چشمی سے
انھیں ان کا اقتدار واپس دلایا تھا۔ عوام انہیں کو وہابیوں کے خلاف اکسانے کے
لئے بعض سماجی اصلاحات جو نافذ کی گئی تھیں اور ان کے خلاف بعض بے بنیاد
بناوٹی الزامات سے کام لیا گیا۔ تمام جگہوں میں جہاں جہاں وہابیوں کی چھوٹی چھوٹی
ٹولیاں مقرر تھیں ایک خفیہ ناگہانی انقلاب کا انتظام کیا گیا۔ ابتدا پشاور سے
کی گئی جہاں مظہر علی قاضی شہر اور دوسروں کو دھوکے سے قتل کر دیا گیا۔
اسی طرح اور ٹولیوں پر حملہ کر کے فریب سے قتل کر دیا گیا۔ چند آدمی جو پتہ
گئے تھے یہ داستان غم سنانے کو پنج تار پہنچے۔ سید احمدؒ اس سے پہلے
اسی قسم کی حرکات سے اپنی بے نفسی سے ہمیشہ اس امید پر چشم پوشی کرنے اور

معاف کر دینے کی کوشش کرتے رہے کہ شاید وہ ان کو براہ راست پرے آسکیں گے اور اخلاقی ترغیب اور مذہبی تعلیمات سے برضا و رغبت ان کا تعاون حاصل کرنے سکیں گے۔ مگر یہ انتہائی دغا بازی ان کے لئے بھی برداشت سے زیادہ ثابت ہوئی۔ مظفر آباد پر حملہ ۱۸۳۱ء کے آخر میں سید احمدؒ آخری بار پنج تار سے رخصت ہو کر وادی کاغان کے شہاں کو چلے گئے۔ دوسرے سال اوائل جنوری میں وہ راج دوارمی پہنچے۔ یہ حمدی نقطہ نظر سے ایک اہم جگہ تھی۔ پکھلی کی وادی کے تمام درے نظر آتے تھے۔ اس کے فوراً ہی بعد شکاری سے کچھ بالاتر ایک وڑہ بھوگرمنگ جو سکھوں کی ایک فوجی چوکی تھی فتح ہو گیا۔ اس جگہ کے ایک برفاںست کردہ سردار زبردست خان کی اطلاع پر کہ وہ غیر محفوظ ہے ایک اور دستہ مظفر آباد بھیج دیا گیا۔ اس دستہ نے چھاوئی کے علاقہ پر قبضہ کر لیا اور سکھوں کی چھوٹی سی ٹولی پر بھی جو بھاگم بھاگ مظفر آباد واپس پہنچی تھی اور گڑھی میں پناہ لے رکھی تھی، حملہ کیا گیا مگر قبضہ نہ ہو سکا کیونکہ مقامی حلیف زبردست خان اوروں کی طرح آخری گھڑی میں ڈگدگانے لگا۔ سید احمدؒ نے اس دستہ کو بالاکوٹ بلوایا جہاں وہ اپریل ۱۸۳۱ء کو آگئے تھے۔

شیرمنگھ مظفر آباد پر حملہ کی خبر سنکر فوراً پشاور سے واپس آ گیا۔ لیکن یہ سنکر کہ وہابیوں نے اُسے چھوڑ دیا ہے اس نے پہلے گڑھی حبیب اللہ پر مورچہ سنبھالا۔ پھر بالاکوٹ کی طرف بڑھ گیا جہاں سید احمدؒ خود موجود تھے۔ بظاہر وہ پوری وہابی طاقت کا جو وہاں موجود تھی مظاہرہ کرنا چاہتے تھے۔ سید احمدؒ نے بھوگرمنگ، راج دوارمی، مظفر آباد وغیرہ سے اپنے تمام منتشر دستے بالاکوٹ بلوائے تھے جو ان کل زندگی کی آخری جنگ کا منظر بننے والا تھا۔

باب ۳

جنگ بالاکوٹ اور فرائضی تحریک

(۱) جنگ بالاکوٹ

منظورہ اور وقائع کے بیانات کی بنیاد پر غلام رسول مہر نے اس مشہور جنگ کے مفصل حالات مرتب کئے ہیں۔ یہ حالات اس وقوعہ سے متعلق مکمل ترین اور معتبر ترین ہیں۔ پھر بھی یہ دونوں مآخذ بعض جزئیات خصوصاً جنگ کے آخری چند گھنٹوں کے وقوعات، سید احمد کی شہادت، ان کی نعش کی شناخت اور تدفین وغیرہ کے متعلق کچھ نہیں بتاتے۔ اور یہ خاموشی قدرتی بھی ہے۔ اس لئے کہ ان کے اکثر رفقا جو ان کے ہمدوش لڑ رہے تھے شہید ہو چکے تھے۔ جو چند افراد بچ رہے تھے اپنے اپنے مشاہدات کو ذہن میں تازہ و مجتمع کرنے کو جمع ہوئے وہ بہت بعد ہیں۔ اس کے علاوہ ان میں سے کسی کا بیان چشم دید نہیں۔

جنگ بالاکوٹ کے متعلق اہم دستاویز، خوش قسمتی سے اس واقعہ کی سبکی کی ایک غیر شائع شدہ روایت ہمیں دستیاب ہو گئی ہے۔ یہ رنجیت سنگھ کے دربار کے ایک قانع نویس کی رپورٹ میں شامل ہے جو ایوان کے لیبیکل اسسٹنٹ سی آر وید نے ان رپورٹوں کے اقتباساً حکومت ہند کو بھیجے تھے۔ اور آخر میں اس واقعہ کا نہایت

لہ منظورہ اور وقائع کے مختصر نام گذشتہ اوراق کے حواشی میں بار بار آئے ہیں منظورہ سے مراد ہے منظورۃ السعداء فی احوال القزاقہ و الشہداء مرتبہ سید حفیظ علی ساکن مچھوال میر ضلع گورکھپور۔ یہ بالاکوٹ کے مجاہدین میں سے تھے۔ ۱۲۸۸ھ (مطابق ۱۸۷۱ء) میں دفات پائی وقائع سے مراد وقائع احمدی ہے جو ۱۲۷۶ھ کی تالیف ہے۔ اس کے ناقص مخطوطات سے مہر صاحب نے اپنی سید احمد شہید میں استفادہ کیا ہے۔ مولف کا نام مذکور یا موجود نہیں [مترجم]

بتی بیان جو تاریخ کے مولف مہتاب سنگھ نے دیا ہے، اور پھر ۱۸۵۴ء میں تالیف
 ہوئی اور جو ۱۸۲۲ء سے ۱۸۵۴ء تک ریونیو انسر کی حیثیت سے ہزارہ میں متعین
 تھا، ہمارے ہاتھ آ گیا ہے۔

سطور ذیل میں میں نے پہلے وقائع اور منظورہ کی بنیاد پر مہر نے جو حالات
 مجھے ہیں ان کی تلخیص کی ہے پھر تواریخ ہزارہ اور وقائع نویں کی رپورٹ میں مندرج
 آیات کا پورا خلاصہ درج کر دیا ہے۔ ان تینوں ذرائع کے تقابلی مطالعہ سے
 ان اہم واقعات کو بہتر طور پر سمجھنے میں مدد ملیگی۔

بالاکوٹ کا محل وقوع: شیرسنگھ اور سید احمد کی فوجیں دریائے گنہار کے
 پارے ایک دوسرے سے مقابل ہوئیں۔ بالاکوٹ کا گاؤں دریا کے مغربی
 پارے پر ایک ٹیلے پر واقع تھا۔ شیرسنگھ کی فوج کا پڑاؤ بالاکوٹ سے تھوڑی
 مدد مشرقی کنارے پر تھا۔ شیرسنگھ دو راستوں سے بالاکوٹ پر حملہ آور ہو سکتا
 تھا۔ بالاکوٹ کے بالمقابل مشرقی کنارے سے، دریا پار کر کے (۲) پھلی کی طرف
 کوٹ کے مغربی پہاڑ پر چڑھ کر بالاکوٹ پر چڑھائی کر کے۔ اس نے پہلا
 سہ اختیار کیا۔

سید احمد کی فوجی حکمت عملی: بٹی کوٹ پہاڑی کے سامنے اور بالاکوٹ کے
 باوجود کے درمیان کھیتوں کا ایک نشیبی علاقہ تھا۔ سکھوں کے اقدام کو روکنے
 کے لئے اس نشیبی علاقہ میں بہت پانی چھوڑ دیا گیا تھا اور اسے دلدلی بنا دیا
 گیا تھا، سید احمد نے پہاڑی پر جانے والی پوشیدہ پگڈنڈیوں کی نگرانی کے
 لئے ایک مختصر سادستہ تعینات کر دیا تھا۔ مگر یہاں بھی غداری اپنا کام کر گئی۔
 پوشیدہ پگڈنڈیوں کا پتہ سکھوں کو بتایا گیا اور کسی کمک کے پہنچنے سے پہلے محافظ
 سہ کو اچانک زیر کر لیا گیا۔ وہابیوں کے نقشہ جنگ پر یہ بہت بڑی مصائب
 برپا تھی، کیونکہ اس کے فوراً بعد سکھ تمام پہاڑی پر چڑھ دوڑے جو بالاکوٹ
 سایہ انگن تھی۔ جب جنگ کی تیج طلوع ہوئی سید احمد نے اپنے آدمیوں کو حکم دیا

کہ سکھوں کو پہاڑی سے نیچے اترنے اور دلدلی کھیتوں سے گزرنے میں جب سنگھ ہانپتے ہوئے بلندی پر پہنچے جہاں مکانات واقع تھے اُس وقت وہابی فائر شروع کرنے والے تھے۔ اُس وقت کے حالات کے پیش نظر یہ بہترین تدبیر تھی جو اختیار کی جاسکتی تھی۔ جب سکھ پہاڑی سے اترنے لگے تو وہابی، منصوبہ کے مطابق اپنی جگہ پر جمے رہے۔ اس کے بعد سید احمدؒ خود ابتدا کر کے اپنے رفیقوں کے ساتھ پہاڑی کے دامن کی طرف جھپٹ پڑے۔ اب جنگ شروع ہوئی۔ وہابیوں کی مختصر فوج چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں تقسیم اور ایک دوسرے سے بے تعلق ہو گئی۔ جنگ جھمکے ہوئی اور دست بدست۔ سید احمدؒ پہاڑی کے دامن میں بہادری سے لڑتے ہوئے گر گئے۔ کسی نے اُن کو گرتے ہوئے نہیں دیکھا۔ جو مجاہدین ان کے ساتھ لڑ رہے تھے وہ ان کے ساتھ شہید ہو گئے۔

جنگ ۲۲ ذی قعدہ ۱۲۲۶ھ مطابق ۶ مئی ۱۸۳۱ء کو بروز جمعہ واقع ہوئی۔ سید احمد کی شہادت جنگ کے بعد شیر سنگھ نے اپنے دشمن کی لاش کی تلاش کی اس کے سامنے ایک بے سر کی لاش لائی گئی جو سید احمد کی بتائی گئی۔ اس نے اس کی شناخت کرانے کی کوشش کی۔ بعد میں سر بھی مل گیا اور شیر سنگھ نے ان کی لاش کو دریا کے کنارے دفن کرادیا۔ دوسرے دن لوٹتے ہوئے اس نے دریا کو عبور کیا۔ اس کے دوسرے دن بعض اکایوں نے جو تیجھے رہ گئے تھے لاش کو قبر سے نکال لیا اور دریا میں پھینک دیا۔ سر اور دھڑ بعد میں دریا کے اُٹے لٹخ پر دو مختلف جگہوں پر پائے گئے اور سر گڑھی حبیب اللہ میں اور دھڑ تیلہٹا میں دفن کر دئے گئے۔ اُس منحوس دن کے واقعات کی پوری پوری تحقیقات کے بعد بالا کوٹ میں موجود وہ قری دوبارہ تعمیر ہوئی مگر یہ متعین نہیں کہ یہ قبر ٹھیک اسی مقام پر واقع ہے جہاں سے دھڑ کھود کر نکالا گیا تھا۔

تواریخ ہزارہ کی روایت: تواریخ ہزارہ میں یہ واقعات یوں بیان کئے گئے ہیں:-
 ”غدارانہ قتل کے بعد سید احمدؒ نے پنج تار چھوڑ دیا اور حبیب اللہ خاں گڑھی

دالا ان کو راج دواڑی لے گیا جو سکھوں سے بنیاد تھا۔ سید احمدؒ پہلے بھوگرنگ پور

کاغان چلے گئے۔ انہوں نے ظاہر کیا کہ وہ کشمیر کی طرف بڑھنا چاہتے ہیں اور کشمیر کے علاقے میں حبیب اللہ خاں اور دوسرے مقامی سرداروں کو جاگیریں بھی باٹھنا شروع کر دیں۔

سید احمد کے کشمیر کی طرف بڑھنے کی خبر سن کر رنجیت سنگھ گھبرایا اور شیر سنگھ کو آٹھ ہزار فوج اور توپوں کے ساتھ سید احمد کے اقدام کو روکنے کے لئے متعین کیا۔ شیر سنگھ کی فوج میں اور سردار یہ تھے: سردار اتار سنگھ کالیان، سردار شہام سنگھ سردار پرتاب سنگھ اٹاری والا، سردار تن سنگھ گر جاگیا، ساوہو سنگھ کنہال، تن سنگھ کونگلو، وزیر سنگھ رنھری کلیا، گورمکھ سنگھ لہنا اور جو الا سنگھ بھدانا (لہریہ) کا چچا لکھیر سنگھ۔ یہ فوج یوسف زئی علاقہ کا معاملہ سربراہ کرنے میں مصروف ہوئی۔ مالگڑاری اور گھوڑوں کی تحصیل کے بعد شیر سنگھ ہزارہ سے گزر کر پھلی کے گاؤں۔ شنکیاری میں خیمہ زن ہوا۔ سید احمد اُس وقت شنکیاری سے ۲۰-۱۶ میل پر بھوگر ننگ میں تھے۔ سکھ سرداروں نے فیصلہ کیا کہ ان کی ذمہ داری سید احمد کو دربار کے علاقے میں فساد پھیلانے سے روکنا ہے۔ وہ اُس وقت بھوگر ننگ میں تھے جو سردار ہری سنگھ کی جاگیر تھا اور وہاں ان سے نیپٹیکا اور خود ان کو مظفر آباد چلا جانا چاہیے۔ سردار ماہن سنگھ نے اس تجویز سے اختلاف کیا اور بتایا کہ پہلے سید احمد سے نیپٹے بغیر مظفر آباد کی روانگی ایک غلطی ہوگی۔ مگر اُس کی اسے مسترد کر دی گئی چنانچہ شیر سنگھ مظفر آباد چلا گیا اور محصور قلعہ کو آزاد کر لیا۔ خوف گذر نہ گھوڑی والا شیر سنگھ سے ل گیا اور مظفر آباد کا تنہا حاکم بنا دیا گیا۔

سکھوں کی بدحواسی: اسی اثنا میں سید احمد بالاکوٹ پہنچے گئے اور مالگڑاری میں ایک اہم گاؤں تھا۔ مقامی لوگ آئے اور ان کے مرید بنے۔ وہاں سنگھ نے جو ایک چھوٹے سے دستے کے ساتھ پیچھے رہ گیا تھا شیر سنگھ کو لکھا کہ سید احمد کے لوگ مایانہ وصول کر رہے ہیں اور مقامی لوگ ان کے ساتھ ہیں۔ یہ وہ وہاں سنگھ اس دستے کی مدد کیے کرے؟ اس پر شیر سنگھ نے وہاں سنگھ کو حکم دیا کہ وہ اپنے

وزیر سنگھ رنگھری کلبیا، سادھو سنگھ کنہال اور رتن سنگھ کو ننگلو کے دستے بیکر گڑھی حبیب اللہ کی طرف پیچھے ہٹ جائے۔ ان سب کی مجموعی تعداد آٹھ سو کے قریب تھی۔ بالاکوٹ سے مغرب چند میل پر گڑھی پہنچ کر مہان سنگھ نے قلعہ فتح گڑھ کی مرمت شروع کر دی۔ مرمت جاری ہی تھی کہ ایک افواہ پہنچی کہ سید احمد کے لوگ دریا عبور کر کے اچانک حملہ کرنے والے ہیں۔ سکھ بدحواس ہو گئے۔ انھوں نے خندقیں کھودیں اور ان کو خاردار جھاڑیوں سے گھیر لیا اور توپیں چھوڑ چھوڑ کر نرسنگھ پھونک پھونک کر اور آگے پیچھے دوڑ دوڑ کر سوار غل مچا دیا۔

شیر سنگھ کی گڑھی حبیب اللہ کی جانب پیشقدمی: اسی وقت انھوں نے ایک تیز رو قاصد بھیج کر اپنی حالت زار کی خبر دی اور اسی رات کمک طلب کی شیر سنگھ نے فوراً اپنی فوجوں کو گڑھی حبیب اللہ کی طرف کوچ کرنے کا حکم دیا۔ دوسری صبح کو پریشان حال لوگوں نے جنھوں نے رات سخت اضطراب میں گزاری تھی کمک کی صفوں کو دیکھا تو جان میں جان آئی۔

آئندہ سولہ دنوں میں قلعہ کی پوری مرمت ہو چکی تھی۔ اس کے بعد سکھوں نے اپنا ڈیرا بالاکوٹ سے چھ میل پر دریا کے مشرقی کنارے پر منتقل کر دیا۔

دونوں فوجوں کے کماندار اپنی اپنی چھاؤنیوں سے جن کے درمیان ندی بہ رہی تھی ایک دوسرے کا بغور نظارہ کر رہے تھے۔ شیر شاہ وقتاً فوقتاً اپنے افسروں کے ساتھ گھوڑے پر بالاکوٹ کے مقابل جا کر دوربین سے دشمن کا ملاحظہ کرتا۔

سید احمد کی ایک جنگی چال: ایک روز سید احمد ایک چال چل گئے۔ انھوں نے اپنی جائے قیام کے سامنے کچھ غلے کے دانے بکھر دائے جن کے چننے کو چڑیوں کا ایک بڑا جھنڈا اُس جگہ جمع ہو گیا۔ ساتھ ہی انھوں نے سکھوں کی چھاؤنی کے پاس ندی کے پار پانسو سپاہی بھیج دئے کہ جنگلوں میں جا چھپیں۔ جب شیر سنگھ نے دشمن کے کیمپ کے روزانہ ملاحظہ کے دوران دوربین سے دوسری طرف چڑیوں کے ایک بڑے جھنڈ کو منڈلاتے دیکھا تو سمجھا کہ وہابی شاید اُس جگہ کو

چھوڑ کر کہیں اور منتقل ہو گئے۔ اُس نے ایک مگراں ٹولی کو دوسری طرف دیکھنے اور رپورٹ کرنے کو بھیج دیا۔ سید احمد نے جن سپاہیوں کو ادھر گھات لگانے کو بھیجا تھا انھوں نے اُس ٹولی کو گھیر لیا۔ اس میں سے صرف دو آدمی نری تیر کر پار ہوئے اور اپنی درگت سنائی۔

سکھ فوج کا مائی کوٹ پر قیام: شیر سنگھ نے پھر مشورہ کیا کہ سید احمد پر کس طرح حملہ کیا جائے۔ طے پایا کہ فوج کا ایک حصہ تو اپنی جگہ پر رہے اور ایک ہزار توپچیوں کا محفوظ دستہ قلعہ اُرمی کے تھانیدار ٹیک سنگھ کے ساتھ کیمپ کی حفاظت کرے۔ بقیہ فوج نے ایک محفوظ مقام پر ندی پار کی اور باسپان سے گذر کر مائی کوٹ کی پہاڑی پر جم گئی۔

ہزارہ اور شنکیاری کے محفوظ دستے بھی ایک اور دستے سے ٹمری ہو کر پہاڑی کی چوٹی پر پہنچ گئے۔ دہلیوں کی وہ چھوٹی سی ٹولی جو چوٹی کو جانے والے پوشیدہ راستے کی حفاظت کے لئے تعینات تھی مغلوب کر لی گئی اور اس میں سے تین چار شہید ہو گئے، باقی بھاگ نکلے۔ سید احمد نے ایک امدادی ٹولی بھیجی جو اتنی دیر سے پہنچی کہ اس چھوٹی سی حفاظتی ٹولی کی کوئی مدد نہ کر سکی، وہ لوٹ آئی۔ سکھوں نے پہاڑی کی چھوٹی پرورات گزاری۔

چوٹی پر پہنچ کر سکھوں کو ایک سخت پریشانی کا سامنا ہوا۔ کہیں پانی دستیاب نہ تھا۔ مگر ان کی خوش قسمتی سے بادل کڑ کا اور ان کے کیمپ پر اولے برسے۔ دوسری صبح کو حملہ شروع ہوا۔ پہلے فیصلہ ہوا کہ ایک چھوٹے سے دستے سے چوٹی کی حفاظت کی جائے چنانچہ ہزارہ کی فوج کے ساتھ تھانیدار سنگھ اور جوالا سنگھ بھدانا کے چچا لکھمیر سنگھ دہلیوں پر حملہ کرنے کے لئے بھیجے گئے، بقیہ فوج چوٹی پر رہے اور حالات کے مطابق کمک بھیجتی رہے۔ جب حملہ آور ٹولی نیچے اُتری تو قیام سنگھ اتری والا نے کہا کہ فتح کی (اگر حاصل ہوئی) رپورٹ کرتے ہوئے یہ اچھا نہیں معلوم ہو گا کہ صرف یہی دو ہزار لڑے تھے، نہ شکست کی

رپورٹ میں یہ اچھا معلوم ہوگا۔ علاوہ بریں اگر انھوں نے شکست کھائی تو بچے ہوئے آدمیوں کا دشمنوں کے مقبوضہ علاقے سے ہو کر لاہور تک پہنچنا ناممکن ہے اس لئے ان کا ایک ساتھ حملہ کرنا ہی بہتر ہوگا۔

آغاز جنگ: مالی کوٹ پہاڑی کے دامن میں کچھ نشیبی زمین تھی، اس کے بعد ایک بلندی پر بالا کوٹ کا گاؤں واقع تھا جس میں سید احمد اور ان کے رفقاء تیرکان اور زنبورک لئے تیار بیٹھے تھے۔ فریقین کے درمیان توپ اندازی کا تبادلہ شروع ہوا۔ سکھ کشمیر سے ایک توپ اٹھالائے تھے۔ انھوں نے اسے نصب کر کے گولے برسائے شروع کر دیئے۔ صبح سے دوپہر تک گولوں کا تبادلہ تیزی سے جاری رہا۔ مہان سنگھ اور جوالا سنگھ دونوں سرداروں کے علمبردار وہابیوں کے گولوں سے مقتول ہوئے۔ اور جھنڈے گرنے لگے۔ دوسرے سکھ ان کو اٹھانے کو چھپے۔ ان جھنڈوں کو گرتا دیکھ کر بالا کوٹ میں جتنے وہابی تھے۔ باہر نکل آئے۔ سید احمد اور خود مولوی اسماعیل نے حملے کی رہنمائی کی اور اس نشیبی زمین کی طرف چھپے جو فریقین کے درمیان واقع تھی۔ اور چلائے کہ دشمن لپٹا ہو رہا ہے اور تم کو حملہ کر دینا چاہئے۔ اور وہابی بھی اس پہاڑی کی طرف بڑھے جہاں سردار اتر سنگھ کلیان والا اور گورکھ سنگھ لہنا کی سپاہ ایک طرف جمی ہوئی تھی۔ مہان سنگھ اور کنور شیر سنگھ کی سپاہ بھی وہاں آ پہنچی اور جنگ میں شریک ہو گئی۔

سکھوں کی پسپائی: سکھوں نے پہلے بیچھے ہٹنا شروع کیا۔ شیر سنگھ نے اپنی تلواریں کھینچ لی اور چاہتا تھا کہ خود میدان جنگ میں گھس پڑے لیکن مہان سنگھ اور دوسروں نے اسے تنہا جانے کو منع کیا۔ لیکن اس نے ان کا کہنا نہ مانا اور سکھوں کو آگے بڑھانا شروع کیا۔ اس نے بھاگتے ہوئے سکھوں کو گالیاں دیں ان پر پتھر پھینکے اور پھر میدان جنگ میں ڈھکیں دیا۔

مجاہدین کی شہادت: اس نے شام سنگھ اور پرتاب سنگھ کے پاس قاصد بھیج کر توہین چلانے کا حکم دیا اور دوسرا قاصد اسی پیغام کے ساتھ اتر سنگھ کے پاس

بھیجا۔ انہوں نے گولہ باری شروع کر دی۔ اُس نشیبی زمین میں خلیفہ سید احمدؒ کے ساتھ
۱۸۷۷ء وہابی گر گئے۔ چار سو ہندوستانی بھی جو سید احمدؒ پر جان چھڑکتے تھے گر گئے۔
سید احمدؒ کی نعش میں دہشتہ ہاتھ اور سینہ پر بائیں پستان کے نیچے گولی کے نشان تھے۔
بقیہ وہابیوں نے جن کی تعداد کوئی اسی ہوگی تین ہزار اپنے سردار کی نعش اٹھالانے
کی کوشش کی مگر سخت گولہ باری کے سبب سے ناکام رہے۔ آخر ایک وہابی
ان کا سر کاٹ کر اٹھا لے گیا۔ (یہ بالکل ناقابل قیاس ہے۔ مسلمان لاش کے منخ
اور قطع دبرید کو گناہ سمجھتے ہیں۔ سید احمدؒ کا کوئی متبع اپنے عزیز پنجاب سردار کی
نعش کے ساتھ یہ سلوک روانہ رکھ سکتا تھا، اُس شخص کے گولی لگی اور سر کو
لیکر آگے بڑھنا ناممکن دیکھ کر اس نے اس کے ہونے سر کو سرسوں کے انبار
میں چھپا دیا۔

سکھ گاؤں میں داخل ہوئے اور سید احمدؒ اور دوسرے لوگوں کے گھروں
کو آگ لگا دی۔ آٹھ زبورک، ایک ہاتھی، دس گھوڑے اور دس نجر کپڑے لے گئے۔
سید احمدؒ کی لاش کی شناخت، شیر سنگھ نے میدان جنگ کے معاینے میں سید احمدؒ
کی نعش دیکھی اور اسے کسی معزز کی نعش سمجھ کر اپنے کیمپ میں لے گیا اور اپنے
اکرمیوں سے اس کی شناخت کا انتظام کرنے کو کہا۔ نواب خاں تناولی کو جو دو تین
برس سید احمدؒ کے ساتھ رہ چکے تھے شیر سنگھ کے سامنے پیش کیا گیا۔ انہوں نے کہا
کہ سر کے بغیر شناخت دشوار ہے لیکن بتایا کہ سید احمدؒ کے جسم پر کچھ امتیازی
نشانات تھے۔ اُن کے پاؤں کے سب ناخن ناقص تھے۔ چنانچہ کفن ہٹانے پر
سب ناخن واقعی ناقص پائے گئے۔ پھر بھی کچھ شبہہ باقی رہ گیا تھا۔ اس اثنا
میں عالم خاں تناولی ایک ملازم نے آگے بڑھ کر کہا کہ ”میں سید احمدؒ کے سر کا پتہ
بتا سکتا ہوں اگر بچھیس روپے کا انعام عنایت ہو۔“ شیر سنگھ نے جھٹ اُسے بچھیس
روپے دے دئے اور ۲۵ سوار اور ۲۵ پیادے اس کے ہمراہ تعینات کر دئے۔ اس
نے چھپایا ہوا سر بتا دیا۔ جب سوار سید احمدؒ کا سر لے کر واپس جا رہے تھے کھپاہی

اُسے غلطی سے دہائی سوار سمجھ کر مسلح ہونے لگے۔ بعد میں جب ان کی شناخت ہو گئی تو سب نے چین کی سانس لی۔ سردھڑ کے پاس رکھ دیا گیا، نواب خان تالی کو پھر بلایا گیا اور انہوں نے ٹھیک ٹھیک شناخت کر لی نعلش چند مسلمانوں کے حوالہ کر دی گئی جو سکھ فوج کے نوکروں میں سے تھے۔ وہ تمام رات قرآن شریف پڑھتے رہے اور دوسرے دن نعلش کو شیر سنگھ کی اجازت سے کنہار ندی کے کنارے ایک قبر میں دفن کر دیا۔ دوسرے دن شیر سنگھ رخصت ہو گیا اور دوسرا مہان سنگھ اور لکھیر سنگھ کو حکم ہوا کہ اپنی زیر نگرانی سارا سامان گروہی حبیب اللہ کو منتقل کر دیا اور تمام فوج ندی عبور کرے تو یہ بھی اسی کے پیچھے چلے جائیں۔ شیر سنگھ کی عدم موجودگی میں ان دونوں سرداروں نے آپس میں یہ سازش کی کہ سید احمدؒ نے اپنی زندگی بھر ان کو بہت تکلیفیں دیں، اب اگر ان کی میت تو قبر میں رہنے دیا جائے تو مسلمان اسے ایک مرکز پر ستش بنالیں گے، اس لئے بہتر یہ ہو گا کہ اسے قبر سے نکال کر ندی میں پھینک دیا جائے۔ سات آٹھ نہنگ لے بھی پاس ہی کھڑے تھے۔ دونوں سرداروں نے ان کو پچیس روپے دئے اور کہا کہ اگر تم خلیفہ (سید احمدؒ) کی نعلش کو قبر سے نکال کر ندی میں پھینک دو تو یہ بڑے بڑے پن (صواب) کی بات ہوگی۔ انہوں نے فوراً تعمیل کی اور نعلش کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے ندی میں پھینک دی اس کے بعد دونوں سردار نو شہرہ کی طرف کوچ کر گئے۔ اس کے بعد شیر سنگھ کے ساتھ لاہور میں داخل ہوئے۔

خلیفہ سید احمدؒ اور کنور شیر سنگھ کے درمیان جنگ ۲۷ ربیعہ ۱۸۸۶ء میں موت مطابق ۷ مئی ۱۸۳۱ء کو ہوئی

[تمام شد بیان تواریخ ہزارہ]

۱۸۸۶ء اس کتاب میں سید احمد کو خلیفہ ہی سے لقب کیا گیا ہے۔ (مترجم)
 شد در حقیقت مسودہ میں ۱۸۳۴ء درج ہے۔ بے شبہہ یہ کتاب کا سہو ہے۔ کیونکہ دیکھ سببت سال ۱۸۸۶ء جو ساتھ ہی درج ہے ۱۸۳۰ء سے ۱۸۳۱ء سے مطابقت رکھتا ہے نہ کہ ۱۸۳۶ء

ویڈ کی روایت :-

ویڈ نے دیسوا چھاوٹی سے ۱۷ مئی ۱۸۳۱ء کو ایک مراسلہ میں وقائع نویس کی رپورٹ مورخہ ۱۰ مئی کا یہ اقتباس نقل کیا ہے۔

”کنور شیر سنگھ اور بھیمن سنگھ (؟ مہان سنگھ) گورنر کشمیر کے مراسلات اس مضمون کے پہنچے ہیں کہ سید احمد کے دو بھائی دھوار گزار پہاڑیوں میں ہونے کی اطلاع ملنے پر ان لوگوں نے اپنے پڑاؤ سے چل کر ان پر حملہ کر دیا۔ ریاست کی فوجیں ان پہاڑیوں کے استحکامات اور دروں سے ناواقف تھیں اس لئے ان کو شکست ہو گئی اور تین سو آدمی ہلاک اور اتنے ہی زخمی ہوئے۔ اس لئے آدریش کو جاری رکھنا ناممکن دیکھ کر وہ سات آٹھ کوس پیچھے ہٹ گئیں اور چھاوٹی قائم کی۔ انہوں نے یہ بھی لکھا ہے کہ ان کا ارادہ فوراً حملہ کرنے کا تھا مگر ان کی چھاوٹیوں میں غلہ بہت گراں ہو گیا تھا۔ ایک روپے میں ۵ میر کچے۔ یہ خبر سن کر مہاراجہ نے اپنے نجومیوں سے کہا کہ وہ دو سو دن کو بلا بھیجا اور حالات بتا کر ان سے احکام نجوم سے یہ معلوم کرنے کی خواہش ظاہر کی ایا کنور شیر سنگھ اپنے مجوزہ حملہ میں کامیاب ہو گا۔ انہوں نے جواب دیا کہ ہم حساب لگا کر عرض کر دینگے“

ویڈ نے مزید لکھا کہ متذکرہ اطلاع بھجنے کے بعد دربار میں خطوط موصول ہوئے جن میں مذہبی دیوانوں کی کامل شکست کا اعلان کیا گیا تھا۔ ”سید احمد نے ایک مستحکم مقام بالا کوٹ میں چھاوٹی ڈالی تھی۔ شیر سنگھ وہاں جا کر حملہ آور ہوا۔ سید احمد نے اپنی جگہ چھوڑ کر حملہ کا مقابلہ کیا اور مغلوب ہو گئے۔ سید احمد کی نعش کی تختہ کی گئی اور سکھوں نے اس کو جلا دیا“

وقائع نویس کی رپورٹ : بعد میں موکریان چھاوٹی سے ایک خط مورخہ ۱۸ مئی ۱۸۳۱ء میں وقائع نویس کی ایک اور رپورٹ مورخہ ۱۴ مئی ۱۸۳۱ء یوں نقل کی کنور شیر سنگھ کا ایک مراسلہ موصول ہوا کہ سید احمد نے دو تین ہزار آدمی کے ساتھ جن میں زیادہ تر گاؤں کے کسان تھے مالا کوٹ (؟ بالا کوٹ) میں نالے کے پار پڑاؤ کیا۔ وہ اکتوبر ۸ تاریخ

کو دوپہر کے وقت گاؤں کے بعض زمینداروں کی مدد سے پرتاپ سنگھ اٹاری والا، رتن سنگھ گھر جاکر اور دوسرے مہاروں کی فوجیں لیکر جن میں پانچ ہزار آدمی تھے اور ایک پایاب نالہ پار کر کے دشمن کو اچانک آلیا، اور اس کو ہر طرف سے گھیر کر کاٹھیوں سے تلواریں کھینچ لیں اور سید کو اس کے پانسو آدمیوں سمیت قتل کر دیا اور اس کے خیموں، سامان، ہاتھی، متعدد پرزوں اور آلات، اور تلواروں پر قبضہ کر لیا۔ اس کی فوج کے باقی لوگوں نے بھاگ کر جانیں بچائیں۔“

تواریخ ہزارہ کی روایت جس کی طرف کوئی اعتنا نہیں کی گئی ہے۔ دوسرے نقطہ نظر سے اہمیت رکھتی ہے۔ یہ منظورہ اور وقائع اور بعد کی دوسری شائع شدہ کتابوں کے بعض مبہم مقامات کی توضیح کرتی ہے۔

یہ پیگٹ اور میسن کے بیان کی توثیق کرتی ہے کہ سکھوں نے دہلیوں کے پہلے حملے کے دوران کیا کیا پسائیاں اور آفتیں جھیلیں۔

یہ سید احمدؒ کے محفوظ مقام سے نکل کر نشیبی زمیں میں ماٹی کوٹ کے دامن کے نزدیک سکھوں سے ٹکر لینے کے اچانک اور عجیب فیصلے کی توضیح بھی کرتی ہے۔ غالباً یہ سکھوں کے دو گرتے ہوئے جھنڈوں کا منظر تھا جس نے دہلیوں کو یہ سمجھ کر کہ سکھ بسا ہوا چاہتے ہیں شدت سے حملہ آور ہونے کی ہمت دلائی۔

مہر نے خیال ظاہر کیا ہے کہ پہلے منصوبے کا ایک بیک ترک کر دینا حیرت انگیز تھا، اور سید احمدؒ کے بعض رفقاء کا خیال تھا کہ دہلیوں کی شکست کا سبب یہی ہوا۔ لیکن مہر نے ان کے اس خیال سے اختلاف کیا ہے اور یہ رائے قائم

کی ہے کہ منصوبہ غالباً اس لئے ترک کیا گیا کہ سکھ جنوب سے بھی چڑھائی کرنے لگے اور دیا پار سے بالا کوٹ پر گولہ باری شروع کر دی تھی۔ تواریخ ہزارہ میں ان دونوں واقعات کا ذکر نہیں کیا گیا ہے، اگرچہ وہ ہر جہت سے جنگ کی تفصیلات

سے بہت معمور ہے۔ مہر خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کا تذکرہ مفروضہ واقعات پر

مبنی تو نہیں مگر صورت حال کی تشریح کے لئے بہت زیادہ قرین قیاس ہے۔ مگر

تاریخ ہزارہ میں دوسرا سبب بیان کیا گیا ہے جو زیادہ قرین قیاس ہے۔
منظورہ اور وقائع سے ظاہر ہے کہ دونوں فوجیں دریا کے پار کچھ دیر تک ایک
دوسرے سے مقابل رہیں۔ مگر یہ ماخذ ٹھیک وقت نہیں بتاتے۔ منظورہ سے زیادہ مد
ملتی ہے۔ یہ بتاتا ہے کہ شیر سنگھ کے آنے کے بعد گڑھی کی مرمت پر سولہ دن ہونے
اور اس کے فوراً بعد جنگ چھڑی۔

یہ مسودہ ان کی معین تعداد بھی بتاتا ہے جو سید احمد کے آخری چند گھنٹوں میں ان
کے دوش بدوش لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔

وقائع نویس کی رپورٹ میں سکھوں کی سپاہیوں کا جس میں تین سو سپاہی ہلاک
ہوئے جو ذکر ہے، وہ واقع ہوئی ہوگی مہان سنگھ کی سپاہ سے جھڑپ کے دوران
میں جب گڑھی کی مرمت ہو رہی تھی۔

جنگ کی تاریخ کے بارے میں تینوں ماخذ تین مختلف تاریخیں بتاتے ہیں، گون
میں بہت زیادہ فرق زمانی نہیں۔ مہر کی بیان کے مطابق ۶ مئی، تواریخ ہزارہ کے
مطابق ۷ مئی اور وقائع نویس کی رپورٹ کے مطابق ۸ مئی احتمالاً ذکر کی تاریخ تحریر
۱۸۴۱ء ہے اور زمانہ وقوعہ سے قریب ترین ہونے کے سبب سے سب
سے زیادہ اقرب الی الصواب۔

دب سید احمد کی سرحدی جنگوں کے سیاسی نتائج

سکھوں کی تاریخ پر عام تالیفوں میں سید احمد اور سکھوں کے درمیان جنگوں کے واقعات کی طرف یا تو زیادہ اعتنا نہیں کی گئی یا بالکل ترک کر دئے گئے۔ اس کا سبب ایک تو اس موضوع پر انگریزی میں مواد کی نادرستیابی ہے۔ پھر بھی جو منتشر حوالے ملتے ہیں ان سے معلوم ہوتا ہے کہ سید احمد کی کاروائیوں اور مساعی پر سکھ دربار نے جو دھمکی دی تھی وہ بالکل بے معنی نہ تھی۔ اگرچہ سید احمد براہ راست سیاسیات سے کوئی تعلق نہ رکھتے تھے، ان کی جنگوں کا ایک اہم سیاسی نتیجہ ضرور ظاہر ہوا۔

رنجیت سنگھ کی سندھ سے دلچسپی: ۱۸۰۹ء کے معاہدہ کے وقت سے ہی رنجیت سنگھ کی نظریں سندھ اور خاص کر کے شکار پور پر گڑھی ہوئی تھیں۔ حکومت برطانیہ اول اول اس سلسلے میں سکھوں کے عزائم اور حرکات کو دوسرے دیکھتی رہی، اس معاملہ میں اس کی اپنی کوئی خاص پالیسی تھی، پی۔ این کھیرا نے اپنی مختصر مگر عمدہ تالیف میں صورت حال کو جامعیت سے یوں بیان کیا ہے :-

”۱۸۲۰ء سے ۱۸۳۰ء تک کا ایک عشرہ (۱۸۲۹ء میں ایک معمولی استثناء کے ساتھ)

عدم مداخلت اور بنگالی و چشم گماری میں امتیاز رکھتا ہے (یعنی ملک ملک دیم دم نہ کشیدم کی پالیسی)۔ ۱۸۲۵ء سے جب کہ رنجیت سنگھ کی فوج خوب منظم تھی لارڈ

ولیم بینٹنک کے اوائل عہد تک جب کہ حکومت برطانیہ نے اپنی عدم مداخلت کی پالیسی

بدل کر پرامن تجارتی منصوبے کی خاطر سندھ میں دلچسپی لینا شروع کی، اس وقت رنجیت

سندھ پر حملہ کر سکتا تھا اور شاید اس ملک کا ایک حصہ لے بھی لیا ہوتا، اور برطانیہ

کی مداخلت درکنار کوئی اعتراض بھی نہ ہوتا۔

لہ پی اپنی کھیرا BRITISH POLICY TOWARDS SIND UP TO

ANNEXATION, 1843

لاہور ۱۹۳۱ء صفحہ ۸

یہ واقعہ ہے کہ برطانیہ کو اس وقت تک سندھ سے کوئی دلچسپی نہ تھی۔ رنجیت سنگھ نے یہ محسوس کر کے اپنی مجوزہ فوج کشی کے لئے اس بہانے سے تیاریاں بھی شروع کر دیں کہ وہ خراج وصول کرنا ہے جو امیروں نے حکومت افغان کو ادا کیا، حالانکہ رنجیت سنگھ اس حکومت کی وراثت کا مدعی تھا۔ مگر صوبہ شمالی و مغربی میں ایک نئے خطرے کے رونما ہوجانے سے اس کا منصوبہ دھرا کا دھرا رہ گیا۔ سکھوں کے ایک زبردست دشمن سید احمد نے مسلح مخالفت شروع کر دی اور کئی سال تک اس سکھ راہب کی تمام تر توجہ اپنی طرف جذب رکھی۔ اس طرح اگرچہ سید کنور شیر سنگھ نے ۱۸۳۱ء میں شکست دی اور قتل کیا مگر سندھ کو کفار کے پنجے سے بچانے والے بالواسطہ وہی تھے ۱۸۳۱ء تک جب کہ رنجیت سنگھ نے اس خطرے سے نجات پائی تو اس نے دیکھا کہ سندھ کے متعلق انگریزوں کی نیت بدل گئی ہے۔

سید احمد کی شہادت پر رنجیت سنگھ کا اظہار مسرت: سید احمد کی شکست اور شہادت سے رنجیت سنگھ کو بڑا اطمینان ہوا۔ ویڈ نے اپنے متذکرہ مکتوب میں لکھا ہے: رنجیت سنگھ اپنی اس فتح پر بھولانا سماتا تھا جس نے اس کی حکومت کو دائمی خلفشار اور بے چینی سے نجات دلائی۔ اس نے اس واقعہ کی یاد میں توپوں سے سلامی دینے اور شہر امرتسر میں چراغاں کرنے کا حکم دیا۔ جو قاصد یہ خوشخبری لایا تھا اسے ایک جوڑا سونے کے کنگن قیمتی تین سو روپیہ، ایک بگڑی اور شال کا جوڑا عنایت ہوا، کنور کو ایک خط میں اس کے خط کی رسید، اس کے اہلی کارناموں کا اعتراف اور اس کے واپس آنے کے بعد مزید جاگیر کا وعدہ تحریر کیا۔ گووند اگڑھ کے گوند نر فقیر امام الدین کو بھی ساتھ ہی حکم دیا گیا کہ قلعہ کی ہر توپ سے گیارہ گیارہ گولوں کی سلامی داغی جائے۔

حکومت ہند نے بھی اپنے پولیٹیکل اسٹنڈٹ کو حکم دیا کہ گوند نر جنرل کی طرف

سے مہاراجہ رنجیت سنگھ کو اس فتنے کی آگ کے ٹھنڈی ہو جانے پر جو اس شخص (سید احمدؒ) نے برانگیختہ کر رکھی تھی مبارکباد پیش کر دے۔

نظریہ غیبیوت سید احمدؒ: سید احمدؒ کی زندگی کے آخری لمحوں سے متعلق واقعات راز میں ملفوف رہے۔ اس لئے ان کے واقعی خاتمہ کے متعلق ایک نزاع چل پڑی جو کچھ مدت تک جاری رہی۔ سب سے آخر میں ان کو ایک گھمسان دست بدست معرکہ میں لڑتے دیکھا گیا۔ اس کے بعد وہ غائب ہو گئے۔ کسی نے ان کو گیتے ہوئے اپنی آنکھوں سے نہیں دیکھا۔ اس لئے وہابیوں کے ایک طبقے میں یہ خیال چکر لگاتا رہا کہ سید احمدؒ شہید نہیں غائب ہو گئے ہیں اور آئندہ کسی وقت پھر ظاہر ہوں گے۔ منظر اور عقل کی روشنی میں سید احمدؒ قطعاً اسی جنگ میں شہید ہو گئے۔ مگر بالاکوٹ کے باقی ماندہ لوگوں اور ان کے بہت سے رفقا و متبعین کے لئے یہ ناگہانی شدید ضرب ناقابل برداشت تھی۔

انہوں نے ایک مقصدِ عالی کے حصول کے لئے اپنی تمام مادی املاک قربان کر دی تھی اور سید احمدؒ کے ساتھ ساتھ ناقابل قیاس و کھ جھیلے تھے۔ لیکن اب قسمت کی ہوشربا ناگہانی سرگشتگی سے سب مٹ رہا تھا۔ غیبیوت کے نظریے کا پس منظر یہی ہے۔ دراصل یہ ایک ہیجانی رد عمل تھا ان کے مادی حرکات و سکنات کے منظر سے ان کے محبوب سردار و رہنما کے یک بیک اٹھ جانے اور مرجانے پر یقین کرنا ان کے لئے دشوار تھا۔ یہ نظریہ ان کے اس راسخ عقیدے کا ایک مقدس سایہ بھی تھا کہ سید احمدؒ جسمانی طور پر فنا ہو گئے ہوں تو ہو گئے ہوں مگر ان کا مشن فنا نہیں ہو سکتا۔

ہٹلر اور سبھاش چندر بوس کی موتیں ہمارے عصر کے واقعات ہیں۔ ان کی موتیں بھی پردہ راز میں مخفی تھیں۔ اول الذکر کی موت کے متعلق حکومت ہند کی مسلسل تحقیقات کے باوجود ان دونوں لیڈروں کے ہموطنوں کے ایک

طبقے میں ان کی زندگی کا عقیدہ اب تک موجود ہے۔ اگر محض سیاسی لیڈروں کے لئے ایسی محکم و فاداری دجاں نثاری ہو سکتی ہے تو ایسے شخص کے لئے جو صرف سیاسی لیڈر نہیں بلکہ حسنا و خیرات کا کامل نمونہ تھا اس کے متبعین میں جو گرم جوشی اور سرشاری محبت و عقیدت پیدا ہوئی ہوگی، قیاس کی جاسکتی ہے۔

عقیدہ ظہور ثانی: صادق پور کے ارکان خاندان خصوصاً ولایت علی پراگمیرا اور ہندوستانی مصنفوں نے سید احمد کے ظہور ثانی عقیدہ کی اشاعت پر بہت نکتہ چینی کی ہے۔ ان پر اس عقیدے کی اشاعت میں دانستہ بے ایمانی کا الزام عائد کیا گیا ہے کہ ولایت علی نے اس مقصد سے یہ قلم اٹھایا ہے کہ تحریک کی ڈوبی ہوئی ناؤ کو پھرا بھارا جاسکے اور اس جدوجہد میں اپنی سرداری بحال رکھی جائے۔ جیسا کہ اوپر بیان ہوا یہ عقیدہ ایک وقتی، سبجانی و عمل تھا۔ اس پر سختی نظر کرنے کی ضرورت نہیں۔ اس تحریک کی خدمات جو ولایت علی اور ان کے بھائی عنایت علی نے انجام دیں وہ اتنی سٹوس تھیں کہ اتنے سے موہوم فائدہ کے کمزور سہارے کی محتاج نہ تھیں۔

امتداد زمانہ کے ساتھ جو تمام زخموں کو مندرل کر دیتا ہے اس عقیدے پر ایتقان کی شدت ہلکی ہوتی گئی۔ ایک دستاویز تسمو رخہ ۱۸۲۵ء میں خاص طور پر مذکور ہے کہ ۱۸۳۹ء کے قریب جب عنایت علی نے اول اول اس تحریک کی قیادت سنبھالی تو اس عقیدے کی بنیادی اہمیت باقی نہ رہی تھی۔ اگر لوگوں کا میلان ہوتا تو یہ عقیدہ رکھ سکتے ورنہ نہ تو اس پر کوئی جبر تھا نہ اس عقیدے کے منکروں پر کوئی الزام عائد کیا جاتا۔ خود سوانح احمدی کے مؤلف (جعفر تھاکر) کی جو شروع میں یہ عقیدہ رکھتے تھے، امتداد زمانہ کے ساتھ اس سے دست بردار ہو گئے۔

۱۔ رسالہ دعوت ولایت علی مشمولہ رسائل تسعہ

۲۔ اور انڈین مسلمان "مؤلف ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر صفحہ ۲۴-۲۵

۳۔ پینہ یونیورسٹی لبریری کا مخطوط مکتوبات سید احمد ص ۲۲۰ سوانح ۱۷۹-۱۸۰

سید احمدؒ معرکہ بالاکوٹ میں شہید ہو گئے اور ان کے چیدہ رُفقا بھی۔ بالیسوں اور انتشار و پراگندگی کی ایک مختصر مدت کے بعد شیخ محمدولی پھولتی سردار منتخب ہوئے اور تمام حاضرین سے بیعتیں لیں۔ وہابیوں کا ایک اور گروہ جو جنگ بالاکوٹ کے موقع پر مظفرآباد میں تعینات تھا وہ بھی واپسی آگیا اور شیخ محمد پھولتی کے گروہ میں شامل ہو گیا۔

آئندہ چند برسوں میں وہابی جگہ جگہ مارے پھرے اور اپنے ذرائع کو دوبارہ درست اور منظم کرنے کے لئے مختلف سرداروں سے مدد طلب کی، مگر قبائلی سردار زیادہ تر فانی اور مقامی مصالح کے تابع تھے۔ وہ تو اپنے اپنے علاقوں اور حدود اثر کی توسیع کے لئے وہابیوں کی خدمات کے خواہان رہتے تھے، کیونکہ وہ مسلح، تربیت یافتہ اور جنگ آزمودہ لوگ تھے۔

وہابیوں کو پائندہ خاں کی پیشکش بالاکوٹ کے بعد وہابیوں کا پہلا پٹاؤ ایک مقام نندھیار میں ہوا جہاں وہ کوئی دس مہینے رہے۔ اس کے سردار کو بڈگان اور نامدگار پاکر وہ پنج تار منتقل ہو گئے جو سید احمد کی زندگی تک ان کی قومی کارروائیوں کا مرکز رہ چکا تھا۔ مگر وہاں بھی وہی دشواریاں پیش آئیں۔ تو آمب کے سردار پائندہ خاں کی امداد اور جہاں نوازی کی پیشکش پر وہ آمب کو منتقل ہو گئے۔ اس سے پہلے ۱۸۳۱ء میں پائندہ خاں سید احمد سے شکست کھا چکا تھا، لیکن اب اس نے مصالحانہ رویہ ظاہر کیا اور وہابیوں کو اپنی قلمرو میں اقامت کے لئے مدعو کیا اور اگر بڈگان کے سردار کے ہمراہ علاقے میں جستی کا قلعہ اور ملحقہ زمینیں دیں۔ بظاہر یہ اعانت کے علامات تھے لیکن دراصل وہ ایک پتھر سے دو چڑیوں کا شکار کرنا چاہتا تھا۔ اس میں اور اگر وہ کے سردار میں پرانی عداوت چلی آتی تھی۔ اس کی بہن اگر وہ کے سردار سے منسوب تھی۔ مگر دونوں کے درمیان کچھ تنازع کے سبب سے شادی ملوکی ہوتی چلی آتی تھی۔ جب وہ سید احمد کے ہاتھوں شکست کھا کر نکل بھاگا تو اس کا خاندان پیچھے رہ گیا اور سید احمد کے قبضے میں آ گیا اب سے انہوں نے کشادہ

ولی سے اگر وہ کے سردار کے حوالہ کر دیا کہ اسے پابندہ خاں کے پاس پہنچا دے۔ سردار اگر وہ نے خاندان کو پابندہ خاں کے پاس بھیج تو دیا مگر اس کی بہن کو جو اس سے منسوب تھی اپنے پاس روک رکھا۔ اس حرکت پر پابندہ خاں نے اسے کبھی معاف نہ کیا اور اُس سے اپنی مخفی عداوت برقرار رکھی۔ اب وہاں کو اس سردار کی قلمرو سے متصل ایک قطعہ زمین دیکر اسے توقع تھی کہ ان کے درمیان نزاع پیدا ہو جائیگا۔ اور وہابی اس کی سرکوبی کر دینگے، اور اس کشمکش میں خود بھی کمزور ہو جائیں گے۔ وہ اپنے اس منصوبے میں قریب قریب کامیاب ہو چکا تھا۔

وہابیوں کا ستھانہ میں قیام وہابیوں نے اس کے منصوبے کو بھانپ کر اس کی دعوت رد کر دی اور اپنے پرانے دوست اور محسن ستھانہ کے سید اکبر شاہ کی طرف چلے گئے۔ (۱۸۳۸ء) اس عرصے میں انہوں نے دہشت زدہ اور غیر منظم گروہ کو از سر نو منظم کر کے لے مستانے اور ہم پنے

کا وقفہ مل گیا۔ شیخ محمد بھولتی نے پورے گروہ کو دو گروہوں میں تقسیم کر دیا جن کو دو علیحدہ علیحدہ کام سونپ دیے گئے۔ جب وہابی ستھانہ میں جم گئے تو شیخ بھولتی بنیر میں تخت بند چلے گئے اور سید احمد کے افراد خاندان کو ستھانہ لے آئے۔ یہ افراد سندھ میں باقی افراد خاندان سے جو وہاں مقیم تھے جا ملنا چاہتے تھے۔ شیخ محمد کی ساری کوششیں اُس کام کی طرف مرکوز تھیں جو انہوں نے ۱۸۳۶-۳۷ء میں انجام کو پہنچایا۔ اس لئے انہوں نے آئندہ ہونے والی جنگ میں کوئی نمایاں حصہ نہیں لیا اور یہ کام دوسری جماعت نے نصیر الدین مغلپوری شاہ جہاں پور یوپی کے زیر قیادت انجام دیا۔

وہابیوں اور فتح خاں کی لڑائی وہابیوں کو ستھانہ میں ایک عارضی پناہ گاہ مل جانے کے بعد بھی چین نہ ملا۔ کئی قبائل وہابیوں کی شکست اور تباہی کے منصوبے بنایا کرتے تھے وہ ان کی خفیہ سازشوں اور مخاصمانہ منصوبوں کا شکار رہے۔ مغرب میں فتح خاں کا علاقہ تھا۔ وادیوں کے قبائلی شاہ میں وہابیوں کے

خلاف غداری کے وقت سے ان کے دشمن ہو گئے تھے۔ دہابیوں کے زبردست دشمن سکھ بھی وہیں تھے۔ پھر بھی یہ تین سال نصیر الدین کی قیادت میں خاموش اور منظم ترقی کا زمانہ تھا۔ ہندوستان سے مالی اعانت اور زرگوڑوں کی آمد کا سلسلہ باقاعدہ جاری رہا۔

ہندوستان سے کارروائیوں کو فتح خاں کی سرزمین سے گذرنا پڑتا تھا۔ وہ دہابیوں کا مخالف تھا مگر ان کو نکال نہ سکتا تھا۔ اس لئے ان کو دوق کرنے بلکہ ہندوستان سے آنے والے کارروائیوں کو لوٹ لینے کا طریقہ بھی اختیار کر لیا۔ یہ دہابیوں کے ایک نہایت زخمی عضو پر چوٹ کرنا تھا اس لئے کہ یہی کاروان ہندوستان سے قیمتی امدادی سامان لاتے تھے جن کے بغیر دہلی باری نہ رکھی جاسکتی تھی۔ اس لئے دہابیوں نے اس مداخلت کی جڑ کو مستقلاً کھود پھینکنے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے ایک گاؤں مناراہر جہاں ایک ہندوستانی قافلہ کی راہ روک کر روٹا گیا تھا حملہ کر دیا۔ اس طرح ایک اور سرکش گاؤں ٹوپی پر بھی حملہ کیا۔ مگر حملہ آور گروہ کو فتح خاں کے آدمیوں نے گاؤں کے اندر ہر طرف سے گھیر لیا اور دہابیوں کی مراجعت کی راہ بند کر کے اپنی کثیر تعداد فوج سے دہابیوں کو گھیر لیا اور شکست دے دیا۔ قائد نصیر الدین شہید ہو گئے۔ اس طرح زمانہ مابعد بالاکوٹ کا ایک دور ختم ہو گیا۔ دوسرا دور ایک دوسرے نصیر الدین دہلوی لہ کے زیر قیادت شروع ہوا۔ ان کے پہنچنے سے پہلے ^{درمیان} وقفے میں موضع سورجگڑھ ضلع مونگیر کے ساکن میرا دل علی قائد منتخب ہوئے۔

۱۔ یہ شاہ عبدالعزیز کے پوتے اور جانشین مولوی اسحاق کے داماد تھے۔

دج، نصیر الدین دہلوی کے زیر قیادت سندھ کی فوج

اس زمانے میں وہابی تحریک ایک بڑے نازک مرحلے سے گذر رہی تھی۔ کسی نہ کسی مقامی سردار کے ساتھ برسوں کی بے قاعدہ آویزش سے مجاہدین کی تعداد گنتی تھی۔ فتح خاں کی دشمنی نے ہندوستان سے آویسوں اور مال کی آمد کو بہت متاثر کر دیا تھا۔ اس نئے ضروری سمجھا گیا کہ نئے سردار کا انتخاب کیا جائے جو اس تحریک کے حامیوں میں ایک نئی جان ڈال سکے۔ چنانچہ نصیر الدین منتخب کئے گئے۔ وہابی کے مشہور متقی گھرانے سے قریبی تعلق رکھنے کے سبب سے ان کا انتخاب ایک نئی جان ذریعہ بنا۔ وہ ۱۸۳۵ء میں دہلی سے چلے اور ٹونک، اجمیر، اور جیسپور سے ہوتے ہوئے ۱۸۳۴ء میں سندھ پہنچے۔ دوران سفر میں ہندوستان کے بہت سے رنگ و ٹوں کی ٹولیاں ان سے آملیں اور ٹونک میں نواب سے پیش قدمی مالی امداد بھی حاصل ہوئی۔ پہلے وہ حردوں کے مرکز پیرکوٹ میں ٹھہرے جہاں سید احمد کے خاندان کے افراد مقیم تھے۔ وہاں سے وہ حیدرآباد سندھ کی طرف چلے جہاں امیروں سے ملے۔ انھوں نے ان کی ضیانت تو کی مگر کسی معتد بہ امداد کا وعدہ نہیں کیا۔ نواب مبارزالدولہ حیدرآباد کے ایک کارپہ واز کے بیان کے مطابق جو اسی زمانہ کے نگ بھگ سندھ بھیجا گیا تھا نصیر الدین اور ان کے گروہ کو پیرکوٹ کے مشورے سے سندھ چھوڑ دینے کا حکم دیا گیا مگر ان کی طرف سے کچھ بے اثرانہاں نے مداخلت کی اور انھیں کچھ دن ٹھہر جانے کی اجازت مل گئی۔ اور نصیر الدین پھر پیرکوٹ چلے گئے۔ وہ کچھ دن شکار پور میں بھی ٹھہرے جہاں متذکرہ کارپرداز لہ نیشنل کرنل پٹننگر کچھ میں پولیٹیکل ایجنٹ تھا۔ وہ ۲۰ اپریل ۱۸۳۹ء کے معاہدہ کی تحریر کا ایک آلہ کار تھا جس نے دریائے سندھ کو انگریزوں کے تجارتی استعمال کے لئے کھول دیا۔ بعد میں وہ امیرون کے دربار میں ریزیڈنٹ ہو گیا اور سندھ کے احاق میں ایک اہم حصہ لیا تھا۔

اُن سے ملے اور رپورٹ کی کہ نصیر الدین کے ساتھ دوسرے رفقاء ہیں جو بنگال کی فوج کے منتظر ہیں۔

سندھ مرکز جہاد نصیر الدین کا اصل منصوبہ سرحد کی طرف روانہ ہونے کا تھا، لیکن بعض سیاسی موانع کے سبب سے انھوں نے سندھ میں ہی ٹھہرے رہنے اور اسی کو اپنی جدوجہد کا مرکز بنانے کا فیصلہ کر لیا۔ انھوں نے وہاں سے برطانوی ہند کے متفرق اشخاص اور اہم سرداروں کو خطوط لکھ کر ان کی امداد اور معاونت طلب کی۔ ان کی اپیل کا جواب حوصلہ افزا تھا اور ملک کے مختلف حصوں بالخصوص بہار اور بنگال سے جہاں برادرانِ علی روایت علی و عنایت علی، مصروف کار تھے آدمی اور زرے موصول ہوئے۔ اس سلسلے میں نصیر الدین کے خطوط میں ولایت علی کا نام بار بار مذکور ہوا ہے۔

سندھ کے سیاسی حالات، نصیر الدین نے اپنی جدوجہد کا مرکز سندھ کو کیوں قرار دیا، اس کا سبب سمجھنے کے لیے اُس وقت کے سندھ کی سیاسی صورتِ حال کا یہاں مختصر جائزہ لیا جاتا ہے۔ یہ جائزہ اُن سلسلے رپورٹوں پر مبنی ہے جو لودھیانہ میں انگریزوں کے پولیٹیکل ایجنٹ کپتان وید نے ارساں کی تھیں :-

اس زمانہ میں امرائے سندھ کا سیاسی مقام بالکل غیر مستقل تھا۔ تین زبردست طاقتوں، سنگھ، ڈرانی اور انگریزوں کے درمیان محصور و مجبور وہ ہر ایک کی دست درازی سے خائف رہتے تھے، اس لیے ان کی پالیسی وقت اور موقع محل کی مناسبت سے بنا کرتی۔ اسی لحاظ سے کبھی اس کا ساتھ دیتے کبھی اُس کا۔ ڈرانی حکومت کے عروج کے زمانے میں شکار پور اسی کی قلمرو میں تھا۔ بعد میں سندھ کے تاپوروں نے اُس پر قبضہ کر لیا مگر درانیوں کو خراج دیتے رہے۔ ڈرانی حکومت کے زوال کے بعد انھوں نے خراج روک دیا مگر اس کے دوبارہ مطالبہ کا ڈر ہمیشہ لگا رہا۔ اور ہوا بھی یہی۔ شاہ شجاع جب افغانستان کو دوبارہ فتح کرنے نکلا اور شکار پور سے گزرا تو انھیں اسے پانچ لاکھ کی رقم ادا کرنا پڑی۔

مگر اس کو شکست ہو گئی اور ادھر سے دوسری بار گزرتے ہوئے بقایا خراج کی ادائیگی کا سوال اٹھایا۔ امرا مایوسی میں شجاع کے مطالبہ سے جان بچانے کو شکارپور سکھوں کے حوالہ کر دینے کے امکان غور کرنے لگے۔

رنجیت سنگھ کا امرا سے خراج کا مطالبہ، رنجیت سنگھ نے جنوب مشرق میں ۱۸۰۹ء کے انگریز سکھ معاہدے سے مات کھا کر اپنی سیاسی حدود کو جنوب مغرب (سندھ) کی طرف وسیع کرنا چاہا۔ تالپور نے شکارپور کلہوڑوں سے چھینا تھا اس لئے رنجیت سنگھ نے کلہوڑوں کے ایک نمائندہ عبدالنبی کو آگے چلکرتا پوروں کے خلاف کھڑا کر دینے کی غرض سے اپنی جنوب مغرب سرحد پر متعین کر دیا۔ کپتان ویڈ نے اپنی رپورٹ مورخہ ۱۸ مئی ۱۸۳۱ء میں بڑی سیاسی چالاکی سے اپنی حکومت کو اس امر کی طرف متوجہ کیا کہ "جنگ بالا کوٹ کے فوراً بعد رنجیت سنگھ پھر سندھ کے علاقے کی طرف متوجہ ہو سکتا ہے۔ اس نے سمجھا کہ سید نے رنجیت سنگھ کے اسلحہ کو پانچ سال تک اٹھائے رکھا تھا، اب سید کی شکست اور فنا کے بند سکھ اپنی فوجی کارروائیوں کے لئے آئندہ میدان کی تلاش میں ہیں۔۔۔۔۔ اور یہ میدان شکارپور کی طرف ہے۔۔۔۔۔ سندھیوں سے اس کے حاصل کرنے کے لئے یا نو ابان بھاو پور کو (جو ستلج کے مغرب میں واقع ہے) قابو میں لانے کے لئے رنجیت سنگھ آرزو مند رہا ہے، اس لئے ممکن ہے کہ وہ ادھر اپنی فوج روانہ کر دے۔ پانچ برس ہوتے ہیں مہاراجہ رنجیت سنگھ نے امرائے سندھ کے ایلیٹیوں سے جو دربار میں حاضر تھے اس خراج کا مطالبہ کیا تھا جو امرا حکومت افغانستان کو ادا کیا کرتے تھے اور وہ اسلحہ کی یہ تھی کہ حکومت کابل کے زوال کے بعد سے اس سلطنت کا سب سے بڑا حصہ اسی کو ملا کرتا تھا اور وہ اس حصہ کا وارث ہے۔"

ہزارہی قبیلہ: امرائے سندھ دل سے سکھوں سے مقابلہ کرنے کے خواہاں تھے۔ کھلم کھلا مقابلہ کے لئے نہ ان کے پاس وسائل تھے نہ طاقت۔ بہر حال ان کو ہزاروں

کا قبیلہ ایک اچھا حلیف بنا تھا گیا۔ یہ بلوچی تھے۔ جن کی سکھوں سے آئے دن سرحدی جھڑپیں ہوتی رہتی تھیں۔ ان کو امرا کی اور سندھ کی سیاسیات میں بعض اور عناصر کی زبردست حمایت حاصل تھی۔ ملتان کے سکھ گورنر نے ان کے ترک تاز کو روکنے کے لئے روجھان کا سرحدی قلعہ اپنے قبضے میں کر لیا تھا (اگست ۱۸۳۶ء) اور وہاں ایک محافظ فوج متعین کر دی۔

سندھ پر انگریزوں کی نظر: سندھ کے متعلق انگریزوں کے منصوبے الگ تھے۔ ۱۸۳۰ء میں بمبئی فوج کے ایگزیکٹو ڈائریکٹر برنس کو تعینات کیا گیا تھا کہ گھوڑے اور دوسرے تحائف جو شاہ انگلستان نے رنجیت سنگھ کو بھیجے تھے سندھ کی راہ سے لے جائے۔ اس سفر کے اصل مقصد یہ تبصرہ کرنا ہوا۔ ٹروٹر لکھتا ہے۔

”اس کا صاف مقصد یہ تھا کہ دریائے سندھ کو برطانوی تجارت کے لئے کھول دیا جائے۔ مگر ساتھ ہی اپنے گرد و پیش کا خوب معائنہ کرے، سندھ کی سیاست میں متعلقہ معلومات حاصل کر کے اس بڑے دریا (سندھ) کا جائزہ لے اور تحقیق کرے جس کے بارے میں اس وقت ہمیں کچھ واقفیت نہ تھی۔ اور اس کے دونوں کناروں پر امرا سے دوستی گاہٹھے“ برنس کا مشن امرائے سندھ کو بالکل پسند نہ آیا اپنا ملک غیر ملکی تاجروں کے لئے کھولنا نہ چاہتے تھے۔ اور اسی طاقت کی طرف سے کسی اقدام پر ان کو اعتماد نہ تھا جسے وہ صرف اس کے جوع الارض کے لئے پہچانتے تھے۔ ایک بلوچی افسر نے کہا ”بلا تو آچکی۔ انگریزوں نے ہمارا ملک دیکھ ہی لیا“

برنس کے مشن کی مخالفت امرا نے برنس کے مشن کو مختلف عذروں سے ناکام کرنے کی کوشش کی۔ مگر ان کی مخالفت پر انگریز اور سکھ دونوں چراغ بیا ہوئے۔ رنجیت سنگھ نے اس مخالفت کو اپنی ذاتی توہین قرار دیا، کیونکہ واضح

۱۔ ”لارڈ اکلینڈ“ مولف ایل جے ٹروٹر ۱۸۹۳ء ص ۲۰

طور پر یہ مشن اس کے لئے شاہی تحائف لیکر آیا تھا۔ اس نے امیروں کو لکھا اور زور دیا کہ راستہ دے دیں۔ لیکن امرانے رنجیت سنگھ کو اپنی مخالفت کی توجیہ کرتے ہوئے لکھا کہ برنس کے مشن کا مقصد جو ظاہر کیا گیا ہے، وہ محض ایک بہانہ ہے اور جو سامان وہ لارہا ہے وہ مہاراجہ کے دشمن سید احمد کو دینے کے لئے ہے۔ لہٰذا امیروں نے اس طرح برنس کے مشن کی مخالفت میں نہایت عیاری سے رنجیت سنگھ کے دماغ میں بے ہوشی پیدا کرنے کے خوف و خطر سے کام لینے کی کوشش کی۔ مگر وہ اس کوشش میں کامیاب نہ ہوئے بلکہ رنجیت سنگھ آخر میں آمادہ ہوا تو دنیچورا کے فوجی مظاہرے سے جس کا رنجیت سنگھ نے حکم دیا تھا، آخر بہت تاخیر و تذبذب کے بعد ایلچی کو دریائے سندھ سے گذر کر سکھ دربار تک پہنچنے کی اجازت دی گئی۔ اس کے دو برس کے بعد جون ۱۸۴۲ء میں کرنل ہنری پونٹنگ نے وہ معاہدہ تیار کیا جس کی رو سے دریائے سندھ کو سیرابی اور انگریزوں کی تجارتی اغراض کے لئے کھول دیا گیا۔ انگریزوں سے متعلق رنجیت سنگھ کی نیت سے اندیشہ رکھتے تھے۔ مگر اس کی کھلم کھلا مخالفت کرنا نہیں چاہتے تھے۔ وہ یہ بھی نہیں چاہتے تھے کہ امرار سکھوں کے ساتھ مزاریوں کی گوریلا جنگ میں حوصلہ افزائی کریں تاکہ کہیں ایسا نہ ہو کہ ان کو تڑپ میں براہ راست مزید مداخلت کا بہانہ مل جائے۔ روس اور برطانیہ کی سندھ پر نظر اُدھر رنجیت سنگھ سندھ میں انگریزوں کے سیاسی منصوبوں سے مشتبہ تھا۔ متذکرہ بالا مشن میں کپتان برنس سے اس خصوص میں کھود کھود کر سوال کئے گئے۔ برنس نے انگریزوں کی پالیسی کے مقاصد ایسے الفاظ میں بیان کرنے کی کوشش کی جن سے اُس کے خیال میں رنجیت سنگھ کے شبہات زائل ہو جائیں اور سکھ دربار میں اس بھلی افواہ کی تردید کی کہ انگریزوں نے سکھوں پر قبضہ کر لیا ہے۔ کپتان برنس کے جواب پر تبصرہ کرتے ہوئے ڈیڈلے حکومت کے نام ایک خط میں اس جواب سے اپنی بے اطمینانی کا اظہار کیا۔ اس کے خیال میں کپتان برنس کو گورنر جنرل کی مجلس شوریٰ کے اس بیان کا اعادہ کرنا تھا کہ برطانوی پالیسی کا

لہٰذا سندھ کے الحاق تک برطانوی پالیسی "مؤلف پی این کھیرا۔ لاہور ۱۹۲۱ء"

سب سے بڑا مقصد باہمی مفاہمت قائم کرنا اور کل ہمسایہ طاقتوں کے درمیان امن اور ہمواری پیدا کرنا ہے۔ اس بیان میں چاہیے تو یہ تھا کہ حکومت کی مرضی ظاہر کر دی جاتی بجائے اس کے کہ خود غرضانہ طور پر اس بات کا اظہار کیا جاتا جو یقیناً مہاراجہ کے لئے پسندیدہ نہیں ہو سکتی تھی جس کا تعاون حاصل کرنے کی مجھ سے توقع کی گئی تھی اور جو رضا جوئی کے سوا اور کسی صورت سے حاصل نہیں ہو سکتا تھا۔ اس طرح ظاہر ہے کہ انگریز رنجیت سنگھ کی نیت سے چونکا ہونے کے ساتھ کھلم کھلا اس سے عداوت مول لینا تا پسند کرتے تھے۔ انگریز وسط ایشیا میں روس کی مفروضہ پیش قدمی کا جو اس زمانے میں حقیقی اور قریب الوقوع معلوم ہوتی تھی مقابلہ کرنے کے لئے رنجیت سنگھ کی امداد اور تعاون کی بڑی قدر و قیمت سمجھتے تھے۔ اسی امکان کے پیش نظر انھوں نے افغانستان کے دو خارج الوطن حاکموں، شاہ زماں اور شاہ شجاع کو سیاسی پناہ دے رکھی تھی، جن کے ذریعے سے وہ افغانستان میں اپنا اثر وسیع کرنا چاہتے تھے۔ اور وہی انگریزی اور روسی شہنشاہیت کے درمیان استخوان نزع تھا۔ چنانچہ یہ دونوں عظیم طاقتیں سندھ کو ہڑپ کرنے کی نیت رکھتی اور ایک دوسرے پر گہری نظر رکھتی تھیں۔ درحقیقت ٹھیک ٹھیک یہ فیصلہ کرنا دشوار ہے کہ انگریز سکھوں کے پہلے کر لینے کے خوف سے سندھ کے الحاق کے لئے کتنے مستعجل اور بے چین تھے۔

نصیر الدین اور مزاری قبیلہ: یہ تھی سندھ کی سیاسی صورت حال جب کہ نصیر الدین وہاں پہنچے۔ انھوں نے مزاریوں کو قیمتی حلیف پایا خصوصاً اس لئے کہ وہ سکھوں سے گوریلا جنگ لڑ رہے تھے۔ وہ نہ سکھوں کے زیر اثر تھے نہ انگریزوں کے۔ یہ سید احمد کی شہادت کے بعد بھی ان کے متبعین کے اس عزم کی مزید مثال ہے کہ وہ ایسی ہندوستانی طاقتوں سے اتحاد سے باز رہیں جو انگریزوں کے ماتحت ہوں۔ وہ ایسی طاقتوں سے اتحاد کو ترجیح دیتے تھے جو ذرائع کی قلت کے باوجود انگریزوں کے خلاف ہوں۔

مزاریوں کی سکھوں سے صلح چنانچہ نصیر الدین نے مزاریوں کی سر زمین میں سکونت

اختیار کر لی جو خیر پور کی سرحد پر واقع تھی اور موجودہ ضلع ڈیرہ غازی خاں کے جنوب مغرب سے مربوط تھی۔ نومبر ۱۸۳۷ء میں انھوں نے سکھوں سے قلعہ روجہساں اور کان میں ہونے والی جنگوں میں ان کی سپاہ نے مزاروں کی غداری سے شکست کھائی۔ ان مزاروں نے ملتان کے سکھ گورنر دیوان ساون مل کی وساطت سے سکھوں سے صلح کر لی تھی۔

نصیر الدین کی روانگی افغانستان: شمالی مغربی سرحد کی معمولی حرکات پھر ظہور پانے لگیں۔ وہابیوں سے ان کے متلون مزاج اتحادیوں نے کناہہ کشی شروع کر دی سرحدی قبائل کی طرح یہ غیر تربیت یافتہ لوگ تھے جن کے پاس سکھ دربار سے مقابلہ کرنے کے لئے نہ وسائل تھے نہ تنظیم۔ پہلے ہی دھنسوڑے (پورٹ) کے بعد ادرتیر ساون مل کی ترغیب سے انھوں نے سکھوں سے صلح قبول کر لی اور وہابیوں کو ادھر میں چھوڑ دیا۔ قدرۃ نصیر الدین سخت دشواری میں پڑ گئے۔ اکثر مقامی سردار جن سے پناہ یا مدد طلب کی جاتی وہ ان کے وہابیوں کے، وجود ہی کو سیاسی پریشانی سمجھتے۔ اس لئے نصیر الدین افغانستان چلے گئے۔ وہاں کے کچھ سرداروں سے وہ خط و کتابت کر چکے تھے۔ انگریز افغان جنگ میں نصیر الدین کی شرکت: اس اثنا میں انگریزوں اور اہل افغانستان دوست محمد سپر پانڈہ، بان بارک زئی کے درمیان تعلقات کشیدہ ہو چکے تھے جو واقعات پہلے انگریز افغان جنگ کا باعث ہوئے اور انگریزوں کی بلا اشتعال اور بلا سبب خصومت، اینہا ہمہ راز امت کہ معلوم خواہم است، اس لئے یہاں ان کے اعادہ کی ضرورت نہیں۔ جنگ کے موقع پر دوست محمد نے تربیت یافتہ وہابیوں کو اپنے سے فائدہ اٹھانا اپنے لئے بہتر سمجھا۔ چنانچہ اس نے نصیر الدین کو دعوت دی اور وہ ایک ہزار سپاہ کا ایک دستہ نیکر کابل کی طرف روانہ ہوئے۔ انھوں نے خود دادور کے قریب بڑا دکیا اور تین سو سپاہیوں کی ایک ٹولہ کو غزنین کی مدافعت کے لئے آگے بھیج دیا، لیکن جب انگریزوں نے اس کے قلعے پر پورٹ کی تو وہ لڑتی ہوئی گر گئی۔ نصیر الدین کی کارروائی نے ایک بار پھر یہ حقیقت نمایاں

کردی کہ وہابی ہر اس طاقت کا ساتھ دینے کو تیار تھے جو انگریزوں سے برسرِ پیکار ہو۔ بہتر لکھا ہے کہ "وہ انگریز کفّار پر ضرب لگانے کے لئے ہر موقع کے منتظر رہتے تھے"۔ ۱۸۳۹ء کے اواخر یا ۱۸۴۰ء کے اوائل میں ایک سخت صبر آزما کوچ کے بعد نصیر الدین اور باقی فوج سہانہ پہنچی۔ اولاد علی کے ماتحت وہابیوں کی ایک مختصر ٹولی وہاں موجود تھی۔ نصیر الدین کے پہنچنے پر وہ قائد منتخب کئے گئے مگر اس کے فوراً بعد ان کا انتقال ہو گیا اور سہانہ میں مدفون ہوئے۔ ۱۷

خلفائے عظیم آباد سید احمد کی شہادت کے بعد کے زمانے کی طرح اس تحریک پر بڑا نازک دور آیا۔ مگر تاریخ کے اکثر واقعات کی طرح حالات نے پھر ایک وقت کا آزمی زبطل حریت پیدا کر دیا۔ اس بار یہ سعادت بہار خصوصاً عظیم آباد پٹنہ کے نصیب میں تھی جس نے اس تحریک کو زندہ رکھنے والے مہیا کئے۔ بہتر اسے اپنے پر زور اور خوبصورت الفاظ میں یوں بیان کرتا ہے: "مذہبی دیوانوں کا مقصد پھر فوت ہوتا نظر آیا۔ لیکن پٹنہ کے خلیفوں (ولایت علی عنایت علی کے دینی جوش اور ان کے قبضے میں کثیر مالی سامان نے اس مقدس جھنڈے کو زمین سے اٹھالیا۔ انہوں نے سارے ہندوستان کو اپنے کارکنوں سے بکھردیا اور ایک سب سے بڑا دینی اجا جو جو کبھی واقع ہوا رونما کر دیا"۔

ان خلفائے عظیم آباد کے کارنامے جن میں یہ برادران علی مستمہ طور پر سب سے پیش پیش ہیں اور ان کی خدمات تحریک آئندہ باب کا موضوع ہے۔ بہر حال اس باب کے آخر میں ایک فراموش کردہ ذمہ داری اور اس سے متعلق تنگال کی شورش باراسیٹ کا بیان درج کر دینا بہتر ہوگا۔

۱۷ اور انڈین مسلمان "ص ۲۱۔ کلکتہ ریویو جلد ۵ صفحہ ۸۸/۲۸۴۔ جرنل آف انڈین ہسٹری اگست ۱۹۳۳ء صفحہ ۲۵۱-۲۶۸۔
 ۱۸ اس جماعت اور سرحد پر وہابی کی ایک دوسری جماعت جو جنگ بالاکوٹ کی بقایا تھی اور نصیر الدین منگلوری کے زیر قیادت تھی،
 دریاں فرق کو ملحوظ خاطر رکھنا چاہیے۔ آخر الذکر کی شروع کی کارروائیاں سندھ میں ان کے ہمنام (نصیر الدین دہلوی) کی
 جدوجہد کے زمانے میں بیک وقت جاری تھیں۔ ۱۷ اور انڈین مسلمان ص ۲۹-۵۰۔

(د) فرائضی تحریک

حاجی شریعتہ اللہ: فرائضی تحریک کے بانی ضلع فریدپور کے گاؤں بہادر پور کے ساکن حاجی شریعتہ اللہ تھے۔ یہ ۱۷۶۲ء میں پیدا ہوئے۔ اٹھارہ سال کی عمر میں حج کو روانہ ہوئے اور بیس سال عرب میں مقیم رہے۔ انھوں نے مسلم معاشرہ کی سماجی اصلاح کی تحریک جو ۱۸۰۲ء میں شروع کی تھی وہ محمد بن عبدالوہاب بخدی کی تحریک سے بالکل مشابہ تھی۔ اسی تحریک نے غیر اسلامی بدعات اور رسوم و رواج کی مذمت کی اور انگریزوں کے زیر حکومت بنگال کو دارالحرب قرار دیا۔ اس کے پیرو صرف قرآن کے بتائے ہوئے احکام الہی کی سخت پابندی ممتاز تھے اور تحریک نے ان میں خالص توحید و تقویٰ کی روح بھونک دی تھی۔

بنگالی مسلمانوں پر جبر و ستم، یہ تحریک بانی کے جانشین اور فرزند مولوی محمد مسلم معروف یہ دادومیاں (۱۸۱۹ء تا ۱۸۶۱ء) کے زمانے میں مزید منظم و مستحکم ہو گئی، اور ان کی قیادت میں اس کا سیاسی پہلو زیادہ نمایاں ہو گیا۔ مشرقی بنگال کے مسلم مزارعین نیل کے انگریز کاشتکاروں اور نئے ابھرنے والے زمینداروں کے طبقے کے جبر و ستم کا شکار تھے۔ انھوں نے ان کو ایک مضبوط نظام میں جھکڑ دیا اور جیور، پینہ، والدہ، ڈھا کا اور ہار ایٹ کے اضلاع میں اپنے علیحدہ علیحدہ مرکزوں کے نظام کی نگرانی کے لئے اپنے خلیفے مقرر کرائے۔ انھوں نے انگریزی عدالتوں سے کامیاب مقاطعہ بھی کرایا اور ان کو آمادہ کیا کہ اپنے جھگڑوں کے اپنی اپنی پستوں میں فیصلے کرائیں۔

دادومیاں: تمام بنی نوع انسان کی سماجی مساوات اور ناجائز کمیشنر قوم کے ٹیکسوں کی تیخ کے نظریہ کی جس کی دادومیاں نے اشاعت کی، سادہ اور مضبوط کسانوں نے گرجوئی سے پذیرائی کی۔ ناجائز محصولات کے خلاف انھوں نے کسانوں کی حمایت کی نتیجہ یہ ہوا کہ مقامی زمینداروں کی کثیر التعداد رعایا اور نیل کے کاشتکار ڈنلوپ کے اسامی دادومیاں کے ساتھ ہو گئے۔ مقامی زمینداروں پر یہ بہت شاق گذرا اور انھوں نے دادومیاں کے خلاف اتحاد و فوجی

مقدمات دائر کرتے۔ ۱۸۴۶ء میں پنج گروہ میں ڈنلوپ کے کارخانے پر حملہ کر کے لوٹ لیا گیا۔ ۱۸۴۶ء سے ۱۸۵۸ء تک فریقین کے درمیان مقدمات اور جوابی مقدمات کا ایک سلسلہ جاری رہا۔ آخر دادومیاں ریاستی قیدی کی حیثیت سے علی پور جیل میں نظر بند کر دیئے گئے۔

پینو میرا بعد کے مرحلوں میں فرائضی تحریک اور میرٹھاد علی عرف نیومیرا کے زیر قیادت ایک مقامی معاصر تحریک میں ضم ہو گئی۔ نثار علی ضلع باراسیٹ کے ایک گاؤں چاندپور کے باشندہ تھے۔ وہ ایک اوسط درجہ کے زمیندار خاندان کے فرد تھے اور جوانی میں ان کا کیریئر متنوع تھا۔ دلی کے شاہی خاندان کے کچھ افراد سے ملاقات ہوئی اور ان کے ساتھ سفر حج میں مکہ معظمہ چلے گئے۔ وہاں سید احمد سے ملاقات ہو گئی اور ان کے مرید ہو گئے۔ ۱۸۴۶ء میں ہندوستان واپس آ کر وہ اپنے پرانے مسکن کے قریب سید پور میں سکونت پذیر ہو گئے اور اپنے عقائد کی تبلیغ شروع کر دی جن کی امتیازی خصوصیت سید احمد کے نظریوں سے مماثلت تھی۔ انھوں نے کامیابی کے ساتھ کلکتہ کے شمال اور مشرق کے اضلاع کے دورے کئے اور کثیر تعداد پرورد بنائے۔ بہت جلد بیرووں کی ایک کثیر تعداد جمع کر لی اور جوہیں پرگنہ ندیا اور فریدپور کے تین ضلع ان کے زیر اثر آ گئے۔

پینو میرا کی اصلاحی سرگرمیاں دادومیاں کی شرح نثار علی نے بھی مظلوم کاشتکاروں کی حمایت کا بیڑا اٹھایا جس کو منظم اور متحد کرنے اور بے ہوشی سے بیدار

۱۷ اس تحریک کا مفصل بیان ایک مقالہ "ہندوستان کے مذہبوں کی تاریخ" کلکتہ ریویو جلد ۵ ص ۱۴۴ تا ۱۹۲ اور اسی

تھورنٹن - THORNTON کے تاریخ ہندوستان جلد ۵ صفحہ ۴۹، ۱۸۴۶ء میں مذکور سجاد السی جی چودھری کی مول ٹرس

اربیڈن انڈیا کلکتہ ۱۹۵۴ء صفحہ ۹۵ میں بھی اس طرح کا بیان ہے۔

۱۸ اور انڈین مسلمان صفحہ ۲۵۔ تھورنٹن جلد ۵ صفحہ ۴۹، ۱۸۴۶ء میں مذکور سجاد السی جی چودھری کی مول ٹرس

پنجاب میں بھی نثار علی کے خروج کا ذکر موجود ہے۔ انتہائی کوشش کے باوجود اس مخطوط کے ضروری

اجزا مجھے دستیاب نہ ہو سکے۔

کرنے کی کوشش کی۔ قدرہ زمیندار طبقے نے ان کی اصلاحی، مساعی کی مخالفت کی۔ کچھ کاشتکاروں نے ان تعلیمات سے اور ہاتوں کے علاوہ ان کی بعض مقبول عام سماجی رسوم و رواج کے امتناع پر گھبراہٹ اور دکھ محسوس کیا۔ ایسی رعایا کی شکایات کی بنا پر زمینداروں نے ایسی جمعیت کے نشوونما کو دبانے کی کوشش کی جو ان کی عزت و وقار کا لحاظ نہ کرتی ہو، اور ایک ایسی متحدہ طاقت کا مظاہرہ کرے جو ان کے مفاد پر اثر انداز ہو۔ اس قسم کے قصوروں پر جرمانہ کی جو رقم بزور وصولی کی جاتی تھی اس نے معاملات کو بہت الجھا دیا۔

اجتماعی جرمانے کے خلاف بنگالی مسلمانوں کا عملی اقدام: اجتماعتی مذی کے کنارے ایک گھاؤں پورنا کے زمیندار کشن دیورائے نے بعض گاؤں پر جہاں معمولی چھڑے ہیں ہو گئی تھیں اجتماعی جرمانہ ٹھونک دیا۔ جولائی ۱۸۳۱ء کو زمینداروں کے گماشتے ایک ایسے ہی قصور وار گاؤں سرفراز پور سے جرمانہ وصول کرنے گئے۔ وہاں تیتویر کے بہت سے پیر موجود تھے۔ انھوں نے ان گماشتوں کا مقابلہ کیا اور آخر میں ان کو مار بھگا گیا۔ مقامی تھانے میں شکایات اور جوابی شکایات داخل کی گئیں، اور آخر میں دونوں فریق برسی کر دئے گئے۔ پھر بھی زمیندار طرح طرح سے ان کو تنگ کرتا رہا۔ زمیندار نے بقایا مالگذاری کے لئے اپنے مخالفوں کو زچ کرنے کے لئے ان کو گرفتار کرنے کے واسطے اپنی طاقت و اقتدار سے کام لیا اور ایٹ انڈیا کمپنی کی عدالت میں چھوٹے مقدمات دائر کر کے ڈگری کی تعمیل میں ان کو گرفتار کر دیا۔ اس اثنا میں اور اضلاع میں تحریک ترقی کرتی رہی اور زیادہ دلیر و جنگو بھی ہوئی گئی۔ ۱۸۲۹ء میں سرحد پر سید احمد کی فتوحات نے تحریک کے شرکا کو ایک نئی طاقت اور حوصلہ بخشا اور ان کی دلیری میں نیا اضافہ ہوا۔ بے نتیجہ اور تکلیف دہ عدالتی کاروائیوں کے سلسلہ لاٹنا ہی نے ان کے سبر کا

پیالہ لبریزہ کر دیا اور اب وہ بلا واسطہ اور براہ راست کارروائی پر تل گئے۔

نرکل بٹیا گاؤں ان سرکشوں کا صدر مقام تھا اور بانس کے حصار سے محصور تھا۔ ایک شخص معز الدین بسواس کے گھر میں غلہ اور اسلحہ کا ذخیرہ جمع کیا گیا۔ اس زمانے میں تیتومیر کی علاقہ پنجاب کے ایک نودارہ فقیر مسکین شاہ سے ملاقات ہوئی، کہا جاتا تھا کہ اس نے خروج پر برا بیگختہ کیا۔

پورنا گاؤں پر حملہ: ان مسلح سرکشوں کا رخ سب سے پہلے پورنا کے زمیندار کی طرف ہوا جس نے ان کی زندگی تلخ کر رکھی تھی۔ اکتوبر ۱۸۳۱ء میں اس گاؤں پر حملہ کر کے لوٹ بیا گیا۔ انھوں نے ایک دسی عیسائی مسٹر اسمتھ پر بھی حملہ کیا جو ادھر سے گذر رہا تھا اور ان مسلمانوں کے ساتھ بھی بد سلوکی کی جو ان کی جماعت میں شریک نہ تھے، اور کمپنی کی حکمران کے اختتام کا کھلم کھلا اعلان کر دیا۔ اور بھی فرقہ دارانہ حرکات کا ارتکاب کیا۔

فرائضیوں کا خروج: بہر حال اوکنیلی نے ان سرکشوں کے عام رویہ اور ان کی جماعت کی تنظیم پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے:-

”معلوم ہوتا ہے کہ ہر کام کسی طے شدہ مقصد کے ماتحت سوچ سمجھ کر کیا گیا... یہ غنڈے ایک قسم کی عسکری ترتیب و تنظیم کے پابند تھے اور غلام معصوم کے زیر کمان صفوں میں مارچ کرتے تھے“

اس کے بعد وہ متصل ضلع ندیا کی طرف بڑھے اور دوسرے گاؤں پر بھی حملے کئے۔ بھڈرہ (باگتوریہ؟) میں نیل کے کارخانے کے ایک کارپرداز پائرن نے کلکتہ جا کر اپنے آقا کو اوائل نومبر میں ان فسادات کی اطلاع دی اور زور دیا کہ اگر جبری انداد کی کارروائی نہ کی جائیگی تو حکومت ایک سخت خطرے میں مبتلا ہو جائیگی۔ اس کے آقا اسٹورم نے بارامیٹ کے میجر میٹ اور لفٹنٹ گورنر کے سامنے

اسے پیش کیا۔ مگر حکومت اپنی معمولی تنگ نگاہی سے کوئی قدم اٹھانے میں متاثر تھی اس اثنا میں ندیا اور براسیٹ کے مجسٹریٹوں کی متصل رپورٹیں فسادات کے جاری رہنے کی، کلکتہ میں پہنچتی رہیں۔

انگریزی دستہ کی شکست؛ چنانچہ ۲۴ نومبر ۱۸۳۱ء کو بانڈی کے سالٹ ایجنسی (نمک کوٹھی) کو بھیج دیا گیا اور ایجنسی کے ایک عہدہ دار الیکزینڈر کو ہدایت کی گئی کہ دستے کے ساتھ نرکل بڑیا چلا جائے۔ وہ بسیر ہاٹ کے داروغہ اور کچھ برق اندازوں اور ایک سو سپاہ کا ایک دستہ ساتھ لیکر روانہ ہوا۔ فسادوں کی تعداد چھ سو تھی اور یہ غلام معصوم کے زیر کمان تھے جو گھوڑے پر سوار تھا۔ ان فسادوں کی عمر بنی صلاحیت کو نظر تحقیر سے دیکھتا ہوا الیکزینڈر سے ڈبھیر کے لئے آگے بڑھا مگر اس کا دستہ پورے کا پورا تباہ ہو گیا۔ کلکتہ کے محافظ دستے کا جمعہ آدس سپاہی اور تیرہ برق انداز مارے گئے۔ بسیر ہاٹ کا داروغہ اور کلنگا تھانے کا جمعہ زخمی ہوئے اور قید کر لئے گئے۔ خود الیکزینڈر کا فسادوں نے ننگی تلواریں لئے پیچھا کیا اور وہ جان بیکر بھاگا اور بڑی مشکل سے جانبر ہوا۔ اس شکست سے پوری ایجنسی میں کامل دہشت پھیل گئی۔ خزانے فوراً کشتی پر رکھ کر سندھین کی راہ سے الیکزینڈر کی ذمہ داری میں کلکتہ بھیج دئے گئے۔ اس اثنا میں ضلع ندیا میں دوسرے کارخانوں پر حملے کر دئے گئے اور پولیس نے صورت حال کا مقابلہ کرنے سے اپنی معذوری کا اعلان کر دیا۔ مجسٹریٹ نے فسادات کو ٹھنڈا کرنے کے لئے تمام ممکن پولیس کی طاقت اکٹھی کی اور کارخانہ دردرالو کے اینڈریوز کے ساتھ تین سو سپاہی بیکر کشتیوں پر اچھا مٹی کو چلا گیا۔ بھاڈریا (بورین) کے کارخانے پر پہنچ کر انہوں نے دیکھا کہ اس پر حملہ ہو چکا اور اس کا سارا مال لٹ چکا تھا۔ پائرن (کارپرداز کارخانہ نیل) نے فسادوں کے خلاف حکام کو جو اطلاع دی تھی، یہ نوٹ مارا اسی کا انتقام یا سزا کھتی یہ

۱۸۳۲ء گورنمنٹ بنگال جوڈیشیل ڈیپارٹمنٹ۔ اسی۔ نمبر ۵ موزعہ ۳، اپریل ۱۸۳۲ء

ان کو نرکل بڑیا میں ایگزینڈر کے دستے کی شکست کی خبر بھی ملی۔ اس لئے کچھ دیر مفردوں کے خلاف اقدام کرنے میں متامل رہے مگر آخر کار وہ آگے بڑھے۔ یورپی صاحبان ہاتھیوں پر اور پیچھے پیچھے برقی اندازہ یوں وہ نرکل بڑیا میں وارد ہوئے، جہاں ایک ہزار مضبوط فسادی تینتومیر کے ماتحت باقاعدہ صفوں میں تیار نظر آئے۔ سرکاری دستے نے دوران زندگی کو بہادری کا بڑا حصہ سمجھ کر مراجعت کا فیصلہ کر لیا۔ مگر بیٹھ پھرتے ہی ان پر حملہ شروع ہو گیا۔ معمولی جھڑپ کے بعد جس میں چند برقی اندازہ مارے گئے دستہ اپنی کشتیوں کی طرف واپس دوڑا اور اپنی حفاظت میں کچھ بندوقیں چھوڑنے کا ارادہ کیا۔ مگر کشتیوں تک پہنچ جانے کے بعد بھی ان کا تعاقب کیا گیا۔ یورپی کشتیاں دوسرے کنارے پر چھوڑ کر اپنے ہاتھیوں کی طرف دوڑے جو ایک میل دور کھڑے تھے۔ ان لوگوں نے مولنا تھک کارخانے کی طرف مراجعت کی جو کوئی چھبیس میل دور تھا۔ ایک ہاتھی، کئی کشتیاں اور دوسرے سازوسامان فساد یوں کے ہاتھ لگے۔ اس کے بعد وہ ہوہلی کارخانہ پر حملہ کرنے چلے۔ اس کے منیجر کو گرفتار کر لیا اور تینتومیر کے سامنے لائے جس نے کامل اور غیر مشروط تسلیم و رضا کا مطالبہ کیا۔ وہ ہوشیاری سے راضی ہو گیا اور آئندہ انھیں کو حاکم ہندوستان مانکر نیل کے بیج لگانے کو تیار ہو گیا۔ اس وقت تک متاثرہ اضلاع میں ملکی حکام کامل طور پر شکست کھا چکے اور مفلوج ہو چکے تھے۔ کچھ دنوں کے لئے متعلقہ اضلاع میں فساد ہی برسر اقتدار رہے۔

غلام معصوم کی شکست و خاتمہ: اس درمیان میں ایگزینڈر اپنی پتاسانے کلکتہ آیا۔ اب حکام کی آنکھوں میں حالت کی خطرناکی نظر آئی اور فوری اقدامات کئے۔ ایک فوج جس میں دیسی پیدل فوج کی دس رجمنٹیں شامل تھیں، گھوڑے سوار توپخانہ، کچھ توپوں اور کچھ محافظ سپاہ، ہایت کی گئی کہ باراسٹیٹ میں ایگزینڈر سے جا ملیں۔ اور یہ سب ملکر ۲۹ نومبر ۱۸۳۱ء نرکل بڑیا پہنچے۔ فوج بانس کے حصار کی طرف بڑھی اور ایک

زبردست دلیرانہ مدافعت کے بعد اس پر قبضہ کر لیا۔ اس کے بعد جو عام لڑائی ہوئی اس میں فسادوں کا قائد تینو میر لڑتا ہوا گر گیا۔ ان کا کمانڈر غلام معصوم اور اس کے ۳۵ آدمی اسیر ہوئے۔ علی پور میں ان کا مقدمہ چلا۔ غلام معصوم کو سزائے موت اور باقی کو مختلف میعادوں کی قید کا حکم دیا گیا۔

فرائضیوں کی سرفروشی پر اظہارِ تعجب: بار اسیت کے خروج کی مختصر مگر ہنگامہ خیز کہانی یوں تمام ہوئی۔ گورنمنٹ نے مقامی میجسٹریٹ کو نوٹ کی رپورٹ پر اسٹن ہی اظہارِ رائے پر اکتفا کی: ”یہ ہنگامہ نتیجہ تھا ایسے حالات کا جن کا اثر ملک کے ایک بہت مختصر حصے تک محدود تھا اور قطعی مقامی تھا“ پھر بھی اس نے باغیوں کی بیباکانہ سرفروشی پر تعجب کا اظہار کیا۔ اوکینیٹی (جسٹس) اپنے تذکرہ بالا مقالے میں حکومت کے اس تنگ نظرانہ پہلو پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا ہے۔

”اب بھی چالیس سال کی مدت گزرنے کے بعد کوئی آدمی اس ہنگامے کی تاریخ پڑھ کر حکومت کی بے بسی پر تعجب کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔ ۱۸۴۲ء میں سید احمد نے ہندوستان کے غیر مسلم حکمرانوں کے خلاف بلا روک ٹوک جہاد کی تبلیغ کی تھی۔ آدمیوں اور روپوں کی کثیر تعداد و مقدار بنگال سے اس (سید احمد) کو کھلم کھلا مہیا ہوتی رہی۔ خفیہ رکھنے کی بھی کوئی کوشش نہیں کی جاتی تھی۔ حکومت کو پنجاب میں اس کی (سید احمد) فتوحات کی پوری واقفیت ہوگی۔ پھر بھی اس کے پیرو اپنی طاقت پر اعتماد کر کے حکمت سے صرف تیس میل پر کھلم کھلا بغاوت کر بیٹھے تو یہ شورش ناقابلِ تشریح۔ ظاہر کی گئی اور باغیوں کو معصوم اور کسی منصوبہ بنا کر کہ ناقابلِ بنیاد گیب نے اخبارات نے بھی اس بغاوت کی نوعیت پر مگر اس وقت تک جہاد سے اتفاق نہیں کیا۔ بلکہ برعکس اس جماعت (بہادرین) کے سرانگہ اہلکاروں پر اندیشہ کا احساس ظاہر کیا۔

فرائضی وہابی تحریک پر اوکنیلی کی رائے: اس مسئلہ پر اوکنیلی نے اخبار ہندو پیٹر لوٹ مورخہ ۲ اگست ۱۸۵۷ء سے ایک طویل اقتباس نقل کیا ہے۔ اخبار کا بیان ہے :-

» فرائضی اور وہابی جیسی جماعتیں اگر خود ایسی عظیم تحریک کے جلانے کی طاقت نہ رکھتی ہوں تو اتنا تو کر سکتی ہیں کہ تمام بے چینیوں اور منافرتوں کے عناصر کو جمع کر دیں جن کی تعداد موجودہ کم عقل گو نیاض اور شاندار حکومت میں بہت زیادہ ہو جا سکتی ہے...
... فرائضی اگرچہ بنگال کا ایک طبقہ ہے، کہا جاتا ہے کہ باہر کے کسی ویسی ریاست کے لوگ ہیں..... بنگال میں پچاسوں گاؤں ہیں مگر حکومت اور پبلک ان کے نظام، ان کی سیاست اور مذہب سے بالکل بے خبر ہے یہ بے خبری بڑی غفلت کی نشان دہی کرتی ہے «

فرائضی تحریک اور بارہ میڈٹ کے خروج کو غلطی سے دو جدا جدا واقعات سمجھ لیا گیا ہے۔ ان کو عام وہابی تحریک کے زیادہ کشادہ پس منظر میں دیکھنا چاہیے۔ اگرچہ فرائضی جماعت وہابی تحریک سے پہلے وجود میں آئی اور وہابی تحریک کے بہت سے بنیادی اجزا اس میں موجود تھے یہ رفتہ رفتہ وہابی تحریک میں جذب ہو گئی۔ اور اس کی تبلیغ اشاعت کے لئے خصوصاً بنگال میں راستہ بنا دیا۔ یہ واقعہ قابل غور اور معنی خیز ہے کہ بارہ میڈٹ کے خروج اور بنگال میں عنایت علی کے تبلیغی دورے کا زمانہ ایک ہی ہے۔

فرائضی خروج کی اصل وجہ: اس نظریہ کے متعلق کہ یہ خروج خالصتہ فرقتہ دارانہ (یعنی مذہبی) تھا کچھ تو ضیح کی ضرورت ہے۔ یہ افسوسناک حقیقت ہے کہ اس واقعہ کا صرف ایک ذکر جوہم تک پہنچا ہے وہ متعلقہ حکام کے اُس وقت کے چند خطوط اور (جسٹس) اوکنیلی کے ایک مقالہ پر مبنی ہے۔ تصویر کا دوسرا رخ ہمیں

لہ آگے تفصیل آتی ہے

دستیاب نہیں۔ بہر حال انھیں ذرائع سے کچھ واقعات فراہم کئے جاسکتے ہیں۔ اس تحریک کا اصل اہم پہلو یعنی یورپی مزارعین سے اس کی آویزش، مورخوں کی نظر سے اوجھل ہے، یا اس پر زور دینے کی ضرورت نہیں سمجھی جاتی۔ یہ فتنے جتنے رقبوں پر پھیلے ہوئے تھے ان میں اضلاع ندیا اور بارہ سیٹ کے حصے ہیں جو نیل کے کارخانوں سے بھرے ہوئے ہیں اور باگنڈی کی سالٹ ایکسی (نمک کی کوٹھی) سے دور نہیں ہے۔ مقامی کسانوں پر ان نیل کے مزارعین کے مظالم سے انیسویں صدی کی اقتصادی تاریخ کے طالب علموں کو واقف ہونا چاہئے۔ یہ بات بھی معنی خیز ہے کہ ان باغیوں کے خلاف پہلی کوشش خود انھیں مزارعین نے انجام دی تھی۔ انھیں کے مسلسل اصرار سے حکام نے باغیوں کے خلاف قدم اٹھائے ان کی عرضداشتیں ہی اس بات کا ثبوت ہیں کہ یہ خروج نیل کے کاشتکاروں کے خلاف تھا۔ اور اسی طبقے کے مفاد پر اس کی زد پڑتی تھی۔ جیسا کہ ان واقعات کے متذکرہ بالا بیان سے ظاہر ہے نیل کے مزارعین کی فوج کے ساتھ جو پہلی جنگ ہوئی تھی اس میں اسے شکست ہوئی تھی اور ان کی ناکامی کے بعد باقاعدہ ہرکار فوج بھیجی گئی تھی جس نے کام ختم کر دیا۔ کمیٹی کے قانون کے التوا کا اعلان ایک دوسرا پر معنی واقعہ ہے جو قابل غور ہے۔ یہ واقعات تحریک کے مقاصد سے میل نہیں کھاتے جس کی نسبت کہا جاتا ہے کہ سرتا سر صرف ہندوؤں کے خلاف تھے۔ یہ خروج دراصل ناجائز استحصال کرنے والے ڈھیٹ اور بے رحم نیل کاروں اور زمینداروں کے ایک نوزائیدہ طبقے کی لوٹ کھسوٹ کے شکار، مظلوم کاشتکاروں کی جدوجہد تھا۔ ان زمینداروں کو بندوبست دوامی کے بخشتے ہوئے حقوق ملکیت کی رو سے یہ اختیار حاصل تھا کہ کاشتکاروں کے ساتھ بے دھڑک جو سلوک چاہیں کریں۔ خود کلورین مجسٹریٹ نے ان کے خروج پر اپنی رپورٹ میں لکھا ہے کہ زمینداروں کو جو اختیارات حاصل ہیں ان سے کام لیکر اپنی رعایا میں ایک نمائشی

کچھری کھڑی کر کے جس بہانے سے چاہیں جو فیصلہ نافذ کر دیں لے۔“

ڈاکٹر چودھرنی نے ہندوستان میں مختلف تحریکات مخالف برطانیہ کی نوعیت پر اپنے پر از معلومات مقالہ میں فرانسویوں کے متعلق نہایت صحیح تبصرہ کیا ہے کہ

”یہ وہابی مساجی اور اقتصادی اعتبار سے مجبور کاشتکاروں کے طرفدار تھے جن کو انھوں نے اونچے طبقوں کے مظالم سے بچانے میں مدد دی“

اس سلسلے میں ایک اور بات خاص طور پر قابل غور ہے۔ یہ خروج انگریزوں کے ماتحت نوکری اور انگریزی عدالتوں میں جانے سے انکار کر کے عوام میں عدم تعاون کا احساس بیدار کرنے کی کوشش بھی تھی۔ یہ معنی خیر اہم تھی ایک اصول کی جس کی بنیاد پر ہندوستان کی آئندہ تحریک آزادی کی ایک عالی شان عمارت کھڑی کرنا تھی۔

۱۸۳۲ء گورنمنٹ آف بنگال جوڈیشیل ڈیپارٹمنٹ اور سی۔ نمبر ۵ مورخہ ۳ اپریل ۱۸۳۲ء

۱۸۳۲ء انھوں نے یہاں وہابی کا لفظ وسیع مفہوم میں استعمال کیا ہے جس میں فرانسوی بھی داخل ہیں۔

۱۸۳۲ء ایس بی چودھری صفحہ ۵۰

باب

ولایت علی و عنایت علی

(۱) ولایت علی اور عنایت علی کے کردار اور جدوجہد

وہابی تحریک کی تاریخ کم سے کم ۱۸۳۱ء سے ۱۸۵۸ء تک بہت زیادہ حد تک خاندان صادق پور پٹنہ سٹی کے ولایت علی و عنایت علی کی جدوجہد کی تاریخ ہے۔ اس مشن کی ترقی و سر بلندی کے لئے ان کے بے نفاں جوش اور تحریک کی خدمت میں ان کی طرح طرح کی قربانیوں کی سر ولیم ہنٹرنے بھی کھلے دل سے تحسین کی ہے۔ وہ لکھتا ہے: "ان تمک مبلغوں کی حیثیت سے اپنی ذات سے بے پروا، بے داغ زندگی، انگریز کفار کے قلع قمع کرنے پر وقف اور زنگروت مہیا کرنے کے لئے ایک قاعدہ نظام قائم کرنے میں قابل تعریف ماہر کے لحاظ سے یہ پٹنہ کے طلباء اس جماعت کے مثالی نمونے نظر آتے ہیں۔ انکی تعلیمات کا زیادہ تر حصہ عیسے پاک تھا، اور اپنے ہزاروں مہوطنوں کو ایک صاف زندگی اور اللہ تعالیٰ کے زیادہ سچے اور پاک تخیل پر ابھار دینا انھیں کا حصہ تھا۔"

ولایت علی کے ابتدائی حالات: یہ دونوں صادق پور پٹنہ سٹی کے فتح علی کے فرزند تھے۔ بڑے بیٹے ولایت علی ۱۲۰۵ھ (۱۷۹۰ء) میں پیدا ہوئے

ان کا قد اوسط، رنگ سانولا اور تن دتوش بھاری تھا۔ ڈاڑھی رکھتے تھے، بھنویں جڑی ہوئی تھیں۔ ابتدائی تعلیم اپنے والد سے حاصل کی۔ پھر وہ لکھنؤ بھیج دئے گئے جہاں رنگ محلہ کے عالم اشرف علی سے تعلیم حاصل کی۔ یہیں وہ سید احمد سے ملے اور بیعت کی، اس کے بعد انھوں نے اپنے ازاں خاندان کو بھی سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کرنے پر آمادہ کیا۔ جب سید احمد پٹنہ سے رخصت ہوئے تو یہ بھی ان کے ہمراہ ہو گئے۔

ولایت علی کی بیوہ سے شادی ولایت علی کی پہلی شادی پندرہ سال کی عمر میں بی بی امیرن دختر مقصود علی ساکن قصبہ بنا پکھڑولی ضلع آرہ سے ہوئی۔ وہ لا ولد و وفات پاگئیں۔ ولایت علی نے دوسری شادی اپنے حیدرآباد وکن کے قیام میں ایک مقامی امیر مرزا وحید بیگ کی بیٹی سے کی۔ اس شادی سے ان کے کئی اولاد ہوئی۔ ان میں ایک عبداللہ تھے جو مشہور امبیلہ میں وہابیوں کے سردار تھے۔ پھر نکاح بیوگان کی سنت کو جاری کرنے کے لئے انھوں نے الہی بخش کی بیوہ دختر سے بھی شادی کی۔ یہ مقامی مسلمانوں کے اعلیٰ خاندان اور اعلیٰ سماجی رتبہ والوں میں نکاح ہو گا کی پہلی مثال تھی۔ اُس وقت اس شادی نے بڑی سنسنی پھیلا دی مگر انھوں نے اپنے عقیدے کی پختگی کا جرأت سے مظاہرہ کر دیا۔

عنایت علی کے ابتدائی حالات: چھوٹے بھائی عنایت علی ۱۲۰۸ھ (۱۷۹۲ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کا قد بھی اوسط اور رنگ گورا تھا۔ ڈاڑھی رکھتے تھے اور مضبوط اعصاب اور خوبصورت ڈیل ڈول اور پرکشش شخصیت رکھتے تھے۔ انھوں نے بھی ابتدائی تعلیم اپنے والد سے پائی۔ بعد میں وہ شہر پٹنہ کے ایک ممتاز رئیس اور تفسیر کے عظیم استاد سید محمد مسافر کے شاگرد ہوئے۔ ان کی پہلی شادی سید محمد مسافر کی دختر آمنہ سے ہوئی۔ ان کے انتقال کے بعد پندرہ سال تک جب کہ وہ زیادہ تر بہار اور بنگال میں تبلیغی دورے میں مصروف تھے کوئی شادی نہیں کی۔ الہی بخش

۱۷ یہ ایک مشہور اسلامی تعلیم گاہ تھی۔

کے فرزند اکبر علی کی وفات کے بعد ولایت علی نے عنایت علی کی شادی اکبر علی کی بیوہ اور محمد حسین کی دختر بی بی شریفین سے کر دی جو اپنے شوہر (عنایت علی) کے ساتھ جسور میں مفیض الدین کے گھر میں رہیں اور ہمیشہ شوہر کے تبلیغی دوروں میں ان کے ساتھ رہیں۔ مفیض الدین نے بھی اپنے خاندان کے اور افراد کے ساتھ سید احمد سے بیعت کی تھی اور سرحد پر ان سے جا ملے۔

عنایت علی کی زندگی اور جدوجہد اُس جوش اور جرأت کے لئے نمایاں ہے جس کا انہوں نے اس تحریک کے مقصد کے لئے ثبوت دیا۔ وہ دو دور اقتادہ مقامات شمالی و مغربی سرحد اور مشرقی بنگال میں بیک وقت کام کرتے تھے۔ اول الذکر میں جہاد کرنے اور جنگ کی نگرانی کرنے میں اور آخر الذکر میں تبلیغ کرنے اور نئے رنگروٹ بھرتی کرنے میں مصروف رہے۔

ولایت علی اور عنایت علی کی مراجعت ہند: سرحد پر کچھ دن قیام کے بعد سید احمد نے دونوں بھائیوں کو تبلیغ اور انتظامی کام کے لئے ہندوستان میں تعینات کر دیا۔ بد قسمتی سے ہم ان کے ہندوستان کو مراجعت کی صحیح تاریخ سے واقف نہیں۔ سید احمد نے بیٹنہ کے قائدین کے نام اپنے ایک مکتوب میں علی برادران کے ہندوستان میں متعین کرنے کا ذکر کیا ہے۔ اُس وقت سے لیکر ۱۸۳۹ء میں عنایت علی کے سرحد جانے تک دونوں بھائی مشرقی اور جنوبی ہند کے اکثر حصوں میں تنظیمی اور تعمیری کاموں میں مصروف رہے۔

دونوں بھائی اول اول سید احمد کی رفاقت سے جدا ہوئے اور سرحد سے چلے آنے پر دل سے راضی نہ تھے مگر سید احمد نے یہ کہہ کر ان کو آمادہ کر لیا کہ وہ ان کوچ کی طرح باہر بکھیر رہے ہیں۔ ان کی یہ پیش گوئی لفظ بلفظ صادق آئی اور بعد کے سالوں میں ان کی مساعی بار آور ہوئیں۔ وہ ہندوستان سے آدیوں اور روپے کی ڈاک چوکی کے ایسے نظام کی تکمیل کے لئے ہمارا ثابت ہوئے جو حیرتناک

مہارت کے ساتھ آنکھوں میں خاک جھونکنے میں عرصہ دراز تک کامیابی کے ساتھ جاری رہا۔ ان کے کارناموں کے دو اہم ذرائع معلومات سوانح احمدی اور تذکرہ صادقہ ہیں۔ آخر الذکر میں ولایت علی کے جو حالات مذکور ہیں وہ زیادہ تراول الذکر کے بیانات پر مبنی ہیں جو ایک عام قسم کا مجمل تذکرہ ہے۔ اس میں ترتیب زمانی بہت کم ہے۔ مثلاً ولایت علی کے اپنے والد کے انتقال کی (۱۸۳۱ء میں) خبر سنتے ہی پٹنہ واپس آتے ہی ان کے مشاغل کے سلسلہ میں صاحب سوانح نے سید عباس اور زین العابدین کی آمد کا ذکر کیا ہے جو مبارز الدولہ کی سازش کے بعد حیدرآباد سے نکل بھاگے۔ حالانکہ یہ واقعہ بہت بعد ۱۸۳۹ء کا ہے مگر ۱۸۳۱ء کے واقعات کے ساتھ خلط ملط کر دیا گیا ہے۔

ہند میں تبلیغی و تنظیمی سرگرمیاں: اس زمانے میں علی برادران کی جدوجہد خالصتاً تبلیغی تھی۔ وہ مقصد کو آگے بڑھانے والے بے غرض اور جوشیلے کارکن تھے۔ اپنی افتاد طبع اور تقاضا سے حالات سے یہ دونوں بھائی اپنی کاروائیوں کی کوئی یادداشت نہیں رکھتے تھے۔ اس لئے اس پہلو پر ان کے متعلق وہابیوں کی دستاویزات یا گورنمنٹ کی تحریرات سے ہمیں بہت کم اطلاعات دستیاب ہوئی ہیں۔ سرکاری تحریرات کا ذکر اس وقت کرتے ہیں جب ان کی باعینانہ کاروائیوں کی طرف حکومت کی توجہ منطف کرنا ہوتی ہے۔ مگر یہ کاروائیاں بعد کی ہیں جو ۱۸۳۰ء سے ظہور میں آئیں اور اسی کے بعد سے ہمیں زیادہ مکمل حالات ملتے ہیں۔

سید احمد نے ولایت علی کو سید کرامتہ اللہ اور عبدالقادر بہاری کے ساتھ بمبئی اور دکن میں کام کرنے کے لئے متعین کیا۔ بمبئی میں انھوں نے محمد علی رامپوری کو اپنی جگہ دیدی جو مدراس چلے گئے۔ وہ ابھی دکن ہی میں تھے کہ بالاکوٹ کی تباہی کی المناک خبر پہنچی۔ قریب قریب اسی وقت ان کے والد فتح علی بھی پٹنہ میں وفات پا گئے۔ اس لئے وہ مدھیا پر دیش (صوبہ متوسط) کے راستے سے پٹنہ چلے گئے۔ عنایت علی باپ کے مرض کی خبر سن کر پہلے پٹنہ آچکے تھے۔

پٹنہ میں وہابی تحریک کی تنظیم نو: پٹنہ پہنچ کر ولایت علی نے تحریک کی تنظیم نو اپنے ہاتھ میں لی۔ بہت سے لوگوں نے ولایت علی کے ہاتھ پر تجدید بیعت کی۔ انھوں نے مقامی مسجد نمویاں کو جو پٹنہ میں وہابیوں کا ایک اہم مرکز تھی محمد حسین کے ذمہ کیا، اور اضلاع مظفر پور، دربھنگہ، اور چھپرہ میں بھی تحریک کی ذمہ داری انھیں کو سونپی شہر کی ایک اور مسجد فخر الدولہ میں نماز جمعہ دوبارہ جاری کی۔ ان کے گھر میں بھی مجلسیں ہوتیں جہاں سادہ اور آسان زبان میں قرآن و حدیث کی تعلیم دی جاتی اور دینی و سیاسی مسائل پر وعظ ہوتے۔ مقصد یہ تھا کہ لوگ احکام الہی کو آپ سمجھ لیں۔ قرآن مجید کو براہ راست خود سمجھنے اور درمیانی علما سے جن کے پھیلائے ہوئے رسم و رواج کے خلاف یہ تحریک شروع کی گئی تھی، آزاد اور بے نیاز ہو جانے پر زور دیا جاتا تھا۔ ان مجلسوں میں عورتیں بچے اور ان پر پڑھ بھی شریک ہوتے۔ عبدالقادر کا ترجمہ قرآن اور قطب الدین دہلوی کا ترجمہ مشکوٰۃ دہلی سے منگوا کر حاضرین مجلس میں ان کے نسخے کثیر تعداد میں تقسیم کئے جاتے۔

ولایت علی دوروں پر بھی نکلتے۔ اکثر اوقات کسی خاص جگہ پر کئی کئی اقامت کر لیتے اور کسی ایک آدمی کو منتخب کر کے اُس کو ہتھیال بنانے اور تربیت دینے پر تمام تر توجہ صرف کرتے اور مقامی تنظیم اُس کے سپرد کر دیتے۔ ان دوروں میں ان کو ہر شعبہ زندگی کے آدمیوں سے ملنے کا اتفاق ہوتا، کسانوں سے کھیتوں میں اور جولا ہوں سے ان کے کرگہوں پر۔ انھوں نے بہار شریف کا دورہ بھی کیا جو ایک بڑا صوفیانہ مرکز تھا اور وہاں بھی اپنے پیغام کی اشاعت کی کوشش کی۔

عنایت علی کا دورہ بنگال: عنایت علی نے شمالی مغربی سرحدت بونٹ کے بعد بنگال کے مشرقی اضلاع کے بے شمار گاؤں میں بڑے وسیع پیمانے پر تبلیغی دورے کئے۔ اُس زمانہ کی پولیس کی رپورٹوں سے بھی ان کے کاموں کی مفصل اور مستند

لہ یہ مسجد تھانہ خواجہ کلال (پٹنہ سٹی) سے تھوڑی دور مشرق میں واقع ہے۔

اطلاعات دستیاب ہیں۔ مارچ ۱۸۴۳ء میں ہی زیریں صوبوں کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے حکومت کو مسلمان "ملاؤں" کے ایک جتھے کی موجودگی کی رپورٹ لکھی تھی جو بارہ سیتھ جسور پینہ اور راجشاہی وغیرہ اضلاع کے چکر لگاتے پھرتے، سکھوں اور حکومت کے حلیفوں کے خلاف جہاد کا وعظ کرتے "اس غرض سے رنگوٹ اور روپے فراہم کرنے کی کوشش کرتے رہتے ہیں۔ اس گروہ کا سردار ایک پٹنہ کا باشندہ عنایت علی نامی ہے۔ رپورٹ میں مزید یہ بھی درج ہے کہ رنگوٹ حاصل کرنے میں ان کو زیادہ کامیابی تو نہ ہوئی مگر روپے کی تحفیل زیادہ کامیابی سے جاری ہے۔"

عنایت علی کے متعلق سپرنٹنڈنٹ پولیس کی رپورٹ: اسی افسر نے بعد میں ایک اور رپورٹ ملاؤں کے دوسرے سربراہوں کے متعلق ارسال کی تھی جس میں ان کی تبلیغ کے اغراض و مقاصد اور عوام میں ان کی تبلیغ کو بے اثر کرنے کی مساعی کی اطلاع دی تھی۔ اس میں یہ بھی لکھا تھا کہ عنایت علی کے علاوہ کرامت علی اور زینودین (عابدین) حیدر آبادی بھی اضلاع مذکورہ میں کام کر رہے ہیں۔ رنگوٹوں کے لئے ان کی اپیل کا خیر مقدم حوصلہ افزا ہوا۔ انھوں نے جنگی پور کے پاس ضلع مرشد آباد کے ایک گاؤں نارائن پور کو تارکا ہے جہاں یہ لوگ سرحد کی طرف روانہ ہونے سے پہلے جمع ہوتے ہیں۔

۱۵ حکومت بنگال۔ محکمہ عدلیہ، فائل نمبر ۲۱-۲۲ مورخہ ۲۹ مئی ۱۸۴۳ء۔ ان دستاویزات پر جو اطلاعات مبنی ہیں وہ پہلی بار شائع کی جا رہی ہیں۔ کلکتہ ریویو ۱۸۶۰ء میں ارنسٹی کے مقالات کی بنا پر مبہم طور پر اتنا معلوم تھا کہ عنایت علی اس وقت مشرقی بنگال میں اپنا کام کر رہے تھے۔ مگر اب تک ان ابتدائی ذرائع معلومات سے کام نہیں لیا گیا تھا۔ خود وہابی ذرائع بھی عنایت علی کی کارروائیوں کے اس پہلو پر زیادہ معلومات مبہم نہیں پہنچاتے۔

۱۶ ڈبلو ڈی سپرنٹنڈنٹ پولیس صوبہ زیریں کامراسلہ بنام ایف جے ہیلیڈے سکرٹری حکومت بنگال محکمہ عدالت نمبر ۵۸۱ مورخہ ۲۹ مارچ ۱۸۴۳ء ۱۷ ایضاً مراسلہ ۶۸ مورخہ ۵ اپریل ۱۸۴۳ء

۱۸ جو نپور کے متوطن تھے ۱۸۳۳-۳۷ء۔ ابتدا سے ۱۸ سال میں سید احمد کی بیعت کی۔ بنگال میں متعین ہوئے اور بڑے پیمانے پر تبلیغی کام کرتے رہے۔

سپرٹنڈنٹ پولیس نے یہ اطلاع بھی دی کہ مشرقی اضلاع کی مسلمان آبادی زیادہ تر "فرائضی یعنی وہابیوں پر مشتمل" یہ لوگ باہم نہایت متحد، جوشیلے مذہبی، ایک خاص سردار کے ماتحت، ہماری سرکار کے دشمن ہیں اور ان پر نہایت مستعدی سے کڑی نظر رکھنا ہے ان صوبوں میں اگر کسی شورش کا خطرہ ہے تو اسی گروہ کے مذہبی جنون کی براہ نگیختگی سے ہے۔ سپرٹنڈنٹ پولیس نے مزید لکھا کہ متعلقہ اضلاع کے مجسٹریٹ بالخصوص مرشدآباد کے مجسٹریٹ ان لوگوں کے اجتماع اور ان میں ایسی احمقانہ تبلیغات پر کڑی نظر رکھنے کے اقدامات کر رہے ہیں۔ اگر کسی جبر و تشدد کی ضرورت دیکھی گئی تو "ان کو مرعوب کرنے کے لئے فوراً طاقت استعمال کی جائیگی۔"

ایک اور خط میں سپرٹنڈنٹ پولیس نے یہ رپورٹ بھی کی ہے کہ عنایت علی کچھ عرصہ سے بنگال کے مختلف حصوں کا دورہ کر کے اپنے متبعین سے روپیہ جمع کر رہے ہیں اور میرے علم میں جہاد اور سید احمدؒ کے ظہور ثانی کے عقیدوں کو امداد کے حصول کے لئے استعمال کر رہے ہیں..... بہر کیف وہ اس حصہ ملک کو چھوڑ کر ٹپنہ چلے گئے ہیں۔ ایک اور مراسلہ میں حکومت کو رپورٹ ملی کہ میں نے مجسٹریٹ بھاگلپور کو لکھ کر یہ دریافت کیا ہے کہ پتہ لگائیں آیا کوئی گروہ ان کے ضلع سے گذر کر شمالی مغربی سرحد کی طرف جا رہا ہے۔ مجسٹریٹ کے جواب سے معلوم ہوا کہ اضلاع باراسیٹ، جسور، مین سنگھ اور راجشاہی کے کوئی آٹھ نو سو آدمی مختلف گروہوں میں مکہ کی طرف جا رہے ہیں۔

انگریزی حکومت کی پولیس کو ہدایات، حکومت نے سپرٹنڈنٹ پولیس کی ان تمام رپورٹوں

لے سپرٹنڈنٹ پولیس نے وہابی اور فرائضی تحریکوں کے نمایاں پہلوؤں اور نظریوں میں آشاہد لکھرائی گہری نظر کا ثبوت دیا ہے۔ یہ فرائضیوں کی ڈالی ہوئی داغ بیل تھی جس نے بعد میں بنگال میں وہابیوں کا تعمیر کام آسان کر دیا۔ سپرٹنڈنٹ پولیس نے بعد کے ایک مراسلہ مورخہ ۱۳ اپریل ۱۸۴۳ء میں کرامت علی اور عنایت علی کے درمیان احکام عبادات کے فرق سے دونوں کے متبعین کے فرق کی نشان دہی بھی کی ہے اور بتایا ہے کہ "کرامت علی کے متبعین عنایت علی کے پیچھا نہیں جن کا اثر میرے زیر ملاحظہ مذکورہ اضلاع میں زیادہ قوی ہے۔"

کے جامع جواب میں وعظ و تبلیغ کو زیادہ اہمیت نہ دینے کا اظہار کرتے ہوئے اسے ہدایت کی کہ سربراہوں کو بالخصوص اور عوام کو بالعموم ترغیب و ترہیب پر مشتمل ایک محتاط ہدایت نامہ جاری کرے کہ اگر کوئی ایسا بیہودہ فعل یا نقص امن کی حرکت صدر میں آئے جس میں وہ یا ان کے متبعین آلودہ ہوں تو وہ ذرہ دار ٹھہرائے جائیں گے۔ مختلف اضلاع کے مجسٹریٹ اپنے اپنے ضلعوں میں ایسی ہی کارروائی کریں اور مناسب مواقع پر بلووں اور شورشوں کے نتیجے سے صحیح وقت پر متنبہ کر دیں۔ ان کو یہ فہمائش بھی کی گئی کہ وہ اپنے اضلاع میں ایسی کارروائیوں کی ہفتہ وار رپورٹیں بھیجتے رہیں اور سپرنٹنڈنٹ پولیس کو ہدایت کی گئی کہ ایسے مقامات کا ملاحظہ کرتا رہے جن پر تنگ و شبہہ واضح ہو۔ عوام الناس کو بھی کسی غیر معمولی اجتماع سے متنبہ کر دیا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یہ ہدایت بھی کر دی گئی کہ اس معاملہ کی تحقیقات کے نتیجوں سے وقتاً فوقتاً حکومت کو مطلع کرتا رہے۔

بنگال میں عنایت علی کی حکمت عملی: اس زمانے میں بنگال میں عنایت علی کا سب سے بڑا کام دیہاتیوں میں بلدیاتی اور اجتماعی روح کا نشو و ارتقا، حکومت کی سول نافرمانی اور حکومت کے بعض انتظامی نظاموں بالخصوص عدالتوں کے خلاف ہڑتال کی پالیسی چلانا تھا۔ عنایت علی بنگال میں جو دوہائی مشنری بھیجتے تھے اکنیلی ان کی تعلیم کے ایک بہت اہم پہلو پر زور دیتا ہے وہ لکھتا ہے کہ ”جو لوگ اس ملک سے ہجرت کر کے جہاد میں شریک ہونے سے مجبور ہوتے ان کو ہدایت کی جاتی تھی کہ مجبوں مقادمت کریں، اور اپنے کافر حاکموں سے تمام تعلقات منقطع کر لیں تاکہ حکومت کے اندر حکومت کے بالکل خلاف ایک طاقت قائم کر لیں۔ کافروں اور ان کی عدالتوں سے جو سودگی ڈگری دیتی ہیں، اجتناب کرنا چاہئے۔ اور بھائی بھائی کے درمیان شکایات کا فیصلہ مقامی سردار

لہ یہ طرز فکر اس سے پہلے بھی اور مواقع پر جیسے حیدرآباد سازش کے موقع پر حکومت کے طرز عمل کے مطابق ہے مگر یہ ان کامل اور واضح ہدایات سے متفاد ہے جو حکومت نے اس خطرے کے خلاف امتناعی اقدامات کے متعلق نافذ کئے شاید یہ ماتحت حکام کے سامنے ایک جراتمندانہ عزم کی نمائش ہے۔

کے ہاتھ میں دے دیا جائے، لے

اس جدید متحدہ معاشرے کا مرکز گاؤں کی مسجد تھا۔ مسجد کے پیش امام کے ذمہ مذہبی خدمات کے انجام دینے کے مقصد ^{علاوہ} کے درمیان عدالتی مقدمات کا فیصلہ بھی کر دیا گیا۔ امت کو اپنے قضیے سرکاری عدالتوں میں لے جانے سے ممانعت کر دی گئی اور اسے آمادہ کیا گیا کہ ان کا تصفیہ اپنی ہی پنچایتوں میں کرالیا کرے۔ بعض اہم مقام کو جہاں بڑی مسجد ہوتی بڑے عدالتی ادارے کے طور پر منتخب کر لیا جاتا۔ جس کا رقبہ دس میل تک محیط ہوتا۔ وہاں کوئی بہتر تعلیم یافتہ پیش امام مقرر کیا جاتا جسے عدالتی اور دوسرے معاملات میں جن میں اعلیٰ صلاح و مشورہ کی ضرورت ہوتی اپیل سننے کا اختیار بھی ہوتا۔ مقامی چند دن کی تحصیل کا مرکز بھی مسجد ہی ہوتی۔ آگے چل کر ظاہر ہو گا کہ دہائیوں کا یہ نظام پیشتر کے فرائضی دستور کا مرہون منت تھا۔ یہ زیادہ تر عنایت علی کی کامیاب تبلیغی کارروائی ہی کا نتیجہ تھا کہ بعد کے مراحل میں سرحد پر جنگ جاری رکھنے کے لئے بنگال سب سے آگے تھا۔

ولایت علی کا دورہ بنگال: اس زمانے میں خود ولایت علی بنگال کے دورے پر روانہ ہوئے۔ اس سے پہلے زین العابدین اور عباس حیدر آباد سے پلٹے آئے، اور ولایت علی نے تحریک کی تنظیم کے لئے ان کو خلیفہ بنا کر اڑیسہ اور الہ آباد میں تعینات کیا۔ انھوں نے بدیع الزماں کو کلکتہ کا مقامی خلیفہ متعین کیا اور وہاں مصری گنج کی مسجد ان کے ذمہ کی۔ اس کے بعد وہ سفر حج کے سزم سے مہنتی گئے جہاں وہ دو مہینے ٹھہرے اور عنایت علی کو اپنا خلیفہ مقرر کیا۔ حج ادا کر کے انھوں نے بمبئی، نجد، یاسر، اور مسقط کا سفر کیا۔ اس سفر میں وہ مشہور عالم قاضی شوکانی سے ملے۔ ان سے فن تفسیر کی سند حاصل کی اور ان کی بہت ہی تمدنی ہندوستان لائے۔ دو سال کے بعد وہ ہندوستان لوٹے، بنگال کے کئی اضلاع کے دورے کئے اور

کہ کلکتہ ریویو جلد ۵۱، صفحہ ۱۸۷-۱۸۸

اپنے چھوٹے بھائی کے ساتھ پٹنہ واپس آئے۔ اس طرح ان کے کارناموں کا ایک حصہ تمام ہوا جو زیادہ تر ایک مستقل اور مضبوط اندرونی تنظیم پر مشتمل تھا۔ سکھوں کے مقبوضات کی انگریزوں کو منتقلی ان دونوں کے کارناموں کا دوسرا اور زیادہ عملی حصہ رنجیت سنگھ کی موت کے فوراً بعد سرحد پر شروع ہونے والا تھا۔ ۱۸۳۹ء میں رنجیت سنگھ کی موت اور اس کے بعد پنجاب میں عام خانہ جنگیاں جو پہلی انگریز سکھ جنگ کا باعث بنیں سرحد پر علی براوران کی کاروائیوں کا پس منظر بنیں۔ ۹ مارچ ۱۸۴۶ء کے معاہدے کی رو سے سکھوں نے جلندرد و آب انگریزوں کے حوالہ کیا اور ۱۵۰۰ ملین (ڈیڑھ کروڑ روپے) کا تاوان نقد ادا کرنے پر راضی ہو گئے۔ خزانے میں اتنی رقم موجود نہ تھی اس لئے دریائے سندھ اور بیاس کے درمیان پورا کوہستانی علاقہ مع کشمیر اور بالائی ہزارہ ۱۰ ملین (ایک کروڑ روپے) رقم تاوان کے عوض انگریزوں کی نذر کرنا پڑا۔ باقی رقم معاہدہ کی توثیق کے وقت ادا کرنا تھی۔ واکذشتہ رقبے میں سے دریائے راوی کے مغرب اور دریائے سندھ کے مشرق کا علاقہ ہزارہ اور کشمیر کے گورنر گلاب سنگھ کے ہاتھ ساڑھے سات ملین (بچھتر لاکھ) نانک شاہی روپے پر فروخت کرنا پڑا اس رقبے میں بالائی ہزارہ بھی شامل تھا۔ دوسری طرف زیریں ہزارہ کے کئی مقامی پٹھان قبائلی سکھ حکومت کے کامل انہزام اور خاتمہ کا یقین کر کے نیم آزاد سے ہو گئے اور سکھوں کی سرپرستی اور بالادستی سے کامل طور پر آزاد ہونے کی جدوجہد کرنے لگے۔ بالائی ہزارہ میں بھی گلاب سنگھ سے حاصل کئے ہوئے علاقے پر کوئی موثر قابو نہ رکھتا تھا۔ وہ وہاں تک کشمیر پر مکمل قبضہ کئے بغیر پہنچ بھی نہ سکتا تھا۔ مگر امام الدین گورنر کشمیر نے لاہور سے ایک خفیہ ہدایت پر کشمیر گلاب سنگھ کو قبضہ دینے سے انکار کر دیا۔ چنانچہ علی طور پر کشمیر اور بالائی ہزارہ دونوں

۱۵ جے ڈی کنگہام تاریخ سکھ۔ کلکتہ ۱۹۰۲ء تہمتہ صفحہ ۱۷-۲۵

قبضے سے باہر تھے اور بے چینی اور بغاوت سے بھرے ہوئے تھے۔ دونوں جنگوں میں سکھوں کی مخالفت کے مرکز بن گئے۔ ان مرکزوں کی قیادت بالائی ہزارہ میں نایت علی کے اور زیریں ہزارہ میں اکبر شاہ کے ہاتھوں میں تھی۔

نئے حاصل کردہ علاقوں میں اقتصادی اور انتظامی معاملات میں برائے نام امن قائم کرنے کے لئے ایٹ کو ہزارہ میں متعین کیا گیا۔ ساتھ ہی دربار لاہور کا زیڈنٹ ہنری لارنس ایک چھوٹا سا دستہ نیکر جموں کی طرف بڑھا۔ وہاں سے انے ہربرٹ ایڈورڈز کو امام الدین کے پاس بھیج دیا۔ اور امام الدین کو ہوار کے مادہ کر لیا گیا کہ کشمیر گلاب سنگھ کے حوالہ کر دے۔

ولایت علی کی روانگی سرحد: اسی نراج اور بے امنی کے زمانے میں سید ضامن نے ولایت علی کو لکھکر دعوت دی کہ آئیں اور سید احمد کے کام کا ٹوٹا ہوا شتہ پھر ہاتھ میں لیں جس کے لئے حالات سازگار ہیں۔ چنانچہ ولایت علی نے اپنے چھوٹے بھائی کو بنگال سے بلا لیا جہاں وہ اس وقت مصروف تبلیغ تھے۔ نایت علی کوئی دو ہزار متبعین کی جمیعت کے ساتھ پٹنہ آگئے۔ حکومت کے شبہ سے بچنے کے لئے پوری جمیعت چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بانٹ دی گئی۔ ہر ایک لی تھوڑے تھوڑے وقفے کے بعد پٹنہ سے کوچ کرتی رہی اور تقریباً پانچ مینوں میں روانہ ہو گئی۔ روانگی کا یہ سلسلہ جولائی ۱۸۴۳ء میں شروع ہوا مگر رعنائیت علی کچھ بعد نومبر میں روانہ ہوئے اور ۱۸۴۴ء کے اواخر میں سرحد پہنچے۔ جو لوگ ان کے ہمراہ تھے ان میں سورجگڑھ کے اولاد علی ایک نمایاں شخصیت تھے۔ یہ سید احمد کی شہادت کے وقت اور اس کے کچھ عرصہ بعد تک سرحد میں تھے۔

سید ضامن شاہ پسر حسن علی شاہ وادی کاغان کے سردار وہابیوں کے مستقل حمایتی اور لاکوٹ اور بالائی ہزارہ پر دوبارہ قبضہ دلانے میں ان کے مددگار تھے۔ ۱۸۴۱ء میں وفات پائی۔ ان کے بھائی نوبت شاہ بھی وہابیوں کے زبردست حامی تھے۔

مگر مکہ کے انتظام کے لئے وہ لوٹ آئے تھے۔

فتح خاں کی شہر انگیزی: سید احمد کی شہادت (۱۸۳۱ء) اور عنایت علی کی روانگی (۱۸۳۲ء) کے درمیانی وقفے کے واقعات کئی انگریزی مصنفوں نے اختصار سے بیان کئے ہیں۔ بیلو کے بیان کے مطابق فتح خاں پنجتاری جو اس وقت تک بہایوں کا مددگار تھا اب مخالف ہو گیا تھا۔ اور سمٹانہ میں وہابیوں کی مختصر ٹولیوں کو ستارہ ہا تھا۔ چنانچہ عنایت علی اور مقصود علی آدمیوں اور روپے کی ایک کثیر تعداد کے ساتھ ٹپٹہ سے روانہ ہوئے پکھلی میں اولاد علی مل گئے انھوں نے اس علاقہ پر قبضہ کر لیا اور خراج لگا دیا۔

بالاکوٹ سے سکھوں کا اخراج، اکنیلی کے بیان کے مطابق مولوی قاسم پانی بتی جو نصیر الدین کی سندھ فوج میں تھے کا غان چلے گئے۔ وادی کا غان کے دونوں سردار ضامن شاہ اور اس کے بھائی نوبت شاہ ان کے مرید ہو گئے۔

انھوں نے ہندوستان کے مختلف خلفا کے نام خط لکھ کر ان کو سید احمد کے قریب الوقوع ظہور ثانی کی یاد دلائی اور آنے کی درخواست کی۔ عنایت علی ٹپٹہ سے

آئے اور سکھوں کو بالاکوٹ سے مار بھگا یا۔ عنایت علی کے ہمراہ زین العابدین بھی گئے۔ اور نجف خاں کا غانی کی امداد میں جو اپنی مملکت سے محروم کر دیا گیا تھا سکھوں

سے ایک جھڑپ میں حصہ بھی لیا۔ اس کے فوراً بعد نجف خاں اور قاسم کے درمیان سید احمد کے ظہور ثانی کے وقت مسئلہ پر غلط فہمی پیدا ہو گئی۔ اور قاسم کلکتہ واپس

چلے گئے۔ تحریک کے ایسے معتد متبع کا انحراف اس کے مستقبل پر ایک المناک ضرب تھی، لیکن برادران علی کا استقلال تمام مشکلات پر غالب آ گیا اور تھوڑے

ہی عرصے میں تحریک سید احمد کے زمانے سے زیادہ نہیں تو اتنی ہی طاقتور ہو گئی ہزارہ گنڈہ پتھر کے مطابق وہابیوں نے سکھوں کی فوجوں کو جو شکست دیا،

بیر کھنڈ، گڑھی حبیب اللہ اور اگرور کے قلعوں میں متعین کھنڈیں شکست دیدی اور ان پر قبضہ کر لیا۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ بعض خفیف فرقوں کے سوا یہ سارے متفرق بیانات ایک دوسرے کی تائید کرتے ہیں۔

رضا کاروں کو تحریک میں شرکت کی دعوت، اس موضوع پر زیادہ معتبر اور اہم تر اطلاع ایک مشترکہ مکتوب مورخہ ۹ ذی قعدہ ۱۲۶۳ھ (۲۹ اکتوبر ۱۸۴۶ء) سے ملتی ہے جو پٹنہ، جیسور، فریدپور، باراسیٹ، ڈھاکہ، کلکتہ، رامپور وغیرہ ہم کے مقتدر اشخاص نے ملکر لکھا تھا۔ غالباً یہ ایک قسم کی عام روداد تھی جو برطانوی ہند میں اس تحریک کے پیروں کے نام سرحد سے بھیجی گئی تھی، اس میں وہاں کے تمام وقائع بیان کئے گئے اور اندرون ملک سے رضا کاروں کو دعوت دی گئی تھی کہ آئیں، تحریک میں شریک ہوں اور فتح و نصرت میں جس کا وقت قریب ہے حصہ لیں۔ اسی مضمون کے خط اور مقامات اور اشخاص کے نام لکھے گئے ہونگے۔ افسوس ہے کہ ہمیں اب یہی ایک خط اس موضوع پر دستیاب ہے۔ یہ دسمبر ۱۸۴۵ء سے اکتوبر ۱۸۴۶ء کے مفصل واقعات بتاتا ہے۔

امارتِ عنایت علی: یہ حالات اس بیان سے شروع ہوتے ہیں کہ عنایت علی (نومبر ۱۸۴۵ء میں) ذوالحجہ ۱۲۶۱ھ کو مجاہدوں، سرداروں اور علما کی طرف سے جو وہابی ریاست میں حاضر تھے امیر منتخب ہوئے۔ صامن شاہ کاغانی نے بھی اپنی اطاعت پیش کی۔ امارت ہاتھ میں لیکر عنایت علی نے سپاہی کی تعیناتی اور اپنے ساز و سامان کی دوبارہ تنظیم شروع کی۔ اس کے کچھ ہی قبل بالاکوٹ پر سکھوں سے لیکر

۱۵۔ مکتوب پٹنہ یونیورسٹی لیبیری کے مخطوطہ مکتوبات سید احمد کا آخری حصہ ہے اور صفحات ۲۲-۲۹ پر محیط ہے۔ غلام رسول مہر نے بھی اس کا حوالہ دیا اور اس سے استفادہ کیا ہے۔ ان کو اس کا ایک نسخہ مسعود عالم ندوی مرحوم سے دستیاب ہوا اور انھوں نے اسے کتب خانہ آصفیہ حیدرآباد سے حاصل کیا تھا۔ حیرت تو یہ ہے کہ ندوی مرحوم نے اسے خود اس تحریک پر اپنی مختصر تصنیف میں پورا استعمال نہیں کیا۔ مہر کی کتاب جلد ۴ جزو ثلث کے ابواب ۲-۱۵۰ سی دستاویز پر مشتمل ہیں۔

قبضہ کیا جا چکا تھا۔ محرم ۱۲۶۲ھ (دسمبر ۱۸۴۵ء) میں گڑھی صیب اللہ پر اچانک حملہ کیا گیا، فتح گڑھ کا محاصرہ کیا گیا اور ایک مہینے میں اسے فتح کر لیا گیا۔ لاہور میں مرکزی حکومت کی کمزوری اور بد نظمی سے ان مضافاتی علاقوں کے قلعوں میں متعین افواج غیر یقینی نازک صورت حال سے دوچار تھیں اور ان میں سے اکثر قلعے چھوڑ کر نکل رہی تھی۔ عنایت علی نے کئی سکھ کمانداروں کو پیغام بھیجا کہ اطاعت قبول کر لیں۔ ان میں سے کچھ نے مصالحتی عبارت میں جواب دیا اور بعض نے محاصرہ الفاظ میں۔ مگر تھوڑے عرصے میں پکھلی، دھماور، اوریش، تناول اور ہزارہ کے کوئی بائیس قلعے فتح ہو گئے اور اسلحہ اور دوسرے سامانوں کی کثیر مقدار پر قبضہ ہو گیا۔ بہت سے دولت مند ہو کار گرفتار کر لئے گئے۔

معرکہ نوشہرہ: اسی درمیان میں ایک سکھ قلعے کی فوج پکھلی پہنچ گئی۔ اس کی آمد نے مقامی قبائل میں کچھ بلچل مچادی اور وہ وہابیوں کو چھوڑ کر سکھوں سے جا ملے۔ انھوں نے وہابیوں سے جو عسکر کی تحصیل کے لئے وہاں گئے تھے طنزاً کہا کہ پہلے سکھ فوج کو شکست تو دے لیں عنایت علی نے بے خوف و خطر ایک فوج نوشہرہ بھیج دی جس میں کچھ تنخواہدار سپاہی تھے اور نشی شجاع الدین کے زیرِ کمان ساٹھ وہابی تھے اور مولوی مقصود علی دو سو آدمیوں کے ساتھ سلطان حسین کی مدد کے لئے مظفر آباد بھیج دئے گئے۔

سکھ فوج کے ساتھ آدریش اس طرح بیان کی گئی ہے: ہنو تھو سکھ سوار اور پانچ ہزار پیادے پہاڑ کی دونوں طرف ڈھال پر جمع تھے۔ چھپے بارہ ہزار مقامی قبائل تھے جو اپنی معمولی روش کے مطابق بظاہر وہابیوں کے ساتھ مگر واقعی باطن میں سکھوں سے ہمتوں کے ہوتے تھے اور منتظر تھے کہ جیسے ہی ان کی امید کے مطابق وہابیوں کو شکست ہو

۱۲ دھمور یاد ہا تو را ایٹ آباد سے ۷ میل مشرق دور ندی کے راستے کنارے پر ایک بڑا اور زر خیز گاؤں ہے پہلے اس پورے علاقے کا یہی نام تھا ۱۲ ضلع ہزارہ کا ایک غیر آباد علاقہ یا منگل علاقے کے جنوب میں۔ ایٹ آباد پھاونی اس کے جنوبی کنارے پر واقع ہے۔

ان کو لوٹ لیں۔ ظہر کی نماز کے بعد ڈھبڑ ہوئی جس کی ابتدا سکھوں کی طرف سے ایک زوردار گولے سے ہوئی۔ وہابیوں کے علمبردار محمد عثمان کے بازو پر ایک گولی لگی۔ جھنڈے کو گرتا دیکھ کر قبائلیوں نے سمجھا کہ وہابیوں کو شکست ہو گئی، مگر اسی علمبردار نے جھنڈا اونچا کر دیا۔ وہابی ہر طرف سے پل پڑے اور روہیلوں نے منظم حملہ کر دیا۔ سکھوں کے قدم اکھڑ گئے اور پیچھے ہٹنے لگے۔ وہابیوں نے جوش سے ان کا تعاقب کیا۔ مقامی قبائلیوں نے ان کے ایک لاکھ روپے سے زائد کے ذخیرے لوٹ لئے۔ بارش کا موسم تھا، زمین میں کیچڑ ہو رہی تھی اور اونچی اونچی شالی گھاس اگی ہوئی تھی اس لئے سکھوں کیلئے بڑی سے بھاگ جانا آسان نہ تھا۔ مقامی لوگوں نے بے جگری سے ان کا تعاقب کیا۔ وہ وہابیوں کی فتح دیکھ کر سکھوں پر جھپٹے اور ان کے اسلحہ اور سامان لوٹنے سے لئے ان کو قتل کرنا شروع کیا۔ مغلوب سکھ فوج کے پسپا اور منتشر سپاہیوں کا قتل و غارت تین روز جاری رہا، اگرچہ وہ سب منسویٹن و توشن واسے تھے وہ ان لوگوں کے ہاتھوں لٹتے رہے جو بھمانی طاقت میں ان کے مقابل نہ تھے۔

منافق سرداروں کو معافی: منافق سرداروں کیلئے جو سکھوں سے مل گئے تھے نواب شاہ تانولی، بددھال اور محمد علی گرفتار کر کے غزنی تانولی کے سامنے حاضر کئے گئے۔ انہوں نے بددھال و تانولیوں مثلاً امیر خاں کی سفارش سے ان کو معاف کر دیا۔

یہ تیسرا جولائی ۱۸۶۶ء کے درمیان کسی وقت ہوا تھا۔ اس کے بعد کچھ

یہ سر بلند خاں کا بیٹا تھا اور وہ سکھوں کی طرف سے گرفتار ہوا تھا۔
 یہ آج کے پانڈہ خاں کا چھوٹا بھائی تھا۔ پانڈہ خاں نے سکھوں کی طرف سے گرفتار ہونے کے بعد
 یہ گرفتاری حبیب اللہ کا سردار اور حبیب اللہ کا بیٹا تھا۔ جس نے اس گرفتاری کو اپنے نام سے
 منسوب کیا تھا۔ یہ ستمبر ۱۸۶۸ء میں فوج ہوئی۔

عرصہ تک سکھوں کو جاؤں کے علاقے کی طرف چڑھائی کی ہمت نہ پڑی۔

امارت ولایت علی: ولایت علی ستمبر ۱۸۴۲ء میں پٹنہ سے سرحد آئے۔ ان کے ساتھ احمد اللہ کے تین چھوٹے بھائی بھی علی فیاض علی اور اکبر علی بھی تھے۔ ان کے ساتھ رضا کاروں کی ایک بھاری تعداد تھی اور اسلحہ اور ذخائر کی مقدار بہ مقدار اپنے ساتھ لے گئے۔ عنایت علی نے دہائی ریاست کی سرحدی چوکی منی کلی پر ایک دستہ ان کی پیشوائی کے لئے بھیجا، ولایت علی کے اعزاز میں نئی ریاست کے اندر متعدد پٹا اور پر خیر مقدم کا ایک سلسلہ بندھ گیا۔ ان کے نوشہرہ پہنچنے پر مقامی کماندار داروغہ ریاست اللہ نکلے اور ایک توپ کی سلامی دی۔ مقصود علی کو عنایت علی نے ایک رسالہ اور پیادہ دستے کے ساتھ بھیجا تھا۔ وہ بھی نوشہرہ پہنچے اور خیر مقدم میں شریک ہو گئے۔ دوسرا پٹا اولیبر کوٹ تھا جہاں ضامن شاہ اور امین خاں محترم مہمان کے استقبال کے لئے بھیجے گئے تھے۔

دہائی ریاست کا دارالخلافہ اسلام گڑھ: خود عنایت علی نے اپنے ذاتی حشد اور روہیلہ فوج کے ایک دستے کے ساتھ ایک منزل آگے بڑھ کر بھائی کا استقبال کیا۔ اترسیہ کے میدان میں جلسہ ہوا۔ یہ ایک عظیم الشان اور مبارک تقریب تھی۔ سب لوگوں نے اللہ کی حمد و ثنا کے ساتھ منائی۔ اترسیہ میں دن کا کھانا کھا کر وہ فتح گڑھ کی طرف روانہ ہوئے جس کا نام اسلام گڑھ رکھ دیا گیا تھا اور دہائی ریاست کا دارالخلافہ تھا جہاں مقامی سردار اور اہل عسکری اور اہل خراج کے لئے جمع ہوتے تھے۔ فوراً ہی عنایت علی نے بلا تامل و توقف ریاست علی کے ہاتھ پر بیعت کی۔ بیعتوں نے ریاست اور رعایت کی امارت سنبھالی۔

۱۴۔ عنایت علی کا وہ شریفانہ رویہ تھا جو ایک بے غرضی و بے نفسی کا جوش تھا اور جس میں کسی ذاتی حوصلہ یا ہوا و ہوس کا دخل نہ تھا۔

ولایت علی نے اس سلوک کے جواب میں تمام حاضرین کو ہدایت کی کہ عنایت علی کے ساتھ حسب سابق اپنے سرداروں کا سا برتاؤ رکھیں۔

ہندوستانی مسلمانوں کو سرحد آنے کی دعوت: اس مکتوب کے کاتبوں نے آخر میں اپنے ہندوستانی بھائیوں کو بھی دعوت دی کہ ”اگرچہ ان لوگوں کی تعداد بھی جو سرحد پر موجود ہیں کافی ہے مگر ان کا دل بھائیوں سے ملنے کو بیقرار ہے۔“ ان کو اپنے پرچوش خیرمقدم اور مہمان نوازی کا یقین دلایا گیا۔ ان کو ملازمتوں کا بھی اطمینان دلایا گیا جو بے شک و شبہہ کفار کی نوکریوں سے زیادہ برکت ہے۔ ساتھ ہی اہل استطاعت سے درخواست کی گئی کہ ”جماعت کو مالی امداد بھیجیں۔ رہا امام (سید احمد) کے ظہور ثانی کا مسئلہ تو کچھ لوگ اس عقیدے پر ایمان رکھتے ہیں اور کچھ نہیں رکھتے۔ اعتقاد رکھنے کے لئے کسی پر کوئی زور نہیں۔ بہر حال امام کا ظہور ثانی جلد وقوع پائے یا نہ آئے عنایت علی اور ولایت علی کی امامت (سرداری) تو قائم ہو چکی ہے۔“

مذکورہ بالا مشترک مکتوب میں واقعات کا خلاصہ جو مذکورہ ہے وہ اسی مقام پر تمام پھو جاتا ہے۔ اور مقام میں دہائی ریاست کے رقبے اور نظام کا ذکر ہے اس کا خلاصہ آگے بیان ہوگا۔

معرکہ درہ ندوہ: دہالیوں کی انگریزوں سے کھلم کھلا جھڑپ درہ ندوہ پر ہوئی جو ولایت علی کی آمد کے فوراً بعد واقع ہوئی۔ سرحد کے فساد زدہ علاقوں پر اپنا اقتدار قائم کرنے کے لئے انگریزوں نے گری سے سکھ حکام اور گلاب سنگھ کی مدد کر رہے تھے۔ دربار لاہور کا انگریز ریڈنٹ ہنری لارنس اور اس کی ماتحتی میں ابوٹ، ایڈورڈز، ٹیلر وغیرہ جو شیلے جوان افسر و حقیقت ان علاقوں میں انگریزی حکومت کی بنیاد ڈال رہے تھے۔

انگریزوں نے گلاب سنگھ کی مدد کے کشمیر پر قابض ہونے کے لئے مناسب سمجھا کہ سکھ فوج کے ساتھ ساتھ دیوان کرم چند کی کمان میں انگریزی فوج کا ایک دستہ بھی بھیج دیا جائے جو کشمیر سے لاہور تک راستے میں امن و اطمینان

لے دوں گرامی حبیب اللہ اور مظفر آباد کے درمیان پانچزار فٹ کی بلند کا پراکٹش ہو رہا ہے۔

قائم کرتا ہوا کوچ کرے۔ دو انگریز افسر فلڈین اور وانس ایگینو اس دستے کے ساتھ تعینات کئے گئے۔ طاقت کی اس نمائش کے ساتھ انگریزوں کی عام سیاسی چال بھی حرکت میں آگئی اور بہت سے مقامی قبائلی سردار مع عباس شاہ جھوٹے وعدوں سے رام کر لئے گئے۔

ابھی وہابی مظفر آباد کی طرف سے آنے والی اس فوج کا مقابلہ کرنے کی تیاری ہی کر رہے تھے کہ مقامی سردار کے میل سے یہ افواہ پھیلا دی گئی کہ دوسری طرف پکھلی سے بھی ایک سکھ لشکر آرہا ہے۔ دوطرفہ حملہ کے اس خطرے نے وہابیوں کے بہت سے مقامی پیروں کو مرعوب کر دیا اور وہ بھاگ کھڑے ہوئے۔ بے یار و مددگار اس رجمنٹوں کی طاقت کے مقابلے میں وہابیوں نے مع برادران علی ایک مختصر محاربہ کے بعد ہتھیار ڈال دیئے۔

اس شکست کے بعد کے واقعات کے بارے میں حکام کے درمیان بہت کچھ اختلاف رائے ہے۔ بیلیو کہتا ہے کہ سکھ فوج نے نیشنل ایگینو کے زیر کمان مجاہدوں کو شکست دیکر منتشر کر دیا۔ مقصود علی گرفتار کر لئے گئے اور لاہور بھیج دیئے گئے۔ نایت علی پٹنہ بھاگ گئے۔ اولاد علی چند آدمیوں کے ساتھ سقانتہ جا رہے۔

دو کینی کا بھی نیش و تم ہیں بیان ہے اس اضافہ کے ساتھ کہ برادران علی ضامنی مچلکے کے ماتحت پٹنہ بھیج دیئے گئے۔ پٹنہ پہنچ کر انھوں نے دس ہزار کے مچلکے لکھکر چار سال تک پٹنہ نہ چھوڑنے کی ضمانت دی۔

سوانح احمدی اور تذکرہ صادقہ کے مؤلفین ان واقعات کو یوں بیان

کرتے ہیں۔

سکھوں کی انگریزوں سے امداد طلبی: علی برادران گلاب سنگھ کے مقابلے میں کامیابی سے لڑتے رہے تھے اور بہت کچھ کامیاب ہو رہے تھے۔ گلاب سنگھ نے خود میں وہابیوں کے مقابلے کی طاقت نہ پا کر انگریزوں سے مدد طلب کی۔ انگریزوں نے برادران علی کو لکھا کہ متنازع علاقہ ہمارے قبضے میں ہے اس لئے تمہیں جنگ بند کرنا چاہیے۔ اس کے فوراً بعد مسٹرین اور ونیس ایگینو گلاب سنگھ کی مدد کو بھیجے گئے۔ انہوں نے وہابیوں کے کچھ مقامی ساتھیوں کو جن میں ضامن شاہ بھی تھا مالی ترغیبوں سے ملا لیا۔ اس لئے وہابی کسی ایسی مفاہمت پر مجبور ہو گئے جس کی رو سے وہ سھانہ اکبر شاہ کے پاس جاسکیں۔ سوات جانے کے لئے ان کو ایسے علاقوں سے گذرنا تھا جو انگریزوں کے قبضے میں تھے اور جس کے لئے ان کو بحفاظت گذرنے کی ضمانت درکار تھی جو مسٹرین اور ایگینو نے لکھ کر دے دی۔ چنانچہ وہابی چیل پڑے مگر انگریزی علاقے میں پہنچنے پر ان کو گھیر کر گرفتار کر لیا گیا۔ بحفاظت گذرنے دینے کی تحریری ضمانت اس بہانے سے منسوخ کر دی گئی کہ یہ اعلیٰ حکام کی اجازت کے بغیر مقامی ماتحت افسروں کی دی ہوئی ہے۔ روہیلہ اس بد عہدی پر بہت برا فروختہ ہو گئے اور لڑنے کو تیار ہو گئے مگر ولایت علی نے نکتل سے کام لینے کا مشورہ دیا۔ وہابیوں نے مع برادران علی اپنے ہتھیار اور سامان جنگ حوالہ کر کے جنگ سے دستبرداری قبول کر لی، اور لاہور بھیج دیے گئے جہاں کمشنر جان لارنس نے ان کا خیر مقدم کیا اور ان کی بہادری کی تعریف کی۔ ان کو آمادہ کیا گیا کہ وہ اپنے ہتھیار اور سامان جنگ فروخت کر دیں، روہیلہ فوج کو علیحدہ کر دیں۔ ہتھیار کی فروخت سے جو رقم وصول ہوئی اسی سے ان کی تنخواہیں ادا کر دی گئیں۔ اس کے بعد وہ پٹنہ واپس بھیج دیے گئے۔ لارنس نے ان کو ایک ضیافت میں مدعو کیا اور ان کی واپسی کے

لے انہی زمانے میں لاہور و دیار میں کمشنر نہیں ریڈیٹنٹ ہنری لارنس تھا، جان لارنس نہیں۔ دونوں کے ہونے کے پہلے ٹکڑے کے اشتراک کے سبب سے یہ غلط فہمی معلوم ہوتی ہے

انخراجات کے لئے کچھ روپے دیئے۔ پٹنہ پہنچنے پر لوگوں کی ایک کثیر جماعت نے ان کا پرچوش خیر مقدم کیا۔ وہ ”مجاہدین سرحد“ کی زیارت کے لئے ٹوٹے پڑتے تھے۔ کمشنر بیٹنہ ان کے گھر آیا اور دو سو روپے کے ضامنی چکے دو سال تک اچھے چال چلن رکھنے کے لئے تعمیل کرنے کو کہا۔

عبدالرحیم کے بیان پر تنقید: غلام رسول مہر بیان متذکرہ بالا کو کچھ واقعات کی بنا پر رد کرتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ اُس زمانے میں نہ تو انگریزوں نے پنجاب کا پورا الحاق کیا تھا، نہ لارنس اس کا چیف کمشنر تھا، نہ سید اکبر کی سوات کے حکمراں کی حیثیت سے تاجپوشی ہوئی تھی، اور نہ ہزارہ کا علاقہ انگریزوں کے زیر حکومت تھا۔ مہراں بے جوڑ باتوں کی تردید میں بالکل حق بجانب ہیں۔ پھر بھی کسی فیصلے پر پہنچنے سے پہلے ہمیں یہ حقیقت اپنے ذہن میں رکھنا ہے کہ سوانح اور تذکرہ صادقہ دونوں کے محتلفوں کی اصل دلچسپی سید احمد اور ان کے بعض اہم رفقا کے کارناموں کے عام ذکر سے کھٹی۔ اس موضوع پر ان کی تحریر نہ ہمہ گیر ہے نہ مفصل اُس زمانے کی عام تاریخ سے ان کی واقفیت محدود کھٹی۔ کم سے کم عبدالرحیم انگریزی زبان نا آشنا تھے۔ جس زمانے میں یہ دونوں حالات قلمبند کئے گئے تھے۔ کمشنر کے عہدے کا وجود تو تھا مگر انہوں نے ریڈنٹ اور چیف کمشنر کے عہدوں کے درمیان ٹھیک ٹھیک دفتری وقانونی فرق کو نظر انداز کر دیا ہوگا۔ علاقہ زیر بحث کے انگریزوں کے قبضے میں نہ ہونے کے متعلق یہ بات یاد رکھنا چاہئے کہ ۱۸۴۵ء سے انگریز اس علاقے کے عملاً حاکم تھے۔ اور اس خاص واقعہ میں ساری گفت و شنید انگریز کمانداروں کی وساطت سے ہوتی کھٹی اس لئے وہابیوں نے سمجھا ہوگا کہ یہ انگریزوں کا مملو کہ ہے۔

۱۸۴۵ء کے معاہدے کی شرائط کے مطابق ایچ ایم لارنس لاہور و دربار کا ایجنٹ مقرر کیا گیا تھا؛ دسمبر ۱۸۴۴ء میں اس عہدے کا نام بدل کر ریڈنٹ اور ایجنٹ گورنر جنرل رکھ دیا گیا۔ یہ نام ۱۸۴۸ء تک برقرار رہا۔ جب کہ یہ نام پھر بدل کر ریڈنٹ اور چیف کمشنر رکھ دیا گیا (لاہور پبلسکل ڈائری جلد ۳ تمہید)۔

ایک حالیہ مولف نے کشمیر کی آتش بغاوت کو ٹھنڈا کرنے اور براہ راست فوجی مدد دیکر نام نہاد سکھ دربار اور گلاب سنگھ کا اپنے اپنے علاقوں میں کھویا ہوا اقتدار بحال کرنے میں انگریزوں نے جو زبردست حصہ لیا اس پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ اس نے امام الدین سے سکھ علاقہ چھین لینے کے لئے انگریز ایجنٹ کے سکھ فوج کے آگے مارچ کرنے کے عجیب منظر پر حیرت کا اظہار کیا ہے۔

عبداللہ کا چشم دید بیان: عبداللہ کا مندرجہ ذیل بیان بھی بتاتا ہے کہ خود لاٹ صاحب (ہنری لارنس) نے ولایت علی سے کہا تھا کہ ملک پنجاب اب حقیقتاً انگریزوں کی ملک ہے۔

اس کے علاوہ ایگنیو کے قول و قرار پر برادران علی کے ہتھیار ڈالنے کی آمینہ توثیق اس زمانہ کی انگریزی دستاویزات سے بھی ہوتی ہے۔ لاہور پوسٹیکل روز ناموں میں ایک اندراج مورخہ ۲۲ مارچ ۱۸۶۲ء میں ”ہزارہ سے ایک مولوی“ کی گرفتاری کے بارے میں جس نے وہاں بغاوت کی قیادت کی تھی اور اس کے لاہور آنے کا ذکر موجود ہے۔ جس مولوی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے بلین طور پر وہ ولایت علی ہی ہیں۔

تذکرہ صادرہ اور سوانح احمدی کے بیانات کی تصدیق اس زمانہ کی ایک نادر اور معاصر انگریزی دستاویز سے بھی ہوتی ہے۔ یہ ایک شخص عبداللہ نامی پیر جان علی ساکن حاجی پور ضلع مظفر پور کا بیان ہے جو ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو اسٹینٹ کمشنر راولپنڈی نے لیا تھا۔ عبداللہ پہلے محمد علی رامپوری کا پھر بعد میں ولایت علی کا مرید ہوا جن کے ہمراہ وہ سرحد گیا۔ وہ خاص طور پر جنگ دوت کا ذکر کرنا ہے جس میں اس نے خود حصہ لیا، اور اس کے بعد کے واقعات کا بھی۔

۱۲۱۔ ارا سیٹی مولف بغاوت کشمیر، بنگال گذشتہ موجودہ۔ جلد ۲۶ ص ۱۱۲۔ ۱۲۱۔

۱۲۲۔ لاہور پوسٹیکل ڈائریز جلد ۲ ص ۱۱۲۔ یہ اندراج وہابیوں کے ساتھ ونیس ایگنیو کے قول و قرار کے متعلق ہے

مگر اس میں کہا گیا ہے کہ اس میں بجاظت ہندوستان جانے کی ضمانت ہے نہ کہ سزا۔

ایک متنوع واقعہ پر اس چشم دید شہادت کے پیش نظر اس کے ضروری حصے ذیل میں درج کئے جاتے ہیں :-

..... "سکھوں کے فرار کے بعد مظفر آباد میں چھ جنگیں لڑی گئیں۔ تقریباً بارہ سو سکھ پہاڑیوں پر چڑھ گئے جن کا نام دو ب ہے۔ ان سکھوں کو انگریزوں نے بھیجا تھا کیونکہ اُس زمانہ میں انگریزی لاہور پر قابض تھے۔ اُس وقت مولوی ولایت علی اور باقی لوگوں کو شکست ہو گئی۔ اور کاغان کے سردار نوبت شاہ، ضامن شاہ اور دوسرے لوگ سکھوں سے جا ملے اور ولایت علی سے صاف صاف کہہ دیا کہ "ہم اب آپ کی مدد نہیں کر سکتے" ابوٹ اُس وقت ہزارہ میں تھا۔ اور اُس نے ایک سکھ سردار کو (جس کا نام اس وقت میں بھولتا ہوں) ہدایت کی کہ ہمیں پہاڑ کے نیچے پہنچا دے، ہمیں چھوڑ دینے کا وعدہ کیا اور اُس سے یہ بھی کہا کہ ہمیں اپنی نگرانی میں رکھے، اور یہ بھی کہا کہ ہمارے پاس جو اسلحہ ہیں ان کو فروخت کر دیں تو وہ ان کی قیمت ادا کر دے گا۔

سٹر ابوٹ اور ولایت علی کی گفتگو: چنانچہ ہمیں توپوں، زبور کوں اور اونٹوں وغیرہ کی قیمت بارہ ہزار روپے ملی..... اُس وقت ہم چار سو انٹر تھے۔ ہم بیر کا دورہ پہنچے تو سٹر ابوٹ ملے۔ وہ بالاکوٹ تک ہمارے ساتھ گئے۔ وہاں انگریزوں کی بارہ رجمنٹیں تھیں اور ہزارہ میں تو سپاہیوں کی کوئی اتہا نہ تھی وہاں سٹر ابوٹ نے ولایت علی سے پوچھا "اب تم کدھر جاؤ گے؟" انھوں نے کہا "سٹھانہ" اس پر سٹر ابوٹ بولے "بہتر ہے کہ تم ہزارہ چلو اور لاٹ لے صاحب سے ملو، جو وہ حکم دیں وہ گرد"۔ اس وقت وہ لوگ بے بس تھے اور ہزارہ

۱۰ ہر (جلد ۱ صفحہ ۲۶۵) نے سوانح اور تذکرہ صادقہ کے ضامن شاہ پر غداری کے الزام کی تردید کی ہے۔ مگر اسی عنصر کا یہ بیان ان کے بیانات کی تائید کرتا ہے۔

۱۱ ایچ۔ ایم۔ لارینس جو لاہور دربار میں ریڈینٹ اور گورنر جنرل کا ایجنٹ تھا۔

جانے اور قلعہ کے نزدیک کیمپ لگانے پر مجبور تھے چند دن کے بعد لاٹ صاحب نے ولایت علی، عنایت علی، مقصود علی، فیاض علی اور یحییٰ علی کو بلا بھیجا۔ وہ خیمہ میں داخل ہوئے تو ان سے یہ سوال کئے گئے: کیا تم صادق پور عظیم آباد کے باشندے نہیں؟ کیا تم انگریز کی رعایا نہیں؟ کیا تم گورنمنٹ کو مالگذاری ادا نہیں کرتے؟ تم اس ملک میں کیوں آتے ہو؟ انھوں نے جواب دیا اپنے دین کی رو سے ہم کو کافروں سے لڑنا ہے۔ سکھ ہمارے دشمن ہیں اس لئے ہم ان سے لڑنے آئے ہیں۔ لاٹ صاحب نے جواب دیا یہ ملک تو انگریزوں کا ہے۔ اب تم کیا کرو گے؟ انھوں نے کہا "ہم کابل چلے جائیں گے" مگر لاٹ صاحب نے کہا وہ ملک کابل تک یا غستان (آزاد) ہے۔ اگر تم وہاں چلے جاؤ گے تو پھر زبانی کرو گے اور انگریزوں سے لڑنے لگو گے، اس لئے میں تم کو وہاں جانے کی اجازت نہیں دے سکتا۔ تب انھوں نے حکم صادر کیا کہ ہم اپنے گھروں کو واپس جائیں۔ اس پر ہم لوگ منتشر ہو گئے۔ مولوی ولایت علی، عنایت علی، مقصود علی، فیاض علی، اور یحییٰ علی اپنے اپنے گھر عظیم آباد لوٹ گئے اور ایک مہلکے سے وہ پابند کر دیئے گئے کہ چار سال تک بیٹنہ بھڑی میں بھی اپنے گھر حاجی پور میں گیا واپس ایک درکار آیا اور دانا پودہ میں شادی کر لی۔ (تم کلاؤں)

ایک ایسے شخص کی طرف سے جس نے ان واقعات میں خود حصہ لیا ہوا اس مستند تصدیق کے پیش نظر سوانح اور تذکرہ صادقہ کے بیانات کو تفصیل میں جزوی اختلافات کے باوجود، مجموعی طور پر صحیح تسلیم کرنا پڑتا ہے۔

ولایت علی و عنایت علی کی مراجعت بیٹنہ بھڑی میں ان علی کے بیٹنہ واپس آنے

نہ یہ ان کے اصل مقصد پر پردہ ڈالنے کے لئے ایک سہل عذر تھا۔ انگریز خود ان کے اصل مقصد (انگریزوں سے جنگ) سے خوب واقف تھے۔ یہ حقیقت لاٹ صاحب کے جواب سے ظاہر ہے۔

لکھنؤ ہائی کورٹ بیٹنہ بھڑی نامی بیٹن سکریٹری حکومت ہند مورخہ ۱۹ اگست ۱۸۵۲ء

اور سرحد کو ان کی دوبارہ ہجرت کا ذکر پٹنہ کے مجسٹریٹ کے ایک مراسلے میں یوں ہے
 ”برادران علی ^{۱۸۲۷} کے اواخر ^{۱۸۲۸} کے اوائل میں صوبہ سرحد سے ادھر لوٹائے
 گئے تھے تاکہ ان سے ان کے گھروں میں رہنے کے لئے مچلکے اور حکومت کو پریشان
 نہ کرنے کا مچلکہ لے لیا جائے۔ سو اتفاق سے اُس وقت کے مجسٹریٹ سٹروٹنگٹن
 نے نذر زینی نہیں لی، چنانچہ اس کے فوراً بعد شمالی مغربی سرحد کی طرف واپس
 چلے گئے۔ لیکن اب ہماری حکومت کے ساتھ کھلم کھلا جنگ میں وہ سوات کے
 سردار سے جا ملے ہیں اس لئے اچھے چال چلن کی جو ضمانت ان سے لی گئی تھی وہ
 میرے خیال سے رد ہو گئی۔ اگر گورنمنٹ مناسب سمجھے تو میں ضامنوں کو
 گرفتار کر سکتا ہوں، لیکن ایسا اقدام اس ذلیل اور شریر شہر میں کچھ مچل لے سا
 باعث ہو سکتا ہے میں گورنمنٹ کے حکم کا منتظر ہوں۔“

ولایت علی و عنایت علی پر پابندی: اوکنسیلی ^{۱۸۲۷} کے بیان کے مطابق دس دس
 ہزار روپے کی چار سال کی ضمانت کے مچلکے کے پابند ہو کر وہ چند مہینے خاموشی سے
 پٹنہ میں بیٹھے رہے مگر جلد ہی سمھانہ میں باقی ماندہ جماعت کے سردار اولاد علی
 سے مراسلہ شروع کر دی، عنایت علی کو ایک بار پھر ان کے پسندیدہ میدانِ عمل مشرقی
 بنگال میں بھیج دیا گیا۔ وہاں ان کی باغیانہ تبلیغ و وعظ نے جلد ہی راجشاہی کے
 مجسٹریٹ کی توجہ جذب کی۔ اُس نے ان کے خلاف قانونی کارروائی شروع کر دی
 اس کے ساتھ یہ الزام بھی ضم تھا کہ عنایت علی جسے پہلے اس ضلع سے اپنی باغیانہ
 حرکات کے سبب سے خارج کر دیا گیا تھا پھر مجاہدین کی بھرتی کر رہا ہے۔ لیکن
 بعد کی کارروائی میں راجشاہی کے مجسٹریٹ نے عنایت علی کے باغیانہ منصوبوں
 کے متعلق اپنی پہلی رائے سے انحراف کیا اور اس سے پٹنہ کے مجسٹریٹ کو

۱۷ شاید نادانستہ یہ دلیل ہے شہر میں عوام میں برادران علی کی ہر دلعزیز کی

۱۷ کلکتہ ریویو جلد ۵۱، ۱۸۴۰ء صفحہ ۳۸۱-۳۸۲

مطلع کر دیا۔ وہ اس حد تک بڑھ گیا کہ اس نے شکایت پیش کرنے والے سے اب طلب کیا کہ جھوٹی نالش کے لئے اس پر مقدمہ کیوں نہ چلایا جائے لیکن نہ کا جسٹریٹ عنایت علی کی پہلی کاروائیوں سے زیادہ واقف تھا ان کی بے سوری پر اعتماد کرنے سے انکار کر دیا اور پھر ایک ہزار کے چلکے کا پابند کر دیا۔ عنایت علی کی بنگال سے طلبی؛ ولایت علی نے یہ مدت دوبارہ تنظیم اور تبلیغ کے کام پر صرف کی۔ انھوں نے صوبے کا دورہ کیا اور لکچر دئے۔ جب نیک چلنی کی مانت کی مدت کے اختتام کو چند مہینے باقی رہ گئے تو انھوں نے اپنی تمام جائیداد منقولہ وغیرہ منقولہ فروخت کر دی اور ستمبر ۱۸۴۹ء کو ہجرت کر گئے۔ اسی اثنا میں ان رسوات کے سید اکبر شاہ کی طرف سے دعوت کے خطوط ملے۔ عنایت علی اس وقت کال میں تھے۔ ان سے کہا گیا کہ وہاں کے معاملات کو ختم کر کے ہجرت کے لئے اپنے بڑے بھائی سے پٹنہ میں آئیں۔ مگر اس کی تعمیل میں ان کو چھ مہینے گئے۔ پٹنہ پہنچ کر انھوں نے اپنی والدہ کو اپنے دوامی ہجرت کے ارادے سے مطلع کیا۔ انھوں نے ان کو ان کے حصہ موروثی کے طور پر قصبہ دو آب پور ملع گیا دے دیا جو انھوں نے بیس ہزار روپے پر بیچ دیا۔ اور خاندانی جائیدادیں

لے تذکرہ صادقاً۔ اصل الفاظ ہیں "موصفات اجمالی سے دستبرداری کی ایک تحریر۔ لکھی ہے مگر مولانا دلایت علی کی اسی تحریر کا ذکر نہیں۔ مولانا دلایت علی یا عنایت علی کی تحریر ہجرت کے بارے میں قطعاً بے محل اور غیر ضروری بھی ہے چنانچہ پہلا ایڈیشن اس سے پاک ہے۔ انیسویں ہے کہ مولف کتاب ہذا کو تذکرہ صادقاً کا پہلا ایڈیشن دستیاب نہ ہوا۔ مولانا علی نے ۱۸۴۹ء میں وفات پائی اور یہ دوسرا ایڈیشن وفات کے چھ سال بعد انھیں کے نام سے غالباً ان کے ورثہ سے شائع کیا جن کا نام درج کتاب نہیں۔ مگر اس میں اتنے الحاقات ہیں اور زبان بھی اتنی بگڑی ہوئی ہے کہ اسے اصل مولف سے منسوب کرنا اس پر ستم ہے۔ اسی طرح اس دور میں مولانا عنایت علی کے سوانح میں ان کے پوتے محمد یوسف اور والد خاکسار کے متعلق لکھا ہے کہ مولانا محمد حسن نے

مبلغ پچیس روپیہ ماہوار در صورت گذران پیدا کر کے اپنا ایک مختصر مکان ان کے حوالہ کر دیا جس کا

یہ بھی قطعاً بے محل اور غیر محقق ہے اور پہلے ایڈیشن میں اس کا کوئی ذکر نہیں۔ اصل یہ ہے کہ مولانا عنایت علی کے پر پوتے (خاکسار مترجم) کے مختار عام نے ۱۹۰۵ء کے قریب مولوی عبدالرحیم سے اس کی موروثی جاہد اور حصہ رسدی کا مطالبہ کیا تھا۔ اور اس کے رد کرنے پر عدالت دیوانی میں دعویٰ دائر کر دیا تھا۔ مگر ۱۹۰۸ء میں مولوی عبدالرحیم کے جوان سال جانشین فرزند کایف بیک انتقال ہو گیا جس سے سارا خاندان متاثر و متاثر ہوا۔ فریقین مقدمہ سے دست بردار ہو گئے اور پانچ ہزار روپے پر تصفیہ ہو گیا۔ یعنی مولوی عبدالرحیم نے اصل سے بہت کم ہی محمد مسلم کا حق تسلیم کر لیا۔ اور وہ اتنے ہی پر راضی و قانع ہو گیا۔

مگر انتقال کے بعد ان کے عہدہ نے جو دو مہراڈیشن شائع کیا تو اس اندیشہ سے کہ کہیں پھر محمد مسلم یا اس کے ورثہ دوبارہ مطالبہ حق رسی کر کے قانونی چارہ چھوٹی نہ کریں حفظ ماتقدم اور پیش بندی کے طور پر محمد یوشع کو محروم یا محبوب الارث ثابت کرنے کیلئے ان کی کتاب میں یہ فقرے الحاق کر دیئے۔ گو عبدالرحیم نے بھی اپنے تذکرہ کی اشاعت کے بعد اپنے جواب و طوے میں یہ اظہار کیا کہ مولانا عنایت علی اپنی والدہ کی جو صاحب جائیداد مورثہ تھیں زندگی میں وفات پا چکے تھے۔ یعنی مولانا ولایت علی اور فرحت حسن سے پہلے۔ اس لئے وہ محبوب الارث تھے۔ اور یہ تمام تاریخی شہادتوں اور سندوں کے خلاف ہے۔ ملاحظہ ہو بیان تحریری مولوی عبدالرحیم در مقدمہ نمبر ۶۱ ۱۹۰۷ء عدالت سب جج سوم ٹینہ۔ مورخہ یکم جنوری ۱۹۰۹ء اس کے علاوہ اس ایڈیشن میں اتنے ہی سند الحاقات یا اضمومات ہیں کہ ان کو مولوی عبدالرحیم کی تالیف کہا صحیح نہیں ہے۔ کتاب کی تاریخی قدر و قیمت بہت خفیف ہو جاتی ہے [مترجم

اپنے باقی حصہ کے متعلق اپنا چکانی اور بے باقی نامہ لکھ دیا۔ اس طرح ان کو اپنے دنیاوی معاملات نبھانے میں تین مہینے لگے، اور ولایت علی کے کوئی نو ماہ بعد ۱۹۰۷ء کے وسط میں روانہ ہو گئے اور ولایت علی سے پنجاب میں کٹنا

کی سرانے میں ملے اور دونوں ساتھ ساتھ آگے بڑھ گئے۔

آغاز سفر: ولایت علی کے سب سے چھوٹے بھائی فرحت حسین کو تنظیم کی سربراہی کے لئے گھر چھوڑ دیا گیا۔ خاندان کے تین ارکان بچی علی، فیاض علی اور عبداللہ ۲۵۰ مردوں اور عورتوں کے ساتھ بعد میں روانہ ہوئے اور آ رہ کے قریب ولایت علی سے مل گئے۔ اس طرح فرحت حسین کے سوا قریب قریب تمام واقع ارکان خاندان اس دشوار سفر کو چیل پڑے۔ پہلا پڑاؤ پٹنہ سے چند میل مغرب کو بیور میں ہوا جہاں ایک مقامی رئیس امام علی نے ان کی تواضع کی۔ آ رہ پہنچے یہ چودہری بشیر نے ان کی ضیافت کی۔ دوسرا پڑاؤ غازی پور میں ہوا جہاں محمد فصیح ان کے میزبان ہوئے۔ مرد مسجد میں کھڑے گئے اور مستورات میزبان کے گھر میں۔ اس کے آگے ولایت علی نے دھیرے دھیرے مختلف جگہوں میں ڈیرا کرتے اور لکچر دیتے ہوئے راستہ طے کیا۔

بہادر شاہ دوم اور ولایت علی کی ملاقات: ایک سال سے زیادہ کے سفر کے بعد آخر وہ دلی پہنچے۔ وہاں وہ ایک ایسے گھر میں قیام پذیر ہوئے جو آسیب زوہ کہا جاتا اور خالی رہتا تھا۔ یہ فتح پوری مسجد کے قریب واقع تھا۔ یہ گھر وہ وہاں کوئی دو مہینے مقیم رہا بقول اکتسیلی ولایت علی کے لکچر عوام کی توجہ کو جذب کر لیتے تھے۔ یہ مجالس وعظ بوجامع مسجد اور دوسری مساجد میں منعقد ہوتی تھیں ان میں حاضر ہونے والے اہم لوگوں میں مشہور شاعر آرزو مومن خاں اور بہادر شاہ دوم کی اعلیٰ ترین ملکہ زینت محل کے معلم امام علی بھی ہوتے تھے۔ امام علی اور مومن دونوں نے ان سے بیعت کر لی اور بادشاہ سے ان کے اعمال کا ذکر کیا۔ بادشاہ نے بھی ان سے ملنے کی خواہش ان کے چنانچہ ان کو شرف باریابی بخشا گیا اور دیوان خاص میں جلسہ قرار پایا۔ ولایت علی

۱۵۹ یہ مولوی عبدالرحیم مؤلف تذکرہ ماودہ کاندھ تھے۔

۷۵ آدمیوں کے ساتھ پہنچے، زندگی کی ناپایداری اور اللہ کے احکام سے سرتابی کرنے والوں کے لئے جہنم کی سزا کے موضوع پر وعظ بیان کیا۔ یہ ایک زبردست اور موثر تقریر تھی جو آداب و مبارک کے منافی تھی۔ جن میں سے ایک یہ تھا کہ بادشاہ کے حضور میں کوئی ناپسندیدہ موضوع نہ چھیڑا جائے۔ تمام سامعین مع بادشاہ نہایت متاثر ہوئے۔ وعظ کے اختتام پر بادشاہ نے عرض کیا کہ زندگی کی ناپایداری پر ہم نے بھی کچھ شعر کہے ہیں۔ اس کے جواب میں ولایت علی نے ایک آیت قرآن اس مضمون کی بڑھی کہ تلاوت قرآن میں کسی کو محفل نہ ہونا چاہیے۔ بعد میں بادشاہ کے اشعار ریزیدنٹ نے پڑھ کر سنائے اور ان لوگوں کو شاہی عمارت کی سیر کرائی۔ اپنی جگہ پر واپس آنے کے بعد ان کی ضیافت کی گئی جس میں پچاس طشت تھے جو بادشاہ کی طرف سے آئے تھے۔ امام علی اور مومن خاں خود کھانے لائے۔

ولایت علی کی دہلی سے روانگی: بادشاہ نے یہ خواہش بھی ظاہر کی کہ ماہ رمضان قریب ہے اس لئے یہ جماعت کچھ دنوں اور رک جائے مگر ریزیدنٹ نے ولایت علی سے ان کے ماضی کے حالات اور مقصد سے متعلق ایسے باریک سوالات کئے تھے جن سے وہ مشتبہ ہو گئے اور بادشاہ سے رخصت ہو کر فوراً

۱۲۶-۲۷۰ یادگار افراد جماعت سے مصافحے کئے اور مزاج پرسی کی مہر جلد ۴ ص ۲۷۲ میں بھی اس بیان کی تائید ہے۔ آگے چل کر ایک اور سلسلہ سخن میں تذکرہ صادقہ صفحہ ۱۵۲-۵۴ بھی مذکور ہے کہ ولایت علی کے چھوٹے فرزند محمد حسن: ذریعہ جو اس وقت پانچ سال کے تھے اس موقع پہاڑ کے ساتھ تھے۔ بادشاہ نے ان کو گلے لگا کر پوچھا کہ کیا پڑھتے ہو؟ انھوں نے کہا "قرآن" اور ایک آیت تلاوت کی بادشاہ اس ہونہار بروے کے قبل از وقت نشوونما پر حیرت زدہ رہ گیا۔ اس لڑکے نے بعد میں پٹنہ ٹی میں ایک مدرسہ قائم کیا جو ترقی کر کے محمدی اینگلو عربک ہائر سکولری اسکول ہو گیا اور اب کالج ہے۔ ۱۹۲۳ء سوانح صفحہ ۲۲۳

مثلاً اکنسیلی لکھتا ہے کہ ولایت علی کو حکومت برطانیہ سے وہ کینہ نہ تھا جو ان کے بھائی کی خصوصیت تھی۔ اور اس کا سبب اس نے ولایت علی کے وسطی ہند بھٹی اور سندھ میں طویل سفر ظاہر کیا ہے۔ اس سفر نے ان کو برطانوی حکومت کی طاقت کا بہتر احساس دلایا۔ اکنسیلی کے خیال کے مطابق ولایت علی سمجھتے تھے کہ وہابیوں کی طاقت ابھی انگریزوں کے مقابلے کینے کافی نہیں۔ اور نا کافی طاقت کے ساتھ ضعیف عزم سے اقدامات کر بیٹھنا ان کی ہمت شکنی کا باعث ہو گا اور انگریزوں کو ہشیار کر دیگا۔ وہ جب اپنے اصلی مقصد سے متنبہ ہو جائیگے تو اندرون ہندوستان سے وہابیوں کا سلسلہ مواصلات منقطع کر دینگے۔ عنایت علی صبر و انتظار کی تاب نہ رکھتے۔ ان کے خیال میں اس صبر و تحمل سے ایمان کی کمی ثابت ہوتی ہے۔ وہ زیادہ جذباتی اور تخیل پرست تھے۔

ولایت علی کا مذہب: بقول اکنسیلی دونوں بھائیوں میں یہ اختلاف اس حد تک بڑھ گیا کہ پوری جماعت دو گروہوں میں تقسیم ہو گئی۔ بنگالیوں نے عنایت علی کا ساتھ دیا جنہوں نے ان میں رہ کر کام کیا تھا اور باقی ولایت علی کے ہم خیال ہو گئے۔ ولایت علی کی عالی خیالی کی کارروائی سے مزید تلخی رگ گئی۔ بڑھے ہوئے اختلافات پر نظر کر کے دونوں گروہوں کے سامنے آئے، سرداری سے ہاتھ اٹھانے کا ارادہ ظاہر کیا اور دعا کی کہ "خدا ان کی اس آڑے وقت میں حفاظت کرے اور بھائی بھائی کے درمیان جنگ سے محفوظ رکھے"۔ عنایت علی نے اس آرزو پر عمل کیا۔ اور ستھان چھوڑ کر منگل پور منتقل ہوئے جو جا رہا ہے یہ واقعہ محرم ۱۳۶۳ھ (اکتوبر نومبر ۱۸۵۱ء) میں ہوا۔

عنایت علی کی مزاجی کیفیت: تذکرہ صادق کے مؤلف عنایت علی کی کسی قدر تند مزاجی کا ذکر کرتے اور فرماتے ہیں کہ بوڑھے پاپے میں یہ تند مزاجی چڑھ چڑھ اپن اور غضبناکی میں منتقل ہو گئی وہ ایک صاف گو کھرے آدمی تھے۔ میدان جنگ اور تبلیغی کاموں میں وہیں تحریک کی خدمات میں وہ کسی سے پیچھے نہ تھے ان کی آرزو تھی کہ انگریزوں کو منسٹ لیا جائے اور

جب مقامی قبائلی سرداروں کی غدری یا اور اسباب سے ان کی کوششوں میں رخنہ واقع ہوتا تو وہ آپے سے باہر بھج جاتے۔ مزاج کا یہ رجحان بھی دونوں بھائیوں کے درمیان غلط فہمی پیدا کرنے میں کچھ حصہ رکھتا تھا۔

یہ امر دلچسپی سے خالی نہیں کہ کبھی علی نے جواب تک سرحد بھی میں تھے دونوں بھائیوں کے درمیان بہتر تعلقات پیدا کرنے کی کوششیں کیں۔ فریقین ان سے محبت رکھتے تھے۔ مگر ان کی کوئی کوشش کامیاب نہ ہوئی۔ وہ ولایت علی کی وفات اور عنایت علی کی جانشینی کے فوراً بعد پٹنہ آگئے اور اپنی گرفتاری تک وہیں رہے۔

اختلاف کا بنیادی سبب، اصل اختلاف راہِ عمل کا تھا نہ کہ مقصد کا۔ وہ واقعہ جس سے اختلاف جلد رونما ہو گیا آرمب کے جہان نداد خاں کی مخالفت تھی وہ اور مقامی سرداروں کی طرح انگریزوں سے مل گیا تھا اور ہندوستان سے... کارروائیوں کے گزرنے میں مزاحم ہوتا تھا۔ عنایت علی اس کے خلاف فوری اقدام کرنا چاہتے تھے مگر بڑے بھائی دوسرے مصالحت کو مد نظر رکھ کر مقامی لڑائیوں میں الجھنا نہ چاہتے تھے۔ ان سیدوں کے احساسات کا بھی لحاظ تھا جنہوں نے تحریک میں اتنی مدد کی تھی اور جہان نداد خاں

۱۔ یہ اطلاع مولوی عبدالغفار مرحوم کے مملوکہ نسخہ تذکرہ صادقہ ۱۳۲ کے حاشیہ پر درج ہے جو میں نے نوٹ کر لی ہے وہ خاندان کے سب سے کبیر السن رکن تھے۔ ان کے پاس اس موضوع پر کثیر التعداد دستاویزات موجود تھے ان کو ربانی روایات بھی حاصل تھیں جو اب ہمیں دستیاب نہیں۔ اس لحاظ سے ان کے جواشی کافی وزن اور قدر قیمت رکھتے ہیں۔ ۲۔ اولاً یہ خلاف واقعہ ہے کہ وہ سب سے کبیر السن رکن خاندان تھے۔ ان سے زیادہ کبیر السن حکیم عبدالغفار جعفری مولانا احمد لکھنوی کے پوتے اور سردار جماعت اہل حدیث، صادق پور میں اب تک بقید حیات موجود ہیں۔ ثانیاً تذکرہ صادقہ کا پہلا معتبر ایڈیشن مولانا عنایت علی کی افتاد مزاج کی ان تشریحات سے دستاویز ہے۔ اصل مولف مولوی عبدالرحیم کے سوا جو چشم دید گواہ تھے مولانا عنایت علی سے متعلق سو برس سے زیادہ مدت گزرنے کے بعد کسی کی روایت قابل قبول نہیں ہو سکتی جب کہ مولوی عبدالغفار مرحوم کے والد ماجد یا ان کے کسی معاصر نندگ نے بھی مولوی عنایت علی کا زمانہ نہیں پایا۔ سہرا ترمذی ایڈیشن مرحوم ہی کے قیاس مع الفارق دلو بہتا لاکس ہے۔ غالباً ان کی نیت پاک تھی مگر طرز امتحان استقرائے ناقص و قیاس آرائی کو کیا کہنے! مترجم

سے ان کی قربت تھی۔

ولایت علی کا انتقال: بظاہر اب معلوم ہوتا ہے کہ ولایت علی کا رقیہ زیادہ صحیح تھا۔ وہ بجا طور پر انگریزوں کے بہتر فرائض و سامان اور اپنے ذرائع کی قلت کا شعور رکھتے تھے۔ اگر وہ ۱۸۵۶ء کی شورش کے وقت زندہ ہوتے تو ان کا طرز عمل کیا ہوتا، یہ خیال قدرۃً وفاق میں پیدا ہوتا ہے۔ مگر یہ ناشدنی تھا۔ وہ ۵ نومبر ۱۸۵۲ء کو گنہگار کو لوٹنے کے بعد ایک سال سے کم عمر ہی زیادہ مدت میں انتقال کر گئے اور مستحانہ میں مدفون ہوئے۔

عنایت علی کی وفات: ان کی وفات کے بعد عنایت علی مستحانہ لوٹ آئے اور قائد منتخب کر لئے گئے۔ اگرچہ وہ بڑے بھائی کی مرضی سے ننگلی مستحانہ جوار رہے تھے تاہم وہ اب بھی اپنے ہی طریق کار کی صحت پر یقین رکھتے تھے۔ آئندہ چند سالوں میں ان کی کاروائیاں اس خیال کی تصدیق کرتی ہیں۔ انھوں نے لورڈ انگریزوں کی چوکیوں پر سرحدی حملوں کا ایک سلسلہ شروع کر دیا اور مشورہ لاہور جنگ کا آغاز کر کے ان کو زچ کرنے لگے۔ ۱۸۵۶ء کی شورش میں بھی سرحدی چوکیوں پر سپاہیوں میں جو بے چینی پھیلی ہوئی تھی اس سے فائدہ اٹھایا اور نارنجی اور شیخ جانا پر حملوں کی تنظیم کی۔ اس زمانے میں ان کی عمری کا گذاروں پر متصل طور پر علیہ باب میں بحث کی گئی ہے۔ عنایت علی کی زندگی کے آخری سال سخت معاشی تنگی اور سیاسی نا کامیوں میں گذرے انھوں نے ۱۸۵۸ء میں چنگائی میں وفات پائی۔

رفقائے عنایت علی کی مراجعت پبشر: عنایت علی کی وفات کے بعد ان کے کچھ رفقاء منتشر ہو گئے اور پٹنہ لوٹ گئے۔ تحریک پر ان کا حاورہ سے سخت ضرب پڑی اور زوال کا سامنا ہوا۔ ولایت علی کے تینوں بیٹے عبدالرشید، عبدالرحمن اور محمد حسن جن کے تعلقات غنا سے اچھے تھے اس وقت کے فوراً بعد بیٹے واپس آ گئے۔ ان کے چچا فرحت حسین پٹنہ میں تھے اور ۱۸۵۸ء میں وفات پا گئے۔ گنئی علی بھی پٹنہ لوٹ آئے۔ غیاث علی اگرچہ غنا میں ہی رہے مگر ان کے لئے نہ تھے۔ یہ بیٹے پٹنہ آئے اور کچھ بعد وہیں وفات پا گئے۔

۱۸۵۸ء میں مذکورہ بالا صفحہ ۹۶ پر شایع شدہ داستان کے پبشر کی بنیاد بھی اسی وقت پر رکھی گئی۔

(ب) حیدرآباد میں وہابی سازش

ولایت علی کی دکن میں تبلیغی سرگرمیاں: ۱۸۳۹ء کے مقدمہ سازش حیدرآباد جس میں نظام کے بھائی نواب مبارز الدولہ ایک مرکزی شخصیت رکھتے تھے اور اس کی بنا ولایت علی کی کارروائیوں پر تھی اس لئے یہاں اس مہتمم بالشان واقعہ کا تذکرہ مناسب ہوگا۔

ولایت علی کے دکن تعینات کئے جانے کا ذکر اوپر ہو چکا ہے۔ حیدرآباد پہنچ کر انہوں نے اپنی مشنری اور تبلیغی کاروائیاں شروع کر دی تھیں۔ کچھ عرصہ کے بعد مبلغ واعظ کی حیثیت سے ان کی شہرت مبارز الدولہ تک پہنچی تو انہوں نے اپنے دو علمائین العابدین اور محمد عباس کو ولایت علی سے ملنے کے لئے متعین کیا۔ ان دونوں علمائے ولایت علی سے بیعت کر لی اور بعد میں ان کے خلیفے مقرر کئے گئے۔ خود مبارز الدولہ نے بھی بیعت کر لی اور تحریک کے ایک سرگرم کارکن بن گئے۔

یہ سازش جو ولایت علی اور ان کے مقامی نقاتی کارروائیوں کے نتیجے میں وقوع پذیر ہوئی اس کو وسط ایشیا میں روسیوں کی پیش قدمی کے اٹھے ہوئے سیاسی خطرے اور انگریزوں کے نظام کے تمام اختیارات عملاً اپنے ہاتھ میں لے لینے کے اقدام کے پس منظر دیکھنا ہوگا۔ حیدرآباد کے ریڈنٹ فریز نے بہت بعد میں حیدرآباد کے متعلق ڈائریکٹوریٹ کی مجلس کے اصل مقصد کو یوں بیان کیا ہے: "حکومت کے نظم و نسق میں اصلاح کا اختیار حاصل کرنے کے لئے ہمیں صرف ایک چیز کی ضرورت ہے۔ اور وہ سپہ ہزہانس (نظام) کی باقاعدہ یقین دہانی کہ آئندہ وہ پبلک معاملات میں بافطرت سے ہاڑیں گے۔ ویسے اس اجتناب پر زیادہ تر عمل تو ہوتا رہا ہے لیکن

۱۸۳۹ء میں اس سازش کی ایک دلچسپ مگر غلطی دارستان اینڈ ایسی پورہ میں اپنے قارئین کو بتا رہی سازش حیدرآباد میں ۱۸۳۹ء کے عنوان سے، روادانڈین اسٹری کانگریس میں ۱۹۵۶ء میں شائع کی ہے۔

اگر اس قسم کی کوئی یقین وہابی ہو جائے تو تمام وزیروں کو صرف ریڈیڈنٹ سے رجوع کرنے پر آمادہ کرنے سے بے انتہا مفید ہوگی۔ دراصل ریاست کے معاملات میں سیاسی جبر و اقتدار کی معمولی زیادتی ہی کے خلاف یہ سازش تھی۔

مبارز الدولہ کے خلاف ریڈیڈنٹ فرنیڈ کی رپورٹ: انگریزی افواج کی (جو افغانستان میں تھی) غیر حاضری سے فائدہ اٹھا کر مبارز الدولہ کے رفقاء نے سر اٹھانے کا منصوبہ بنایا۔ پہلا قدم یوں اٹھایا گیا کہ حیدرآباد اور دکن کے دوسرے مقامات پر جو دیویشی مقیم تھیں ان کو بلا لینے کی کوشش کی گئی۔ اس سازش میں ہندوستان کے حاکموں کی ایک معقول تعداد میں نواب کرنل بھی شامل تھے، شریک تھی۔

راجہ ستارہ، جو دھپور اڑکے گڑھ۔ جھوپال اور رامپور کے فرمانروا بھی سازش کے ناظموں سے مراسلت کر رہے تھے۔ اول الذکر دونوں حکمراں ذاتی اور سیاسی وجوہ سے انگریزوں سے بیزار تھے۔ ان راجاؤں کے فیصلے میں مختلف اسباب کار فرماتے، لیکن ہر صورت میں انگریزوں کے خلاف جذبہ ایک مشترک سبب تھا مبارز الدولہ اور ان کے رفقاء کی کارروائیوں پر رپورٹ کرتے ہوئے فرنیڈ نے ایک شخص حاجی سید اسمعیل کا بیان بھی منسلک کیا ہے جو مبارز الدولہ کا برطرف کردہ ملازم تھا۔ اس میں مذکور ہے کہ خود مبارز اور ان کے رفقاء بہت سخت فوجی تربیت حاصل کر رہے تھے۔ اس میں مبارز کے اس ارادے کا ذکر بھی ہے کہ وہ نکل کھڑے ہوں وہابی مسائیلوں کو جمع کریں اور انگریزوں کو قتل کر کے ملک اور حکومت پر خور قبضہ کر لیں۔ ان کے پیر و فقیر وغیرہ کے بھیس میں بہت سے افسروں اور سپاہیوں تک پہنچ جاتے اور سپاہیوں کو وہابیت میں داخل ہونے کے لئے بہکاتے۔ ساتھ ہی ساتھ بقرنیہ بغاوت کے لئے، ان ایجنٹوں سے خبروں کا ایک لائن ہی سلسلہ مبارز کے لئے فراہم ہوگا۔ چنانچہ انھوں نے رپورٹ کی کہ ریجنٹ کے تمام سپاہی متحد الخیال ہیں اور سب مبارز

۱۶ ایچ فرنیڈ "مبارز الدولہ اور حلیف نظام لندن ۱۸۶۵ صفحہ ۲۳۸۔ ۱۷ مقالہ متحولہ بالا ۱۷

کے خروج کے منتظر ہیں تاکہ ان سے جا ملیں۔ مبارز اپنے اقتدار کی تیاری میں مصروف بنوا رکھی تھیں جن پر یہ نقش کدہ کوائے تھے ”محافظ دین متین، حامی دین و مسلمین“ اور ”مبارزہ نائب سید احمد شہید“

ایک اور بیان کے مطابق مبارز نے سندھ میں وہابی جماعت کے قائد نصیر الدین کی طرف سے ایک درخواست کے جواب میں اپنے قاصد آصف قاسم اور دوسروں کو سندھ بھیجا تھا کہ وہاں وہابیوں کی عام حالت اور ان لوگوں کی طرف سے سندھ کے امیروں کے رُحجان و میڈیاں کی رپورٹ لائیں۔ یہ قاصد جو ولایت علی کے مرید تھے اپنی مفروضہ خدمت اور ان کے مشورہ کے متعلق بذریعہ ڈاک لکھا اور ان کی اجازت کے بعد کراچی اور کراچی کے راستے سے شکارپور پہنچے جہاں اُس وقت نصیر الدین مقیم تھے۔ وہاں سے انھوں نے مطلوبہ رپورٹ بھیجی جس میں اور باتوں کے ساتھ بنگال کی آمد کا ذکر بھی تھا۔

منصوبہ کا انکشاف : شمالی ہند، کابل اور ایران سے صوبہ مدراس میں آنے والوں کے غیر معمولی ہجوم سے شک پیدا ہوا اور اس سے سازش کا انکشاف ہوا، پھر ایک سچھ نے جو شک پر گرفتار تھا سازش کے متعلق اطلاع دی۔ سب سے پہلے نیلور کے ججسٹریٹ اسٹون ہاؤس نے حکومت مدراس کو رپورٹ دی حکومت مدراس نے اسے حکومت ہند کے سکریٹری کے پاس بھیجتے ہوئے سورت حال کی یوں تفتیش کی کہ : ”ہندوستان کے مختلف حصوں میں مسلمانوں کی ایک معتد بہ تعداد نے وہابیت قبول کر لی ہے۔ ان میں ایسے اشخاص بھی ہیں جو اپنے عہدے اور رقبے سے اپنے ہم مذہبوں سے کافی اثر کا استعمال کرتے ہیں۔ کچھ عرصہ سے وہ سرگرمی سے لوگوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے اور کفار کے خلاف جنگ چھیڑنے کے لئے آرمی اور روپے فراہم کرنے میں مصروف رہے ہیں اور یہ کہ اس میں کوئی شک نہیں ہو سکتا کہ ان کے مقصد کی غائت ہندوستان میں برطانوی طاقت کا انہزام و اختتام ہے اور اس غرض سے دسی فوج میں سپاہیوں کو اپنا ہم عقیدہ بنانے کی جدوجہد کرتے رہے ہیں“

مبارزہ الدولہ کے بارے میں تحقیقات، فریئر ریزولوشن اور اس کے اسسٹنٹ مالکوم اور ایک ایرانی مسلمان نے جو ذریعہ نظام میں بھٹی کے تاجروں کا نمائندہ تھا اور بعد میں جس کے لئے اس کی خدمات کے صلے میں دو ہزار روپے کے انعام (اور ایک ہزار اخراجات) کے لئے سفارش کی گئی تھی، مبارزہ کے خلاف تحقیقات میں حصہ لیا۔ فریئر نے اپنی تحقیقات کے نتیجے میں حکومت ہند کے سکریٹری کو رپورٹ دی کہ اور باتوں کے ساتھ یہ ثابت ہو گیا کہ مبارزہ نے صرف اپنے حاکم (نظام) ہی کے خلاف باغیانہ منصوبے تیار نہیں کئے بلکہ حکومت برطانیہ کے خلاف بھی خاص طور پر فحاشمانہ ارادہ رکھتا تھا، جیسا کہ اس کی اور اس کے ایجنٹوں کی اس غیر معمولی کوشش اور جانفشانی سے ظاہر ہے جو انہوں نے دیسی پیرل فوج خصوصاً سکندر آباد اور ناگپور کی فوجوں کی وفاداری کو نشانہ اور برگشتہ کرنے کے لئے کی۔ نیز اس نے مبارزہ کی سیاسی اور مذہبی جدوجہد کے درمیان فرق ہمہ زور دیکر بتایا کہ عام طور پر وہابیوں میں بھی یہی فرق ہے۔ اُسے ان کے عام تبلیغی کام اور اپنے فرقہ کی توسیع پر کوئی اعتراض نہیں، لیکن ان کی سیاسی چابازی دوسری بات ہے جس شکل میں بھی ہو اسے دبانا اور پھال کرنا ناگزیر ہے اس کے خیال میں نظام پر غلطی کر رہے ہیں اپنے مہائی کی کارروائیوں کو صرف مذہبی روشنی میں دیکھ رہے ہیں۔ اس نے مشورہ دیا کہ نظام کو ان کے مہائی کی باغیانہ کارروائیوں کی پوری پوری اطلاع دے دی جائے (اب تک تحقیقات زیادہ تر ریزولوشن کی رائے ہو رہی تھی) اور مبارزہ کو حکومت کے قیدی کی حیثیت سے قلعہ گو لکنڈہ میں قید کرنے کے لئے ان کی رضامندی بھی حاصل کر لی جائے۔ لیکن اس نے اس معاملہ میں اپنے یا نظام کے طرز عمل کو عوام میں مشہر کرنے سے منع کیا۔

مبارزہ الدولہ کو جلس و وام کی سزا: ایک تحقیقاتی کمیشن نے جس میں برطانوی افسر اور کچھ ہندوستانی بھی تھے مبارزہ پر مقدمہ کی سماعت کی جون ۱۸۳۹ء میں ایک عدالت نے اور مسلسل طویل نشستوں کے بعد سماعت اپریل ۱۸۴۰ء میں تمام ہوئی مبارزہ کو جس و وام کی سزا دی گئی، وہ قلعہ گو لکنڈہ میں قید کر دئے گئے اور ۱۸۵۰ء

ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے رفقاء نے کارجن میں زیادہ تر وہابی مولوی تھے مزید تحقیقات تک گرفتار کر رکھے گئے۔ مگر حکومت ہند نے ان واقعات میں کوئی خطرناک علامت نہیں پائی۔ بلکہ اس کے برخلاف لارڈ آکلینڈ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ ”میں ان لوگوں میں سے نہیں جن کا یہ گمان ہے کہ ہندوستان میں برطانوی بالادستی کے خلاف نفرت کا کوئی ہندوستان گیر عملی جذبہ موجود ہے“ ایسے ایسے مظاہر متفرق واقعات کے متعلق عام انگریزی حکام کے طرز فکر کا یہ ایک نمونہ ہے۔ اس سے برطانوی حکومت کے خلاف بڑھتی ہوئی سیاسی بے چینی جس کی یہ علامات نکلتی تھیں، نا فہمی ظاہر ہوتی ہے۔ بنگال میں فرائضی شورش کے زمانے میں بھی حکام نے ایسی ہی ذہنیت دکھائی تھی، جس کی حکام کو آگے چلکر بڑی مہنگی قیمت ادا کرنا پڑی۔

(۷) سرحد پر وہابی امارت

برادران علی نے سرحد پر ایک آزاد ریاست قائم کی تھی اس کی ایک جامع روداد ہمیں ایک عدیم النظیر خط عمولہ بالا سے حاصل ہوئی ہے۔ اس سے مختلف عنوانات کے تحت، جیسے حدود اربعہ، فوج کے مختلف عہدوں کی تنخواہوں، اخراج کے لگان وغیرہ کے متعلق معلومات حاصل ہوتی ہیں۔ اس کی غیر معمولی اہمیت کے پیش نظر اس دستاویز کا پورا ترجمہ جو خط زیر نظر کا آخری حصہ ہے درج ذیل ہے :-

وہابی ریاست کا حدود اربعہ : (۱) حدود - اسلامی ریاست کی حدود نوشیرواں جو ہزارہ کے سکندر پور سے متصل ہے متعین کی گئی تھیں۔ سامانوں کی ایک کثیر مقدار مشمولہ ٹوبہ، اونٹ، گھوڑے، خیمے اور دوسرے سامان مومنوں کے ہاتھ آئے۔ ان میں سے معمولی معمولی چیزیں مقامی قبائلیوں کو دے دی گئیں۔ جب عسکر اسلامی فتحیاب داخل ہوا تمام علاقے جیسے جادوین، تناول، نندھیار، بھوگر منگ، کچھلی، دھماوہ، داس (۹) وغیرہ نے عشر دنیا اور بہاری بالادستی قبول کر لی۔ شروع میں وادی کہتا (بھوگر منگ) بالائی وزیر میں کچھلی اور کندی (۹) کے سرداروں سے خراج کا مطالبہ کیا گیا تھا۔ تو وہ اس کے قبول کرنے پر راضی نہ تھے بعد میں اپنے آپ کو بے بس پا کر قبول کر لیا۔ اللہ کے فضل سے تمام اطراف سے خراج کی تکمیل جاری ہے۔ لوگوں کو اپنے حق کے مطابق انعامات، تحائف، معافیوں اور جاگیریں دی جا رہی ہیں۔ فی الحال ایک ہزار کے قریب روہیلہ سپاہی بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ ان کے علاوہ اسی طرح دس ہزار سپاہی بھرتی کئے جا رہے ہیں۔ انھیں اس شرط پر زمینیں دی گئی ہیں کہ جنگ کے وقتوں میں فوجی خدمات انجام دیں گے۔ علاوہ بریں اس ملک کا رواج

لہذا وہابی حکومت جمہوریہ جو سرحد پر قائم کی گئی اسی کا مختصر حال پہلی بار انگریزی زبان

میں شائع کیا جا رہا ہے۔

ہے کہ جب کبھی کوئی (قتالی) سردار جنگ کے لئے کہیں جائے تو ہر گھر سے ایک ایک مسلح آدمی اس کے ساتھ ہو۔ متعینہ پیشہ ورسپاہیوں کو چھوڑ کر ان سب کا شمار تیس ہزار ہے مگر ان میں سے صرف پیشہ ورسپاہ قابل اعتماد اور دیرسے لیے

سپاہیوں کی نتخواہیں: (۲) سپاہیوں کی نتخواہیں۔ پیدل سپاہیوں کی نتخواہ چھ سے دس روپے ماہوار، توپچیوں اور حوالداروں کی نو سے بارہ روپے ماہوار، کبارستری کی تیس روپے ماہوار۔ یہ معاوضے ان علاقوں کے مروجہ دستوں کے مطابق ہیں۔

سرکاری ملازمین (۳) مختلف عہدہ داروں اور افسران

کے نام یہ ہیں۔ داروغہ ریاست اللہ افسر قلعہ مانسہرہ۔ حاجی گدائی رامپوری دالہ کلکٹر مانیانہ مانسہرہ۔ منشی شجاع الدین علاقہ جادون میں منیار منگلی کے تھانہ دار۔ رمضان علی خاں عظیم آبادی ساکن دہلی ضلع پٹنہ افسر قلعہ بالاکوٹ۔ منشی غلام علی پٹنہ والا، قلعہ مذکورہ بالا کے منشی۔ حاجی نجو عظیم آبادی، قلعہ مذکور کے کلکٹر مانیانہ۔ سبھی علی قاضی (بالاکوٹ)۔

ملک احمد علی ساکن ارکی (قرآن مند خیرت علی) رسالدار۔ محمد علی عظیم آبادی جمیلہ صدر پھانک قلعہ فتح گڑھ۔ حاجی شیر خاں ساکن صاحب گنج جمیلہ بادی کارڈ۔ بہادر خاں ساکن صاحب گنج کلکٹر مانیانہ فتح گڑھ۔ عبداللہ عظیم آبادی فوج کو عسکری تربیت دینے کے لئے وہ ہر روز بعد نماز فجر فوجی قواعد کراتے ہیں۔ سراج الدولہ اسلم خانہ اور محکمہ اصلبل کے انچارج ہیں۔ نظیر بن الدین ایک طرح کے اسپیشل افسر ہیں جن کے ذمہ نظامت حضوری ہے اور قید خانوں کے سیرنڈنٹ بھی ہیں۔ بدرالدین بربان وال (ہی)

۱۔ اس خط کی تحریر کے زمانے میں (مولانا) بھٹی (علی) سارقیوری تھے تو سارقیوری میں ہی مگر یہ بات صاف نہیں آتا یہ نام بڑھ بھٹی علی وہی تھے۔
۲۔ ضلع گیا میں واقع ہے۔

۳۔ ضلع سنتھال پرگنہ (بہار) میں واقع ہے۔ اسے ولایت سی کے پیشے تھے۔ وہ غنغون شباب سے فوجی تربیت اور تعمیر کے ماہر سمجھے جاتے تھے۔

محافظ خزانہ مقصود علی کمانڈر انچیف (سب سالانہ) صوفی معزالدین و خاتمہ کے اور ناظم فرید پوری غلوں کے نگراں۔ اسی طرح متفرق عہدے اور ملازمتیں ہیں۔

عاریہ (۲۱) قوانین فوجداری اور سزائیں حدود اور قصاص شریعت کے مطابق جاری ہیں۔ پانچ وقتوں میں سے کسی وقت کی نماز میں غیر حاضر کی سزا سردار کے لئے ایک روپیہ اور غریب آدمی کے لئے پانچ سیر غلہ۔ اسی طرح نماز جمعہ کا قانون ہے۔ قاطع الطریق (ڈاکو) کو قتل کر دیا جاتا اور وار پوٹہ چھایا جاتا ہے تاکہ اور لوگ عبرت حاصل کریں۔ ملا اسدا خونزادہ دادی کنہار میں مفتی اور اخلاق عامہ کے محتسب مقرر کئے گئے ہیں۔ ان کے ساتھ کئی سوطلبہ تعینات کئے گئے ہیں کہ اندرونی گاؤں میں دورے کر کے دریافت کریں کہ کون نماز پڑھنا نہیں جانتا ان کو سکھائیں اور لوگوں کو شادی دہنی کے مواقع پر ناجائز رسوم ادا کرنے سے باز رکھیں۔ جو اس کا ارتکاب کریں ان پر جہانے لگائیں۔ اور انھیں جرم انوں سے ان طلبہ کے اخراجات پورے کئے جاتے ہیں محمد حسین آخونزادہ بکھنی کے واعظ مقرر کئے گئے ہیں۔

دریاری روداد: (۵ دربار کی روداد۔ راجہ سلاطین اور سردار ہمیشہ مولانا (ولایت علی) کے حضور میں حاضر ہوتے رہتے ہیں داخلہ کے پاس کے بغیر کوئی منتنفس راجہ ہو یا سلطان قلعہ میں داخل نہیں ہو سکتا۔ رسالدار اور جمعہ دار بلائے جانے پر ایک کانٹیل کے ساتھ سلامی کے لئے حاضر ہوتے ہیں۔ بس تو بچی ہمیشہ مولانا کی خدمت میں حاضر رہتے ہیں۔ کوئی شخص سر اٹھانے کی ہمت نہیں کر سکتا۔ کشمیر کے صوبہ دار شیخ کمال الدین نے دروازہ تعلقات کی خواہش ظاہر کی ہے اور خط جانے کے لئے دوہر کارے مقرر کئے ہیں۔ چنانچہ وہ ہر مہینے دو خطا بھیج کر محبت اور دوستی کا اظہار کرتا ہے۔ جب شیخ کو نو شہر

۱۷ یہ سورج گڑھ صنلح موگیر کے تھے۔ ۱۸ مہر کے خلاف صد ۲۲۹ میں یہ اہم مذکور نہیں مگر بیٹہ بونور کئی کے مسودہ میں صاف موجود ہے۔
۱۹ مہر کے مسودہ میں صاف موجود ہے۔

کی فتح کی خبر ملی تو اس نے اس خوش تھری لاسٹ کے لئے تادم کو انعامات

دئے اور خوشی منانے کے لئے توپیں واغلیں۔ کابل کے حکمران دوست محمد اور محاکم کی طرف سے

بھی اظہار دوستی اور آرزو سے اتحاد کے خط وقتاً فوقتاً آتے رہتے ہیں۔ ان فرضی امی

طرح کشمیر اور پشاور سے لیکر کابل اور قندھار تک اس ملک کے خوانین اور

سرداروں کے ساتھ اتحاد حاصل ہو گیا ہے۔ یہ سب امام (سید احمد) کی برکت سے ہو گیا

ایسی کوئی چیز خود امام کے زمانے میں جنگ بالاکوٹ سے پہلے نہ ہوئی تھی۔

خمسراج: (۱) خراج۔ مالیات کی تفصیلات یہ ہیں: خراج وادی کنہار سے مولہ

ہزارا واوی بھوگر جنگ سے پانچ ہزار کا ندھی سے سات ہزار تکھی سے چھتیس ہزار

سالاروں (قبیلہ) سے تین ہزار سن زنی سے تیس ہزار مظفر پور سے پچاس ہزار

کرنا سے دس ہزار سن دھیار سے بیس ہزار غلامی سے تیس ہزار غلامی اور مظفر پور

میں ملازموں کے لئے جاگیروں کے علاوہ اور شمسرا کا خراج کے علاوہ (۱) ہزار تکھی کیا

جاتا ہے۔ اور اس کی مجموعی رقم خراج سے کم نہیں ٹھہرتی۔ باقی لوگوں سے صرف

خراج طلب کیا جاتا ہے۔ بھوگر منگ اور ملائی سے تحصیل تکمیل ہو گئی، اب تکھی

سے تحصیل تقریباً ایک ہفتہ میں مکمل ہو جائیگی۔ بہت سی ٹھہریاں ہیں۔ ان کے

تخصیصاً تعینات کروئے گئے ہیں اور تکھلی کی تحصیل کے اختتام سے بعد ان شاء اللہ

میں دھیار اور مظفر آباد سے تحصیل شروع ہوگی۔

صدر ریاست کے شان و شوکت کی وجہ: رود دریا کے ساحل پر جو پانچ سو

بروہان علی کے زیر حکومت ایک علاقے وسیع عدائے کی ایک آبادی ہے۔ ان میں

تھی۔ ان کے پاس ایک بڑی اور طاقتور قوج ایچ کی ہے۔ یہ لوگ ایک

معتدل آمدنی اور کافی افسروں کی ایک جماعت سے پر ہیں۔

عدالت کی نشر و اشاعت کے لئے ان میں یہاں تبصرہ کیا گیا ہے۔ ان میں

بیان اس لئے متعلق رکھتا ہے۔ یہ سب کے ایک ایک کے لئے ہے۔ ان میں

اور سب امیوں کے تمام اوقات کے ساتھ قائم کی گئی ہیں۔ ان میں

اور سب امیوں کے تمام اوقات کے ساتھ قائم کی گئی ہیں۔ ان میں

کی شان قائم رکھنا تھی اور اس کی مناسب و معقول کارکردگی کے لئے متعدد ضروری آلات نصب کرنا تھے۔ اس کے علاوہ اگر ریاست کا ان لوگوں کی نظروں میں جن کے درمیان یہ قائم کی گئی تھی عزت و احترام برقرار رکھنا ضروری تھا تو ظاہری رعب و اب کا یہ تیور بھی قائم رکھنا ضروری تھا۔ مقامی جنگجو لوگ صرف طاقت ہی کی زبان سمجھتے تھے ان مصالح کے علاوہ یہ نظام یہ حقیقت بھی ظاہر کرتا ہے کہ وہابی قائدین مذہبی دیوانے نہیں بلکہ اپنی تحریک کے سیاسی لوازم و عواقب سے بھی خبردار تھے۔

جدید انتظامی بکرہ کی خامی: ایک جدید طرز کا انتظامی تجربہ یہ تھا کہ گاؤں کے دورے کر کے عوام کے حال میں پر نظر رکھنے اور ملزموں کو کیفر کردار پر پہنچانے کے لئے قاضیوں کے ماتحت نگرال طالب علموں سے کام لیا جاتا۔ اور ان ملزموں سے جو جرمانے وصول ہوتے انھیں سے ان طلبہ کے اخراجات چلانے جاتے۔ لیکن اس نظم میں ایک عیب یہ تھا کہ ان نگرال طلبہ کے گزارے کے اخراجات ان جرمانوں کی تخصیص پر موقوف تھے جو وہ عائد کرتے تھے اس لئے ہر ممکن موقع پر وہ جرمانے لگانے پر آمادہ رہ سکتے تھے۔

وہابی ریاست کا نظم و نسق: ریاست کے نظم و نسق میں اسلامی اثرات سے کام لیا بنظاہر حکومت آلہیہ جیسی بات نظر آتی ہے۔ لیکن تحریک کی بنیاد کو وہابی ریاست کی نوعیت معین کرنا تھا، خصوصاً اس زمانے میں جب کہ ہندوستان میں لادینی لایکولہ کا تختیل نہ تھا۔ علاوہ بریں وہابیوں کے قبضے میں جو خطہ تھا وہ قریب قریب سارے کا سارا صرف مسلمانوں سے آباد تھا۔ ان کے نظام حکومت میں غیر مسلموں کے مقابلے میں مسلمانوں کے ساتھ کسی ترجیحی سلوک کا دخل نہ تھا جو حکومت آلہی کی سب سے بڑی خصوصیت ہے۔ بہر حال اپنی مسلمان رعایا کے عوام اناس میں انھوں نے کچھ ایسے احکام جاری کرنے اور ایسے امتناعات نافذ کرنے کی کوشش ضرور کی جن کو وہ ضروری سمجھتے تھے۔ اس لئے وہابیوں کے متعلق سختی سے کوئی رائے قائم کرنا نہ چاہیے۔ بہر حکم ان جماعت جو بہر اقتدار ہو جاتی ہے وہ نظام حکومت انھیں اصولوں پر چلانے کی کوشش کرتی ہے جو اپنی نگاہ میں لازمی دیکھتی ہے۔ وہابیوں نے کچھ سماجی مذہبی

اصلاحات کے رائج کرنے میں نہیں بلکہ اُس شدت اور سرعت میں جس کے ساتھ وہ ان کو انجام دینا چاہتے تھے سیاسی دقیقہ رسی اور فہم و ذکا کی قلت کا ثبوت ضرور دیا۔ وہابیوں نے اپنی نئی نئی حاصل کردہ ریاست میں جو نظام رائج کیا وہ ابتدائی اور نویافتہ تھا۔ حالات نے ان کو اتنا دم لینے کی مہلت نہ دی کہ وہ حکومت کا کوئی ہمہ گیر نظام تیار کر سکیں۔ اس چھوٹی سی ریاست کے سر پر اس کے نہایت مختصر وجود کی مدت میں ہر وقت جنگ اور اندرونی بغاوت کے سائے منڈلاتے رہتے۔ زمانہ امن و صلح کے وہ حالات کبھی پیش نہ ہوئے جو کسی متحرک نظام کے نشوونما کی اجازت دیتے۔ ہر بات جنگ کے امکانات پر مشروط تھی اس لئے غیر جنگی حکام کی دو بہائیں، نمبرداران مالیات اور عدالتی افسروں کی قائم کی گئیں۔ دوسرے ملکی محکمے جیسے تعلیم و حفظانِ صحت وغیرہ قائم نہ کئے جاسکے۔ اس تحریک کی تاریخ کے طالب علم کے لئے اس کے سوا اور کچھ نہیں رہ جاتا کہ وقت اور امن کے موجود ہونے کی شرط یہ صورت حالات و واقعات پر غور و فکر کرے۔

باب

۱) وہابی تحریک کی اندرونی تنظیم

وہابی تحریک کے دو اہم پہلو تھے، سماجی مذہبی اور سیاسی پہلو پہلو کا تقاضا تھا کچھ سماجی اور مذہبی اصلاحات کی تبلیغ اور دوسرے کا دور دراز کے ملکوں کے لوگوں اور تاجروں اور لباظیوں کے خلاف نبرہ آزمائی۔ ان دونوں ضرورتوں کا تقاضا تھا مبلغوں اور دانشوروں کی ایک مخلص جماعت کی تشکیل جو تمام چلے لگائیں اور عوام کو مقصد سمجھائیں جیسا کہ اوپر بیان ہو چکا اس سلسلہ میں پہلی کوششیں سید احمد امدان کے رفقاء خاص کی تھیں۔ لیکن ۱۸۲۶ء میں ان کی ہجرت کے بعد وہ کمزور پڑ گئیں۔ ان کی شہادت کے بعد تحریک کے تنظیمی پہلو کو برطانوی ہند کے اندر دوبارہ تازہ کرنے کی ضرورت محسوس کی گئی۔ یہی کام تھا جس کے لئے قائدین عظیم آباد نے تحریک کی سب سے بڑی خدمت انجام دی۔ اب پٹنہ برطانوی ہند میں اس تحریک کا سب سے زیادہ فعال مرکز اولہ متر جسے مرکزی پروگنڈا کہنا ہے اس کا صدر مقام بن گیا اور خانگہ ٹک رہا۔

اگرچہ طریق کار اصولاً داتا رہا جو سید احمد کے زمانے میں تھا۔ یعنی دور سے تبلیغ بیعت و جہاد اور چہند کے قیام میں تنظیم میں زیادہ رہا۔ تنظیم پیدا کیا۔ پٹنہ میں ایک تنظیم و مشاعرہ ترقی کر کے قائم کیا اور تمام ملک میں بھرت۔ صحابی محاذ اور مرکزی قائم کیا۔ اندر محاذ پر مقامی و تنظیمی مقرر کئے۔ یہ مقامی کارکن اپنے اپنے محاذوں میں تبلیغ کرتے۔ ریسٹلر تنظیم کرنے لگا اور دوسری غیراتی رقوم اور چند تنظیمیں کھول کر سنا اور ان کو صدر مقام پٹنہ بھیج دیتے اور تنظیم تمام رقوم کے انگریزی کے ان کا پتہ لگا

اس قلمرو سے انھیں جڑ سے اکھاڑ پھینکنے کے تمام ذرائع اور طاقت کا مقابلہ کیا چار مستقل عنوانوں کے تحت ان کا مطالعہ کیا جاتا ہے (۱) پٹنہ کی مرکزی تنظیم (۲) دورے کرنے والے مبلغین (۳) اضلاع کے مراکز (۴) رقوم کی تحصیل :-

(۱) پٹنہ کی مرکزی تنظیم

قافلہ : سب سے پہلے ہم پٹنہ میں دہائی صدر مقام کی اس عمارت کا حال بیان کرتے ہیں جسے خود دہائی اپنی خفیہ زبان میں قافلہ یا بقول ہنٹر باغیوں اور سازشیوں کا روانہ سرائے کہتے تھے۔ ہنٹر نے ان عمارت کی جو بعد میں حکومت کے حکم سے ہاکر زمین کے برابر کر دی گئیں اور ان میں جو تعلیم دی جاتی تھی جو تصویر کشی کی ہے محفوظ ہے اور ذیل میں پیش کی جاتی ہے :-

پٹنہ کے قدیم شہر کے مسلمان محلہ میں ایک گلی ہے جسے صادق پور کی گلی کہتے ہیں، ہاں مسافر بہت چلتے پھرتے ہیں۔ اس گلی کے بائیں ہاتھ پہرہ برہمی طرز کی عمارتوں کا ایک مجموعہ ہے جس کے سامنے کافی کشادہ صحن ہیں اور گلی سے کچھ فاصلہ پر نیچے تک چلے جاتے ہیں۔ ان کے بیرونی حصوں کی شکلیاں ویسی ہی ادا اس ٹکنتہ و ریختہ نظر آتی ہے جیسی برسات کے بعد اینٹوں پر پلاسٹر کی ہوئی عمارتیں مستقلاً اختیار کر لیتی ہیں اور جو مشرقی شاندار تعمیر کے ہمارے جمے جمائے تصور کی مکروہ عمدہ پیش کرتی ہیں اس پورے مجموعہ عمارات میں سب سے نمایاں مسجد ہے جس کا اندرون بہت سادہ ہے جہاں ہر گھڑی نمازیں ہوتی رہتی ہیں اور ہر جمعہ کو خطبہ یا کچھ دیا جاتا ہے۔ یہ مسجد کی مسجد میں جمعہ کے یہ خطبے شہر کی دوسری مسجدوں کے خطبوں سے مختلف ہوتے ہیں۔ یہ پرزور تقریریں ہوتی ہیں جن میں ایمان کے بغیر سارے اعمال کے بیکار

لہذا اب اس مقام پر پرانی پٹنہ سٹی میونسپلٹی کے دفاتر کے مکانات اور ان سے متصل باٹ واقع ہیں

ہونے، سامعین کو عظیم روحانی خطرے سے متنبہ کرنے اور روحانی زندگی اختیار کرنے کی ترغیب دی جاتی ہے۔ یہ خطبے پیغمبر صلعم کی سادہ عبارتوں کلام مساجد پر پیچیدہ رسوم عبادتِ لانتناہی سوانگوں ڈھونگوں، اور طرزِ رکوع و سجود سے مقابلہ کرتے اور ان لوگوں کے خلاف سخت گوئی کرتے جنہوں نے سنی سنی روایتوں کی بنا پر احکامِ مخصوصہ کو پس پشت ڈال رکھا ہے۔ شہر کی دوسری مسجد کے مولوی کو چھ صدقپور کے واعظوں کی علمی قابلیت اور فصاحت و بلاغت کا اعتراف کرنے پر تو مجبور ہوتے مگر مفرداں تمہرکات کے منکر کی حیثیت سے ان کو بڑھ بھلا سمجھتے، آخر میں یہ بیان آس پاس کی عمارتوں کے ذکر پر تمام ہوتا ہے۔ "مسجد کے انگریز پیش امام اور مستور کے سکونتی مکانات اور صبح العقیہ طلبہ کے لئے ایک چھوٹا سا کالج، متقی مسافروں کے لئے ایک مہمان خانہ اور کئی مزاریں جن میں وہابی بزرگانِ دین کی ہڈیاں مدفون ہیں۔"

رنگرہٹوں کی تعلیم و تربیت: "پہر شعبہ زندگی سے رضا کاروں کا مسلسل ریلوے فرقے کے عقائد کی تعلیم حاصل کرنے اور تبلیغ اور نئے رنگرہٹوں کی بھرتی کے صبر آزما کاموں کی تربیت کے لئے صدر مقام میں پہنچا رہتا۔ رضا کاروں کے انتخاب میں بڑی احتیاط برتی جاتی تھی۔ ان کو ان کی تعلیمی قابلیت اور ان کے سماجی رشتہ کے مطابق کام دئے جاتے تھے۔ چنانچہ زیادہ ہونہار جوانوں کو کالج میں داخلہ کر لیا جاتا اور اسلامی شریعت اور علم کلام میں تربیت دی جاتی۔ اور کٹر قابلیتوں کے لوگوں کو اصلاح شدہ مذہب کے صرف موٹے موٹے عقائد میں تحصیل کے ساتھ تعلیم دے دی جاتی اور سرحد کو بھیج دئے جاتے۔ ان سے کم درجہ کے رضا کاروں کو افضلیت دے جاتی۔ مہمان خانے میں ان کا خیر مقدم کیا جاتا اور مہمان خانے کے خازن "بھیان" کے ذمہ کئے جاتے۔ وہ ان کو ان کے مقصدِ عظیم کے لئے جہاد کی ضرورت اور ثواب

لکچر دیتے۔ ایسے نوواردوں کے لئے زیادہ نظری تعلیم درکار نہ تھی۔ ان کا کام سرحد پر عملی زیادہ تھا۔ سادہ غیر نظری دانشمندانہ تعلیم سے ان تمام رنگروٹوں میں اتنا جوش اور شوق پیدا ہو جاتا کہ اپنا گھر بار چھوڑ کر اپنی خوشی سے محاذ پر پہنچ جاتے۔ ان کٹر معتقدین کا اپنے مذہب کے لئے جوش اور سکھوں سے نفرت جو انہوں نے سکھوں کے جانشین انگریزوں میں منتقل کر دی تھی اس درجہ تھی کہ سید احمد کی شہادت کے کئی سال بعد تک رنگروٹ اور روپے کثیر تعداد اور مقدار میں برطانوی ہند سے سہانہ پہنچے رہے۔

خاندان کا لہڑا۔ یہ سارے کام مقامی سربراہ کے زیر ہدایت انجام دے سجاتے تھے۔ جو خلیفہ کہلاتا تھا خود سید احمد کے مقرر کردہ خلیفوں میں پٹنہ سے محمد حسین ولایت علی اور مظہر علی تھے۔ ان کو اپنے اپنے طور پر اپنے خلفا مقرر کرنے کا اختیار تھا۔ اس طرح خلفا کی زنجیر طویل کھینچی رہتی۔

محولہ سابق سواہی عبدالغفار مرحوم کی یادداشتوں اور نجی کاغذات میں ان لوگوں کی فہرست موجود ہے جن کو یکے بعد دیگرے خلافت کے فرائض سونپے گئے۔ ہر خلیفہ کے معاون مشیروں کی ایک کمیٹی ہوتی، ایک وزیر جنگ و وزیر مالیات وغیرہ ہوتے تھے۔

فہرست درج ذیل ہے :-

(۱) سید محمد حسین۔ جن کے معاون تھے۔ اکبر علی، فیاض علی، یحییٰ علی، واعظ الحق اور مقصود علی۔

(۲) ولایت علی امیر، عنایت علی وزیر جنگ، فرحت حسین مالیات اور رضا کاروں کی بھرتی کے ذمہ دار۔

(۳) فرحت حسین (خلیفہ ولایت علی) امیر، یحییٰ علی صلاح کار احمد اللہ و عبدالرحیم مشیر۔
(۴) یحییٰ علی (خلیفہ فرحت حسین) امیر، عبدالرحیم ذمہ دار مالیات، احمد اللہ مشیر،
منجملہ مذکورہ مشیروں کے جو زندہ بچ رہے تھے۔

(۵) احمد اللہ امیر، مبارک علی ذمہ دار مالیات، ارادت حسین مشیر اور ممبروں کے نام
معلوم نہیں۔

(۶) مبارک علی امیر، محمد حسن ذمہ دار مالیات۔

(۷) محمد حسن امیر۔ (اس فہرست میں کسی اور کا نام نہیں۔

(۸) عبدالرحیم (غائبان کے جزیرہ انڈمان سے لوٹنے کے بعد) امیر ابو محمد ابراہیم، عبداللہ
غازی پوری اور عبدالعزیز رحیم آبادی مشیران لہ

مجلسِ اعلیٰ: یہ فہرست ایک اہم دستاویز ہے۔ یہ وہابی تحریک کی کارکن کمیٹی کی
کچھ نشان دہی کرتی ہے یہ سب سے بڑی مجلس تھی جو تحریک کی تنظیم کرتی اور چلاتی
تھی۔ تحفظ و احتیاط کے پیش نظر اس کی تشکیل اور کارکردگی تحریری صوابط پر مبنی
نہ تھی۔ تمام ارکان ایک ہی جذبہ ایثار و خدمت سے سرشار تھے اور سارا نظام خاموش
سمجھ بوجھ کے ساتھ ہموازی سے چلتا تھا۔ اس فہرست سے یہ بھی ظاہر ہوتا ہے کہ امیر
تحریک کی خدمت میں تجربہ کی بنا پر ترقی کر کے امیر ہوتا تھا نہ کہ زیادتی عمر یا عہدے
کی بنا پر۔ یہ فہرست ہماری ان معلومات کے بھی عین مطابق ہے جو ہمیں تحریک کی
تاریخ مابعد کی دستاویزی شہادتوں سے اور امیروں کی کارگزاریوں کے خاتمے کے
بعد کے حالات سے حاصل ہوئی ہیں۔

خلیفہ یحییٰ علی: برادران سی کے زیر قیادت احیائے تحریک کے زمانے میں کچھ عرصہ
تک پٹنہ کے خلیفہ یحییٰ علی تھے۔ انھیں کی تنظیمی قابلیت نے پٹنہ کے صدر مقام کی متنوع
ضروریات کی سربراہی کی۔ ان کے ذمہ فرائضوں میں سے صرف چند کا ذکر کیا جاتا ہے۔

لہ یہ باقاعدہ نظام عبدالرحیم کے جس (جزیرہ انڈمان) کے بعد درہم برہم ہو گیا۔

لئے مال جمع کرتی۔ جہاں گرو داعیوں کے اس طریق کار کو ہندوستان کے موسمی حالات اور سیلابی جوگیوں اور سادھوؤں کی قدیم روایات اور نمونوں سے سہل اور دلکش بنا دیا تھا۔ موسم کے شرائد جو لوگوں کو گھر سے نکل کر پناہ لینے پر مجبور کر دیتے اس ملک میں ناقابل برداشت نہ تھے۔ اور سال کے زیادہ حصوں میں یہ دعاۃ بلامزاحمت سفر کر سکتے تھے۔ میرھے سادے دیہاتیوں کے لئے ایک سیلابی فقیر کا یہ پھیرا کوئی انوکھی بات نہ ہوتی تھی اکثر و بیشتر ان کا خیر مقدم کیا جاتا اور مختصر مدت کے لئے انکو مفت طعام و قیام مہیا کر دیا جاتا۔ ایک مبلغ کے سیر و سفر کی ایک مثال بطور نمونہ ہنٹر کی ناقابل تقلید زبان میں پیش کی جاتی ہے: ”دیہاتی مبلغ کی تنہائی کی زندگی اس کے سفر میں دیہاتیوں کے لئے زیادہ دلچسپی کا موجب بنا دیتی۔ جہینوں وہ کسی کے گھر میں داخل نہ ہوتا۔ وہ کسی دور کے صوبے سے آتا اور اپنے طویل سفر میں کسی معتد شاگرد یا چیلے کے سوا کسی مسافر کو جو اس کے دھیان گیان میں خلل انداز ہو سکتا نہ رکھتا۔ اس کے کردار کی سنجیدگی اور خارجی ماحول سے اس کی لا تعلقی اسے عام آدمیوں سے نمایاں طور پر مختلف بنا دیتی۔ اس لئے کوئی تعجب کی بات نہ تھی کہ دیہاتی اس کے گرد جمع ہو جاتے اور کچھ دیر کے لئے اپنے آہر پوکھر اور سرحد سیوانوں کے پرانے جھگڑے بھول جاتے۔“

مبلغین کا محتاط رویہ: یہ مبلغ اس بات کی بڑی احتیاط رکھتے تھے کہ ان کی تعلیم میں کوئی ایسی بات نہ ہو جو حکام کے کان کھڑے کر دے۔ عنایت علی کی کارروائیوں میں بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح راجشاہی کا مجسٹریٹ اس حد تک چلا گیا کہ ایک شکایت لانے والے سے جواب طلب کر لیا کہ عنایت علی کی باغیانہ حرکات کے خلاف چھوٹی شکایت دائر کرنے کے لئے اس پر مقدمہ کیوں نہ چلایا جائے فی الحقیقت ان مبلغوں کی کارروائیوں کے صحیح معنی کا پتہ چلانے میں جن پر بغاوت کی عمارت کھڑی کی گئی تھی کام کی ہمیشہ ناکامی حیرت انگیز ہے اور ہنٹر اور اوکنیلی دونوں نے اس پر سختی سے

لے اور انڈین مسلمان صفحہ ۷۲

تعمیر و تعمیر کی ہے۔ ان مبلغین کی تبلیغ سماجی مذہبی اصلاحات کی ضرورت اور غیر
 ملکی حکمرانوں کے خلاف جہاد کی تعلیمات کا ایک نہایت احتیاط سے تیار کی ہوئی
 محزون مرکب تھی یہ قدرتی بات ہے کہ بہت سے گاؤں میں قدیم روایات اور رسم
 رواجوں میں بہت زیادہ جاگزیں ہوتے تھے اور مایوس و اعظا میں سخت دل
 گاؤں کی نگہ داری اپنے دامن سے چھوڑ کر نکل کھڑا ہوتا ہے۔ لیکن بہت سے گھروں میں
 اس کے پیغام پر کان بھی دھرا جاتا۔

بمبلغین کی کارکنان یاں کسی چہرہ فرد کو زیادہ گہری تعظیم و ترمیم دینے کا خاص
 خیال رکھا جاتا تھا۔ جب حالات موافق ہوتے تو مبلغ گاؤں کے معلم یا کسی اسی
 نام کی حیثیت سے رہ پڑتا، وہیں عقیدہ بھی کمر لیتا اور اس پاس کی منتشر بستوں میں بھی
 نام کرتا۔ اپنا کام اچھی طرح پورا کر کے کسی مقامی آدمی کو مستبر نائب کے طور پر
 چھوڑ دیتا اور خود آگے بڑھ جاتا۔ ایسے مقامی سرداروں کے علاوہ بہت
 سے دیہات کے آدمی بھی تحریک میں داخل کر لئے جاتے۔ اکثر ان سے کہا جاتا
 کہ مبلغ کے ساتھ ساتھ رہا کریں اور ان کے طویل سفر میں ان کو آمادہ کیا جاتا
 تھا کہ وہ وقت کی پکار پر بیک نہیں، مثلاً سرحد پر جنگ چھڑی ہو اور وہاں رضا کار
 مہذبوں کی ضرورت ہو تو یہ سب سے بڑی دینی خدمت ہے جو انسان انجام
 دے سکتا ہے، سب سے بڑی سر بلندی ہے جو انسان حاصل کر سکتا ہے زندگی
 میں ایسا پہلا موقع جو ان کے سامنے آگیا ہے کیا اُسے ہاتھ سے دے دینگے
 اور فائدہ نہ اٹھائینگے؟ مہینوں اس صحبت میں رہنے کے بعد جو جوش و شوق
 اولاد آدمی کی بے لوث اور پاک روح سے لبریز رہی اس مکرر مسلسل سوال کا
 لونی اور جواب بھی نہیں سکتا تھا کہ سرحد کی طرف رنسا کاروں کا تانا بندا جاتا۔ یہ
 ہنر صحیح لکھتا ہے کہ ان لوگوں اور دور کے کرنے والے مبلغین نے سارے نکال
 کہ اپنے جاں میں پیٹ رکھا ہے اور ہزاروں کارآمد برٹش رعایا کو پہلے پرگندہ
 دماغ مذہبی دیوانہ پھرتا جہاد کا سبب بنادیا۔

(۳) ضلع دار مراکز

اندرونی تنظیم کی درجہ بدرجہ تعمیر میں دوسرا درجہ ضلعی مراکز تھے، جو دوڑنے کرنے والے مبلغین کے اندرونی گاؤں میں جہاں ان کے پیغامات کا خیر مقدم حوصلہ افزا ہوتا اقامت پذیری کے نتیجے میں قائم ہو جاتا۔ سارے بنگال اور ملک کے دوسرے حصوں میں ایسے مراکز پھیل گئے۔ ہنٹر ان کے طریق کار کی تشریح کے ساتھ بنگال کے ضلع مادہ کے دو مرکزوں کا مفصل ذکر کرتا ہے۔

مبلغین کا طریقہ کار: ۱۸۴۱ء کے قریب عبدالرحمن ایک لکھنؤ کا باشندہ اور ولایت علی کا ایک خلیفہ اپنے تبلیغی دوروں میں مادہ آیا۔ وہاں شادی کر لی، ایک مدرسہ کا معلم بن گیا اور وہیں منتقلاً قیام پذیر ہو گیا۔ اس کے پیشے نے اس کو موقع دیا کہ وہ ہر طبقہ کے لوگوں سے ملتا جلتا رہے اور بالخصوص جوانوں پر اپنا اثر ڈالے۔ وہ اپنے احاطے سے آدمی اور روپے جمع کرنے اور ان کو ٹیپہ بھیجنے کا دوسرا کام کرتا رہا۔ اس کام میں ایک شخص رفیق منڈل قابلیت کے ساتھ اس کی اعانت کرتا رہا۔ وہ دراصل ایک کاشتکار تھا مگر عبدالرحمن اُسے تحصیلدار مقرر کر دیا۔ ان کا کام بہت عرصے تک بلا مزاحمت چلتا رہا یہاں تک کہ ۱۸۵۳ء میں حکام مشتبه ہو گئے۔ رفیق منڈل کے گھر کی تلاشی لی گئی اور اس کے کاروبار کے باغیانہ انداز کے ثبوت میں کچھ کاغذات دستیاب ہوئے اور وہ گرفتار کر لیا گیا۔ لیکن کچھ عرصے کے بعد اس سبب سے جسے ہنٹر "سہکار کی معمولی سازشیوں کی تحقیرانہ نظر اندازی" کی پالیسی کہتا اور تنقید و تعریف کرتا ہے، رہا کر دیا گیا۔ رہائی کے بعد رفیق منڈل نے اپنا کام اپنے بیٹے امیر الدین کے سپرد کر دیا جو ایک لائق جانشین ثابت ہوا اور بڑی قابلیت، احتیاط، چوکسی اور کامیابی سے کام چلاتا رہا۔ اس کے زیر نگرانی مادہ کے مرکز کی اہمیت بہت بڑھ گئی اور عملاً بنگال کے سارے ضلعی مراکز کا ایک مقبول عام اڈا اور اکثر قائدین پٹنہ عنایت علی، فیاض علی اور مقصود علی کی ان کے دوروں میں ایک مفید مطلب اقامت گاہ بن گیا۔ مرکز کا

بلاخصل و مزاحمت دس سال سے زیادہ چلتا رہا، اس لئے کہ حکام ضلع اور خصوصاً ہندوستان کا ایک انگریز مجسٹریٹ صدر سلطنت رومہ کی طرح اپنے زیر حکومت اقوام کے طرح طرح کے عقائد و توہمات میں دخل اندازی کو ناپسند کرتا تھا۔ اس طرح غلاری بھی مذہبی لبادے میں باطمینان چل پھر سکتی ہے، ۱۸۶۵ء میں احمد اللہ کے مقدمے نے وہابی اثر کے اسی اہم مرکز کی کارستانیوں کی طرف حکام کی توجہ مبذول کی۔ اس وقت بھی امیر الدین کی کاروائیاں جاری تھیں ۱۸۶۸ء میں اس نے پٹنہ کے سردار (خلیفہ) کے بیٹے کو دعوت دی کہ آکر اس کے علاقہ کے متبعین کے بچھنے ہوئے (دینی) جوش کا بچشم خود معاینہ فرمائیں۔ اس کا علاقہ تین ضلعوں تک پھیلا ہوا تھا جن میں پورا مالہ اور اضلاع مرشد آباد و راجشاہی کے کچھ حصے شامل تھے۔ اس نے سرحد کو جو رنگروٹ بھیجے ان کی ٹھیک ٹھیک تعداد معلوم نہ ہو سکی۔ لیکن ہنٹر اندازہ لگاتا ہے کہ سرحد پر ایک ایک وہابی چوکی پر جس میں ۴۰۰ آدمی ہونے تھے دس فی صد سے زیادہ اس کے ماتحت علاقوں سے آئے تھے۔ ۱۸۶۹ء یہ کار گزار مرکز توڑ دیا گیا اور اس کے قائدین گرفتار کر لئے گئے۔ جس کا مفصل ذکر آگے آتا ہے۔

یہ وہابی ضلعی مراکز میں سے ایک مرکز کے طریق کار کی بطور نمونہ مختصر داستان ہے۔ تمام ملک میں دوسرے اور مراکز کاروائیاں کم و بیش اسی قسم کی ہوتی ہونگی۔

(۴) مال کی تحصیل

مال کی تحصیل کے لئے کئی کئی گاؤں کو ملا کر دفاتر صیغہ انگلزاری ایک صد تحصیلدار کے ماتحت قائم کر دئے گئے تھے۔ ہر گاؤں کا تحصیلدار اس کے ماتحت ہوتا۔ زیادہ آبادی والے گاؤں میں تحصیلدار کے علاوہ ایک بڑا پیش امام ہوتا جو مسجد میں نمازیں پڑھاتا، ایک غیر مذہبی سردار ہوتا جو ایک قسم کا جنرل مینیجر ہوتا، اور ایک ڈاک سردار ہوتا جس کا کام ہوتا قاصدوں کا بندوبست کرنا جو ملک سے باہر خطوط اور روپے پہنچانے کا خطرناک فرض انجام دیتے۔ بڑا تحصیلدار اپنے اہالوں کے سالانہ

دور سے کر کے دیکھتا کہ تمام بقایا رقوم جمع ہو گئیں۔ دوروں کے اثنا میں بھی مقامی آدمیوں کی محصلہ رقوم کی باقاعدہ ترسیلات وصول کرتا اور ان کو پٹنہ بھیج دیتا جہاں ان کی رسیدوں کا ایک کھانا رکھا جاتا۔

وہابی فنڈ کے چندے، ہینٹریو پی (صوبہ متحدہ) کے ایک نیل کے کاشتکار کے بیان کا یوں حوالہ دیتا ہے۔ کہ اس کے مسلمان ملازمین اپنے معاوضہ کا ایک حصہ باقاعدہ وہابی فنڈ کے چندے کے طور پر الگ کر رکھتے۔ ان میں جو زیادہ دلیر ہوتے وہ وقتی چھٹیاں بھی لیتے اور سرحد پر فوجی خدمت کے لئے نکل جاتے ۱۸۴۰ء اور ۱۸۴۶ء کے درمیان ان نیل کے کاشتکاروں کے مسلمان گمانتے اکثر چند مہینوں کی رخصت کے لئے سرحد پر وہابی مرکز میں شرکت کی ضرورت پیش کرتے۔ وہابی فنڈ کے چندے نقد اور جنس دونوں شکلوں میں ادا کئے جاتے۔ چندوں کی خاص خاص شکلیں یہ تھیں :-

۱) زکوٰۃ۔ اسلام میں اس کی ادائیگی فرض میں سے ہے۔ یہ ایک قسم کا انکم ٹیکس ہے جو ایک معینہ سالانہ شرح سے ان لوگوں پر عائد کیا جاتا ہے جو آمدنی کی بعض حد تک میں آتے ہیں۔ شروع میں اس نگان کا مقصد ایک طرح کا رفاہی فنڈ قائم کرنا تھا جس سے نادار لوگوں کی حاجتیں پوری کی جاتیں، مگر وہابیوں نے اسے اصولاً انگریزوں کے خلاف جہاد پر استعمال کیا۔

۲) صدقات۔ صدقے بھی پرہیزگار لوگ نقد اور جنس دونوں شکلوں میں دیا کرتے تھے۔ جنس کی فروخت کی رقمیں جمع کر کے اکٹھی ارسال کر دی جاتیں۔ بیٹریکوں کی کھالیں بھی جو بقر عید کی قربانیوں سے حاصل ہوتیں۔ وہ خشک اور محفوظ کر کے بیچ دی جاتیں۔

۳) اب بھی مسلمانوں میں یہ طریقہ رائج ہے کہ بقر عید میں یتیم خانوں کے طلبہ کھالیں جمع کرتے ہیں ان کو نمک لگا کر خشک کر کے بیچ دیا جاتا اور آمدنی کی رقم جمع کر لی جاتی ہے۔

عمومی لگان (۳) ایک عمومی قسم کا لگان تھا مٹھیا۔ یعنی ایک مٹھی چاول یا کوئی اور غلہ اس طریقے میں ہر گھر ایک اکائی تصور کیا جاتا اور توقع رکھی جاتی کہ ہر گھر روز مرہ کے صرف سے ایک مٹھی غلہ بیت المال کے لئے علیحدہ کر دے۔ اس طرح کی بچت سے غریب طبقہ کے معاویہ پر کوئی بار نہ پڑتا اور ساتھ ہی غلے کی مقدار یہ مقدار پس انداز ہو جاتی۔ یہ جمع کی جاتی اور وقتاً فوقتاً صدر مقام کو بھیج دی جایا کرتی مٹھیا کا یہ طریقہ چندے جمع کرنے کا ایک معروف اور فائدہ بخش ذریعہ تھا اور بعد میں اور سیاسی انجمنوں جیسے پرانی کانگریس پارٹی میں بھی تجویز ہوا تھا۔ سریندر ناتھ بنرجی نے جولائی ۱۸۸۳ء میں کلکتہ کے ایک جلسہ میں قانونی حقوق کے لئے احتجاج میں مالی اعانت کے واسطے ایک قومی فنڈ جاری کرنے کے لئے ایک زور پویشن (تجویز) پیش کرتے ہوئے کہا تھا "وہابی اپنا فنڈ کس طرح فراہم کرتے ہیں؟ میں وہابی مصلحتیوں کا ذکر کر رہا ہوں، وہابی باغیوں کا نہیں ہے اس لئے آپ کو ڈرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ اسے یوں انجام دیتے ہیں کہ ہر گھر والا اپنا کھانا پکانے سے پہلے ایک مٹھی چاول رکھ لیتا ہے، اور یہ مٹھیاں ایک ہفتہ میں اکٹھی کی جاتی ہیں اور مسجید میں لے جاتی جاتی ہیں کہ وہابی مبلغ آکر لے جائیں۔ اس طرح وہابی سٹیشن کے چلانے کے لئے فنڈ جمع ہو جاتا ہے۔"

عطیات؛ مبلغین ہر موقع پر تحریک کے لئے فیاضی سے عطیات دینے کی ضرورت اور ثواب پر زور دیا کرتے بالخصوص ان لوگوں سے زیادہ پر زور اپیل کی جاتی جو کسی سبب سے سرحد جا کر خود جہاد میں شریک نہ ہو سکتے تھے۔ ان مستقل لگانوں کے علاوہ خاص خاص وقتی موافقت پر جیسے شادیاں

لے وہابی مبلغوں اور وہابی باغیوں کے درمیان یہ امتیاز غالباً سرورۃ قائم کیا گیا تھا اور حکام باغیوں کے طریقہ کار کے اختیار کرنے میں معتبر نہیں ہوتے۔

۱۸۸۳

لے پروگریس آف دی نیشنل فنڈ بینک منعقد ہوا، جولائی ۱۸۸۳ء کی رپورٹ میں بطور غور میں لکھا گیا

ولادتیں، تہوار، عقی، خاص عطیات دئے جاتے۔ یہ خیرات، فطرہ اور صدقات وغیرہ ہوتے برطانوی عہد میں تحریک کے دو بلند معتقدین وقتاً فوقتاً خفیہ طور پر چند دن کی بڑی بڑی رمتیں بھیجا کرتے۔

(۵) مال کی ترسیل

یہ تو متھاطریقہ وہابیوں کے مال حاصل کرنے کا۔ اب دوسرا زیادہ دشوار کام حاصل کردہ مال کو خفیہ طور سے سرحد تک پہنچانے کا نظام قائم کرنا تھا۔ یہی کام متھاجس میں پٹنہ کے قارئین بالخصوص بھٹی علی کمال رکھتے تھے۔ انھوں نے سرحد کے راستے پر پورے طول میں وہابی مسافر خانوں یا مہمان خانوں کا سلسلہ تیار کر دیا اور ہر ایک کو کسی آزمودہ کار مرید کے سپرد کر دیا۔ ہنٹرنے اس نظام کار کی تصویر یوں کھینچی ہے۔

”عظیم شمالی شارع عام مناسب حال ٹکڑوں میں تقسیم کر دی گئی تھی۔ اور وہابی باغی ہمارے دشمن کی چھاوینی کی طرف مصروف علاقوں سے اس اطمینان کامل سے گذرا کرتے تھے کہ ہر منزل کے آخر میں ان کے دوست ان کے منتظر ہیں۔ ان مسافر خانوں کے وہابی کارکن مختلف مدارج زندگی کے ہوتے اور سب برطانوی حکومت کی بر بادی کے جانداوہ ہوتے اور ہر ایک باغیوں کی مقامی کمیٹی کا سردار ہوتا۔ بھٹی علی نے ان اشخاص کے انتخاب میں اپنے گہرے نفسیاتی علم کا ثبوت دیا، کیونکہ نہ انکشاف کے خوف نے نہ انعام کے لالچ نے ان میں سے کسی ایک کو بھی اپنے سردار کی رسوائی کے وقت اس کے خلاف کھڑے ہونے پر آمادہ کیا۔ اور اگرچہ معلوم تھا کہ اس وقت ان پناہ گاہوں، کے ایک سلسلہ (جیسے متھانیسور) نے پٹنہ کو سرحد پنجاب سے ملا رکھا تھا۔ لیکن کوئی سامنے آکر کسی خاص مقام کی طرف انگلی سے بھی اشارہ نہیں کرتا“

تحریک کے خفیہ کارکن: روپے کی ترسیل کا یہ نازک اور دشوار کام خفیہ کارکنوں کا ایک گروہ انجام دیتا تھا۔ اگرچہ ضرورت و مصلحت ان کے کام چادر راز میں ملتوف رہتے۔ اور ان کے متعلق زیادہ تفصیلات دستیاب نہیں، اس خطرناک مہم کا ایک مختصر بیان ایسے مواد سے جو دستیاب ہیں ذیل میں درج کیا جاتا ہے:-

یہ کارکن نقد لیکر (جو زیادہ تر اشرافیوں کی صورت میں ہوتا) پٹنہ سے چلتے مخلوط سکون کے وزن اور حجم کو کم کرنے کے لئے ان کو اشرافیوں میں منتقل کر لیا جاتا جو صدیوں، جوتوں یا قاصد کے کسی حقہ جسم پر ٹانگ دی جاتیں سگوں کو اشرافیوں میں منتقل کرنے کے کام میں پٹنہ کے مشہور تاجر مہرچرم امیر خاں سے بہت مدد ملتی جن کی اچھنی کلکتہ میں تھی۔ دہلی کے کچھ ساہوکاروں کی خدمات سے بھی کام لیا جاتا۔ سید احمد کے زمانے میں روپے کے بھیج بھیجاؤ کے انتظام میں دہلی زیادہ اہم درجہ رکھتی تھی۔ دہلی میں اس کاروبار کا سب سے بڑا ایجنٹ ایک شخص اسحاق نامی تھا۔ سید احمد قائدین عظیم آباد کے نام مکتوب میں ترسیل زرہ کے لئے اسحاق کا نام ایک معتبر اور معتمد شخص کی حیثیت سے لیتے ہیں۔ بعد میں پٹنہ مرکز بن گیا اور ترسیل زرہ تھا نیسور اور راولپنڈی کے راستوں سے ہوتی تھی۔ خفیہ کارکنوں کا طریقہ عمل: یہ خفیہ عامل ملک کے پورے طول میں کبھی تنہا کبھی بھیس بدل کر، اور زیادہ تر دوسرے بڑے کاروانوں کے ساتھ چھوٹے چھوٹے جتھوں میں سفر کرتے۔ وہ منزل بمنزل مختلف مرکزوں میں ٹھہرتے جاتے جو کئی علی کی تنظیمی قابلیت سے پورے گرنڈ ٹرنک روڈ پر قائم تھے۔ ان کے یہ سفر ایسے آسان اور محفوظ نہ تھے جیسا کہ ہنٹر کے بیان سدرجہ بالا سے مترشح ہوتا ہے۔ کبھی ایسا بھی ہوتا کہ حامل زرہ قاصد کے اختیار کردہ راستے کی خبر پہلے سے پھوٹ جاتی، پھر بھی ان کو یہ خطرہ جھینا ہی پڑتا۔ ہمیں ان باخبر ذرائع اور مخلص ایجنٹوں کے دیرانہ کارناموں کے زیادہ واقعات تو دستیاب نہیں۔ صرف سید احمد کے زمانے کے ایک ساہوکار پیر محمد کے مشن کا

ایک واقعہ ذیل میں درج کیا جاتا ہے۔ اس سے ان کے اس خطرناک کام کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے۔ وہ تین ہزار روپے کی ایک ہنڈی اور ایک ہزار اشرفی نقد لیکر دہلی سے سرحد کو جا رہا تھا۔ رنجیت سنگھ کو اس کا پتہ چل گیا اور جنرل وینچورا کو ہدایت کر دی کہ قاعدہ کی تاک میں رہے۔ آخر اس کا پتہ مل گیا تماشلی کی گنجی اور اس کے جسم سے مخفی رقوم برآمد کرنی گئیں۔ پیر محمد کی سخت پٹائی ہوئی اور لاہور میں قید کر دیا گیا۔ وہابیوں کے پاس بھی اپنے ذرائع معلومات تھے، ان کو لاہور میں سپاہیوں کے مقامی ہمدردوں کے ذریعہ سے اس گرفتاری کی خبر مل گئی۔ آخر کار حکیم مغیث الدین سہارنپوری نے بھاڑے کے ایک مشہور جرمن فوجدار ولیم ریہارٹ کی بیوہ بیگم سمرو سے جنرل وینچورا کے نام ایک چٹھی لکھوائی۔ الغرض پیر محمد رہا ہو گیا اور بہت سے دوسرے حادثات سے دوچار رہنے کے بعد سرحد واپس آ گیا۔

ایلیٹوں کی دیانت: منتقلی زر کا ایک بڑا ذریعہ ہنڈی تھا دلی اور پشاور میں کسی ساہوکار کے پاس نقد رقم جمع کر دی جاتی وہ اس میں سے بارہ فیصد کمیشن کا حکم سرحد بھیج دیتا۔ شرح کمیشن بہت زیادہ تھی مگر یہ لوگ قابل اعتماد تھے اور روپے کے روک رکھنے یا ارسال میں ادھر ادھر ہو جانے کا کوئی واقعہ کسی تحریر میں نظر سے نہیں گذرا۔ ہلکے رقوم کی ہنڈیوں کو ترجیح دی جاتی تھی کیونکہ وہ زیادہ آسانی سے بھنائی جاسکتی تھیں۔ اکثر ساہوکاروں کو ہدایت کر دی جاتی تھی کہ ان رضا کاروں کے متوتلسیں (بال بچوں) کو جو ہندوستان میں پڑے ہیں دینے کے لئے کچھ رقم الگ رکھ چھوڑیں۔ ان کی خبر گیری کا خاص لحاظ رکھا جاتا تھا جو لوگ یہ کام کرتے تھے ان کے کردار اور ایمانداری کی یہ واضح دلیل ہے کہ جو بڑی بڑی رقمیں ان کے سپرد ہوتیں ان میں سے ایک پائی کے بھی خورد برد ہونے کی ایک مثال بھی نہیں ملتی۔ ان لوگوں کے اخراجات سفر الگ سے دئے جاتے، اگر راستے میں بیماری گرفتاری یا رکاوٹ وغیرہ کے غیر متوقع سبب سے صرف

بھی ہو جاتے تو جسمانی محنت و مشقت سے ان کو پورا کر دیتے اور اس امانت سے جسے پہنچانا ہوتا کچھ بھی خرچ نہ کرتے۔

ترسیل زر کا طریقہ کار جس زمانے میں احمد اللہ اس فنڈ کے خازن تھے ایک کھاتا دکھا جاتا تھا جس میں تمام رقوم جو وقتاً فوقتاً وصول ہوتیں درج کر لی جاتیں۔ یہ کھاتا عبدالغفار کے نام سے تھا۔ الہی بخش کو جو احمد اللہ کے مقدمے میں سرکاری گواہ بن گیا تھا۔ اشرفی خریدنے اور بیٹریاں تیار کرنے پر مامور کیا گیا تھا۔ یہ دونوں کام ترسیل زر کی زنجیر کی مضبوط کڑیاں تھے، اور یہ امر قابل توجہ ہے کہ یہ ہندو مہاجروں کے ذریعے سے ہوتے تھے۔ اس سلسلہ میں پٹنہ کے رام کشن فتح چند، موہن رام دہلی کے جگن ناتھ اور مکوند لال، بنارس کے لال چند کرم سنگھ، سائنٹ لائٹ، اور شیوشیش اور منورا، سرحد کے سنسوا اور موٹی کے نام موجود ہیں۔ جو خطیر قلمی قائدین پٹنہ نے ارسال کیے ان کا کچھ اندازہ اس بات سے ہو سکتا ہے کہ تین سال ۱۸۶۲ء سے ۶۵ء تک جب کہ امیدا کی جنگ چھڑی ہوئی تھی پٹنہ سے ایک لاکھ کی رقم صرف ایک مہاجن موہن رام کی معرفت بھیجی گئی تھی اس کی بنا پر یقین سے کہا جاسکتا ہے کہ اس طویل مدت میں جب کہ یہ نظام ترسیل جاری تھا بڑی بڑی رقمیں بھیجی گئیں۔

(۶) خفیہ اور مرزوز پیغامات

خفیہ پیغامات اور روپے کی رسیدوں کے لئے مرزوز الفاظ و اعداد کا ایک پیچیدہ نظام بھی خود سید احمد کے زمانے سے مستعمل تھا۔ کچھ مرزوز نقش جو حیدرآباد سازش کے مقدمے میں پکڑے گئے تھے ان کا حاصل ابھی

۱۰ دہلی مقدمات پر ننگال گورنمنٹ کی دستاویزات کے انتخابات مرتبہ
ایم، اے، خاں صفحہ ۹۸

باقی ہے۔ عربی نام بھی استعمال ہوتے تھے۔ حتیٰ الوسع کاتبوں کے نام اور پتے براہ راست استعمال سے اجتناب کیا جاتا۔ خفیہ مطالب کے ظاہر کرنے کے لئے ادبی اور مذہبی اشعارات و تلمیحات کا استعمال کیا جاتا۔ پٹنہ کے قائدین نے اپنے محصولہ فنڈ کے ارسال کے لئے مرموز علامات اور فرضی ناموں کا ایک نہایت باقاعدہ اور کارآمد نظام تیار کر لیا تھا۔ محصلہ رقوم کی ترسیل میں بہت زیادہ اسی پر انحصار رکھتے تھے۔ وہابیوں کے متعلق جس ابوٹ کی رپورٹ؛ کئی مواقع پر حکومت کی توجہ اس طرف منعطف کی جا چکی تھی کہ ہندوستان میں باغیانہ مراسلات کا ایک جال اور سرحد کی نوآبادی کو آدمی اور روپے کی فراہمی کا سلسلہ موجود ہے، جس کا صدر مرکز پٹنہ تھا۔ جیمس ابوٹ ڈپٹی کمشنر ہزارہ نے ۱۸۴۹ء ہی میں پنجاب کے بورڈ آف اینڈسٹریز کی توجہ اس امر کی طرف منعطف کی تھی کہ ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کا ایک عجیب جتھا یہاں آباد ہو گیا ہے۔ یہ اپنے اسلحہ اور گزارے کا سامان اپنے ساتھ لاتا ہے اور سستھانہ میں آجما ہے۔ یہ مقام ان سب لوگوں کا مرجع ہے۔ جو ایک کامیاب غزوہ کے دیکھنے کے منتظر ہیں۔ اس نے ان مہاجرین کے خفیہ طور پر اپنے جسموں پر اور کھوکھلے پانس کی لاکھٹیوں میں خطوط اور سونالے آنے کا ذکر بھی کیا۔ یہ بھی رپورٹ کی گئی کہ نواب وزیر محمد خاں والی ٹونک مرید سید احمد بھی بڑی بڑی سالانہ رقوم بھیجا کرتا ہے۔ گذشتہ دو سالوں میں ان کی تعداد ۶۰ یا ۸۰ نفر ہوگی مگر گذشتہ دو ہفتے میں بڑھ کر دوسو سے زیادہ ہو چکی ہے اور ہزاروں کی امید کی جاتی ہے۔ جیمس ابوٹ نے اپنے بعد کے خطوط میں بورڈ کی توجہ دوبارہ اس امر کی طرف منعطف کی کہ ہندوستان کے مختلف حصوں سے خاص کر کے راجپوتانہ اور روسیہ کا مفند سے سستھانہ میں آدمیوں کا اجتماع جاری ہے۔ وہ فقیروں اور طالب علموں کے بھیس میں ملک کی راہ سے آتے، اور سستھانہ پہنچ کر اپنی میلی کھیلی گڈڑیاں اتار پھینکتے ہیں۔ سستھانہ میں گودام بھی بن رہے ہیں جہاں گندم کا ایک بڑا ذخیرہ اونٹ پر لایا اور جمع کیا جاتا ہے۔

۱۸۴۹ء میں ایک پیام اس طرح ہے: خفیہ کاغذات، نمبر ۱۲، مورخہ ۱۲ جون ۱۸۴۹ء، قابل ۱۲۸۔

جیمس ابوٹ کی سبکدوشی: کپتان ابوٹ ہزارہ کے مضبوط ملک میں ان جوٹیلے لوگوں کے اجتماع سے فکر مند تھا۔ کیونکہ یہاں حکومت کے خلاف کارروائیوں میں لگھوں اور درانیوں سے کسی آویزش کے موقع پر یہ فساد جڑ کی طرح کام میں لاتے جاسکتے تھے۔ اس کا خیال تھا کہ پنجاب میں کسی نئی شورش کے موقع پر ہزارہ ہی پہلا اکھاڑا منتخب کیا جائیگا۔ جھگڑے کے عناصر متعدد ہیں یہ زمین دار حکومت سے بلند اور دور ہے اور آخری فیصلہ سے جو ملتان کے حق میں ہوا نقطہ مائلت کی دریافت میں کوئی دقت نہیں ہوگی، استھانہ کو ذرائع آمدورفت کا سلسلہ قطع کر دینے کے لئے اس نے مشورہ دیا کہ دریا کے کنارے مسلح چوکیاں قائم کی جائیں۔ لیکن بورڈ نے کپتان ابوٹ کے اندیشے سے اتفاق نہ کیا۔ وہ ان نمایاں علاقوں میں مناسب ذریعہ آمدورفت کے بغیر ایسی مسلح چوکیاں قائم کرنے پر راضی نہ ہوا۔ ہزارہ میں کسی انقلاب کی کوئی وجہ ان کی سمجھ میں نہ آئی۔ "حکومت برطانیہ کے تمام دشمنوں کی ابھی ابھی پوری سرکوبی ہو چکی ہے..... ہزارہ کے لوگ..... جیسے تلون مزاج اور بے وفا ہیں اس لئے ابھی کسی جہاد کا وقت نہیں آیا ہے خواہ مذہبی دیوانے کچھ ہی تقریریں کریں اور چند غنڈے کچھ ہی سوچیں۔" برسر موقع شخص کپتان ابوٹ اور بورڈ آف ایڈمنسٹریشن کے درمیان پالیسی کے اختلاف میں لہجے کی تلخی بڑھتی چلی گئی۔ آخر ۱۸۵۳ء میں ابوٹ کو اپنے عہدے سے سبکدوش ہونا پڑا۔ بہر حال کپتان ابوٹ کی نمایاں سپاہی دہاتی کا اقرار کرنا قرین انصاف ہے۔ اس کا صورت حال کا تخمینہ اس بورڈ سے کہیں زیادہ صحیح ہے جس کی آنکھیں ہزارہ کی ایسی مستقل وفاداری کی وافر قوت کے خلاف کھل جانے والی تھیں کہ اہل ہزارہ ہمارے ہاتھوں ہمیشہ اعانت و مروت ہی پاتے رہے ہیں۔

دہاتیوں کی نقل و حرکت پر نظر: ۱۸۵۳ء میں پٹنہ ایک بار اور باغیانہ مداخلت اور سرحد پر دہاتی نوآبادی کو آدمی اور روپے کی زخمی کے طور پر نمایاں ہوا۔ گزشتہ کئی مواقع کی طرح اس موقع پر بھی حکومت صورت حال کی واقعی سنجیدگی کو سمجھنے سے قاصر رہی۔ گورنر بنگال نے اس وقت پر سرکاری روداد مورخہ ۲۱ اگست ۱۸۵۲ء

تیار کرنے پر اتفاق کی جس میں لکھا گیا کہ ”مجھے اس میں شک نہیں کہ بیٹنہ کے کچھ اشخاص اور سوات اور سوات کے مذہبی دیوانوں کے درمیان مراسلت ہوتی ہے۔ اگرچہ گورنر نے مجسٹریٹ کے اندیشہ سے اتفاق نہیں کیا اس نے مناسب سمجھا کہ اشخاص متعلقہ کے رویے اور نقل و حرکت پر نظر رکھی جائے اور جس صورت میں کہ مجسٹریٹ کی رپورٹ کے مطابق وہابی مسلح آدمیوں کا اجتماع ہو تو حکومت کے اقتدار کو قائم رکھنے کے لئے میں ضروری اقدامات کرونگا۔“

جنگ اہلیہ کے بعد انگریزوں کی کاروائیاں ہندوستان سے آدمیوں اور روپے کی فراہمی کا یہ نظام ہی تھا جس نے سرحد پر وہابیوں کی ریاست کیلئے کشمکش کو برقرار رکھا۔ اس زبردست سہارے کے جاری رکھے بغیر یہ کشمکش برقرار نہ رہ سکتی تھی۔ ۱۸۶۳ء میں اس ذریعہ مراسلہ و رابطہ کے اتفاقی انکشاف ہی سے حکومت ہند نے جنگ اہلیہ کی سخت ٹھوکر سے ہوش سنبھالا اور ہندوستان کے اندر سازش کے ان مرکزوں کا پتہ لگانے اور ان کا خاتمہ کر دینے پر اپنے تمام وسائل وقف کر دیئے۔ اس کے بعد اگرچہ سرحد پر وہابی مرکز قائم رہا مگر اس کی طاقت اور اثر باقی نہ رہا۔ جیسے ہی گنگا کی شاخاب وادوں سے طاقت بخش ذہیوں کا یہ مستقل بہاؤ بند ہوا وہابی ریاست کا نوخیز پودا سرحد کی بنجر گرم جٹانوں میں جھلس کر رہ گیا۔

(ب) وہابیوں کا ہندوستانی فوج میں تداخل

وہابیوں کی تنظیمی کاروائیوں میں دوسرا زبردست ہتھکنڈے برطانوی فوج کی ہندوستانی پلٹوں میں گھل مل جانے کی کوشش تھا۔ خود سید احمدؒ نے اپنی جدوجہد کے آغاز ہی میں آنے والی کشمکش و آویزش کے لئے ایک تو اعدان تربیت یافتہ فوج کی ضرورت محسوس کی تھی۔ مگر ان کا مقصد محض ایک بھاڑے کی فوج رکھنا نہ تھا بلکہ ایسے جانناز رضا کاروں کی جماعت اکٹھا کرنا تھا جن کی تربیت دینی اور اخلاقی معیاروں کی بنیاد پر ہوتی ہو۔ اسی مقصد کے پیش نظر وہ خود امیر خاں والی ٹونک کی فوج میں داخل ہوئے تھے جہاں ان کو پیش امام کا کلیدی عہدہ ملا تھا۔ اسی نے ان کو اپنے حوصلہ کے مطابق سپاہیوں کو اخلاقی تربیت دینے کا موقع دیا۔ مخزن کا مولف سید احمدؒ کے وہاں تقرر کے زمانے میں ان کی کئی کرامات بیان کرتا ہے۔ ان کے ذریعے سے انھیں عام سپاہیوں کے دماغوں پر کچھ اثر ڈالنے کا کافی موقع ملا ہوگا۔ اس قائد تحریک نے جو خاکہ تیار کیا تھا بعد میں اس کے رفتی کچھ ترمیموں کے ساتھ اس پر کاربند رہے۔

ایسٹ انڈیا کمپنی کی جنگی چالیں: ایسٹ انڈیا کمپنی کی ہندوستانی پلٹیں جو سپاہ کھلاتی تھیں ان کی ترکیب اور نشوونما بجائے خود ایک قابل غور اور اہم موضوع ہے یہ سپاہ ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی ترقی اور نشوونما میں عظیم الشان حصہ کھتی تھی۔ انیسویں صدی میں تاریخ ہند میں اس بات کی بہت سی شائیں ملتی ہیں کہ ہندوستانی پلٹوں کو جو ملک کے ایک حصہ سے بھرتی کی جانی تھیں کس طرح ملک کے دوسرے حصوں کو فتح کرنے میں استعمال کیا جاتا تھا۔ بنگال کی فوج کا حصہ پہلے جنگ کابل میں (جو عجیب طور پر ان میں بے چینی کے بیج بونے کا باعث ہوئی) اور بعد میں انگریزوں اور سکھوں کے درمیان جنگوں میں، پھر ۱۸۵۷ء کی تحریک کی سرکوبی میں سکھ ریاستوں

کی اہم خدمات اور کارکردگی، جس میں میگال کی فوج علمبردار تھی، چند مثالیں ہیں۔ اور یہ صورت حال کی اعجوبگی کی انتہا تھی۔ لارڈ لارنس کا ۱۸۵۷ء میں دہلی کی بازیابی میں ایک زبردست ہاتھ تھا۔ اس کے سیرت نگار نے اس کی اس پالیسی کی تحسین کی ہے کہ پنجاب کی مختلف نسلوں میں محاصرت سے جس کا اسے علم تھا فائدہ اٹھا کر انگریزوں اور سکھوں کے درمیان دوسری جنگ میں اس نے تیس ہزار پٹھان بھرتی کر لئے اور اس طرح دروج طریق کار کو آرٹ دیا جو غدر میں ہمارے اتنا کام آیا۔

دوپلے کی حکمت عملی: یہ فرانسیسی اور زیادہ تر دوپلے کی کارستانی تھی جس نے پہلے پہل اس نفع بخش تخیل کو عملی شکل دی کہ اٹھارہویں صدی کے نصف آخر میں جزیرہ نما تے ہند کی تاریخ میں مختلف مقامی جنگوں میں حصہ لیکر فرانسیسی مفاد کو طاقت پہنچانے کے لئے ہندوستانی پٹھانوں کو بھرتی کر کے فرانسیسی افواج کا ایک حصہ بنا دیا جائے۔ لیکن یہ دوپلے کے زیادہ خوش نصیب رقیب کلاہو کا کارنامہ تھا جس نے اپنے سیاسی حریف کے شاندار تخیل سے پورا پورا فائدہ اٹھایا۔ حقیقت اسے اپنے کام کا سب سے زیادہ کارآمد آلہ بنایا اور ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی بنیاد ڈال دی۔ ۱۸۵۷ء میں بہار میں اپنے پہلے ورود میں فوجی مصالحوں کے پیش نظر خالصتہً ضلع شاہ آباد کے باشندوں پر مشتمل جوانی تو منڈی اور بہادری کے لئے مشہور ہیں ایک مختصر پلٹن تیار کی۔ ان پٹھانوں کو جو وہاں سے بھرتی کی گئیں یورپی طرز پر فوجی قواعد کراتے جاتے اور تربیت دی جاتی۔ یہ یورپی افسروں کے ایک چھوٹے گروہ کے زیر کمان تھے جو اپنا فرض اس مہارت سے بجالایا جو اس تخیل کے بانی کے خیال سے انہوں نے بھارت سلطنت مغلیہ کا انتشار، اس کے مقامی خاندانوں میں اس کی تقسیم و پراگندگی، طویل خانہ جنگیاں، کسی عظیم قومی مسلح نظریہ کی غیر موجودگی، نیز اس باہمی اعتماد و ارتباط کا وہ خاص جذبہ جو دوش بدوش لڑنے سے پیدا ہوتا ہے اور جو مختلف نسلوں اور مذہبوں کو ذات بات اور دین دھرم سے آزاد کر کے وفاداری اور دوستی کے بندھن میں مربوط کر دیتا ہے، سب ملکر ہندوستانی پٹھانوں اور ان کے یورپی

افسروں کو ایک نہایت کارآمد اور موثر فوجی تنظیم میں منتقل کر دینے بہت معاون ہوئے۔ یہ تو نتیجہ تھا امتداد زمانہ اور غالباً اس حقیقت کو بہتر طور پر سمجھ لینے کا کہ انہوں نے ہی کسی حد تک انگریزوں کو ہندوستان میں اپنی سلطنت قائم کرنے میں مدد دی تھی اور بہت سی مقامی شکایات کا بھج کو مغربی احساسات نے ہوا دی کہ ہندوستانی پلٹنوں میں بے چینی نے سر اٹھایا جس کے نتیجے میں پہلے تو معمولی شورشوں اور سازشوں کا ایک سلسلہ شروع ہو گیا اور آخر میں ۱۸۵۷ء کے ہنگامہ عظیم پر ختم ہوا۔ اس نے مشرق میں سلطنت برطانیہ کے عظیم الشان ڈھانچے کو جو خود «سپاہ» کے خون اور پسینے سے تعمیر ہوا تھا قریب قریب تباہ کر دیا۔

دہلی قائدین کا عسکری تدبیر یہ دہلی قائدین کا کارنامہ تھا کہ انہوں نے انگریزوں کے ساتھ آدیزشوں میں سب سے پہلے محسوس کیا کہ ہندوستانی فوج کو اس جنگ میں کلیدی مقام حاصل ہے، انگریزوں کی طاقت کا سب سے بڑا آلہ کار یہی ہے، اور اگر کسی طرح اسے معطل کر دیا جائے تو آدھی جنگ جیت لی جاسکتی ہے۔ اسی احساس سے دہلی ایجنٹوں نے بار بار ہندوستانی سپاہ کے ذہن نشیں کیا کہ وہ کتنی طاقت کی مالک ہے اور انگریز کہاں تک اس کے محتاج ہیں۔ دہلیوں کے ہندوستانی فوج میں عمل مل جانے کے متعلق مندرجہ ذیل بیان اور معلوم عام تحریری واقعات سے واضح ہو جائیگا کہ ان کی کارروائی پورے ہندوستان کو محیط تھی۔ ان کو خبر نہ تھی کہ دوسری بار کون سی ٹولی ان سے لڑنے کو بھیجی جانے والی ہے، اس لئے ان کے ایجنٹ دریائے ستلج سے کاکرت تک تمام اہم مہا دنیوں میں تعینات تھے اور جتنی ٹولیوں کی وفاداری کو توڑنا ممکن تھا ان کے توڑنے اور ان کے اثر کو معطل کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ جہاں محض وعظ و تبلیغ اور حب وطن کی اپیل کارگر نہ ہوتی وہاں مالی ترغیب و تحریص کی زیادہ یقینی اگرچہ ادنیٰ تر ترکیب سے بھی کام لیا جاتا۔ ۱۸۵۷ء کی پٹنہ سازش میں ہندوستانی سپاہیوں میں کثرت سے روپے تقسیم کئے گئے تھے دہلیوں نے فوج میں گھس جانے کی چال بہت قبل سے اختیار

کر لی تھی اور ان کے اصول میں داخل تھی۔ اور فوجی ٹولیوں میں ان کی گڑ بڑ کی کارروائیوں کے بہت سے تحریری واقعات موجود ہیں، ان سے ان کے طریق کار کا سیکھاں نمونہ صاف ظاہر ہے۔

دکن میں وہابیوں کی کارگزاری، عجیب بات ہے کہ ہندوستانی فوج کی وفاداری کو متاثر کرنے کے لئے وہابیوں کے ہندوستانی فوج میں تداخل کا پہلا تحریری واقعہ جنوبی ہند سے متعلق ہے۔ ۱۸۳۹ء میں حیدرآباد سازش کا ذکر ہو چکا ہے۔ اس سازش میں حکومت کی تفتیش کے دوران میں یہ انکشاف ہوا تھا کہ مدراس میں اور آگے دکن تک مختلف ملکی اور فوجی چھاندنیوں میں وہابی کارندوں کا ایک وسیع جال مصروف کار تھا۔ دلیور کے کمان افسر نے حکومت میں ان کی کارروائیوں کی رپورٹ بھی بھیجی ہے۔ اس نے اطلاع دی ہے کہ عدالت ضلع کے مفتی ولی محمد اور عدالت کلکٹر کے صدر بیوب اللہ (۹) ایک فارسی اخبار ستارہ (۹) اخبار جو کلکتہ کا ایک شخص رجب علی طبع کرتا ہے، وصول کیا کرتے تھے۔ آخر الذکر شخص محمد علی رامپوری کا خلیفہ ہے جو اب سے پیشتر علاقہ کارناٹک میں اپنی باعینانہ جدوجہد کے سبب سے مدراس سے نکال دیا گیا تھا۔ اس اخبار نے دوست محمد اور انگیزیوں کے درمیان ہونے والی جنگ کو نمایاں کیا ہے اور پیش گوئی کی ہے کہ دوست محمد جلد ہی انگیزیوں کو ہندوستان سے نکال باہر کر دے گا۔ مولوی مودین (۹) مسجد نزد قلعہ کا بڑا مولوی اور مولوی محمد علی رامپوری موصوفی صدر کے دوسرے معتقدین مغرب کی نماز کے بعد جمع میں وعظ کہتے اور جہاد کی تبلیغ کرتے ہیں۔ شہر کی دوسری مساجد مسجد قلعہ، سٹی اسٹریٹ مسجد اور پان صاحب کی مسجد میں اسی قسم کی تقریریں ہوتی ہیں۔ آخر الذکر مسجد کا پیش امام فوج سے خارج کیا ہوا سپاہی ہے۔

۱۹ دس زمانہ کا دستور تھا کہ جینٹ میں ایک مولوی اور میڈٹ مقرر ہوتا، بعض دفعہ وہابیوں نے رجمنٹ کے مولویوں اور پیڈتوں کے ذریعہ سے بھی کام لیا ہے۔ لہٰذا ان کو سید احمد نے دکن میں کام کرنے کو بھیجا تھا۔

بسک ایک چھٹی مورخہ ۵ جون ۱۸۳۹ء میں ویلور کے کمان افسر نے حکومت مدراس کو ایک کوڈ گورنمنٹ کے بارے میں خبر دی ہے جو پلاوڈم کے سپاہیوں کو بکھریا کرتا اور شرطیج کھیلنے کے بہانے سے اکثر افسروں کی کوشیوں پر حاضر رہتا۔ اس نے ایک شخص موسوم بہ بڑا صاحب کی طرف سے ایک رسالے کی اشاعت کی خبر بھی دی جس میں باغیانہ مضامین درج ہیں۔

۱ افسر نے ایک اور چھٹی مورخہ ۱۰ جون ۱۸۳۹ء میں حکومت مدراس کو ویلور صدر محمد علی کے حلیفوں اور ایجنٹوں کی فہرست بھیجی جو دکن میں مختلف ملکی اور فوجی چھاؤنیوں میں کام کرتے تھے۔

وہابیوں کی بہار میں سرگرمیاں ۱۸۳۵ء میں پٹنہ میں ایک وسیع ترادار بہتر منظم سازش کو جنم دیا جا رہا تھا جس میں وہابیوں کا کردار بہت نمایاں تھا۔ اس واقعے کی طرف مورخین نے اب تک پوری توجہ مبذول نہیں کی ہے اور جے ڈبلیو کیسی J.W.KAYE کا مختصر خلاصہ اب تک تنہا شائع شدہ بیان باقی رہ گیا ہے۔ فی الحال جبکہ بہار میں ۱۸۵۶-۵۹ء کی تحریک کی تحقیقات سے متعلق اس موضوع پر نسبتاً مکمل تحقیق ہونے لگی تو اس سے متعلق اصلی کاغذات برآمد کر کے مطالعہ

کئے گئے۔ پھر بھی ان دونوں نوشتوں میں یہ بات مان لی گئی کہ سازش کے منظموں کے پورے حالات معلوم نہ ہو سکے۔ کیسی KAYE نے بھی اقرار کیا کہ یہ سازش واقعی کسی حد تک وسعت پذیر ہوئی اور کس مرکزی نقطے سے پھوٹی نہ اب معلوم ہے نہ کبھی معلوم ہوگی۔ دوسرے نوشتے نے بھی یہی بیچارگی ظاہر کی ہے۔ وہ (سیف علی) آخر آخر تک ایک برادر شخصیت رہا۔ علاوہ بریں دوسری تحریک دراصل

۱۵ یہاں یہ دلچسپ بات ملحوظ رکھنا چاہیے کہ ولایت علی کو عمومان کے قریب رفقائے حقیقے میں اور ان کے مراسلات میں بڑے حضرت کے لقب سے خطاب کیا جاتا تھا۔ اس طرح ان کا عزت علی سے امتیاز کیا جاتا تھا جو منجھلے حضرت کہلاتے تھے۔

کنور سنگھ کے سوانح سے متعلق تھی جو بہار میں ۱۸۵۷ء کی تحریک کا قائد تھا۔ اور اس سازش کا اسی نقطہ نظر سے مطالعہ کیا گیا، کیونکہ اس میں کنور سنگھ کے ملوث ہونے کا کچھ ذکر ہے۔ چونکہ اصل منظموں کی شناخت کی صحیح جانچ نہ کی گئی اسی لئے وہاں کا اس کے خاص منظموں میں شامل ہونے کا مسئلہ نظر انداز ہو گیا۔

بہار میں اس سازش کی بنیاد کو حکومت کی بعض سماجی اور اقتصادی پالیسیوں کی وجہ سے پھیلی ہوئی عام بے چینی میں تلاش کرنا ہو گا۔ عوام کی شکایات کی فہرست میں ارا مئی کی بازیافت کی کاروائیوں اور مشنریوں کی جدوجہد کو بھی داخل کیا جاسکتا ہے۔ حکومت کے خلاف شورش کرنے والوں نے قوم کے خوف اور اندیشوں سے بھی ہوشیاری سے کام لیا۔

خواجہ حسن علی کی انگریزوں کے خلاف کاروائیاں: سازش کے موٹے موٹے واقعات مختصراً ذیل میں درج کئے جاتے ہیں تاکہ ہم تمام داستان کا صحیح اندازہ لگا سکیں۔ ۱۸۴۵ء کے اواخر میں حکومت کو رپورٹ کی گئی کہ دانا پور (پٹنہ) میں متعینہ دسی افسروں اور سپاہیوں کی وفاداری کو متاثر کرنے اور بگاڑنے کے لئے ایک عمومی وسیع سازش موجود ہے۔ واقعات کی زنجیر جو اس سازش تک پہنچتی ہے وہ فرسٹ ریجمنٹ - N. 1 کے ریجمنٹل منشی پیر بخش اور ایک دو تہند مقامی زمیندار راحت علی کی ملاقات سے شروع ہوتی ہے۔ یہ زمیندار کچھ دنوں سے حکومت کے خلاف جدوجہد کے لئے مشہور تھا۔ یہ ملاقات ستمبر ۱۸۴۵ء میں واقع ہوئی۔ اور پیر بخش کے بیان کے مطابق ملاقات کا مقصد راحت علی سے کچھ قرض لینا تھا۔ دونوں کے مشترک دوست نے راحت علی سے اس کی سفارش کی تھی۔ سازش کے اصل منتظمین میں سے ایک سیف علی بھی وہاں موجود

۱۔ بہر حال بعد کی ایک جٹھی میں پٹنہ کے مجسٹریٹ کی طرف سے حکومت بنگال کے سکرٹری کے نام نمبر ۶۸ مورخہ ۳۰ جنوری ۱۸۴۶ء میں اختلافی بحث کی گئی ہے۔ ۲۔ واقعات کا یہ بیان پیر بخش کے اظہار پر مبنی ہے جو دفعہ ۵، ۱۸۴۰ء کے تحت، مارچ ۱۸۴۶ء کو سازش میں ملوث تھا۔

تھا۔ جس کا پیرنجش سے تعارف کرایا گیا۔ اس تعارف کی بنا پر سیف علی آئندہ دسمبر میں کچھ کتابیں فروخت کرنے کے بہانے سے پیرنجش سے ملا مگر اس نے سیف علی سے کوئی واسطہ رکھنے سے انکار کیا۔ اس بیان میں اس حقیقت کو بھی ملحوظ رکھنا ہو گا کہ پیرنجش سرکاری گواہ بن گیا تھا اور اپنا بچاؤ کرنا چاہتا تھا۔ بعد میں سیف علی نے پیرنجش کا سازش کے ایک دوسرے اہم منتظم خواجہ حسن علیؒ سے تعارف کرایا۔ پٹنہ میں خواجہ کے مکان کی بالائی منزل پر ان تینوں کی ملاقات ہوئی۔ ان کے درمیان گفتگو بڑی حقیقت کشا اور مگر رات سے پُر ہے۔ خواجہ نے منشی سے اپنے تقرر کی شرائط، تنخواہ وغیرہ کے متعلق سوالات کئے۔ اس کے بعد بولا "منشی جی ہندوستان دارالحرب (وہابی نظریہ) ہو گیا، قیدخان میں کیا کیا مظالم ڈھائے جا رہے ہیں..... بہت سی کے مجسٹریٹ نے مسلمانوں کے مکہ جانے کا راستہ بند کر دیا ہے" اس پر منشی نے خواجہ کے ارادے دریافت کئے خواجہ نے جواب دیا کہ میں ان لوگوں سے تعارف چاہتا ہوں جو فوج میں بلند ہیں جیسے صوبیدار اور جمعدار منشی نے خواجہ کو ایسے باغیانہ منصوبوں سے باز رکھنے کی کوشش کی۔ اس موقع پر خواجہ نے ایک آدمی سے ایک سو روپے ایک رومال میں باندھ کر لانے کو کہا اور منشی کو دے دیا۔ اس نے اسے سیف علی کے پاس جمع کر دیا۔ اس نے منشی سے کہا کہ رجمنٹ کے سرداروں کو راضی کر کے وہ ہم سے معاملہ رکھیں، اور ابھی کسی سپاہی کو خبر نہ کریں۔ اس نے اسے بھی ایک سو روپے ایک کپڑے میں بندھے ہوئے دئے۔

خواجہ حسن علی کی ہندوستانی فوجوں کو پیشکش منشی نے پوچھا یا دوسری رجمنٹوں سے معاملہ کرنے کی ایسی ہی کوششیں کی گئی ہیں؟ خواجہ نے کانپور، بنارس،

لہ وہ کئی سال تک ریاست گوالیار میں ملازم رہا، اور کچھ عرصہ تک کلکتہ میں ریاست کاویل (ایجنٹ) رہا۔ پیرنجش کا بیان ہے کہ وہ ایک بوڑھا آدمی ہے، بال سفید ہیں، ڈاڑھی رکھتا ہے، قد اوسط ہے، نہ موٹا ہے نہ لاغر، زنگ گذری ہے۔ لہ اس زمانے کے قریب ایک ماجیوں کا جہاز قرنطینہ میں روک لیا گیا تھا اس سے یہ افواہ پھیلی کہ حکومت ادارے حج میں مزاحم ہے۔

آٹہ ہاؤس، سگول (ضلع چمپارن) اور ڈورنڈا (ضلع ہزاری باغ) کو بتایا کہ یہ وہ مقامات ہیں جہاں پر لوگ کام کر رہے ہیں۔ اس نے یہ بھی کہا کہ اگر رجمنٹ کے سردار یہ «ضیافت» قبول کریں تو میں ان کو ایک ماہ کی تنخواہ دوں گا۔ اور یہ کہ مجھ کو ایک کروڑ روپے تک خرچ کرنے کا اختیار ہے۔ میں سرداروں سے یہ نہیں چاہتا کہ ابھی ہماری طرف ہو جائیں اور جنگ کرنے لگیں بلکہ یہ کہ جب بغاوت ہو جائے تو وہ ہماری طرف ہوں۔ اس سے پوچھا گیا آیا آپ کانپور تک کے انتظامات کے ذمہ دار ہیں یا اس سے آگے تک کے؟ اس نے جواب دیا کہ کانپور سے آگے کا انتظام کار کوئی اور ہے۔ منشی نے کہا کہ رجمنٹ کا پنڈت درگا پرشاد آپ لوگوں کا مقصد بہتر طور پر انجام دے سکتا اور سرداروں سے آپ لوگوں کے تعلقات قائم کر دے سکتا ہے، تب سیف علی نے پیرنجش سے کہا کہ پنڈت سے اس کا تعارف کرا دے۔ اس طرح پہلی ملاقات ختم ہوئی۔ منشی نے اس معاملہ کا ذکر درگا پرشاد اور مہیکھن جمدار سے کیا۔ اول الذکر نے سرداروں سے باتیں کرنے کا وعدہ کیا۔ پیرنجش پھر راحت علی سے کچھ دستگرواں لینے کے بہانے سے ملا اور نہ اس سے اپنی بار بار ملاقات کی توجیہ کیا کر سکتا تھا، وہ سیف علی سے بھی ملا اور اس سے کہہ دیا کہ میں نے تم لوگوں کا پیغام سرداروں تک پہنچا دیا ہے اس لئے سیف علی داتا پور تک اس کے ساتھ ساتھ گیا اور حوالدار میجر ٹوبلے کو کہا۔ اس کے آنے پر اسے اس نے پچھتر روپے دیئے جو اس نے قبول نہیں کئے۔ پنڈت بھی آگیا اور کہا کہ «میں نے بڑی جدوجہد کی۔ کچھ آدمی راضی ہو گئے ہیں کچھ لوگ نہیں۔ سیف علی نے پنڈت کو دس روپے دئے اور مزید انعام چالیس برسہمنوں کا بھوج اور ہر ایک کو دس دس روپے کا نقد تدارک دینے کا وعدہ کیا۔ اس کے بعد سیف علی پٹنہ واپس آگیا۔

منشی پیرنجش کی گرفتاری دو ہفتے کے بعد پنڈت پیرنجش کے پاس آیا اور اسے مطلع کیا کہ «سرداروں نے روپیہ لینا منظور کر لیا ہے۔ چوتھی کمپنی کے موتی مسراجدار اور رام سواروپ صوبہ دار گیا جا رہے ہیں۔ وہ چاہتے ہیں کہ ان کے حصے پٹنہ میں گول گھر کے قریب ادا کر دئے جائیں» پنڈت نے پیرنجش سے کہا کہ پٹنہ جا کر سیف علی سے ملے اور روپے کا بندوبست کرے۔ سیف علی منشی کو خواجہ کے گھر لے گیا اور وہاں

سے اُسے اپنے گھر لے آیا اس کے بعد دوسرے روپے اٹھا لیا اور (حولداری کی تہنواہ کی پوری رقم) بیاسی روپے دو علیحدہ علیحدہ رومالوں میں رکھے اور دونوں دو علیحدہ علیحدہ بیکوں میں گول گھر کی طرف چلے۔ وہاں پہنچ کر ان کو معلوم ہوا کہ دونوں سردار میجرسٹریٹ سے ملنے گئے ہیں۔ سیف علی اور منشی وہاں پہنچے اور احاطہ کے چھاٹک پر انتظار کرنے لگے۔ وہ باہر نکلے تو پیر بخش نے ان کے روپے ان کو دے دیئے۔ (ان دونوں نے میجرسٹریٹ سے منصوبے کا افشا کر دیا تھا۔ اور اس کی ہدایت پر روپے لے رہے تھے۔ پیر بخش جس وقت یہ بیان دے رہا تھا اس کو یہ بات معلوم نہ تھی) تب پیر بخش اور سیف علی دانا پور لوٹ آئے۔ وہ جھکین جعدار بھی پہنچا اور اپنا حصہ طلب کیا چنانچہ اس کو بتائیں روپے دے دیئے گئے۔ اسی کے بعد پنڈت نے سیف علی سے کہا کہ ایک صوبہ دار کیوں تیواری اپنے پانچ سرداروں کے لئے روپے طلب کر رہا ہے۔ رقم سیف علی کے پاس اس وقت موجود نہ تھی اسے لانے کے لئے پٹنہ واپس گیا۔ اس اثنا میں پیر بخش کو جس کی کیوں تیواری سے کچھ ان بن تھی اسی کی طرف سے کچھ دھوکے کا شبہہ ہو گیا اور آدھی رات کو سیف علی کو کہلا بھیجا کہ کیوں تیواری غائب ہم سب سے عذاری کرنے والا ہے۔ سیف علی نے پیر بخش کو بلا بھیجا مگر وہ نہ آیا۔ کیوں تیواری نے اپنے اور منشی کے لئے روپے کی ادائیگی پورا کر لیا، مگر پنڈت نے کسی نہ کسی عذر کی آڑ لے لی۔ اس کے فوراً بعد دوسرے الوار کو متوقع ضرب آپڑی اور منشی گرفتار ہو گیا۔

خواجہ حسن علی کی رہائی: بہار کے دوسرے مقامات میں متعین رجمنٹوں کے انوار کے متعلق کچھ مزید معلومات ان کاغذات سے فراہم ہوتی ہیں۔ مثلاً پیر بخش نے اپنے ایک سابق بیان میں کہا تھا کہ چھیا سٹھویں N. 1. بھی روپیہ لینے پر راضی ہو گئی تھی۔ ساتویں اور آٹھویں کیوں تیواری (رسالہ متعین سگولی ضلع چمپارن) کو بھی کوٹ گشت، پٹنہ سٹی کے (داروغہ) باقر علی کی معرفت ٹولا گیا ہے کہ پنی

کے سولہ، ساٹھ، اور ایک سو ایک روپے جو دیسی افسران ریگولر کیویلیری کے پراویٹ کی تنخواہوں کی مادی رقم تھیں راحت علی کے مکان میں ایک کپڑے میں بندھی ہوئی پائی گئیں،

سازش کی شکست و ریخت کے بعد کے بلے اور اس کے بعض نمایاں ناظموں کی تاریخ مابعد بھی دلچسپ ہیں پیرنخش منشی نسرکاری گواہ ہو گیا اور اسے معافی مل گئی۔ ڈرگا پر شادا پنڈت اور بھیکھن جمعدار کا کورٹ مارشل ہوا۔ یہ سب مجرم قرار دئے گئے بہر ایک کو تین سال کی قید سخت اور ملازمت سے برطرفی کی سزا دی گئیں۔ کمانڈر انچیف کی مداخلت پر جس نے ان سزاؤں کو خفیف تصور کیا یہ سزا میں اور بڑھادی گئیں۔ پنڈت کو موت کی، اور جمعدار کو جیس دوام کی سزا دی گئیں۔ کرشمہ تقدیر سے کمانڈر انچیف نے پھر مداخلت کی اور پہلی سزاؤں کو قائم رکھا۔ چونکہ پیرنخش نے اپنے پہلے بیان میں ترمیم کر دی جس سے راحت علی مازس کی شرکت سے صاف بری ہو گیا اس لئے راحت علی بری کر دیا گیا۔ خواجہ حسن علی قریب ایک سال تک روپوش رہا اور حکومت کی انتہائی کوشش پر بھی اس کا پتہ نہ مل سکا۔ آخر اکتوبر ۱۸۴۶ء میں وہ حاضر عدالت ہو گیا اور اس پر مقدمہ چلا۔ لیکن اہم گواہ استغاثہ پیرنخش نے اس کو شناخت کرنے میں وہی شخص تسلیم کرنے سے انکار کر دیا جس سے وہ حسب بیان سابق ملا تھا، حکومت اس کو بری کرنے پر مجبور ہو گئی۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس کو یقین تھا کہ پیرنخش کو روپے سے خرید لیا گیا۔ مگر گورنمنٹ کچھ نہ کر سکتی تھی اور وہ پاک صاف نکل گئے۔

دہائی تحریک میں پٹنہ کی اہمیت: سیف علی تماشا گاہ سے غائب ہو گیا۔ اور جب سے اس کے بارے میں کچھ سنا نہ گیا۔ اب ہم سازش کو صحیح عینک سے جانچتے ہیں اور اس کے خاص خاص ناظموں کے سابق حالات زندگی پر نظر ڈالتے ہیں۔ یہ تو ظاہر ہے کہ یہ سازش کوئی علیحدہ واقعہ نہیں۔ اس کی شاخیں بہار سے باہر تک پہنچتی تھیں یہ مبنی تھی قسم قسم کے دور رس شبہات اور بے چینیوں پر جو صوبے میں

پھیلی ہوئی تھیں اور جن کو بہار میں اور باہر حکومت کے کچھ مخالف بے چینی پھیلانے والے بڑی ہوشیاری سے کام میں لائے۔

پٹنہ وہابیوں کا ایک مشہور مرکز تھا جس کی خلاف حکومت کاروائیاں مدت سے جاری تھیں۔ ٹیلر نے ۱۸۵۷ء کے فساد پر لکھنے ہوئے مقامی وہابیوں کو ان کی منضبط باقاعدہ تنظیم اور تربیت یافتہ اور بے غرمانہ رخ اور تیور سے ان بادلوں میں شمار کیا ہے جہاں سے اُسے طوفانِ بلا کی توقع ہے کیا ممکن ہے کہ ایسا پلانا مخالف حکومت طبقہ ایسی سازش سے جو ٹھیک ان کے صدر مقام میں جنم پا رہی ہو کنارہ کش رہتا؟

گمشدہ پٹنہ کی رپورٹ: اس خیال کو سلبی قیاسی طرز فکر کہا جاسکتا ہے۔ اس لئے اب ہم زیادہ قطعی اور ایجابی دلائل کی طرف رخ کرتے ہیں۔ واقعات کے غائر مطالعہ سے صاف واضح ہو جاتا ہے کہ سازش و حصول میں منقسم تھی: (۱) مقامی بے چینی (۲) اس کا رخ حکومت کے خلاف شورش کی طرف پھیر دینا اور اسے فوج کے ہندوستانی سپاہیوں تک پہنچا دینا۔ اس موضوع پر اکثر مصنفین نے اس اہم پہلو کی غلط تاویل و تعبیر کی ہے۔ بہر حال معاشرہ حکام کی نظر کے سامنے دونوں پہلو نمایاں اور صاف تھے۔ پٹنہ کے گمشدہ نے لکھا کہ "مغرب جو کہا جاتا ہے کہ کلکتہ سے سٹیج تک فوج کے ایک ایک ڈویژن میں بھیجے جاتے تھے قدرۃً ان کو بے چینی کے تمام اسباب کا پتہ لگانا تھا تا کہ ان کا خمیر اٹھایا جاسکتا اور ایسے لوگوں سے شناسائی پیدا کی جاتی جو اپنی سازشی افتادِ طبیعت سے ہماری طاقت کے اُلٹنے اور پامال کرنے میں معین ہوتے۔ مسلمانوں کو یہ سبب بارگہ کھایا جاتا کہ تختِ دہلی پر دو بارہ خانوادہ تیموری کا جلوس ہو گا اور ہندوؤں کے سامنے عیسائی بنائے جانے کا ہوا کھڑا کیا جاتا۔ راحت علی مخالف حکومت رحمان کا

۱۸۴۶ء
لہ گمشدہ پٹنہ کی جٹی سکریٹری حکومت بنگال کے نام۔ نمبر ۱۰۰۲ مورخہ ۸ جنوری ۱۸۴۶ء۔

بالکل ایسا ہی مقامی آدمی تھا۔ اس نے بہت پہلے ۱۸۲۹ء میں ایک شخص عبداللہ نامی کے ساتھ افسر بازیابی ایلٹیٹ کی عدالت میں بازیابی کی کارروائیوں کی سختی کے خلاف ایک تنظیم کا آلہ کار تھا۔ اس لئے شمالی مغرب کے لئے دوسرے فریق کے مجبوروں نے اسے مقامی ٹسر کا یا ارکان کی حیثیت سے منتخب کیا تھا۔ سیف علی دوسری پارٹی یعنی سازش میں باہر کی پارٹی کی نمائندگی کرتا تھا جو مقامی سرداروں اور باہر (شمالی مغرب) کے ناظموں کو باہم مربوط کرنے والی کڑی تھی۔ یہ حقیقت کہ آخر الذکر ٹولی ہی سازش کی اصل منظم تھی تفتیش کنندہ پولیس افسر کی اس تصدیق سے ثابت ہو جاتی ہے کہ سازش کا منصوبہ ان کے مخبر سیف علی کے ساتھ اوپر سے آیا تھا۔ اس سازش کا وہ روح رواں تھا۔ اسی نے فوجی سپاہیوں سے رابطہ پیدا کرنے کی پہلے پہل تجویز پیش کی، بار بار جمنٹل احاطوں میں گیا اور نقد روپیہ کا معاملہ کیا، میجر ٹریٹ نے بھی اس کا رنامے میں اس کے نمایاں حصہ کا اعتراف کیا ہے۔ اس نے لکھا کہ یہ پہلا شخص ہے جس نے نئی (پیرنکس) کے کان میں یہ آواز ڈالی اور جس نے اس کا تعارف خواجہ سے کرایا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے یہ رائے زنی بھی کی کہ اگر سیف علی گرفتار ہو جاتا تو اس معاملہ پر زیادہ روشنی پڑتی۔

سیف علی: اب سوال یہ ہے کہ سیف علی تھا کون؟ سپرنٹنڈنٹ پولیس جس نے سیف علی کا مبہم سا پتہ دیا تھا کہ وہ شمال مغرب کی طرف سے کارپرواز تھا۔ بعد میں اپنی چٹھی مورخہ ۱۶ مارچ ۱۸۳۶ء میں زیادہ معین اور اہم خبر دی ہے جس سے اس موضوع پر تمام مصنفین کی نظر چوک گئی، وہ یہ ہے کہ سیف علی مشہور مسلمان سردار امیر خاں کے بیٹے کا ایجنٹ ہے جو اب ٹونک کا جاگیردار ہے، سیف علی کی تشریح سے جو پیرنکس کے متذکرہ بالا بیان میں دی گئی ہے۔ مطابقت رکھتی ہے جس میں اسے ایک حکمراں شاہزادے کا ایجنٹ بتایا ہے۔ پیرنکس نے اس کو ایسا شخص بتایا ہے جو بہت اچھا تعلیم یافتہ اور حساب و کتاب

سے واقف ہے ایک سوال کے جواب میں کہ آیا سیف علی ایک ذمہ دار اور باوقفت شخص ہے پیر کنیش نے کہا کہ وہ ایک خوش رو جوان، صورت شکل سے شریف خوش لباس سیاہ ڈاڑھی سوچھوں والا کشیدہ قامت ہے۔ وزیر الدولہ اور اس کے زیادہ مشہور والد امیر خاں کا تعلق دہلی تحریک سے اور اس کے لئے ان کی پیش یہاں خدمات اور سرپرستی محتاج تشریح نہیں۔ اگر ایک دفعہ یہ اصل حقیقت بھی نشیں کر لی جائے تو ان کاغذات کے تمام مبہم اشارات واضح ہو جائیں۔ مثلاً شمال مغرب سے مجزوں کا ذکر، راحت علی کے پیر کنیش کے نام خط میں قرآن مجید کی آیات: اپنے گھروں سے ہجرت کر جاؤ، اللہ کی راہ میں جہاد کرو اور ایک خط میں مشہور فارسی نصیف انوار سہیلی سے بعض نصائح، یہ سب بے شک و شبہہ دہلی مصطلحات ظاہر کرتے ہیں۔ ۱۸۵۷ء کے برعکس فوری طور پر شورش برزود نہیں دیا گیا بلکہ ضرورت پڑنے پر اگر عملی اعسالت حاصل نہ ہو تو خاموش بیٹھے۔ یہ امر بھی دہلی حکمت عملی سے مطابقت رکھتا ہے۔ یہ اس حقیقت کی طرف صاف اشارے ہیں کہ سازش بہار سے آگے اور لوگ کانپور سے آگے اس کا ہندو بست کر رہے تھے۔ اور یہ دوسرے لوگ صرف دہلی ہی اپنی ہندوستان کے انگریز دشمن جدوجہد کے پھیلے ہوئے جال سے بچ سکتے تھے۔

راحت علی: اس سازش میں دوسری خاص شخصیت راحت علی کی تھی۔ وہ صدر امن سلامت علی کا بیٹا اور قصبہ نیورا ضلع پٹنہ کا باشندہ تھا۔ ہم یقینی طور پر نہیں جانتے یا وہ

یہ خود بخود مان لیا گیا ہے کہ شمال مغرب کے ذکر سے پنجاب مراد ہے جہاں انگریزوں اور سکھوں کی جنگ چھڑی ہوئی تھی اور یہ اس زمانے کا بہتم بالشان واقعہ تھا۔ بہر حال ہمیں یاد رکھنا چاہئے کہ یہ ٹھیک ہی زمانہ تھا۔ اس کے بعد ان علی ہزارہ میں انگریز سکھ فوج سے نبرد آزما تھے۔ کیا ان کے لئے یہ ممکن نہ تھا کہ پٹنہ اپنے وطن ہی میں شورش پیدا کر دیں جہاں حکومت کے خلاف ایک منظم جماعت بہانہ کا دسترس تھا۔

۱۸۵۷ء وہ نیورا کا ایک وقیع زمیندار اور سر علی امام مرحوم کا رشتہ دار تھا۔ اس کا تعمیر کردہ اینٹ کالیک مینارہ توپ لگانے کے سوداخوں کے ساتھ اب تک نیورا میں موجود ہے۔

وہابی تھا لیکن اُس کے بعض قریبی قرابت مندوں کے مندرجہ ذیل حالات یہاں معاون ہونگے۔
 ۱۸۴۰ء میں دانا پور کا ایک شخص محمد عمر ایک نمایاں وہابی سردار کی حیثیت سے گرفتار کیا
 گیا تھا جو حکومت کے خلاف جدوجہد میں مصروف تھا۔ تفتیش کے دوران میں حکومت
 کو معلوم ہوا کہ وہ راحت علی کا بھانجا ہے۔ راحت علی کے پچھلے حالات اچھی طرح معلوم
 تھے اس لئے محمد عمر کے قرابت مندوں کے حالات کی پوری چھان بین کی گئی اور معلوم ہوا کہ
 راحت علی کے تین بہنیں تھیں۔ ان میں سے ایک کی شادی ادا علی صدر امین ترہت سے
 ہوئی۔ اس کے دو بیٹے تھے، نجم الدین اور وعید الدین۔ اول الذکر کچھ عرصہ تک پٹنہ افیم
 گودام کا سررشتہ دار رہا، بعد میں راجہ بتیا کادلیوان ہو گیا۔ ۱۸۵۶ء میں ٹیلر نے اسے
 حکومت کے خلاف مشتبہ شورش انگیز کی حیثیت سے گرفتار کر لیا۔ اس کی دوسری
 بہن کے بیٹے فرزند علی وکیل عدالت دیوانی چھپرہ، تنشی اسمعیل اور عبدالکریم عملہ عدالت
 حجتی پٹنہ اور عبدالوہاب تھے۔ تیسری بہن کے بیٹے کا بیٹا وہابی قائد محمد عمر تھا۔ اس کے دو
 بھائی محمد یحییٰ منصف پٹنہ اور صادق عدالت حجتی پٹنہ کے محافظ دفتر تھے۔ ان سب پر
 وہابیوں کے عملی ہمدرد ہونے کا شبہہ تھا۔ الغرض راحت علی کے اکثر قرابت دار حکومت
 کے مختلف عہدوں پر فائز تھے اور ان پر پہلے سے حکومت کے خلاف کارروائیوں کا شبہہ
 تھا۔ ۱۸۴۰ء میں واضح طور پر ثابت ہو گیا کہ ان میں سے اکثر وہابی تھے۔
 سازش ۱۸۴۵ء کے بانی: آخر میں ہم جی بی مالین کی اس موضوع پر تحریر پر بھی
 ایک نظر ڈالیں۔ وہ اس سازش کو صاف صاف وہابیوں کی کارستانی بتاتا ہے۔ بہار
 میں بے چینی کے متفرق مقامی اسباب کی تنقیح اور پٹنہ میں وہابیوں کی کارروائیوں
 کا جائزہ لیتا ہوا وہ اپنی تصنیف کے ایک اور مقام پر وہابی جدوجہد اور ۱۸۴۵ء کی
 سازش کے باہمی تعلق کو زیادہ صاف عیاں کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے کہ "سازشیوں کا ایک
 جھٹا (پٹنہ میں ۱۸۴۵ء میں) ایک سازش کو جنم دے رہا تھا جب کہ سپاہیوں کو نقد میں
 تقسیم کی جاتی تھیں، ایک کاغذ ہاتھ آیا تھا جس میں ایک سو خاص خاص خاندانوں کے نام
 درج تھے۔ ان میں ایک شہر (پٹنہ) تھا جو پیغمبر اعظم (سید احمد) کے دو نامور خلیفوں

(برادران علی) کا صدر مقام تھا لہ

ان تمام معنی خیز امور کے پیش نظر جن کا ان کے صحیح سیاق و سباق میں اب تک جائزہ نہیں لیا گیا یہ واضح ہے کہ ۱۸۲۵ء کی سازش کے اصل منظم وہابی ہی تھے۔

اہم خطوط کی ضابطی: وہابی پھر ۱۸۵۲ء میں ہندوستانی افواج کی وفاداری میں خصل انداز کی کوشش میں نمایاں کردار تھے۔ اس باریہ کوشش شمال میں راولپنڈی کے قریب کی گئی۔ راولپنڈی میں تعینات چوتھی دہلی پیدل فوج کے ایک رجمنٹل منشی محمد ولی کے گھر سے متعدد خطوط ضبط کئے گئے۔ منشی نے اپنے تئیں سید احمد کا مرید ہونے کا اقرار کیا۔ خطوط کا یہ پلندہ جو اس سے برآمد کیا گیا اور جو وہابیوں کے عام طرز تحریر میں لکھا ہوا تھا اس میں کئی ستھانہ کے اکرام اللہ کی طرف سے دبگر ٹولی ... پٹنہ سٹی کے حسین علی خاں کے نام سے تھے۔ ان خطوط میں ہندوستان سے سوات میں رضا کاروں کی آمد کی خبر ہے اور آئندہ سرحد کو آنے والوں کی رہنمائی کے لئے مفصل ہدایات ہیں۔

عباس علی کی گرفتاری: ان ضبط شدہ خطوط سے یہ بھی معلوم ہوا کہ آدمی اور اسلحہ میرٹھ اور لدھیانہ کے راستوں سے سوات بھیجے جاتے تھے۔ اسلحہ میرٹھ میں قاضی محمد یا سرفراز علی کے پاس امانت رکھ دئے جاتے۔ اور لدھیانہ کا ایجنٹ عباس علی تھا جو مقامی مسجد عبدالقادر ٹیٹی مسجد کے قریب رہتا تھا۔

ڈپٹی کمشنر راولپنڈی نے پٹنہ اور میرٹھ کے میسٹریوں کو اور ڈپٹی کمشنر لدھیانہ کو لکھا کہ ان اشخاص کے گھروں کی تلاشی لیں جن کے نام ان کے اپنے علاقوں کے سخت درج ہیں اور ان کے قبضے سے جو کاغذات برآمد ہوں وہ ضبط کر لے جائیں۔ لدھیانہ کے عباس علی کو گرفتار کر لیا گیا اور کچھ مزید خطوط اس کے قبضے سے دستیاب ہوئے جن سے ایک شخص ابو عبدالرحیم ساکن پٹنہ کا ملوث ہونا ثابت ہونا تھا۔ ڈپٹی کمشنر لدھیانہ فلیپ گوانٹانی نے بھی پٹنہ کے میسٹریٹ کو لکھا کہ اس شخص کے

لہ جی بی مالین جلد ۱ صفحہ ۲۰۵-۲۰۶ یہ صوفیوں کے قبضے سے ملے ہوئے اسلحہ کا تفصیلی بیان ہے

بارے میں تفتیش کرے جو "سوات کے قائدوں سے تعلق رکھتا تھا"

حسین علی کی خانہ تلاشی: چنانچہ پٹنہ کے مجسٹریٹ نے تحقیقات کی اور حسین علی کے گھر کی تلاشی لی۔ مجسٹریٹ نے اپنی رپورٹ میں لکھا کہ تحقیقات غلط تھی، کیونکہ حسین علی تو محض احمد اللہ کا ایک خاندان تھا اور اُس کے گھر کا پتہ صرف پردہ داری کے لئے لکھا گیا تھا۔ اصل مکتوب الیہ احمد اللہ ہی تھا۔ مجسٹریٹ کو اس کے گھر کی تلاشی لینے کا کوئی اختیار نہ تھا۔ اس کام کے لئے بہر حال اُس کو فوجی اعانت کی ضرورت تھی احمد اللہ کی دھمکی: احمد اللہ کو اپنی متوقع گرفتاری کی خبر پہلے ہی مل چکی تھی ان کو بہ خیر لاہور کے ایک حکیم سے ملی تھی جو راولپنڈی سے آنے والے خط سے دو روزہ قبل پٹنہ پہنچا تھا۔ چنانچہ سارے کاغذات تلف کر دیے گئے۔ مجسٹریٹ نے آگے چلکر یہ رائے زنی بھی کی کہ شہر میں یہ گروہ بڑھتا جاتا ہے۔ ہر جمعہ کو جلسے (خطبے) ہوتے جن میں اس فرقہ کے عقائد کی وضاحت کی جاتی اور نئے لوگ اس میں داخل ہوتے زیادہ مخدوش بات یہ تھی کہ احمد اللہ نے کوئی پانسو آدمی جمع کر لئے تھے اور علانیہ کہہ دیا تھا کہ اگر حکومت نے ان کی سرکوبی کے لئے کوئی سخت اقدام کیا تو میں بغاوت کا علم بلند کر دوں گا۔ صورت حال ایسی مخدوش ہو چکی تھی کہ حکومت کو توجہ کی ضرورت لاحق ہو گئی تھی۔ ابو عبدالرحیم کے متعلق جس کا ذکر گولڈن کی چٹھیوں میں ہے مجسٹریٹ نے لکھا کہ ایسا کوئی شخص موجود نہیں۔ مگر اس کو شک ہو گیا کہ وہ ملوث شخص ولایت علی کے بڑے بیٹے عبداللہ ہیں اور شخص اول الذکر محض ایک نابینا شخص ہے۔

پنجاب کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن (مجلس انتظامیہ) یا حکومت بنگال، کسی نے بھی اپنے اپنے ماتحت ملکی افسروں کے خدشہ سے اتفاق نہیں کیا۔ لفٹننٹ

لہ اس سے سرکاری دفاتر میں وہابی سازشیوں کی موجودگی اور ان کی تنظیم کے جو کس رہنے کا ثبوت ملتا ہے۔

گورنر بنگال نے صرف متذکرہ بالا روراد مورخہ ۲۶ اگست ۱۸۵۲ء کے لکھنے پر اکتفا کی۔ حکومت ہند کے سکریٹری نے پنجاب کے بورڈ آف ایڈمنسٹریشن (مجلس انتظامیہ) کے نام ایک علیحدہ چٹھی میں مذکورہ روراد میں مندرج جذبات کا اعادہ کرتے ہوئے مزید لکھا کہ پٹنہ بے شبہہ ہندوستان کے وہابیوں کا صدر مقام ہے وہاں سے خطوط ملے ہیں۔ رضا کاروں کی ٹوبیاں وہیں سے سرحد کی نوآبادی کو روانہ ہوتی ہیں۔ گورنر جنرل باجلاس کونسل نے یہ ہدایت بھی کی کہ چوتھی N.I. (رسی پیدل فوج) نے رجمنٹل منشی کو ایک مثال سمجھنا چاہئے جو حکومت کے خلاف مراسلت کا واسطہ بنا رہا ہے۔

شمالی ہند میں وہابی تحریک: یہ حقیقت کہ وہابیوں کی متذکرہ بالا کارروائیاں دہلی سے ضرر نہ تھیں جیسی کہ گورنر جنرل باجلاس کونسل ہمیں یقین دلانا چاہتے تھے ان مہموں سے ظاہر ہے جو ان کے فوراً بعد ہی ۱۸۵۲ء میں قبیلہ حسن زئی اور وہابیوں کے خلاف بھیجی گئیں۔ ہنٹر راولپنڈی میں اس اقدام کی معنویت کا صحیح انداز لگاتا ہے۔ وہ رقم طراز ہے کہ "۱۸۵۲ء میں ہماری افواج کے ساتھ باغیانہ مراسلے پنجاب کے حکام نے پکڑے تھے جو چوتھی دہلی پیدل فوج متعینہ راولپنڈی کو جو ان شورشوں کی نوآبادی سے بہت قریب ہے اور پہلی رجمنٹ ہے جو ہمارے صوبہ پر دھاوا کر کے ان کے خلاف کارروائی کرنے کو بھیجی جاتی، اسے درغلانے کو ایک عیارانہ کوشش کی گئی تھی"۔

پشاور میں وہابیوں کے خطوط کی ضبطی: ۱۸۵۴ء میں دوسری کوشش پشاور میں کی گئی۔ ایک بار اور پٹنہ کے کچھ وہابیوں کے باغیانہ خطوط پشاور میں متعین جو شہر میں دہلی پیدل فوج کے نائب شیخ کریم اللہ کے قبضے سے پکڑے گئے۔ وہ شیخ قدرۃ اللہ ساکن ارکی ضلع گیا کا بیٹا تھا۔ اس کے بہت سے رشتہ دار فوج کے متفرق شعبوں میں متفرق عہدوں پر مامور تھے۔ اس کے قبضے سے جو خطوط برآمد ہوئے وہ ایک شخص نھو کے لکھے ہوئے تھے۔ یہ سب خطوط ۱۸۵۴ء کی شورش

۱۸ معلوم نہیں اس منشی کو کیا سزا دی گئی

کے موقع پر لکھے گئے تھے۔ کریم اللہ ان کو ستھانہ کے وہابیوں تک پہنچا دیا کرتا اور اپنے لوگوں میں ان کے پیغام پھیلا دیا کرتا۔ ان خطوط کے ترجمے اور خلاصے کاتبوں کا پتہ لگانے کے لئے پٹنہ بھیج دئے جاتے۔

ہزارہ کے سیاسی حالات: ان واقعات پر اُس وقت ہزارہ کی سرحد پر سیاسی حالات کے پس منظر میں نظر کرنا چاہئے۔ منظر اگرچہ بظاہر ساکن اور خاموش نظر آتا تھا مگر تھا تاریک اور خطرناک یہ ضلع قبیلہ یوسف زئی کے علاقہ کی سرحد پر واقع تھا جہاں ہیجان کا خمیر اٹھ رہا تھا۔ سوات کا بے دخل کیا ہوا سردار مبارک شاہ جو انگریزوں سے آزردہ تھا۔ پڑوسی علاقہ پنج تار میں مقیم تھا۔ اس کے قریب ہی منگل تھانہ وہابیوں کا صدر مقام تھا۔ ولایت علی ۱۸۵۲ء میں وفات پا چکے تھے اور ان کے چھوٹے اور زیادہ متہوّر بھائی عنایت علی وہابیوں کے قائد تھے۔ یہ ۱۸۵۴ء کے واقعے سے فائدہ اٹھا کر انگریزوں پر جب کہ وہ دوسرے علاقوں کی پریشانیوں میں الجھے ہوئے تھے سخت حملوں کیلئے بے چین تھے۔ اس کی تیاری میں ان دیسی فوجوں میں جو اس پاس ہیں متعین تھیں گھس پیٹھ اور مداخلت کی چالوں میں تیزی سے مصروف کار تھے۔

جنگ ۱۸۵۴ء: اس حقیقت کو پیش نظر رکھنا ضروری ہے کہ اس وقت تک ۱۲ مئی ۱۸۵۴ء کی شورش اٹھ چکی تھی اور اس کے شعلے تیزی سے ایک چھاؤنی سے دوسری تک پھیل رہے تھے۔ پشاور ڈویژن کی مخصوص صورت یہ تھی کہ ۱۸۵۴ء کی عام تحریک اور وہابی تحریک کے علیحدہ علیحدہ اثرات بیک وقت اپنا اپنا کام کر رہے تھے، اور ان کا رد عمل مختلف شعبوں پر مختلف تھا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ اس نازک وقت میں واقعات کا رشتہ بہت الجھ گیا تھا اور اکثر اوقات اُس زمانہ کے حالات پر وہابیوں کے اثر سے انکار کیا گیا ہے۔ لیکن واقعات کے فاسر مطالعہ سے ظاہر ہو جاتا ہے کہ دونوں اثرات جدا جدا کام کر رہے تھے۔ مثلاً اکاون ویل دیسی پیدل فوج کے سپاہی کار تو اس کے معاملے

پر بہت برا فروختہ تھے۔ اور اس سے وہابی کوئی واسطہ نہ رکھتے تھے۔ اور بہت سی پلٹنیں خصوصاً پچین ویں ویسی پیدل فوج کی (جس کے دستے مردان اور نو شہرہ میں تھے) پشاور کی انہتروں ویسی فوج اور دسویں اور ریگولہ رسالہ، یقینی طور پر وہابیوں کے زیر اثر تھے۔ اس ڈویژن کے واقعات پر اپنی رپورٹ میں ایڈورڈز رائے زنی کرتا ہے کہ پچینوں اور چوسٹھوں ویسی پیدل پلٹنوں کے درمیان اور دسویں اور ریگولہ رسالہ اور سوات اور پڑوس کے پہاڑوں کے ہندوستانی مذہبی دیوانوں کے درمیان ایک مدت سے ساز باز جاری ہے۔ اور مردان کلکٹری میں وہابیوں کے ایجنٹ دو ہندوستانی موسیٰ ان جاسوسوں کے میزبان تھے جو ادھر سے ادھر اُچکے پھرتے تھے۔

برطانوی وقائع نویسوں کا بیان، برطانوی مہموں کے دو مشہور وقائع نویس پیگٹ اور مین جو سرحد بھیجے گئے تھے وہ وہابی اثر کے متعلق اپنے اظہار رائے میں زیادہ صاف گوئی سے کام لیتے ہیں۔ ضلع پشاور کا صرف ایک حصہ جہاں لوگوں نے ملک میں فتنہ پردازی کے لئے سپاہیوں کے عذر سے فائدہ اٹھایا وہ یوسف زئی کی سرحد تھا۔ اور یہ زیادہ تر ہندوستانی مذہبی دیوانوں کے و باؤ کی وجہ سے ہو جن کو ہندوستان کے باغی حکمرانوں اور افراد کی طرف سے آدمی اور روپے کی امداد ملا کرتی تھی، پچین ویں ویسی پیدل پلٹن نے اپنی چھاؤنی سے خارج ہونے کے بعد جو کچھ کیا اور جس کا بیان بعد میں ہو گا، اس سے اس خیال کی تصدیق ہوتی ہے۔ کیونکہ یہ لوگ سیدھے سوات

لے رحمت ۱۵ نے تمام ہیریٹ رحمت (۱۰۶۴۔۷) کو ایک خط لکھ کر کارنوس کے محلے میں اپنے اظہار کا اظہار کیا اور ان کو دعوت دی کہ ان سے آئیں (خط از ایچ بی ایڈورڈز کمنڈر پشاور تمام آرٹیکلز میں جو پبلش کمنڈر پنجاب ۶۷ مورخہ ۲۳ مارچ ۱۸۵۸ء) ایڈورڈز اس خط کو نہایت قیمتی دستاویز بتاتا ہے کیونکہ اس سے عذر کے مسئلہ پر ایک رحمت کا دوسری رحمت پر کاسل اعتماد کا اظہار ہوتا ہے۔
۱۵ جس رات ان دستوں سے ہتھیار چھین لینے کے لئے پشاور سے فوج آئی دونوں فرار ہو گئے۔
بعد میں ایک گرفتار ہو گیا اور اسے پھانسی دی گئی۔

کی طرف چل پڑے اور وہاں سے وہابیوں کے صدر مقام منگل تھانہ چلے گئے۔

اکبر شاہ کا انتقال: بد قسمتی سے ٹھیک مبرہٹھ کی شورش کے دن وہابیوں کے

زبردست حامی صدر گار شاہ سوات اکبر شاہ کی ناگہانی اور بے وقت وفات نے

..... سیاسی پانسہ انگریزوں

کے موافق پلٹ دیا۔ اگر صرف سواتی اپنے مذہبی پیشوا آخوند کے تحت پھینچیں ملٹن کے

سپاہیوں اور وہابیوں سے مل جاتے تو غالباً اور قبائلی بھی مل جاتے اور انگریز زیر ہو جاتے۔

مگر یہاں یہ کہ متوقع مدد اور تعاون کے عوض پھینچیں ملٹن کے سپاہیوں کا زیادہ تر موت

کے آخوند کی عداوت سے ہر طرف مخالفت سے سامنا ہوا اور اس طرح کھد پٹے

گئے کہ کچھ بے برگ و بار ویران پہاڑوں میں سرٹکارتے ٹکراتے مر گئے، باقی اور لوگوں

نے عنایت علی کے صدر مقام منگل تھانہ میں پناہ لی۔ ان کا مزید ذکر آئندہ باب میں

ہوگا۔ الغرض ظاہر ہے کہ ۱۸۵۷ء کی شورش کے موقع پر اور اس دوران میں برابر

وہابی مستعدی سے سرحد پر انگریزوں کے خلاف مصروف کار رہے۔ انھوں

نے علیحدہ کام کیوں کیا اور ۱۸۵۷ء-۵۹ء کی تحریک میں شامل کیوں نہ ہو گئے اس

کے اسباب ایک علیحدہ موضوع ہیں جن پر علیحدہ باب میں بحث ہوگی۔

۱۸۵۷ء جلد ۲ صفحہ ۲۹۲-۵۵ کے سوات سے خارج کئے جانے کے بعد ان کا سرگردان

مارے مارے پھرنا اور مقامی لوگوں کا ان کے ساتھ غیر انسانی سلوک اس تحریک کی تاریخ میں بے

شبہہ ایک نہایت المناک حارثہ ہے۔

باب ۳

مجاہدات سرحد (۱۸۵۲ تا ۱۸۶۳)

معرکہ ۱۸۵۲ء - سرحد پر وہابی معرکوں کا پہلا سلسلہ خود سید احمد کے زیر قیادت ۱۸۲۲ء میں چلتا رہا۔ بعض تاریخی اسباب سے جن پر علیحدہ باب میں بحث کی گئی ہے، ان معرکوں میں سے اکثر سکھوں اور سرحد کے بعض خیرہ سرمداروں کے خلاف تھے۔ لیکن اس کے یہ معنی نہیں کہ سید احمد ملک کے خطرے کی اصل بجز انگریزوں سے بیفکر تھے۔ ان کے بہت سے مکتوب اس بات کا ثبوت دیتے ہیں کہ ان پر یہ حقیقت روشن تھی کہ اصل جنگ انگریزوں سے ہونی ہے۔

معرکوں کا دوسرا سلسلہ حکومت برطانیہ کے خلاف کچھ بعد میں شروع ہوا، اور ۱۸۵۲ء سے ۱۸۶۳ء تک جاری رہا۔ اس عرصے میں کئی سخت خونریز جنگیں ولایت علی، عنایت علی اور عبداللہ کی قیادت میں لڑی گئیں۔ واقعہ یہ ہے کہ سرحد پر وہابیوں کا یہ ننھا سا سوتا ایسی طاقت کا حامل تھا۔ جو ایک سیاسی خطرہ بن گیا اور برطانوی حکومت کے لئے ۱۸۵۲ء سے بیس سال تک سخت پریشانیوں کا باعث بنا رہا۔

ہزارہ پر انگریزوں کا قبضہ، پنجاب کے الحاق کے بعد ہزارہ کا علاقہ گلاب سنگھ سے علاقوں کے مباد لے کر انگریزوں کے قبضے میں آ گیا۔ اور ۱۸۴۵ء میں ہمیں ابوٹ اس کا پہلا ڈپٹی کمشنر ہوا۔ ابوٹ نے سب سے پہلے اس علاقے میں ہندوستان سے ہجرت کرنے والوں کے ایک نمایاں آشیانے اور اس کی حرکات و سکنات کی طرف

دیکھا ان میں سے بعض شیعہ شہدہ مکتوبات میں "انگریزوں اور عیسائیوں کے الفاٹاکو" سے بددیا گیا ہے اور کئی تعزات کئے گئے ہیں۔

توجہ مبذول کی جو اس کے خیال میں دکن یا مغرب میں ڈرائیوں کی کسی شورش کی صورت میں حکومت کے لئے خطرناک ثابت ہو سکتی ہیں۔

وادی کاغان پر انگریزوں کا قبضہ: اُس نے شمال میں وادی کاغان کے سادات سے بالخصوص وہاں کے ضامن خاں سے جو وہابیوں کا زبردست حامی تھا، جھگڑے بھی مول لئے۔ بظاہر سادات کے خلاف جھگڑے کا سبب ان کے بعض گوجر اسیوں کی ان کے مظالم کے خلاف شکایت تھا۔ مگر یہ محض ایک بہانہ تھا کیونکہ ابوط تحقیقات کے دوران میں صرف سادات کے دشمنوں کی دامتان پر کان دھرتا تھا۔ اصل سبب یہ شبہہ تھا کہ سادات وہابیوں سے ساز باز رکھتے ہیں۔ یہ وہابی دوسرے قبائل جیسے ڈھونڈ وغیرہ کو انگریزوں کے خلاف عام شورش برپا کرنے کے لئے اکٹرا رہے تھے۔ ایک فوج جو چھوڑ جھنٹوں، چھو توپوں اور بہت سے قبائلی نگر وٹوں پر مشتمل تھی سادات کے خلاف بھیجی گئی اور ان کو شکست دی گئی۔ ضامن خاں کو بے دخل کر دیا گیا اور وادی کاغان پر انگریزوں کا قبضہ ہو گیا۔

فوری مقصد حاصل ہو چکا تو ابوط اور اس کے بالادست افسروں کے درمیان

ان علاقوں میں مزید اقدامات پر مناقشہ شروع ہوا۔

۱۸۵۱ء
حسن زئی قبائلیوں کا سرحدی چوکیوں پر قبضہ: مہم کاغان کے فوراً بعد
میں انگریزوں کو کوہ سیاہ کی پہلی مہم کا بندوبست کرنا پڑا۔ اوریہ وہابیوں کے ساتھ پہلی مسلح آویزش کا باعث ہوئی۔ ہزارہ کا نظم و نسق ہاتھ میں لینے کے بعد انگریزوں نے اپنے مخصوص مکمل طرز پر پنجاب بورڈ آف منسٹریشن (مجلس انتظامیہ) کے مجموعی اختیارات کے تحت انتظامات کے متعدد محکمے قائم کئے۔ ان میں سے ایک محکمہ نمک کی سرحد پار سے درآمد کی نگرانی کرتا تھا۔ محکمہ کے دو مقامی افسروں، کارنک اور بیٹے نے ان راستوں کی دیکھ بھال اپنے ذمہ لی جن سے ممنوع نمک آتا تھا۔ ان کو رپورٹ ملی کہ یہ سرزمین آمب کے اُس ماہ راے سندھ حصہ سے گزرتا ہے جو حسن زئی کے آزاد قبائلی رقبے کی سرحد پر واقع ہے۔ اپنی تفتیش و تلاش میں وہ

آزاد حسن زئی رقبے سے خطرناک طور پر قریب جا پہنچے۔ یہ ڈھٹائی ان کے اعلیٰ افسروں کی واضح اور مثبتہ مرضی کے خلاف تھی۔ انھوں نے اس کا خمیازہ بھگتا اور بعض نامعلوم قبائلیوں کے ہاتھوں جن پر حسن زئی ہونے کا شبہ ہے مارے گئے۔ یہ قتل لاپرواہ اور لوٹ پر محمول کیا گیا۔ حالانکہ دراصل اقتصادی مقاصد کا فرما تھے۔ حسن زئی کو گمان ہوا کہ یہ دونوں افسر ممنوع نمک کا راستہ ان کے رقبے تک وسیع کر کے ان کے نمک کی تجارت کو متاثر کر دینگے۔ اس فعل کو انھوں نے اپنے وسیلہ معاشی میں مداخلت اور ناجائز تصرف قرار دیا۔ پہلے انگریزوں نے آسٹریا کے سردار جہان نداد خاں اور اس کے جاگیرداروں پر حسن زئی کے شریک کار ہونے کا شبہ کیا۔ اس لئے حسن زئی سے کہا گیا کہ ان تمام حسن زئی کو جو اس کی سر زمین پر آباد ہیں یہ اعمال کے طور پر انگریزوں کے حوالہ کر دے جہان نداد خاں نے تو یہ مطالبہ مان لیا مگر اس سے حسن زئی مشتعل ہو گئے، اس پر حملہ آور ہوئے اور اس کی سرحدی چوکیاں چھیری اور شنگلائی چھین لیں۔

کوہ سیاہ کی پہلی مہم، انگریزوں نے اپنے حلیف کو اس کمر تو ت کے نتائج سے جو انھیں کی مرضی سے اسے انجام دینا پڑا تھا، بچانے کے لئے مداخلت کی اور اس طرح پہلی مہم کوہ سیاہ کا آغاز ہوا۔ کوہ سیاہ کا سلسلہ ضلع ہزارہ کی شمالی مغربی سرحد تک پھیلا ہوا ہے۔ یہ شمال میں علاقہ اگروڑ سے اور جنوب میں تٹاروں سے گھرا ہوا ہے۔ دریائے سندھ کا دامن اس کی شمالی سرحد ہے اور وہاں سے سیدھا جنوب کو مڑ جاتا ہے۔ دریائے سندھ اور پہاڑ کی درمیانی ڈھلوان پر عظیم یوسف زئی قبیلہ آباد ہے جس کی اسی کی ایک شاخ ہے۔ اہل نے کارنگ اور چیمے کے قتل کے انتقام کے لئے مسلسل مطالبے کیے جو قبائل میں حکومت کا وقار برقرار رکھنے کے لئے ضروری سمجھا جاتا تھا۔ مگر گورنر جنرل باجلاس کونسل

لہ سرحد پر برطانوی مہموں کی تاریخ میں کوہ سیاہ اہم مقام رکھتا ہے۔ اس کے ڈھلوان پر آباد قبائل کے خلاف یکے بعد دیگرے جلد جلد کئی گھمان کی جنگیں لڑی گئیں۔

پہلے کسی ایسے اقدام سے متفق نہ تھا اس لئے نہیں کہ وہ ان بھلے آدمیوں (کرتاک اور ٹپے) کے انجام کو کوئی وقعت نہ دیتا تھا۔ بلکہ اس لئے کہ رپوٹ کی مجوزہ ^{میں} ہمیں بدترحات میں ڈال دینگے، آخر بڑے تامل و تذبذب کے بعد اور کرنل میکین کے اصرار سے جو اس بارے میں ابوٹ کا انجیال تھا، ایک فوج جو رہنماؤں کے ایک دستے اور کچھ پولیس کی ٹولی پر مشتمل تھی (دسمبر ۱۸۵۱ء میں) تین کالموں میں ہزارہ کے خلاف روانہ ہوئی۔ یہ کوہ سیاہ پر چڑھ گئی، حسن زئی کو سزا دی اور ان کے گاؤں کو آگ لگا دی۔

اس فوجی مہم کی جس کے بارے میں حکام پہلے متامل تھے نسبتاً سہل کامیابی پر حکومت خود حیرت زدہ ہو گئی۔ اب وہی حکام کرنل میکین کی مدد سراجی سے ٹھکتے نہ تھے۔ وہ خود بھی اس سہل فتیابی پر متحیر تھا اور کہتا تھا کہ ”اس کا سہرا جہانِ اداخاں کے سر ہے جس نے میرے گاڑھے وقت میں اتنی سہولت سے میری موثر امداد کی“ ساتھ ہی وہ شبہہ کا اظہار کرتا تھا ایا جہانِ ادا ہماری مدد کا مستحق ہے اور کب تک وہ اس سے فائدہ اٹھاتا رہے گا۔ میکین کا یہ قول غیبی اشارہ تھا، کیونکہ مہم حسن زئی سے واپس آنے کے بعد فوج ایک نئی مصیبت یعنی وہابیوں سے دوچار تھی۔ انگریزوں کے خلاف عنایت علی کی کوششیں: حسن زئی پر انگریزوں کے حملے سے فائدہ اٹھا کر عنایت علی نے دوسرے قبائل میں اپنا کام شروع کر دیا۔ ان کو رغبت دلائی کہ انگریزوں کے مقابلے میں اٹھ کھڑے ہوں اور اپنے قبائلی بھائی حسن زئی کی اعانت میں جنگ کریں۔ انھوں نے تمام سرحدی قبائل کی زیادہ وسیع ہمدردی حاصل کرنے کا یہ غنیمت موقع تاکا۔ یہ ان کے اپنے مقصد کی کامیابی کے لئے بھی نہایت قومی اور ضروری ذریعہ تھا۔ جہانِ اداخاں کے علاقے پر جو راستے میں پڑتا تھا ایک بار پھر حملہ کیا گیا اور اس کی مملو کہ چوکی کو ٹلا پر قبضہ کر لیا گیا۔ مگر پہلے اور مواقع کی طرح اس بار بھی قبائل متحد نہ ہوئے۔ آخر یہ کام ہندوستانی رضا کاروں کے ایک گروہ پر چھوڑ دیا گیا جو انگریزوں کے

زیر ستم ایک سرحدی قبیلہ کی مدافعت کے لئے بہار و بنگال کے دور دراز ملکوں سے آئے تھے۔ خود پڑوسی قبائل خاموش اور بے تعلق تماشا بنے رہے۔ انگریزوں نے دہائیوں کو بھی حسن زئی کی امداد سے باز رہنے کی کوشش کی، مگر عنایت علی نے ان کی پیشکش کو حقارت سے ٹھکرا دیا، اور کہہ دیا کہ ”میں تو مرنے ہی کو آیا ہوں۔“ ایک بار پھر حکومت دہائیوں کے خلاف فوج بھیجنے میں متائل ہوئی۔ خود کرنل میکسین نے اپنی ایک رپورٹ مورخہ ۶ جنوری ۱۸۵۲ء بنام مجلس منتظمہ پنجاب میں لکھا کہ ”میں نے بہت تامل کیا آیا کوٹلا کے معاملہ میں کوئی مداخلت کروں۔ صرف وہ علاقہ دیکھ کر جس کو بار بار بحفاظت مطیع کرنے کی طرف سے ہمیں اطمینان ہو جائے اور جہاں سے دہائی لشکر کو مجبور اور بے بس کر دے سکیں..... مجھے یہ ہمت ہوئی کہ ادھر اپنی ایک فوج روانہ کر دوں.....“

قلعہ کوٹلا پر انگریزوں کا قبضہ: آخر ۶ جنوری ۱۸۵۲ء کو قلعہ کوٹلا پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے میجر ابوٹ کے زیر کمان ایک فوج روانہ کی گئی۔ یہ قلعہ قصبہ عشرہ میں قریب ایک ہزار فٹ کی بلندی پر پہاڑ کی نکلی ہوئی چٹان پر واقع ہے۔ برطانوی فوجیں اپنے حلیف جہان ناد خاں کی فوج کے شمول سے تین مختلف اطراف سے آگے بڑھیں۔ اسی طرح دہائی تعداد اور اسلحہ میں اپنے سے قوی تر دہائیوں کے درمیان پھنس گئے۔ جب کہ انگریزی فوج دریائے سندھ کو عبور کر کے آگے بڑھ رہی تھی جہان ناد خاں کے بھرتی کئے ہوئے زنگر وٹوں نے اپنی واپسی کا راستہ قطع کر دیا۔ دہائی ایک پرجوش عقبی دستے لڑتے مہڑتے کوٹلا سے نکل گئے اس میں ان کے ستر آدمی ضائع ہوئے جو کرم علی دانا پوری کے زیر کمان لڑتے ہوئے شہید ہو گئے البتہ عنایت علی اپنے خاص رفقا کے ساتھ کوٹلا

سے صحیح و سالم نکل گئے۔ وہابیوں کا صدر مقام ستھانہ اب غیر محفوظ اور برطانوی حملہ کی زد میں تھا۔ مگر انگریزوں نے صرف کوٹلا پر دوبارہ قبضہ کر لینے پر قناعت کی اور ستھانہ پر چڑھائی نہیں کی کیونکہ ستھانہ تمام ذخائر اور اسلحہ سے خالی ہو چکا تھا۔ جو کوٹلا منتقل کر دئے گئے تھے۔

سرجن لائل کا وہابیوں کو خراج تحسین: اس معرکہ سے متعلق انگریزی کاغذات سے ریاست ستھانہ کی کچھ نہایت اہم جزویات ہمیں دستیاب ہوئی ہیں۔ ہمیں کچھ زخمی وہابیوں کے بیانات بھی ملے ہیں جن کو گائڈ کے دستوں کی اسسٹنٹ سرجن لائل علاج کے لئے پشاور اٹھائے گیا تھا۔

لائل ان کی وفاداری اور عزت نفس کے اعلیٰ جذبہ کی تعریف کرتا ہوا لکھتا ہے کہ اپنی زار و زبوں حالت پر بھی ہر بات سے اپنی قطعی لاعلمی کا اظہار کیا اور اپنے ساتھیوں کو ملوث کرنے کے خوف سے کوئی بیان دینے سے انکار کیا۔ صرف رجمنٹ کا ایک سپاہی ان کا اعتماد حاصل کر کے ان سے کچھ باتیں دریافت کر سکا۔ ان کے بیان سے یہ ظاہر ہوا کہ وہابیوں کی تعداد چھ سو ہے اور یہ کہ پہلے ولایت علی ان کی تمام کارروائیوں کی سربراہی کرتے تھے، مگر ایک سال ہوا ان کے انتقال کے بعد قیادت ان کے چھوٹے بھائی عنایت علی کو تفویض ہوئی۔ سوات کے سید اکبر کے چار بھائی ان کی جماعت کے ساتھ رہتے اور ان میں کافی اثر رکھتے تھے۔ ان کی آمدنی کا بڑا ذریعہ تمام ملک میں پھیلے ہوئے مبلغوں کی تحصیل کردہ رقوم تھیں۔ ان کے خاص محسن نواب ٹونک بیس سے چالیس ہزار روپے سالانہ بھیجا کرتے تھے۔ حیدرآباد کے نواب نصیر الدولہ بھی روپے بھیجتے تھے۔ آمدنی کا ایک اور بڑا ذریعہ ستھانہ میں نوستو بیگمہ زمین تھی جو اکبر شاہ نے دی تھی، اور سب مزدور تھی۔ چالیس آدمیوں کی اپنی زرعی پیداوار تھی جو سب کی سب بیت المال

سے سرحد کے راستے پر ان رضا کاروں کو شہروں اور گاؤں کے اجہاں سے گزرتے تھے۔ چند دن سے خوراک مہیا ہوتی تھی۔

میں دیدی جاتی تھی۔ ان کی خوراک زیادہ تر وال روٹی تھی۔ جماعت کو پابندی سے قواعد کرائی جاتی۔ مکان کا لغزہ اللہ اکبر تھا۔ ان کے پاس اچھی نسل کے کوئی دس گھوڑے تھے۔ جماعت میں سے نصف کے پاس قرابینیں تھیں۔ مجموعی حیثیت سے وہ اچھی طرح مسلح نہ تھے

یہ تھا اُس مختصر جاں نثار جماعت کا حال جو آزادی کے لئے لڑ رہی تھی اور جس نے مسئلہ طور پر بہت قلیل مادی وسائل کے باوجود حکومت برطانیہ کی طاقت کو چیلنج دے رکھا تھا۔ برطانوی سے ایشیہ پہلے محاربوں میں وہ فتح کا جھنڈا توڑا نہ سکے، مگر ان کی جدوجہد کا موازنہ محض فوجی فتوحات کے نقطہ نظر سے نہ کرنا چاہیے۔ ان کی عظمت کا اصل معیار آزادی کی لگن اور قربانی کا جذبہ ہے جس نے ان کو مشار کر رکھا تھا۔

اخوند کی وہابیوں سے سرد مہری: کوٹلا کی لڑائی کے بعد عنایت علی چملا کے علاقہ نواگانی میں منتقل ہو گئے۔ بعد چند سالوں میں وہ سوات اور بنیر کے علاقوں میں مختلف جگہوں میں پھرتے رہے۔ مہرنے اس زمانہ میں عنایت علی کی نقل و حرکت کی متفرق روایتیں ان کے بیٹے عبدالمجید کے روزنامے سے نقل کی ہیں۔ اس روز نامے کے ایک اندراج سے معلوم ہوتا ہے کہ عنایت علی نے سید اکبر شاہ اور اخوند سے انگریزوں کے خلاف جنگ میں ان کا ساتھ دینے پر اصرار کیا تھا۔ مگر اخوند

سے اخوند (یعنی مذہبی پیشوا) کا نام عبد الغفار تھا۔ وہ ۱۷۹۴ء میں پیدا ہوا اور ایک نسبتاً غیر معروف خاندان کا فرد تھا۔ وہ یوسف زئی اور سوات کے علاقے میں ایک مقبول اور بااثر مذہبی پیشوا تھا۔ وہ ایک منجلیہ سیلانی کی زندگی بسر کرتا تھا۔ وہابیوں کے ساتھ اُس کا رویہ مختلف مراحل سے گزرا۔ وہابی تحریک کے پہلے دور میں وہ سید احمد کا ساتھی رہا، لیکن بعد میں ۱۷۵۶ء میں وہ وہابیوں کی طرف سے سرد مہر اور غیر معاون رہا۔ مگر ۱۷۶۳ء میں معرکہ امبیدہ میں دل و جان سے ان کے ساتھ شریک ہو گیا۔ مزید تفصیلات کے لئے دیکھئے بیوٹھ ۱۰۲-۱۰۷ اور ایلوئور کے اکریوس دی بورڈر کے صفحات ۲۸۰-۲۸۱۔

نے اس تجویز سے زیادہ دلچسپی نہیں دکھائی۔ شروع سے ہی دہائیوں کی اعانت میں وہ ٹھنڈے نظر آئے۔ شاید دہائیوں کے بڑھے ہوئے اثر میں اپنے اثر و اقتدار کی تخفیف کا خطرہ محسوس کیا۔ آخر مذکورہ بے اعتنائی نے عنایت علی کو اپنے قدیم مرکز سہقانہ سے تو کچھ کمرہ نہ دیا مگر ایسی دشواریوں سے ہمت نہ ہارنے اور کسی اور طرف کام کرنے کا فیصلہ کر لیا۔

عنایت علی کا مشکل ٹھکانہ میں قیام، چنانچہ سید عباس کی دعوت پر عنایت علی اپنے مرکز منگل سہقانہ میں، جو خود ہی تحصیل کی سر زمین میں سہقانہ کے مغرب جانب مہا بن پہاڑ کی برآمدہ چٹان پر واقع ہے، سہقانہ کا قدیم مرکز یعنی علی کے ذمہ کر کے اپنے اور ولایت علی کے خاندان کو ساتھ لیکر منگل سہقانہ جا رہے۔ مرکز کے مقام کی تبدیلی کے ساتھ وہاں کیوں کا مقام بھی ہزارہ سے پشاور کی سرحد میں تبدیل ہو گیا۔

عنایت علی اس نئے مرکز سے یوسف زئی قبائل میں کام کرنے لگے جو پشاور اور مردان سے متصل میدان میں رہتے تھے اور ان کو انگریزوں کے خلاف منظم کرنے لگے۔ ہندوستانی فوج کے سپاہیوں میں تداخل اور گھس پھس کی کوششیں بھی چلتی رہیں۔ اس زمانہ میں عنایت علی کی حرکات و سکنات کا ذکر اوکنسیلیوں کرتا ہے ”عنایت علی نے اپنے متبعین کو منظم کرنے اور ان کے دلوں میں انگریز کافروں سے نفرت کی آگ بھڑکانے کی جدوجہد کی۔ مجاہدین سے روزانہ ڈول (تواضع) کرائی جاتی، کبھی کبھی دن میں دو بار اور پریڈ پر ان آیات کا تلاوت کرنا سکھایا جاتا تھا جن میں جہاد کی فضیلت کا بیان ہوتا۔ اور جمعہ کے دنوں میں خطبے دئے جاتے جن میں ان کو نصیحت کی جاتی کہ اُس وقت کا صبر سے انتظار کریں جب برطانوی ہندوستان کی تسخیر کی معینہ گھڑی آجائے۔“

انگریزوں کی دہائیوں کو تنہم: مہر نے عبدالمجید کے روزنامے ہی کے حوالے سے اس زمانہ کے بعض واقعات نقل کئے ہیں۔ ان میں سے ایک

اندراج کے مطابق دسمبر ۱۸۵۵ء میں قبیلہ مبارک خیل نے عنایت علی کی قیادت قبول کر لی اور ان کی دعوت پر عنایت علی آئندہ جنوری میں نگرانی گئے۔ اس کے فوراً بعد ہندوستان سے ایک قاصد وزیر الدین پٹنہ سے کچھ روپے لیکر آ گیا۔ مہر یہ بھی نقل کرتے ہیں کہ اسی زمانہ میں انگریز حکام نے ایک چھٹی تمام وہابیوں کو خطاب کر کے لکھی جس میں یہ پیشکش تھی کہ ان سب کو معافی مل سکتی ہے اور ان سب لوگوں کو جو اطاعت قبول کر لیں وطن کو واپسی کے اخراجات ملیں گے۔ اور جو ان شرائط کو تسلیم نہ کریں گے ان کو تین سال کی قید یا مشقت کی سزا کی دیکھی لیکن یہ پیشکش حقارت سے ٹھکرا دی گئی۔

مبارک شاہ کا سوات سے اخراج: مردان میں پچیسویں دہائی کی فوج کی آویزش کا مختصر ذکر کیا جا چکا ہے۔ رہا بیوں نے اپنی چھادنی سے نکال کر سیدھے سوات کا رخ کیا جہاں وہ سوات کے اکبر شاہ سے مل جانے کی امید رکھتے تھے۔ لیکن عجب سوء اتفاق کہ وہ ٹھیک میرٹھ کے ہنگامہ کے روز فوت ہو گیا اور اس کی وفات نے وہاں صورت حال کو بدل دیا۔ سوات میں ایک عجیب قسم کی دوگانہ حکومت تھی جس میں اکبر بادشاہ اور آخوند مذہبی پیشوا کے درمیان اقتدار برابر بٹا ہوا تھا۔ آخوند کو اس کے مذہبی تقدس اور بزرگی کے سب سے خوش اعتماد عوامل پر زیادہ اثر حاصل تھا۔ اکبر شاہ کے زمانے تک آخوند کی پادشاہت اچھی بنتی رہی۔ لیکن اس کے بعد آخوند نے اس کے بیٹے مبارک شاہ کی جانشینی کی مخالفت کی اور اُسے سوات سے نکلوا دیا۔ مبارک شاہ نے پہلے ستھانہ میں پناہ لی اس کے بعد پنجاب میں اقامت پذیر ہو گیا جس کا سردار مقرب خاں تھا۔ منگل تھا نہ اس سے قریب ہی تھا۔ کچھ عرصہ کے بعد مبارک شاہ عنایت علی سے ملا۔ اور دونوں نے ملکر قلعہ مردان پر حملے کا منصوبہ بنایا۔ اس قلعہ سے تمام یوسف زئی میدان زیر نظر ہو جاتا تھا۔ اس اثنا میں پچیسویں دہائی کی فوج آخوند کی مخالفت کے سبب سوات سے برخاست کر دی گئی، اور یہ پلٹن کسی مخالف انگریز گروہ سے مل جانے کی تاک میں ماری

پھرتی تھی۔ عنایت علی کے آدمیوں نے ان منتشر ٹولیوں کو اکٹھا کیا۔ عنایت علی نے ننگل تھانہ میں ان کے خیر مقدم کی پیشکش کی۔

انگریزی علاقے پر حملے: ۱۸۵۷ء کی شورش نے عنایت علی کو ایک سنہرے موقع بخشا کہ پشاور کے بعض سرحدی گاؤں اور فوجی چوکیوں پر چھاپے مارنے کا انتظام کر کے انگریز حکام ضلع کو پریشان کر دیا۔ اُس وقت پنجاب کی ہمسایہ ریاست اپنے سردار مقرب خاں اور اس کی رعایا بالخصوص ٹوٹالی کی باہمی خانہ جنگی میں الجھی ہوئی تھی۔ فوج و مقرب خاں کا چچازاد مہائی چنگلائی کامبارز خاں اس کے خلاف تھا۔ اس آویزش کے فوراً مبارز نے عنایت علی کو کہلا بھیجا کہ آئیں اور انگریزی علاقوں پر حملہ کرنے میں اُس کا ساتھ دیں۔ چنانچہ پہلا دھوا دھوا چنگلائی کے قریب ایک نواکلا پر کیا گیا جس کے باشندوں کے بارے میں معلوم تھا کہ وہابیوں سے ہمدردی رکھتے ہیں اُس گاؤں پر مع ایک ملحقہ گاؤں شیخ جانا پر قبضہ کر لیا گیا۔ اسٹنٹ کمانڈر لفٹنٹ مہورن نے پانچویں پنجاب پیڈل فوج کے کمانڈر میجر واگہان کی کمان میں روانہ کی جس نے جولائی ۱۸۵۷ء کو شیخ جانا پر دوبارہ قبضہ کر لیا۔ سات گاؤں والوں کو قتل کی سزا دی گئی۔

عنایت علی کا نارنجی پر قبضہ: اس کے دو ہفتے کے بعد عنایت علی نے اپنی ذاتی کمان میں نارنجی پر دوسرا حملہ کیا اور اُس پر قبضہ کر لیا۔ یہ گاؤں اگرچہ برطانوی علاقے میں انتہائی حد پر واقع تھا اور وہاں تک پہنچ، دشوار تھی۔ اس کے باشندے اپنے خویش اور آزادی کی محبت کے لئے معروف تھے۔ عنایت علی کے آدمیوں کی تعداد کل ڈیڑھ سو تھی اور چالیس آدمی بھینویں دسی فوج کے سیاہی تھے۔ پنجتار اور سواتشکے کچھ سوار بھی جماعت میں شریک ہو گئے۔ نارنجی کے اس موافق و مناسب حال مقام سے عنایت علی یوسف زئی قبیلہ کو انگریزوں کے خلاف کھڑے ہونے پر آمادہ کرتے رہے، اس لئے اس قبیلہ کو کچھ حفاظتی اقدامات کرنا پڑے۔ نارنجی کا قبضہ بجائے خود ایک چیلنج تھا۔

۱۸ جولائی ۱۸۵۷ء کو میجر واگہان کے زیر کمان ایک فوج نے پھر مردان سے کوچ

کیا۔ نصبہ نارنجی کی پوزیشن بہت مضبوط تھی۔ یہ ڈھلوان تعمیر کیا ہوا تھا اور کھڑی پہاڑی پر اوپر کے حصے میں واقع تھا۔ جنگی کارروائی کا آغاز گاؤں پر گولہ باری سے ہوا، اس کے بعد پیدل فوج چھوٹی چھوٹی ٹولیوں میں بڑھی۔ وہابیوں کی پامردانہ مدافعت کے بعد برطانوی فوجوں نے پہاڑ کے زیریں حصے پر قبضہ کر لیا۔ گاؤں کے بالائی حصے کا زبردست استحکام اور نیر دشمن کی بہادری ان کے اور آگے بڑھنے میں مانع ہو گئی۔ گاؤں پر قبضہ ہو جانے کے بعد بھی اس کو آگ لگا کر تباہ کرنے کی کوشش بھی اوپر سے دشمنوں کی بے قاعدہ گولہ باری سے رک گئی۔ وہابیوں کا نقصان ۵۰ زخمیوں اور ۵۰ مقتولوں پر مشتمل تھا۔ ان میں بچپنوں ویسی فوج کے سپاہی بھی شامل تھے جن کی لاشوں کو انگریزوں نے ان کے اسلحہ اور وردیوں سے شناخت کیا۔ (انگریزوں کا نقصان پانچ مقتولین اور پچیس زخمیوں پر مشتمل تھا۔)

عنایت علی کی شکست و پسپائی؛ مگر اس سے نارنجی کے معاملے کا خاتمہ نہیں ہو گیا نارنجی گھٹ گیا مگر اُس پر قبضہ نہ ہوا۔ عنایت علی نے شکست کھائی مگر حوصلہ پست نہ ہوا۔ نارنجی کے باشندے ان کے ساتھ تھے اور انگریزوں نے جب ان کو مانگا تو ان کے حوالہ کرنے سے انکار کر دیا۔ چلانے ساتھ جھنڈے بھیجنے جن کے ساتھ دو سو آدمی تھے اور آنے والی عید کے تہوار کے بعد مزید کمک کی توقع تھی۔ سیرات سے بھی مدد کا وعدہ وصول ہوا۔ اس لئے ۳ اگست کو شیوا میں ایک بڑی فوج جمع ہو گئی اور نارنجی سے ڈیڑھ میل آگے ایک جمہول راستے سے ایک دستہ بھیجا گیا کہ ایک منحنی راستے سے اُس پر جا چڑھے اور دشمن کے عقبی حصے پر حملہ کرے۔ دو چوبیس پوند والے موہید ذروں اور پہاڑی توپوں سے گاؤں پر گولہ باری ہونے لگی۔ وہابیوں کے پاس ان کے مقابلے کی توپیں نہ تھیں مگر اپنی بلند جگہ سے توڑے دار بندوقوں سے گولہ باریوں کا جواب دیتے رہے۔ آدھے گھنٹے کی گولہ باری کے بعد حملے شروع ہوئے۔ یہ بڑی بہادر اور ہجانہ باری سے

لڑے مگر دو طرف سے قوی تر فوجوں کی حملہ آوری سے پسا ہونا پڑا۔ عنایت علی نارنجی سے ایک محفوظ ترمقام میں پہاڑ کے اور اوپر چلے گئے۔

نارنجی کی تباہی: کپتان جیمز جو پوٹیکل افسر کی حیثیت سے فوج کے ساتھ تھا گاؤں کی تباہی کا یوں ذکر کرتا ہے:- ”اس کے بعد تباہ کاری کا کام شروع ہوا۔ ایک گھر بھی چھوڑا نہ گیا۔ بہت سے گھروں کی دیواریں بھی ہاتھیوں سے روندوائی گئیں۔ پھر ایف ایس ٹیلر انجینئر کے زیر ہدایت مینارے اڑا دئے گئے۔ اور بہت جلد گاؤں ملیوں کا انبار اور ایک کھنڈ بن گیا۔“

تین آدمی قید کر لئے گئے۔ اور بعد میں قتل کر دئے گئے۔ اس سے زیادہ کیا کہا جاسکتا ہے۔ کہ اسیران جنگ کا قتل ایک غیر معمولی فعل تھا۔ وہ باقی ہونے کے بہانے سے بھی قتل نہیں کئے جاسکتے تھے کیونکہ وہ ایسی ریاست سے تعلق رکھتے تھے جو حقیقتہً ”آزاد تھی“۔

احمد اللہ اور محمد حسین کی نظر بندی: نارنجی کی لڑائی سے بعد کے کچھ دن وہابیوں کے سخت صبر آزما مصائب اور دشواریوں کا زمانہ تھا۔ تازہ جھڑپوں میں انگریزوں کی کامیابی نے بعض قبائلیوں کی وفاداری اور ثابت قدمی کو متزلزل کر دیا۔ اپنی مخصوص تنگ دلی سے وہابیوں کے ساتھ تعاون ختم کر دیا، اور اس سے بدتر وقوعہ یہ ہوا کہ ہندوستان سے مسلسل امداد بھی عارضی طور پر بند ہو گئی۔ وہابیوں کے سربراہ احمد اللہ اور محمد حسین کو ان کے گھر پہنچنے کے بعد بیلرکشنر پٹنہ نے نظر بند کر دیا تھا۔ اس سے بھی روپے کی تحصیل و ترسیل کا انتظام درہم برہم ہو گیا تھا۔ ۱۸۵۷ء کی شورش کے بعد سے دریائے سندھ پر آمدورفت کے گھاٹوں پر نگرانی زیادہ سخت ہو گئی تھی جس سے قاصدوں کے لئے دریا عبور کرنا سخت مشکل ہو گیا تھا۔ نو مخو حلیفہ کے خطوط جن کا اندازہ ذکر ہو چکا اور اس زمانہ کے تریب لکھے گئے تھے ان میں مشرب سے ڈاک بند ہونے کا ذکر ہے۔ پریشانیوں اتنے ہی پر ختم نہ تھیں، قبائلیوں نے بجن نام طور پر ان کو دن کرنا شروع کر دیا اور بھوئے بھلکے وہابیوں کو ادھر ادھر قتل بھی کر دیتے۔

انگریزوں سے عنایت علی کا آخری محاربہ: اس سے ہمیں وہابیوں کے علو سے بہت اور صبر و استقامت کا کچھ اندازہ ہوتا ہے کہ اس انتشار و پراگندگی اور بے بسی میں بھی وہ

بیکار نہ بیٹھے۔ اور جنگ میں پہل کرتے رہے اکتوبر ۱۸۵۷ء میں شیخ جانا اور نارنجی کے باشندوں کی مدد سے جو سرحد پر دو تعزیری مہموں کے باوجود اب بھی وہابیوں کے ہمدرد تھے تو اکلّا (قلعہ) کے گاؤں پر جہاں یوسف زئی علاقے کے اسٹنٹ کمشنر ہورن نے چھاونی ڈال رکھی تھی۔ ایک دلیرانہ اور بے باکانہ شیخوں مارا۔ یہ حملہ شریعتہ اللہ کی قیادت میں ہوا۔ حملہ آوروں کو بہت سامانی غنیمت ہاتھ آیا اور ہورن کے پانچ آدمی مقتول ہوئے۔ عنایت علی اور انگریزوں کے درمیان یہ آخری محارہ تھا۔

وہابیوں کا دو ایٹلا: وقت گزرنے کے ساتھ بعض متذکرہ بالادشاہیوں کی شدت میں اضافہ ہو گیا۔ فوج کی تنخواہوں میں تعویق ہو گئی۔ خود عنایت علی اور ان کے بیٹے عبدالمجید سخت علیل ہو گئے۔ اس کے کچھ ہی دن پہلے عبدالمجید کی بیٹی کا انتقال ہو گیا۔ آخری کئی مہینوں میں کوئی غلہ دستیاب نہ ہوا اور فاقہ زدہ جماعت درختوں کی جڑوں اور پتے کھاتی رہی۔ ان میں سے زیادہ تر خونیں پیش میں مبتلا ہو گئے۔ خود عنایت علی کو تیز بخار آ گیا اور اس دن کسی دوا یا غذا کے بغیر گزارے۔ عنایت علی جیسی وقفِ رضا کے الہی تک کی جان کے لئے حقیقتہً یہ ایک سخت آزمائش کی گھڑی تھی۔ پھر بھی ان کے قدم نہ ڈگے اور انگریزوں کی تسلیم و اطاعت کی پیشکش کو قبول کرنے کی بجائے اپنے وسائل کی تنظیم نو کی کوششیں جاری رکھیں۔ فوراً ہی بعد مارچ ۱۸۵۸ء کے اوائل میں ان کا انتقال ہو گیا۔ اس طرح شدید مصائب میں اس شخص کے کارناموں کا اختتام ہو گیا جس نے اپنے ملک کو انگریزوں کی غلامی سے نجات دلائے۔ ... دہانے کے مفہم تسلیم کے لئے اپنی زندگی وقف کر کے اپنے پیچھے شاد و آباد وطن چھوڑا۔ ان کی یاد میں ان کا کم سے کم حق جو ہم پر قائم ہوتا ہے وہ آزادی وطن کے حصول کی تاریخ میں ان کے درجہ کا اعتراف ہے۔

مجلس از باب ثلاثہ بان کے انتقال کے بعد قدرۃ وہابی فرقہ میں تقابلی طور پر دو مجلسیں اور کچھ مدت کے لئے حالات منتشر و پراگندہ رہے۔ ان کے بعد فوراً ہی انگریزوں نے ان کو تباہ نہ ہوا ان کے بیٹے عبدالمجید گھنگو میں خلیفہ سی کنٹ کے منصب سے اس منصب کے قابل نہ سمجھے گئے۔

طاہر اسٹینٹا ہر جہاں کہ فائدہ تحریک کے انتخاب کے لئے نظر آئے تھے اور یہ وہی تھے۔

عہد لکھی گیا چھوڑ کے سحر میں نشان بنوں میر یہ میراں تو جیتا نہیں ہمارا کون سا ہے

اس لئے اکرام اللہ، نور اللہ اور میر تقی کے ساتھ ایک مجلس اربابِ ثلثہ بنالی گئی۔ نور اللہ ان میں سب سے کبیر السن تھے اس لئے وہ تینوں سردار بنائے گئے۔ ان میں سے اکرام اللہ سٹھانہ کے قریب ایک معرکہ میں جو فوراً بعد ہوا تھا شہید ہو گئے۔

وہابیوں کے خلاف لارنس کی جدوجہد: یہ بتایا جا چکا ہے کہ کس طرح ۱۸۵۷ء

میں یوسف زئی کے علاقے میں عنایت علی کی جدوجہد نے وہاں انگریزوں کی طاقت کا ثبات خطرے میں پڑ گیا تھا۔ شروع میں ادھر ادھر چھوٹے چھوٹے جہادی حملوں سے وقتی طور پر اس سے نمٹا گیا۔ ۱۸۵۷ء کے نصفِ آخر میں جب کہ لارنس کی ان تھک جدوجہد اور سخت ہدایت کے تحت پنجاب کے تمام وسطی و شمالی دہلی کی باہریوں کے داؤں پر لگا دئے گئے تھے جنگ کی فوری ضرورتوں اور مصالحتوں کے پیش نظر یہی ایک رستہ رہ گیا تھا۔ صورت حال کے دو باعثاً بدلتے ہی فیصلہ کیا گیا کہ وہابی مسئلہ کو خاص توجہ سے نبٹایا جائے۔

پنجتارا اور جگلائی کی تارا جی: ۱۸۵۷ء میں سر سٹیو ہارن کے زیرِ نگرانی پنجانہ اور منگل تھانہ کے

وہابی مرکزوں کو تباہ کرنے کے واضح مقصد سے ایک زبردست فوجی مہم نیا رکھی گئی۔ یہ فوج

قریب سلیم خان میں جمع ہوئی اور ۲۵ اپریل ۱۸۵۸ء کو چیل پڑی۔ یہ حملہ ٹھیک سرحد پر

وہابی مرکز کی تاریخ میں سخت خستگی و ساماندگی کے دور میں ہوا۔ عنایت علی کی وفات کے بعد

ہندوستان سے مسند امداد کے انقطاع کے سبب سے مرکز کی حالت نازک ہو گئی۔ ان کی

تعداد بھی افسوسناک طور پر گھٹ گئی۔ وہابیوں کے خاص معاون، ساوات، نے عثمان زئی

کے ہاتھوں ایک معرکہ میں سخت زک اٹھائی تھی جس کا بیان ابھی آتا ہے۔ قبائل نے

جیسے ہی دیکھا کہ وہابیوں کے خلاف ایک تھری مہم بھیجی جا رہی ہے وہ اپنی عادت کے

مطابق ان کے خلاف ہو گئے۔ پہلا قبیلہ جس نے وہابیوں سے درکنار خود اپنے سردار کے

ساتھ اس معرکہ کی پوری تفسیل جنرل ایس کاٹن کے (NINEYSRSIVDIA) (ہندوستان میں نوپور

میں درج ہے۔ مولف اس مہم کا قائد تھا اور اس کا ذکر تفصیل سے کیا ہے۔ جنگ امبید کے منظوم

حالات کا مصنف، عبدالحق بھی اپنی کتاب درمقال کے دیباچے میں اس معرکہ کا مختصر تذکرہ کرتا ہے۔

نیربیت اور سن صفحہ ۹۷-۹۸

انحراف کیا وہ خود دھکیل تھا۔ اس نے پنجتار پر حملہ کر کے مقرب خاں کو وہاں سے نکال دیا۔ انگریزوں کی فوج پنجتار پہنچی تو اسے آدمیوں سے خالی پایا جو بچے بچے لوگ رہ گئے تھے ان سے بھی خاں کو لایا اور ۲۵ اپریل کو پنجتار کو نذر آتش کر دیا۔ اسی روز چنگلائی کو بھی تباہ کیا گیا۔

منگل تھانہ کی تباہی: دوسرا دھاوا منگل تھانہ پر ہوا وہاں بیوں نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اپنی تمام طاقت ستھانہ میں مجتمع کر لیں اور منگل تھانہ سے نکل آتے تھے مگر مقرب خاں نے پنجتار سے مکالمے کے بعد اپنے خاندان کو اسی خالی قلعہ میں پناہ لینے کو بھیج دیا تھا۔ انگریزوں نے اس کی تباہی کو بھی ضروری سمجھا تا کہ یہ نہ بچا جا سکے۔ قلعہ بھی تباہ کر دیا جائے تو مقرب خاں کی سزا کاٹیں اور نہ زیادہ سہرتنا کی ہو جائے۔ قبائل میں اس قلعہ کی بے حرمتی و اہمیت تھی کیونکہ یہ پہاڑی استحکامات میں اس قدر گھسا ہوا اور محفوظ تھا کہ بے شمار تباہی و تخریب سمجھا جاتا تھا۔ یہ آس پاس کے قبائل میں مایہ ناز تھا۔ اور اس کی وقعت و اہمیت اس قدر تھی کہ صرف اس کی تباہی تمام قبائل کو مرعوب کرنے کے لئے کافی خیال کی گئی۔ منگل تھانہ کی خوشحال آبادی اور اس کی بربادی کا ایک تنہا واضح تذکرہ خود اس کے تاریخی تذکرہ کا تن کے لفظوں میں محفوظ ہے۔ ”منگل تھانہ کوہ مہابن کی ایک سب سے بڑی۔ برآمدہ چٹان پر واقع ہے۔ اور عنایت علی کا صدر مقام تھا جس نے نارنجی اور دوسرے مقامات پر ۱۵۵۰ء میں نہایت عبور و استعمال سے یوسف زئی کو بغاوت پر آمادہ کیا تھا۔ یہ بالائی اور زیریں دو گروں پر مشتمل ہے۔ زیریں گاؤں میں تیس چالیس گھر ہیں جن میں سادات رہتے ہیں۔ بالائی منگل تھانہ تین چوٹیوں کے درمیان ایک سطح مرتفع پر واقع ہے۔ یہ چوٹیاں غور نصیب کا کام دیتی ہیں۔ اس سطح مرتفع پر پہلے نہایت علی کا قلعہ بند مکان ہے جس میں اس کے بھائی متعین کے لئے احاطے ہیں دوسرا سید عباس کا قلعہ بند گھر ہے۔ تیسرا سید علی کا قلعہ ہے جس میں ایک سفید تختہ مینار ہے۔ پورے رقبہ میں تیس چالیس گھر ہیں۔ قلعہ بندیاں بڑے بڑے پتھروں اور عمدہ لکڑی سے بڑی محنت سے تعمیر کی گئی تھیں اور ہندوستان کے مذہبی دیوانے اور چور جو اکبر کے اس قلعہ میں جتے ہوئے تھے بڑی راحت اور حفاظت سے رہتے ہوئے اور جو وقعت و اہمیت اس سے منسوب ہے وہ آسانی سے سمجھ میں آتی ہے۔“

یہ سرسبز و شاداب منزل ۲۹ اپریل کو برباد کر دی گئی اور اس کے استحکامات منہدم کر کے زمیں کے برابر کر دئے گئے۔ فوج تمام رات اپنے ہی ساختہ کھنڈروں میں بسر کر کے دو سرے دن سلیم تھاں لوٹ گئی۔

منگل تھانہ اور ستھانہ کی غارتگری کے درمیان مختصر سے وقفے میں ایک واقعہ ظہور پذیر ہوا جس کے آغاز کا اگرچہ اس سے بہت پہلے سے پتہ ملتا ہے اس کا براہ راست تعلق ستھانہ کی تباہ کاری سے تھا اور اس میں بہت سہولت بہم پہنچا دی۔

ستھانہ: دریائے سندھ کے دائیں جانب کی سرزمین اور یوسف زئی کی بوادی اور ٹوپی برٹونی

سرسدی چونکی کے درمیان دریا کے کنارے اور کوہ مہاین کی چھاؤں میں زمین کی ایک پتلی دھجی ہے۔ برطانوی ہند کی حدود سے باہر یہ زمین عثمان زئی قبائل کی ملکیت تھی۔ اس میں کچھ اور بستیوں کے علاوہ بالائی اور زیریں کیاہ اور خیال اور بالائی وزیریں ستھانہ کے گاؤں بھی شامل تھے، ایک مدت دراز سے ستھانہ بطور آتمغہ بنیر میں تخت بند کے سید ضامن شاہ کو عطا ہوا تھا۔ یہ ایک محترم تارک الدنیا بزرگ تھے اور کسی جھگڑے میں ان کو اپنے ہی علاقے

سے جلاوطن کر دیا گیا تھا۔ ان کے پوتوں سر شاہ اور اکبر نے شروع سے دہائی تحریک میں حصہ لیا تھا اور اکبر سید احمد کے خازن کی حیثیت سے کام کرتے تھے۔ انھیں نے دہائیوں کو ستھانہ میں دعوت دی اور ان کو وہاں بسا دیا تھا۔ وہ ۱۸۴۶-۴۷ء میں زیریں ہزارہ میں سکھ دربار کے خلاف بغاوت میں قائد منتخب ہوئے تھے۔ جس کا اور ذکر ہو چکا۔ جب ہزارہ انگریزی قبضہ میں چلا گیا وہ سوات لوٹ آئے اور وہاں پادشاہ منتخب ہو گئے۔ ان کی غیر حاضری میں عمر شاہ ستھانہ کے سردار تھے۔ انھوں نے اور اکبر شاہ دونوں نے کیاہ اور خیال کے گاؤں

سے اپنی سیاسی بالادستی کی حیثیت سے، اور وہاں دہائی مرکز کا بیڑ چلانے کے لئے بھی کچھ عرصہ وصول کیا تھا، عثمان زئی نے اس لگان پر غور کیا مگر اس کی مخالفت کے لئے اپنے آپ میں طاقت نہ پائی، بالخصوص اس لئے کہ دونوں گاؤں کے مقامی لوگوں نے ان سیدوں کی حمایت کی۔ اب کاٹن کی اس مہم کے موقع پر انھوں نے ان سیدوں کو کاٹن کی فوج کے ذریعے سے نکال باہر کرنے کا عمدہ موقع تصور کیا۔ یکم اپریل اور ڈیڑھ سیرادی قبائل سے بزور یہ معاہدہ لینا چاہتا تھا کہ سیدوں یا دہائیوں کو پناہ نہ دیں۔ چنانچہ عثمانی زئی

سے کھسک جایا کرتے مگر ہندوستانی سپاہیوں کا ایک ایک فرد آخر دم تک جمار ہوتا۔ . . .
 . . . ان کی جنگ مختصر، جاننازادہ، فیصلہ کن ہوا کرتی اور آخر یہ بہادر، گور بخود غلط غازی
 مارے جاتے یا قید ہو جاتے۔“

ستھانہ کی تباہی ہوئی تیس وہابی ان کے قائد سمیت شہید ہو گئے۔ انگریزوں کا بھی
 کچھ نقصان ہوا۔ منگل تھانہ کی طرح ستھانہ بھی بے رحمی سے تباہ کیا گیا۔ تمام تعمیرات کو
 منہدم کرنے کے لئے ہاتھی استعمال کئے گئے۔ حصار اور استحکامات اڑا دئے گئے۔ درخت
 کاٹ کر گرا دئے گئے اور جو کاٹے نہ جاسکے ان کی چھالیں نوح ڈالی گئیں تاکہ وہ پھر نیپ نہ سکیں۔
 دوسرے قبائل جیسے جاوٹوں کے خلاف تعزیری اقدامات کئے گئے اور ان سے اور عثمان
 زئی سے اقرار نامے لئے گئے کہ وہابیوں کو واپس نہ آنے دیں اور ستھانہ میں پھر آباد نہ ہونے
 دیں۔ بظاہر انگریزوں نے ستھانہ کو عرصہ وجود سے مٹا دینے کے لئے کوئی دقیقہ اٹھانہ
 رکھا، مگر اپنے دشمن کی استقامت اور تحمل کا اندازہ نہ رکھا سکے۔ دوسری زندگی ستھانہ کا
 مقدر تھی۔

معرکہ ستھانہ کے بعد سادات نے وہابیوں کو ملکہ میں دعوت دی کہ وہ بھی انھیں کی ملکیت
 تھا مگر ویران پڑا تھا۔ اب سادات اور وہابیوں کے وہاں آباد ہو جانے سے بہت جلد ایک
 سرسبز و شاو اب آبادی بن گیا۔

تورالشد کی وفات: اب وہابی اتحاد ثلاثہ کے دو باقی ماندہ ارکان نورالشد اور محمد تقی کے زیر
 قیادت تھے۔ انھوں نے ایک بار پھر دھاگے کی لچھی کا کھوپا ہوا اور ڈھونڈ لکھانے اور مرکز کو از سر
 منظم کرنے کی مشقت شروع کر دی۔ پٹنہ سے سامان کی آمد بند ہو جانے سے جو نازک
 حالت پیدا ہو گئی تھی وہ احمدالشد اور دوسرے قائدین کی برادرت کے بعد سنبھل گئی۔ اسی زمانہ
 کے لگ بھگ مقصود علی جو ملک کے لئے پہلے ہی پٹنہ روانہ ہوئے تھے میرٹھ کے راستے سے
 جہاں وہ گرفتار ہو گئے پھر آزاد کر دئے گئے تھے، ایک خطرناک سفر طے کر کے سرحد واپس
 پہنچ گئے۔ وہ پشاور بھی گئے، وہاں نین مہینے کے قریب ٹھہر گئے، معینہ راستوں سے
 آدمی اور روپے کی فراہمی کا بندوبست کرنے اور رضا کاروں اور امداد کی اپیل کے لئے

برادران علی کے اعلانات کی اشاعت کے انتظامات کئے۔ وہ ۱۸۵۹ء کے اوائل میں پٹنہ سے چلے تھے اور دوسرے سال سرحد پہنچے اس درمیان میں نور اللہ بھی جو امیر کابل بنے چاہے تھے راستے میں انتقال کر گئے۔ اس سفر کا مقصد وہابیوں کی ان مصائب میں امیر سے استمداد ہو گا۔ نور اللہ کی وفات سے ۱۸۶۲ء تک مقصود علی جماعت کے قائد رہے۔ ۱۸۶۲ء میں وہ بھی چل بسے۔ لکن کے انتقال کے بعد وجانشیں ممکن تھے۔ ولایت علی کے بیٹے عبداللہ اور مقصود علی کے بیٹے اسحاق ان میں سے عبداللہ اپنی زیادہ تجربہ کاری اور حربی معاملات کے علم کے سبب سے منتخب ہو گئے۔ اسحاق دوسرے بڑے عہدے خازن کے لئے منتخب کئے گئے۔

عبداللہ اپنے والد کے انتقال کے بعد پہلے ہی پٹنہ جا چکے تھے۔ ان کو اپنے چچا فرحت حسین کی علالت کے سبب سے کچھ دن وہیں رک جانا پڑا۔ فرحت حسین داخلی تنظیم کے سربراہ تھے اوائل ۱۸۵۸ء میں ان کا بھی انتقال ہو گیا۔ اس کے فوراً ہی بعد مکہ اور افغانستان کے سفر کے بعد وہ سرحد کو روانہ ہوئے۔ اور مقصود علی کی وفات (۱۸۶۰ء) سے دو سال قبل وہاں پہنچے ان کی قیادت کی مدت چالیس سال سے زیادہ قائم رہی اور اس زمانے کا سب سے زیادہ بھان انگریز واقعہ غزوہ امبیلہ تھا جس کا اہم ترین جزو ہے معرکہ امبیلہ۔ ۱۸۶۳ء امبیلہ وہابیوں کے خلاف انگریزوں کا اہم ترین اور زبردست معرکہ تھا۔ آدمی اور روپے دونوں اعتبار سے یہ وہابیوں کو جر سے اکھاڑ پھینکنے کی انگریزوں کی سخت ترین جدوجہد کی نشان دہی کرتا ہے۔ یہ خاصیت وہابیوں کے اتیصال کے لئے لڑا گیا۔ اکثر اگلے معرکوں میں تحذیر کے مقصود وہابی اور قبائل دونوں تھے۔ قبائل اکثر اوقات وہابیوں کی اعانت کی بدولت تلوث ہو جاتے۔ اس موقع پر معاندہ برعکس تھا۔ اہم دراصل وہابیوں کے

۱۷ تذکرہ سادقہ صفحہ ۱۴۷۔ مہر (جلد ۴ صفحہ ۲۱۹) پٹنہ سے سفر کی تاریخ جنوری ۱۸۵۹ء بتاتے ہیں اور مکہ و افغانستان کے سفر کا کوئی ذکر نہیں کرتے۔ ۱۵۲ اس معرکہ کا ایک خالص فوجی تذکرہ کرنل ایڈوائس کی کتاب ستخانہ مطبوعہ لندن ۱۸۶۷ء میں مندرج ہے۔ یہ ایک چھوٹی سی کتاب ہے جو اب نہایت نایاب ہے۔ اس غزے کا خلاصہ بیان دیتی ہے۔ اس میں مولانا خورشید نوح خانے کا ایک افسر تھا۔ نیز مولانا غلام محمد بیگ و حسین وغیرہ متذکرہ صدر وغیرہ انگریزی ماخذ میں درمقال اس قسم کی تنہا کتاب ہے جو اس کا مخالف ہی متذکرہ واقعات کا چشم دید شاہد تھا۔

خلاف چلائی گئی تھی۔ مگر طول پکڑ گئی، کیونکہ وہابی قبائلیوں کو (اگرچہ بہت تھوڑے ہی عرصے کے لئے) مدافعتی تحریک کرنے میں کامیاب ہو گئے تھے۔

جنگ کی بنیاسادات اور عثمان زئی کے درمیان مسلسل آویزشوں میں پنہاں ہے جن

کا ذکر اوپر ہو چکا۔ سیدوں اور وہابیوں کے استھانہ سے نکل جانے کے بعد عثمان زئی نے اس گاؤں پر پھر قبضہ کر لیا اور کھیتوں کو جوتا۔ اکبر شاہ کے بیٹے مبارک شاہ نے جو اب سیدوں کا قائد تھا اپنی آبائی جائیداد استھانہ کے مطالبہ سے اب تک ہاتھ نہیں اٹھایا تھا۔ وہ اپنی جلاوطنی کے وقت سے ہی اس پر دوبارہ قبضے کے منصوبے بنا رہا تھا۔ اس کے لئے اس نے پہلے جاوین قبیلوں سے مدد طلب کی اور انھوں نے منظور کی۔ ان کی اور وہابیوں کی مدد سے اس نے مینارہ سیرکی کے نام سے ایک قلعہ نما مینار تعمیر کیا۔ یہ کیاہ اور استھانہ کے درمیان میں واقع ہے۔ وہاں سے اس نے استھانہ اور دوسرے گاؤں پر چھاپے مارنے کا بندوبست کر لیا۔ ان پریشان کن حرکات سے وہ عثمان زئی کو ان کے نئے مقبوضہ کھیتوں سے بھگادینے میں کامیاب ہو گیا تھا۔ انھوں نے مبارک شاہ کو بلا بھیجا کہ ہم اب رخصت ہو رہے ہیں، آپ استھانہ کو اپنے آدمیوں سے جتوا سکتے اور ہم سے لگان لے سکتے ہیں۔ اس نے استھانہ کی ہمزمین سے گزرنے والے تجارتی مال پر جنگی لگانا بھی شروع کر دیا۔ ان پریشان کن چالوں سے مبارک شاہ کا مقصد عام طور پر عثمان زئی کو مرعوب کر کے بھگادینا تھا۔ وہ اپنے مقصد میں بہت حد تک کامیاب ہو گیا تھا، مگر کچھ ہی عرصے میں کچھ نالائق عناصر اس کی جماعت میں شریک ہو گئے۔ اور مینارہ سیرکی رہنوں، ڈاکوؤں اور غنڈوں کے اڈے کی حیثیت سے بدنام ہو گیا جو ان کی پناہ گاہ تھا اور جہاں سے معمولی معمولی چھاپے، ڈکیتیاں اور سرحدی گاؤں کے مالدار تاجروں کا اغوا عمل میں آتا۔

محمود شاہ: یہ کھٹی صورت حال جب کہ عمر شاہ کا بیٹا اور مبارک شاہ کا عم زاد بھائی محمود شاہ استھانہ پہنچا محمود شاہ کو باپ کے مرنے پر اننگہ یزدوں کے ماتحت ایک نام نہاد نوکری رسالدار کی مل گئی تھی پہلے

۱۵ جو مالدار تجار بطور برغمال قید کرنے جاتے تھے ان میں زیادہ تر ہندو ہوتے تھے۔ انگریز محسنوں نے اس پر بہت شور مچانا بند کیا ہے۔ بہر حال وہابی نے ایسی مجرمانہ حرکت کبھی نہیں کی۔ (فورین ڈیپارٹمنٹ پالیسی

۸ "دستاویزات نمبر ۱۹۱-۱۹۳ مورخہ اگست ۱۸۶۲ آگے ملاحظہ ہو)

اُس نے سنگریو کے ہارس کالم میں پھر لاہور پولیس میں ملازمت کی۔ اس کو یہ نوکری انگریزوں کے حلیف جہانداو خاں کی سفارش سے ملی جو اس کا رشتہ دار بھی تھا، یہ ملازمت دینے میں انگریزوں کا ایک سیاسی مقصد بھی تھا، کیونکہ توقع کی جاتی تھی کہ اس مصروفیت سے وہ سرحد سے دور رہیگا اور وہاں امن و قانون میں خلل اندازی سے انک رہیگا۔ غرض کہ دوران میں وہ دہلی اور لکھنؤ تعینات کیا گیا۔ اس کے بعد اس کا رسالہ برخواست ہو گیا، اس کو سرحد کی فوج میں کیویٹری (رسالہ) افسر کی حیثیت سے ریگولر عہدہ نہ ملا، اس لئے اس نے حکومت سے درخواست کی کہ ستھانہ اس کو واپس دے دیا جائے۔

محمود شاہ کی ستھانہ میں آمد: لفٹنٹ گورنر نے اسکی درخواست اس عذر سے نامنظور کر دی کہ ستھانہ برطانوی ہند سے باہر ہے اور جو چیز حکومت کی ملکیت ہی نہیں وہ اسے نہیں دی جاسکتی۔ تب اس شاہزادے نے اپریل ۱۸۶۳ء میں درخواست کی کہ اسے اجازت دی جائے کہ انگریزوں کی مدد کے بغیر اسے خود ستھانہ پر قبضہ کرنے کی اجازت دی جائے۔ اسے بھی اس عجیب جواب کے ساتھ رد کر دیا گیا کہ "اُس سے کہو کہ اس قسم کی بات سنی نہ جائیگی" محمود شاہ کے ساتھ انگریزوں کا رویہ نہایت مبہم اور خشم انگیز تھا۔ وہ نہ اس کو اس کی آبائی جائداد واپس دینے پر راضی تھے نہ اُس کی اپنے طور پر قبضہ کرنے دیتے تھے۔ عاجز آکر وہ اپنے آدمیوں کو ساتھ لیکر ستھانہ جا پہنچا۔ وہ اُس وقت وہاں پہنچا جب کہ مبارک شاہ اپنی متذکرہ بالا کاروائیوں میں مصروف تھا۔ اس لئے معتدل پالیسی اختیار کی اور صلح و امان کے ساتھ ستھانہ کی بازیافت کی جدوجہد کرنے لگا۔ بہر حال انگریزوں کی نامنظوری نے اسے اپنے عم زاد بھائی سے مل جانے پر مجبور کیا جو اس معاملہ میں زیادہ عملی پالیسی چلا رہا تھا۔

وہابیوں کے خلاف افواہیں: عثمان زمینوں میں بھی دو گروہ تھے۔ ایک سیدوں کی مراجعت کے حق میں تھا اور دوسرا انگریزوں کی مدد سے اس کی مخالفت کرتا تھا۔ سیدوں نے ستھانہ پر قبضہ کر لیا تو دوسرا گروہ خیال کے مقابل ترسنا کی انگریزی چوکی پر چلا گیا اور انگریزوں سے

۱۷۔ یہ نامنظور کی انگریزوں کے تحت نوکری نہ کرنے کی جذباتی بنا پر تھی۔

شکایت کی کہ سادات اور وہابی جنگ کی تیاری میں مصروف ہیں۔ آرتب کے لوگوں میں بھی بے چینی پھیل گئی اور اس کا نوجواں سردار اکرم خاں ولد جہان نذاو خاں بھی بھاگ گیا۔ مقامی انگریز افسروں نے بھی وہابیوں کے مفروضہ مخالفانہ عزائم پر ضرورت سے زیادہ زور دیا اور حکومت کو اس مضمون کی مبالغہ آمیز رپورٹیں بھیجیں۔ یہ بات اس امر سے ظاہر ہے کہ خود انگریزوں کو شروع میں یہ شبہہ تھا کہ عثمان زئیوں کا مخالف سادات گروہ انگریزوں کی مداخلت کے لئے قصداً بے چینی پھیلا رہا ہے۔ ہزارہ کے ڈپٹی کمشنر نے اپنی چھٹی بنام کمشنر پشاور مورخہ ۳ جولائی ۱۸۶۲ء میں سچائی سے اقرار کیا تھا کہ "اس تحریک کا اصل مقصد مستحانہ میں آباد ہونا ہو سکتا ہے، مگر سادات کے دوسرے ارادوں کی طرح طرح کی افواہیں بھی اڑ رہی ہیں۔ مثلاً یہ کہ ان کا مقصد گیارہ اور خیال کی غارتگری ہے اور یہ کہ آسب کا وزیر محمد سفہان (۹) امب کی تاخت و تاراج کا اندیشہ رکھتا ہے۔"

مبارک شاہ: معمر کہ امبیدہ کی کو کسی قدر تفصیل کے ساتھ اس لئے بیان کیا گیا کہ اس میں سید اور وہابیوں کی کاروائیوں اور انگریزوں کی خاصانہ پالیسی کو الگ الگ واضح کر دیا جائے۔ وہابی کئی لحاظ سے سادات کے مضمون تھے۔ مستحانہ سادات کی ملکیت تھا اور وہابی اس پر دوبارہ قبضہ کرنے کی ان کی جدوجہد کو برحق سمجھتے تھے اور ان کو پورا سہارا دینے کے علاوہ محدود امداد بھی دی۔ مگر محض عثمان زئیوں کو خوف زدہ کرنے اور ان کے حامی انگریزوں پر اپنی طاقت جتانے کی غرض سے مبارک شاہ کے آدمیوں کی تاخت و تاراج، ڈکیتوں اور عام لوٹ مار کے سلسلہ میں وہابیوں نے کوئی حصہ نہیں لیا۔ پھر بھی اس موضوع پر اکثر انگریز مضمون نے وہابیوں اور مبارک شاہ کے آدمیوں کی کاروائیوں کو گڈ گڈ کر دیا ہے۔

وہابیوں کا اعلیٰ کردار: یہ مصنفین اس معرکے کو انگریزوں کا انتقام بتاتے ہیں جو وہابیوں کی خلاف قانون کاروائیوں کے خلاف بادل تاخواستہ اختیار کیا گیا۔

مگر ڈپٹی کمشنر ہزارہ وہابیوں

اور قبائلیوں کی حرکات کے درمیان نمایاں فرق دکھاتا ہے۔ وہابی ایک سیاسی خطرہ تھے مگر لوٹ مار

اور ڈکیتیاں باہر کے بعض گنڈوں کے کمر تو تھے۔ جنھوں نے ہینار سہری میں پناہ لے رکھی تھی۔ حکومت پنجاب کے سکریٹری کی ایک چھٹی میں ڈپٹی کمشنر کے سچے اور گھرے خیالات کی جو تلخیص درج ہے، اس کا ضروری اور متعلقہ حصہ درج ذیل ہے۔

ہندوستانی خود ہر قتل اور ڈاکا زنی سے محترمہ رہتے ہیں۔ یہ حقیقت ذہن نشیں کر لینا ضروری ہے۔ یہ معلوم نہیں ہے کہ ان کے کسی فرد نے کبھی ہماری ہندو رعایا کے اغوا اور قتل میں حصہ لیا ہو۔ البتہ انھوں نے سیاسی سازش کا ایک مرکز بنا رکھا ہے اور وقتاً فوقتاً غازیوں کو بھیتے ہیں تاکہ کافر فرنگیوں کے قتل کی تاک لگائیں..... فی الحال ہمیں ان سے جو خورشہ ہے وہ یہ کہ انھیں کی موجودگی اور حمایت سے مبارک شاہ نے طاقت اور اہمیت حاصل کر رکھی ہے..... جنگی کارروائیاں شروع کرنے اور ان کو مکمل طور پر تباہ و برباد کرنا ناممکن ثابت ہونے کی صورت میں نہایت ضروری ہوگا کہ ہماری سرحد کے قریب ان کی آبادی کے قیام کے خلاف نگرانی رکھی جائے.....“

اس سے صاف ظاہر ہے کہ وہابیوں کا تصور صرف ان کا وجود تھا۔ وہ سیاسی خطرے کا قوتی موجب تھے۔ اور بعض گنڈوں بد معاشوں کی معمولی معمولی لوٹ مار جس سے عموماً ان کا کوئی تعلق نہ تھا ان کو جرٹ سے اکھاڑ پھینکنے کا ایک اچھا بہانہ سمجھا جاتا تھا۔ صوبائی حکومت پنجاب جارحانہ جنگ پر تکی ہوئی تھی، اور اپنے اس منصوبے پر عمل پیرا ہونے کے شوق میں انھوں نے حکومت ہند یا کمانڈر انچیف کو بھی پوری طرح آگاہ نہ کیا۔ واقعہ یہ مہم کمانڈر انچیف کے مشورے کے خلاف اختیار کی گئی۔

سادات کا استھانہ پر قبضہ آخر میں یہ بات یاد رکھنے کے قابل ہے کہ سادات اور عثمان زئی کے درمیان جھگڑا اس علاقے کے لئے تھا جو برطانوی ہند سے باہر آزاد قبائلی قبوساں تھا۔ حکومت نے محمود شاہ کی درخواست امداد اسی بنا پر رد کر دی تھی۔ پھر بھی جب اس نے اپنی فوج حاصل کرنے کے لئے آزادانہ اقدامات کے عزم داخلت کا اصول طاق پر رکھ دیا اور اپنے جاگیردار سردار امب کو ایک فرضی خطرے سے بچانے کا عذر رنگ تراشکر انگریزوں نے داخلت

کی کوشش میں اتنا کچھ داؤں پر لگا دیا۔

مبارک شاہ کے سخنانہ پر دوبارہ قبضہ کرنے کی جدوجہد پہلے ۱۸۶۱ء میں شروع ہو چکی تھی اور واقعات متذکرہ بالا ۱۸۶۱ء تا ۶۷ء میں رونما ہوئے۔ جولائی ۱۸۶۳ء میں سیدوں نے خادون اور عثمان زئی کی کسی مخالفت کے بغیر سخنانہ پر دوبارہ قبضہ کر لیا اس کے بعد سرحد پر حملے شروع ہو گئے قبل اس کے کہ ٹوپی پر جہاں متوقع پیش قدمی کے لئے سپاہ اور ذخیرے جمع کئے جا رہے تھے باقاعدہ لڑائیاں شروع ہوں ۱۸۶۳ء میں اس پر حملہ کر دیا گیا۔

وہابیوں کے فوجی دستے: اس وقت سرحد پر وہابی فوج کی عدوی طاقت اور ساخت کا ایک مفصل حال ہمارے پاس موجود ہے۔ ان کی تعداد بارہ سے چودہ سو تک تھی اور زیادہ تر بنگال، اودھ، صوبہ جات وسطی و شمالی (صوبہ متوسط ایوپی) اور زیریں پنجاب کے رنگر وٹوں پر مشتمل تھی۔ انھوں نے فوجی تنظیم اختیار کر لی تھی اور روزانہ قواعد (ڈرل) کرتے تھے۔ وہ سب ہتھیاروں سے اچھی طرح مسلح تھے جن میں دو چھوٹی توپیں بھی تھیں۔ مرکز ملک میں ان کے ایک دھات گمانے اور ایک بارود بنانے کے کارخانے موجود تھے۔ پوری فوج و س کمپنیوں میں منقسم تھی اور ہر ایک کا علیحدہ علیحدہ افسر ہوتا تھا۔ اس طرح:-

(۱) جماعت میاں عثمان - سپاہی ۱۲۰ - گز والی بندوقیں ۲۰ - چھتاتی بندوقیں ۱۰

(۲) جماعت شریعتہ اللہ - سپاہی ۱۵۰ - ۳۰ = ۱۰

(۳) جماعت قائم خاں = ۱۳۰ = ۳۰ = ۲۰

(۴) جماعت قائم خاں = ۱۳۰ = ۶ = ۲۰

یہ سب سے پرانی جماعت تھی جو ہندی جماعت کہلاتی تھی اور خالصتہ ہندوستانیوں پر مشتمل تھی۔

(۵) جماعت نجف خاں = ۱۳۰ = ۱۵ = ۲۰

(۶) جماعت نعیم الدین = ۱۲۵ (زیادہ تر بنگالی) = ۶ = ۳۰

۱۹۹-۱۰۲ ان دقتوں منسل اعداد و شمار۔ سے ظاہر ہوتا ہے کہ یہ اطلاق کسی جاسوس نے مہیا کی ہے جو خاص اسی مقصد سے دیئے متعین کیا گیا ہوگا۔ مندرجہ ذیل فہرست میں بنگال سے وہ قبیلہ مراد ہیں جن میں قدیم صوبہ بنگال مع بہار شامل ہے۔

۲۰	=	۱۰	=	۱۰۰	=	(۷) جماعت نوحیر اللہ
یہ نئی جماعت کہلاتی تھی						
۲۰	=	۶	=	۱۰۰	=	(۸) جماعت نشی بشیر الدین
۲۰	=	۴	=	۱۳۰	=	(۹) جماعت محمد ابراہیم
۶	x	۴	x	۲۰	=	(۱۰) جماعت بہرام الدین بنیری

جماعت کہلاتی تھی اور ہزارہ بنیر اور ہمسایہ علاقوں پر مشتمل تھی۔

وہابیوں پر حملہ کا منصوبہ : ملکی اور فوجی حکام کے درمیان کوچ کے مختلف استوی اور ہر راستے کی جدا جدا فوجی سہولتوں کے متعلق طویل بحث و تھیس کے بعد آخر طے پایا کہ وادی چملا کے راستے سے کوچ کر کے کوہ مہابن کے نسبت آسان اور قابل عبور پہلو سے اقدام کیا جائے اور ملکہ پر عقب سے حملہ کیا جائے تاکہ اوپر وہابیوں کے کسی اور پہاڑی قلعہ کی طرف پسپا ہو جانے اور پناہ گزیں ہونے کا موقع بھی باقی نہ رہے۔ وادی چملا میں داخل ہونے کا راستہ یوسف زئی میدانوں کے پہلو سے ایک تنگ درے سے ہو کر تھا۔ اس کے دوسرے سرے پر امبید کا گاؤں واقع تھا اور اسی سے درے کو اس نام سے پکارتے تھے۔ یہ ایک تنگ درہ تھا۔ جس کی نو میل لمبی گیٹ ندیاں جنگل اور چٹانوں سے بھری تھیں۔

انگریزوں کی پیش قدمی: پیش قدمی کا نقشہ ایک اہم مفروضہ پر بنایا گیا تھا۔ وہ تھا قبائل بنیر کی عملی مدد نہیں تو کم سے کم غیر جانبداری بنیر کی زمینیں بہت نیچی پہاڑیوں کی ایک پستل دھجی سے وادی سے علیحدہ ہوتی تھیں۔ خود امبید انھیں کی ملکیت تھا۔ اس طرح انگریزی فوجوں کو نظرہ مول لیکر ایک زبردست قبیلہ کی سرحدوں کے قریب سے گزرنا تھا۔ انگریز اس قبیلے کی تاریخ اور سیاسی رجحان سے ناواقف تھے۔ اس سے بڑا خطرہ یہ تھا کہ ان بنیر کو مجوزہ کوچ کی اطلاع نہ دینے کا فیصلہ کیا گیا تھا۔ اپنے راستے کو مخفی رکھنے کی کوشش میں انگریزوں نے ان قبائل سے بھی مشورہ نہ کیا جو بنیر کے حریف تھے اور سر زمین کے پہلو سے انگریزوں کے مجوزہ خفیہ کوچ کے ممکن رد عمل سے زیادہ واقف تھے۔ یہ والوں سے مشورہ کرنا اس لئے بھی قرین مصلحت نہ سمجھا گیا کہ یہ زیادہ قرین قیاس تھا کہ وہ نہ مانگے۔

اس کے علاوہ نقشے کا افشا ہو جانا اور اچانک حملہ کی مصلحت جو کامیابی کے لئے ضروری تھی فوت ہو جاتی، تجویز یہ قرار پائی کہ درے میں داخل ہو جائے اور وادی چھلا میں فوراً اور اچانک پڑاؤ کر لیا جائے تاکہ اہل بنیر اسے نوشتہ تقدیر مان لیں۔ امید کی گئی تھی کہ دو ہفتے کے اندر سارا قصہ ختم ہو جائیگا۔

ٹیلر کا قبیلہ بنیر کو پروانہ: چنانچہ ۱۹ اکتوبر ۱۸۶۳ء کو جب کہ چھلا یا دوسرے قبائل کو..

..... انگریزی فوجوں کا راستہ روکنے کے لئے کوئی تیاری کرنے کا وقت نہ تھا ٹیلر

کشمیر پشاور نے جو فوج کے ساتھ تھا قبیلہ بنیر کو ایک پروانہ بھیج کر مطلع کیا کہ یہ ہم ہندوستان

کے خلاف ہے اور تمہیں کوئی اندیشہ کرنے کی ضرورت نہیں۔ ٹیلر کے جانشین پشاور جنمیر کی

رائے میں یہ نامعقول اقدام ہے اور ممکن ہے کہ اس کے نتائج مقصود کے برعکس ظہور

پذیر ہوں۔ اس کی رائے میں یہ ترین قیاس نہیں کہ "جاہلوں کی ایک دلیر قوم کس ایسے کاغذ کا

جیسے وہ پڑھ نہ سکتی ہو خلاصہ مضمون سمجھنے کے لئے ٹھہری رہے گی جب کہ ایک متوقع تملہ اور

کے ہتھیار اس کے دروازوں پر چمک رہے ہوں" اس کے علاوہ عبداللہ کو نظر انداز کر کے

یہ ساری قیاس آرائی کی گئی تھی حکمت عملی کے ایک اُستادانہ داؤں سے انھوں نے بھی ایک

اعلان بھیج کر قبائل سے اصرار کیا کہ "انگریزی افواج کی پیش قدمی کو روکیں اور صورت

حال کے اصل خطرے سے اُن کو تنہا کیا۔ ابھی تو اصل مقصود وہابی ہیں مگر تمہاری نوبت

آنے میں بھی کیا دیر لگیگی؟ دشمن عیار اور غدار ہے اور ممکن ہے کہ تمہیں بھی زرو مال سے

پھسلانے لگے تمہیں ہوشیار رہنا چاہئے"

انگریزی فوج محصور: یہ عظیم الشان فوج جنرل چیمبرلین کے زیرِ کمان مجتمع ہوئی اور ۱۸ اکتوبر

۱۸۶۳ء کو یوسف زئی کے میدان سے گذرتی ہوئی بڑھی اور ۲۰ اکتوبر کو درے پہنچ گئی۔ فوج

کا ایک حصہ وادی چھلا میں داخل ہو گیا اور بلا مزاحمت وہاں پر قابض ہو گیا۔ مگر یہ شواروں

کا آغاز تھا۔ سامان اور ذخائر ابھی درے میں اتر رہے تھے اور ان کا انبار راستہ بند کئے

دیتا تھا۔ اس لئے چیمبرلین نے فیصلہ کیا کہ جب تک فوج کا عقبی حصہ درے کو طے نہ کر لے آگے

لے اس اعلان کو پورا متن تتمہ میں نقل کر دیا گیا ہے۔

قدم نہ بڑھایا جائے۔ بہر حال اس وقت تک عبداللہ کا اعلان اپنا کام کر چکا تھا۔ بنیری چونک گئے تھے اور انگریزوں کے خلاف ہو چکے تھے۔ جنرل چیمبرلین نے اپنے ایک مراسلہ مورخہ ۲۳ اکتوبر میں لکھا: کوئی شک نہیں کہ ان کا رویہ (بنیریوں کی مخالفت) سھانہ کے ہندوستانی مذہبی دیوانوں کی کارستانی ہے۔ بعض ضبط کئے ہوئے کاغذات سے ظاہر ہوتا ہے کہ جب سے ان کو معلوم ہوا کہ موجودہ مہم ان کے خلاف تیار کی گئی ہے ہندوستانی اہل بنیر کو ہمارے ارادے اور ان کے ملک الحاق سے ڈرا کر ان کی مدد حاصل کرنے کی کوشش کرتے رہے ہیں۔ بنیریوں کے دشمن ہو جانے سے انگریزوں نے اپنے آپ کو یوں پھنسا ہوا پایا کہ مراجعت کا ایک ہی راستہ جو درے کے نشیب سے تھا آدمیوں، جانوروں اور ذخائر سے جواب تک لاپرواہی سے تھے بند ہو گیا تھا۔ انگریزی افواج ایک گہری گھاٹی میں تھیں جس کے دونوں جانب اونچے پہاڑ کھڑے تھے اور ان کے ڈھلوان پر ایک طاقتور قبیلہ ان پر حملہ آور ہونے کے لئے پیترے بدل رہا تھا۔ سرف یہ کہ مہم کے اعلیٰ مقصد کو ملتوی کر کے اسے ثانوی مقام دے دیا گیا تھا بلکہ خود فوج کی سلامتی خطرے میں تھی۔ اس تمام صورت حال سے عبداللہ نے بڑے کمال سے فائدہ اٹھایا۔ بہتر اس کی تصویروں کھینچتا ہے۔ اب ایک عظیم سیاسی آفت کا اندیشہ تھا۔ ہماری فوج روزانہ کے حملوں سے چور ہو کر کسی لحظہ میں انتشار اور گھبراہٹ سے ترتر ہو کر درے میں قتل و غارت کا شکار ہو جاتی ہے۔

جنرل چیمبرلین کی امداد طلبی: آئندہ کئی دن وسط نومبر تک انگریزوں کی فوج تنگ گھاٹی میں محصور رہا بیوں اور قبائل کی لگاتار گولہ باری بھیلتی رہی۔ جنرل چیمبرلین نے ملک طلب کی جو دہشت زدہ صوبائی حکومت نے فوراً روانہ کر دی۔ اس کو حالات کے اس طرح بگڑ جانے سے تشویش تھی، زیادہ تر اس لئے کہ اس نے یہ مہم کمانڈر انچیف کے اعتراف و خدشات کے باوجود تیار کی تھی۔ جن میں سے بعض حرف حرف صحیح ثابت ہوئے۔ صوبائی حکومت کی گردن شرم سے جھک گئی اور حکومت ہند کو رپورٹ لکھے ہوئے اس نے بڑے دکھ سے بتایا کہ قبیلہ بنیر کی غداری قطعاً غیر متوقع تھی۔ یہ بات نہ ہوتی تو سب مراحل بالکل سہل ہوتے۔

عظیم سرحدی جنگ: کمکون کا سیلاب اتنا بڑھا کہ اس گھری ہوئی آفت زدہ فوج کو امانت مہیا کرنے کی کوشش میں سارا پنجاب افواج سے خالی ہو گیا۔ خود کمانڈر انچیف جھپٹ کر لاہور پہنچا۔ انگریزوں کی کمکون کے جواب میں مختلف قبائل کی طرف سے رضا کاروں کی نئی نئی ٹولیوں کا مستقل سیلاب بھی اُمنڈ آیا۔ عبداللہ اور مبارک شاہ کے چچا سید عمران نے سوات کے اُخوند کو خط لکھ کر اس کے تعاون اور پیش بہا امداد کی درخواست کی۔ اُخوند نے اس صدا پر فوراً لبیک کہی اور ایک وسیع رقبے پر اپنے مذہبی اقتدار کی بدولت قبائلیوں کی ایک کثیر تعداد فراہم کر لی۔ دوسرے قبائلیوں، چملا اور دیر نے بھی جہاد کی دعوت قبول کر لی۔ اکیلے باجور کا فیض طلب خاں تین سو آدمی لایا۔ افریدیوں اور عثمان زئیوں نے بھی رنگ روٹ بھیجے۔ اب یہ انگریزی مہم اپنے پہلے محدود مقصد سے آگے بڑھ کر قبائلیوں کے گٹھ جوڑ (جس کی کوئی نظیر اس وقت تک دیکھی نہ گئی تھی) کے خلاف عظیم سرحدی جنگ میں منقلب ہو گئی تھی۔

وہابیوں کی داد شجاعت، اس زمانے میں بہت سی مقامی لڑائیاں ثابت قدمی سے لڑی گئیں جن میں فریقین نے سخت نقصانات اٹھائے۔ ہمیں یہاں ان مقامی لڑائیوں سے بحث نہیں۔ یہاں ہم ان متعدد بھڑپوں کا حال بیان کرتے ہیں جو کریگ پکٹ میں ہوئیں، اولاً اس لئے کہ یہ متعدد مقامی لڑائیوں کا صحیح نمونہ ہیں، ثانیاً اس لئے کہ ان حملوں میں وہابی بہت نمایاں رہے۔ چیمبرلین نے ایک عرصہ دراز تک عملاً جنگ گھاٹی میں محاصرے میں رہ کر اپنے پڑاؤ کے دونوں جانب پہاڑ کی دو بلند چوٹیوں پر قبضہ کر لیا، اور وہاں محافظ دستوں کی چوکیاں قائم کر دیں، کریگ پکٹ اور انگلیس نسٹ (آشیانہ عقاب) کے ناموں سے مشہور ہوئیں۔ دونوں اہم مقام تھے اس لئے ان میں متعدد خونریز بھڑپیں واقع ہوئیں۔ وہابیوں نے صرف کریگ پکٹ پر چار بار حملے کئے اور قبضہ کیا اور چار بار ان کے ہاتھوں سے واپس لے لئے گئے۔ فریقین نے نمایاں شجاعت اور پادری دکھائی۔ لیکن ایڈمیٹ A DYE نے وہابیوں کی بہادری اور تندہی اور انگریزی فوج کی پُر استقلال رفت کے درمیان نمایاں فرق اور انگریزوں پر طویل المدتی جنگ کے حوصلہ شکن اثر کی تصویر کشی کی ہے۔ ۳۰ اکتوبر اور ۲۰ نومبر کے درمیان وہابیوں نے متعدد پہ جوش اور دلیرانہ حملے کئے۔ انہوں نے پہاڑ

کی چوٹی پر بھی قبضہ کر لیا مگر انگریزوں کی مددگار فوجوں کی بہت بڑی تعداد نے ان کو پھروہاں سے نکل جانے پر مجبور کیا۔ ۱۳ نومبر کو تیسرے حملے میں وہابیوں کی یورش اتنی زبردست تھی کہ ”انگریزوں کی حفاظتی چوکی ہی (جواب ۱۲۰ مضبوط جہازوں پر مشتمل تھی) مار نہیں بھگانے لگی بلکہ چھاؤنی کے سپاہیوں میں بدحواسی پھیل گئی۔“ مددگار فوج نازیوں کے ہجوم کو مفید مقصد پر مضبوطی سے جما ہوا تھا اپنی جگہ سے ہلانہ سکی۔ ۲۲ نومبر کو کمرنگ پبلیٹ پر حملے کی آخری کوشش کی گئی۔ یہ حملہ اتنا بھگتا ہوا کہ برطانوی فوج پہاڑ نیچے ڈھکیل دی گئی جس سے اس کو کافی نقصان پہنچا۔ صورت حال ایسی نازک ہو گئی کہ چیمبرلین نے فیصلہ کر لیا کہ جو دستہ حملہ آوری اور کمرنگ پبلیٹ پر دوبارہ قبضہ کرنے کے لئے متعین کیا گیا تھا اس کی قیادت وہ خود کرے۔ چوکی پر دوبارہ قبضہ تو کر لیا گیا مگر انگریزوں کو ۵۳ آدمیوں کا نقصان اٹھانا پڑا جن میں فوج کا کماندار بھی تھا، خود چیمبرلین کا بازو سخت زخمی ہو گیا۔ اسلحہ اور ذخائر کی ایک بہت بڑی مقدار وہابیوں کے ہاتھ لگی۔ کئی انگریز گرفتار بھی کر لئے گئے۔

سڑک کی تعمیر و انہدام وہابی حکومت سرحد کی صورت حال سے بے خبر اب تک پہلے مقصد (مکہ کی تباہی) کی تکمیل پر زور دے جا رہی تھی۔ لیکن چیمبرلین نے مناسب نہ سمجھا کہ قبائلیوں کے گٹھ جوڑ سے اپنی فوج کے بازوؤں کو خطرے سے نجات دلانے بغیر مزید پیش قدمی کی جائے اس نے اس صبر آزما مدت جنگ میں مبتلا رہنے کے سبب سے اور یوسف زئی واپس جانے کے لئے ایک متبادل راستہ حاصل کرنے کے لئے پہاڑ کے ڈھلان پر ایک سڑک تعمیر کرنے کا حکم دیا۔ میدھی ملک جالے والی ایک اور سڑک کی تعمیر میں بھی ہاتھ لگا دیا گیا تاکہ اگر ممکن العمل ہو تو اس پہاڑ چھانی کرنے میں آسانی ہو۔ مگر وہابی بھی اس کو اپنے دینے کو تیار تھے۔ انجنیروں کی جماعتیں اکثر الگ ہو کر مختلف خطوں میں پھیل جاتیں اور اس کے افراد گرنے والوں سے ایک دوسرے سے علیحدہ ہو جاتے۔ ان پر حملہ کر کے بھگا دیا جاتا اور سڑک کے تعمیر شدہ حصے توڑ دئے جاتے یا چٹانوں اور درختوں سے بند کر دئے جاتے۔

انگریزی سپاہ کی بد حالی : دسمبر تک تقریباً نو ہزار باقاعدہ فوج جس میں ۹۳ ہائی لیسٹرز وغیرہ کی چیدہ رجمنٹیں شامل تھیں سرحد پر تعینات کر دی گئیں، اور یہ بات ناقابل یقین معلوم ہوتی تھی کہ ایک زبردست برطانوی فوج یوں ہفتوں درے میں ہندوستان کے حملوں سے بے بس اور لاچار پڑی رہے اور ایک ضرب بھی نہ لگا سکے۔ ہنٹر کے قول کے مطابق اس کا اصل سبب یہ تھا کہ انگریزوں نے مذہبی دیوانوں کی نوآبادی کے اس اثر و اقتدار کا غلط موازنہ کیا جو اسے سرحد میں حاصل تھا۔ جو لوگ دین کی خاطر ان سے مل گئے تھے وہ مال غنیمت کے لالچ یا شہادت کی آرزو میں بے تاب تھے۔ اور ان سے کم ایمان والوں کو ان کی سر زمین پر انگریزوں کے قبضے کا خوف دلایا جاتا تھا۔ صورت حال فوجی اور سیاسی دونوں اعتبار سے دشوار ہوتی جا رہی تھی فوج کا کمانڈر جنرل چیمبرلین زخمی ہو کر ناکارہ و مجبور پڑا تھا۔ گورنر جنرل لارڈ ڈالہمن "انڈوئی پہاڑوں" میں حالات سے بے خبر اور کوئی ہدایت دینے سے مجبور بستر مرگ پر پڑا تھا۔ تمام حالات کا بھاری بوجھ حیران و پریشان و فکر مند لفسٹنٹ گورنر کے کندھوں پر تھا۔ ۲۰ نومبر کی لڑائی کے بعد جنرل چیمبرلین کے مراسلے نے صوبائی حکومت کو اس قدر محنت و بدحواس کر دیا تھا کہ وہ عام پسپائی کا حکم دینے کے بارے میں سوچ رہا تھا۔ مگر سر ہف روز HUGH ROSE کمانڈر انچیف کے استقلال اور ایک زبردست لک کی فراہمی نے اس رسوا کن اقدام سے بچالیا۔ ایک خطرہ اور تھا۔ "ہر چند ہماری دیسی سرحدی رجمنٹوں نے اب تک اپنی وفاداری اور ہمت کا ثبوت دیا تھا پھر بھی یہ سمجھ لینا کہ وہ ہفتوں پر ہفتے اپنے ہی عزیزوں اور قرابت داروں کے لڑتے چلے جائینگے فطرت انسانی کے خلاف تھا۔ سیاسی صورت حال اور بھی خراب تھی۔ سارے سرحد میں ہچل مچی ہوئی تھی۔ کابل میں بھی قبائلی حلیفوں کے لئے عملی امداد نہیں تو کافی ہمدردی ضرور تھی۔

برطانوی حکام کا قبائلیوں سے سیاسی گٹھ جوڑ : برطانوی حکام نے کھلم کھلا جنگ سے اپنا مقصد حاصل ہوتے ہوئے نہ دیکھا تو سیاسی جوڑ توڑ شروع کر دیا جس میں وزیرنی زردھات کے کبھی پٹ نہ پڑنے والے پانسوں کی تحریکوں کو سب سے زیادہ دخل تھا۔

کمشنر جیمز اور بالخصوص پولیسکن افسر نے حلیف قبائل کے آپس میں نفاق کے بیج بونا شروع کیئے۔ ہنٹر ٹھسپائی سے اقرار کرتا ہے کہ پہاڑی قبائل کے ایتلاف میں ہمیشہ تلون رہتا ہے۔ اور جس چیز کو ہمارے اسلحہ حاصل نہ کر سکے وہاں پھوٹ اور حکمت عملی اپنا کام کرنے لگی۔ شروع دسمبر میں جیمز نے میجر جنرل گارواک کو جو جنرل جیمبرلسن کا جانشین ہوا ایک یادداشت بھیجی جس میں اہل بنیر کے درمیان اندرونی نزاع اور عداوت کے وجود کی خبر دی۔ قبائل بنیر جو پہلے اپنے وطن کی محافظت و مدافعت میں لڑا کرتے تھے اب جنگ سے تنگ آچکے ہیں۔ اور آپس میں متفرق ہو گئے ہیں۔ جیمبرلسن کا مسلسل دباؤ اور مالی تحریکیں آخر بنیریوں کو توڑ لینے میں کامیاب ہو گئی۔ وہ جنگ جو وہابیوں کی اتنی امیدوں کے ساتھ بے نظیر جوش و خروش اور قبائل کے تعاون سے شروع ہوئی تھی محض قبائل کے نفاق اور خود غرضی سے ناکامی پر انجام پائی۔ آجوند نے شروع میں کوشش کی کہ وہ قبائلی غداروں کی ہونناک موجوں سے بے داغ نکل جائے مگر ناکام ہوا اور آخر میں محض ایک بے بس تماشائی بنکر رہ گیا۔

وہابیوں کا جذبہ شہادت: جنگ کے آخری مرحلوں میں وہابی چند باجوہریوں کے ساتھ زبردست حریف کے مقابلے کے لئے تنہا رہ گئے تھے۔ عبداللہ نے اپنے رفقاء کی منتشر جماعت کے ساتھ جنگ کرنے کی امید پر کہ قبائل کی رگ حمیت و عزت نفس کو متحرک کر کے جنگ میں دوبارہ شرکت کے لئے آمادہ کر دیں ایک عظیم الشان گویا مصلحت کوشش کی۔ اس آخری محاربت کے آغاز سے پہلے ایک پر جوش تقریر کی جس میں اپنے متبعین پر زندگی کی ناپایداری اور ہتھیار ڈالنے کی بجائے بڑائی میں جان دینے کی نصیحت پر زور دیا۔ وہابی ان کی فصاحت سے متاثر ہو کر اور ایک خود فراموشانہ جوش سے مشتعل ہو کر برسی جانبازی سے لڑے۔ ان کی سفین ایک فولادی دیوار کی طرح بے لچک جمی رہیں۔ وہابیوں کی ایک بڑی تعداد اسی لئے لڑنے لڑنے عبداللہ پھر ایک بار دوسرے مرحلے میں انگریزوں کا مقابلہ کرنے کے لئے پیچھے ہٹ گئے۔

ملکہ کی تباہی: جنگ تو ختم ہو گئی مگر اس ہم کا قریباً وہ مقصد یعنی ملکہ کی تباہی کی تکمیل باقی رہ گئی۔ بنیریوں کی پسپائی کے بعد بھی انگریز جہاں تھے وہیں رہ گئے۔ ایک دفعہ وہ بنیریوں

کی غیر جانبداری پر یقین کر چکے تھے اور اس کا خمیازہ بھی بھگت چکے تھے۔ دُروہہ کا جلا چھانچھانچہ بھونک بھونک پیتا ہے۔ وہ ایسے دہشت زدہ تھے کہ اب وہ اور آگے افزائی اور عدی خیل قبائلی علاقے میں قسمت آزمائی کے لئے تیار نہ تھے جہاں سے گذرنا ضرور تھا اگر ملکہ جانا تھا۔ درمقال کا مصنف انگریزوں کی فتحیابی کے بعد بھی ان کے خوف اور تذبذب پر طویل بحث کرتا ہے اور بتاتا ہے کہ کس طرح اُن کو ملکہ کی تیاری کے لئے افزائیوں اور نیرویوں کی امانت خریدنا پڑی تھی۔ وہ طنزاً لکھتا ہے کہ نیروی کس طرح کوچ میں آگے آگے تھے اور بہادر انگریز پیچھے رہ گئے۔

اب جیمز نے پھر ایک انوکھا منصوبہ گانٹھا۔ تباہی کا اصل کام نیروی افزائی اور خودی خیل قبیلوں کو انجام دینا تھا کیونکہ ایک بار کھلکر مذہبی دیوانوں کی مخالفت کرتا اس بات کی یقینی ضمانت تھی کہ وہ ان کو پھر آنے نہ دینگے۔ لیکن معاملہ کو زیادہ یقینی بنانے اور یہ دیکھنے کے لئے کہ تباہی واقعی انجام پذیر ہوگئی، چند برطانوی افسروں کا بھی اس گروہ کے ساتھ جانا قرار پایا۔ وہ ۱۹ دسمبر کو پولیسکیل افسر کرنل ٹیلر کے ساتھ روانہ ہوئے۔ ۲۱ دسمبر کو وہ اُس جگہ پہنچے اور ایک رات ٹھہرنے کے بعد تباہی کا کام شروع ہو گیا۔ جیمز اُس جگہ کا اور اُس کی تباہی کا حال یوں بیان کرتا ہے۔

”ملکہ مہا بن پہاڑ کے شمالی برآمدہ چٹان پر ایک سب سے بلند سطح مرتفع پر واقع ہے۔ یہ ان پہاڑوں میں تمام معلوم مقامات سے بہت بڑا اور کثیر المنفعہ تھا۔ ان میں بہت سی عمارتیں تھیں ان میں مولوی کے خطبات کا ہال، سپاہیوں کے بارک، صمصمیل اور بارو کا کارخانہ نمایاں تھے کوئی باقاعدہ قلعہ بندی تو نہ تھی لیکن گھروں کی بیرونی دیواریں ایک دوسرے سے ملی ہوئی اور عقی دروازے سب مل ملا کر ایک مسلسل خط مدافعت بناتے تھے۔ باہر کے پھاٹک پر ایک مینارہ بھی تھا۔ یہ مقام آدمیوں سے خالی پایا گیا۔۔۔۔۔ اور دوپہر تک مکمل طور پر تباہ کر دیا گیا۔“ (۲۲) دسمبر مہر سید محمود شاہ سھانہ کے براہ راست اولاد عبدالجبار شاہ کی اس مضمون کی روایت نقل کرتے ہیں کہ ملکہ کو واقعی آگ نہیں لگائی گئی۔ مگر اس واقعہ پر انگریزی دستاویزات

لے عبدالحق صحیح رقم جو ان کو اس کام کے لئے دی گئی ۴۰۰ دینار بتاتے ہیں۔ درمقال ۳۴۹

کی شہادت واضح ہے۔ جیمز بھی اپنے منقولہ بالا خط میں بعض امزائیوں کے گاؤں سے ایک کو بچا لینے کی کوشش کا ذکر کرتا ہے، اس دلیل سے کہ وہ ان کی ملکیت ہے، نہ کہ وہابیوں کی۔ مگر یہ عذر رد کر دیا گیا اور پوری جگہ جلا دی گئی۔

انگریزی سپاہ کا بھاری نقصان: یہ معرکہ انگریزوں کو آدمی اور روپے دونوں اعتبار سے بہت مہنگا پڑا۔ ان کے نقصانات ۸۴۷ مقتول و مجروح یا پوری فوج کی جو مہائی تک پہنچ گئے جب کہ اس کی کل تعداد نو ہزار تھی۔ یہ صرف درے میں نقصانات کا ذکر ہے اور ان آدمیوں کے علاوہ ہے جو ٹھنڈ اور بیماری سے ہلاک ہوئے۔ دوسری طرف کا نقصان قبائلیوں سمیت تین ہزار تھا۔

جنگ امبیلہ انگریزوں کی نظر میں: صوبائی حکومت نے مہم کے نتیجہ پر یوں تبصرہ کیا کہ پہلے کبھی کسی موقع پر پہاڑوں میں لڑائی اتنی شدید، مستقل و دیرپا نہیں ہوئی، قبائلیوں کے درمیان وہابیوں نے زبردست اتحاد قائم کر دیا تھا جس میں وہابیوں کی رائے کو غلبہ رہتا تھا۔ اتنی بڑی برطانوی فوج کے ایک نسبتاً معمولی سے مقصد کے حصول کیلئے اتنی مدت لگانے سے قبائلیوں کی نگاہ میں انگریزوں کے وقار کو سخت صدمہ پہنچا۔ اور اتنی قربانیوں پر بھی زیادہ اہل نظر انگریز افسر اور معاصر اہل قلم یہ محسوس کئے بغیر نہ رہے کہ اختلاف کی دائمی علت کا خاتمہ نہ ہو پایا۔ ADYE لڑائی رائے زنی کرتا ہے کہ "من حیث المجموع یہ جنگی مہم بالکل قابل اطمینان نہ تھی" ہنٹر اس بات کا دتاروتا ہے کہ "ہمارے زندان کے پھانگ اُن جوق در جوق نامراد شوریدہ سر باغیوں کے سنے بند ہو گئے، ہمارے عدالتوں نے سرغزوں کی جماعتوں کو یکے بعد دیگرے سمندر پار ناموش جزیرہ دن میں بھٹا دیا۔ پھر بھی سارا ملک ہماری سرحد پر اسلام کے یاس زدہ لوگوں کو روپے اور آدمی بھیجے جاتا ہے اور یہی حکومت کے خلاف خونیں احتجاج پر سختی سے جما ہوا ہے" جیمز اپنے خط منقولہ بالا میں یوں رائے زنی کی: "مذہبی دیوانوں کی نوآبادی جو اس ہمت و استقلال سے ہماری سرحدوں پر منڈلا رہی تھی اور ہمارے انتظامیہ پر ایک داغ تھی..... اب نصف تباہ ہو چکی اور مہمان گش اور ناموافق علاقوں (جزائر انڈمان) میں بسا دی گئی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ بہت جلد ہمیشہ کے

لئے جرے سے اگھاڑ پھینکی جائیگی، جہیز اپنے اس یقین میں غلطی پر تھا۔ یہ حقیقت دوسرے
 معرکہ (یعنی دوسری مہم کوہ سیاہ) سے پھر اس کے بعد کے معرکوں سے واضح ہو جائیگی۔
 وہابی تحریک کا مقصد ۱۸۰۰ء پر کے بیانات سے یہ واضح ہو چکا ہوگا انگریز سرحد پر وہابی
 ریاست کے وجود کو ہندوستان میں اپنی حکمرانی کی استقامت کے لئے بالقوہ خطرہ سمجھتے تھے صورت
 حال کا جو اندازہ انگریزوں نے لگایا تھا وہ درست تھا کیونکہ وہابیوں کے خلاف انگریزوں کی بعد
 کی آدریشوں کے بیان سے واضح ہو جائیگا کہ وہابی جب کھلم کھلا حریف نہ کبھی ہوتے تھے تو اکثر
 قبائلی کشمکشوں میں اندر اندر ان کی ریشہ دوانی ثابت ہوتی تھی۔ وہ عناد پیدا کرنے
 کے کسی موقع کو ہاتھ سے جانے نہ دیتے تھے۔ وہ کسی بھی گنڈے خاں سے جو انگریزوں کے
 خلاف اقدام کے لئے آمادہ کیا جاسکے گھوڑ جوڑ کر لینے کے لئے ہمیشہ تیار رہتے تھے، ان
 ناقابل تردید حقائق کے مقابلے میں یہ نظریہ رکھنا کہ وہابی تحریک قطعاً سکھوں کے خلاف چلائی
 گئی تھی نہ کہ انگریزوں کے خلاف، تحریک کی تاریخ کے بہت بڑے حصے سے بالکل انکار کرنا ہے

ساتواں باب

دہائی ۱۸۵۷-۵۹ء کی تحریک میں

جنگ پلاسی (۱۷۵۷ء) کے بعد کی صدی میں ہندوستان میں سلطنت برطانیہ کی تدریجی توسیع اور استحکام پیدا ہو گیا۔ ساتھ ہی سازشوں، شورشوں اور عموماً مختلف کیفیت اور کیفیت کی انگریزوں کے خلاف تحریکوں نے سر اٹھایا۔ ان تحریکوں میں ۱۸۵۷ء کی تحریک اور دہائی تحریک سب سے زیادہ نمایاں نظر آتی ہیں۔ ان میں جہاں اول الذکر تاریخ وقوع کے فوراً بعد ہی سے بعض مستند وسیع النظر مطالعہ کا موضوع رہی ہے اور فی الحال بھی ان میں بعض بیش بہا تحریروں کا اضافہ ہوا ہے، وہاں آخر الذکر پر اب تک کافی کام نہیں ہوا۔

۱۸۵۷-۵۹ء کی تحریک کے بعض مستند مورخین نے دہائی تحریک کے صرف اُس پہلو پر جس کا تعلق ۵۷-۵۹ء کی تحریک سے ہے بہت مختصر اور سرسری نگاہ ڈال لی ہے مگر ان کے مطلوب نگارش میں ایک اہم اور نمایاں نقص یہ ہے کہ بیاں اصلی سابق و سابق سے جدا ہونا ہے۔ دہائیوں کی بنا اور احوال ماضی، ان کی تحریک کے اغراض و مقاصد، ان کی تنظیم، ان کے پیشوا و قائدین اور اسی قبیل دوسرے نکات بالکل نظر انداز کر دئے گئے ہیں۔ زیادہ اہم بات یہ ہے کہ انگریزوں کے خلاف دہائیوں کی لائٹنابی کا روایتوں کے معنی و مقصد کی توضیح صحیح طور پر نہیں کی گئی۔ جب ۱۸۵۷ء کی عظیم آویزش شروع ہوئی تو اُس سے تیسرے سال پہلے سے ہی دہائی اپنی تحریک چلا رہے تھے۔ مگر اس حقیقت پر کسی نے صحیح طور پر زور نہیں دیا۔ نتیجہ

ہوا کہ ۱۸۵۷-۵۹ء کی تحریک کی عام تاریخوں میں وہابی ناقابل فہم اور بے جوڑے سے غصہ دکھائی دیتے ہیں، وہ کس جماعت کی نمائندگی کرتے تھے؟ وہ اس زور شور سے انگریزوں کے خلاف سرحد کے علاقے میں کیوں لڑتے رہے؟ پھر اس کے برخلاف بہار میں جو بہت پہلے سے تحریک کا اصل مرکز بنا وہ دوسری طرح کی کاروائیوں میں کیوں مصروف رہے؟ بے رحمانہ اور کامل سرکوبی کے بعد بھی اتنے عرصے تک ایک اہم سیاسی عنصر کی حیثیت سے کس طرح باقی رہ گئے؟ یہ اور ایسے ہی متعلقہ سوالات بغیر جواب چھوڑ دئے گئے۔ شاید بعض مورخ اس فرودگذاشت کو محسوس کرتے تھے۔ مثلاً مایسن نے وہابی کے موضوع پر ایک مختصر تہذیب کا اضافہ کر کے اسی کی جزوی تحلیل کی کوشش کی ہے مگر ظاہر ہے کہ وہابی تحریک جیسے موضوع پر بحث کرنے کے لئے محض تہذیب کوئی صحیح مقام نہیں۔

اگرچہ ۱۸۵۷-۵۸ء کی تحریک کی کیفیت و کیفیت کا مفصل تجزیہ تالیف ہذا کے احاطہ تحریر سے باہر دونوں تحریکوں کے درمیان مناسبت و تقابل کے کچھ نکات ذیل میں دئے جاتے ہیں تاکہ جو سوالات اوپر اٹھائے گئے ہیں ان کا حل اور اس تحریک کے ساتھ وہابی تحریک کے تعلق کا ادراک کیا جاسکے۔

تحریک ۱۸۵۷ء اور وہابی تحریک کا موازنہ: ایک متفقہ فوج چیلنج کی حیثیت سے ۱۸۵۷ء کی تحریک ہندوستان میں برطانوی سلطنت کے لئے ایک نہایت زبردست چیلنج تھی۔ اگرچہ یہ ایک زمانہ ویرا کی مختلف النوع بے چینیوں کا نتیجہ تھی مگر بظاہر اس کا ظہور ناگہانی شعلہ فشاہی کی طرح ہوا، تند و تیز، سیلاب پا اور آگ اور خون کی ایک لکیر پر ختم ہو جانے والا۔ یہ تاریخ ہند کے افق پر شہاب ثاقب کی چمک اور رفتار سے چمکی اور اڑ گئی۔ دوسری طرف وہابی تحریک ایک دیرپا اور پیش تھی جو آدھی صدی سے زیادہ قائم رہی اور اپنی مدت حیات میں شدت اور حرکت کے متنوع و مختلف درجوں سے گذرتی رہی۔ اس کا بھی انگریزوں کے خلاف روبرو جنگوں سے سامنا ہوا مگر وہ ۱۸۵۷ء کی ناگہانی شورش کے خلاف سیاسی جدوجہد کے ایک نہایت منظم، وسیع و طویل الذیل جاں پر مبنی تھی۔

تحریک ۱۸۵۷ء کی ناکامی کے اسباب: ایک بہت بڑی فرودگذاشت جس سے ۱۸۵۷ء کی تحریک نے نقصان اٹھایا اور جو فی الحقیقت اس کے ناکام انجام کا ایک سبب ہوئی وہ ایک متحدہ مقصد اور متنقہ دستور العمل کا فقدان تھا۔ سارا شمالی ہند جدا جدا اکھاڑوں میں بٹا ہوا

تھا۔ ہر ایک اپنے اپنے سردار کے تحت تھا۔ اگرچہ یہ سچ ہے کہ ان تمام حالات میں برطانویوں کے خلاف ایک مشترک مقصد کام کر رہا تھا اور ان سرداروں کے درمیان کسی نہ کسی قسم کا باہمی رابطہ ضرور تھا لیکن من حیث المجموع یہ بھی حقیقت ہے کہ آویز شیشی اکثر چھوٹے چھوٹے اور جدا جدا محاذوں پر لڑتی ہوئی تھیں۔ مختلف جدوجہد کو ملانے والی کوئی مرکزی تنظیم نہ تھی۔ اس کے برخلاف وہابی تحریک کی ایک نہایت باقاعدہ اور موثر یا اندرونی تنظیم تھی۔ سماجی یاد دہانی اور فوجی دونوں امور کے دونوں فراتص دو علیحدہ علیحدہ بازو سمجھے جاتے تھے جو خلیفہ صدر اور مرکز فرمانروا ہوتا تھا۔ جماعت کا ایک بازو تحریک کے ملکی مذہبی پہلو کی نگرانی کرتا۔ تمام ملک میں عبادات، جلے، نئے زنگروٹ بھرتی کرنا اور ان کی تربیت، خیراتی اور تعلیمی کام اور جماعت کے آشیانوں کی نگرانی کا نظم تمام ملک میں پھیلا ہوا تھا۔ دوسرا بازو سیاسی فوجی معاملات سرانجام دیتا، جیسے سرحد کو بھینچنے کے لئے آدمی اور ساز و سامان مہیا کرنا، انگریزوں کے خلاف تبلیغی لٹریچر کی اشاعت اور انگریزی فوج میں اپنے آدمیوں کو گھسانا۔

وہابی تحریک کا عقیدہ ہجرت: وہابی تحریک کی ایک خصوصیت یہ بھی تھی کہ اپنے آغاز ہی سے شدت سے عقیدہ ہجرت کے زیر اثر رہی جس کا تقاضا یہ تھا کہ انگریزوں کے خلاف محاربہ ملک کے باہر سے ایک قسم کی عارضی حکومت کے ذریعے سے ہو جو برطانوی ہند سے باہر کے علاقے میں قائم ہو۔ اس لئے اس تحریک نے برطانوی ہند کے علاقے سے ہجرت کرنے اور ایک علیحدہ آزاد ریاست قائم کرنے پر بہت زور دیا۔ تاکہ جنگ یوں لڑی جائے جیسے وہابوں نے آزاد حکومتوں میں لڑی جاتی ہے۔ چنانچہ وہابی انگریزوں کے خلاف لڑائیوں کے دوران ایک مخصوص قطعہ زمیں کے مالک تھے اور ایک فوج رکھتے تھے جو اس کی مدافعت کیے اور اپنے نظریات پر مبنی ایک دستور اساسی کا خاکہ بھی رکھتے تھے۔

دوسری طرف ۱۸۵۷ء کی تحریک انگریزوں کو بزدرا سحہ ملک بدر کرنے کی کوشش ملک کے اندر سے تھی۔ بے شبہہ اس شورش کو عام ملکی (غیر فوجی) سہارا حاصل تھا جس کی پشت

لہ وہابیوں کے قریب قریب تمام رسالے اور منشور ہجرت کی ضرورت اور فضیلت پر زور دیتے ہیں

پروسی فوجیں بھی تھیں، خصوصاً اودھ اور بہار کے علاقہ شاہ آباد میں تحریک نے ایک قومی بغاوت کی ضخامت و جسامت تو اختیار کر لی مگر اصلایہ ملک کے اندر سے ایک بغاوت تھی۔ اس شورش کے دوران میں ملک کے بہت سے حصوں میں بطلانوی حکومت کا وجود ختم ہو گیا تھا مگر اسکی جگہ پر کوئی علیحدہ نظام حکومت رد نہ ہوا اور اس کے لئے وقت بھی نہ تھا، کیونکہ انگریزوں نے اس کے فوراً بعد ہی ان علاقوں پر دوبارہ تسلط قائم کر لیا۔ بہار میں بعض مقامات پر کسی نہ کسی قسم کا عارضی نظام حکومت قائم بھی کیا گیا تو وہ موجودہ بطلانوی نظام کا محض چہرہ تھا۔

۱۸۵۷ء کی تحریک پر دہائی تحریک کا اثر : ۱۸۵۷ء کی تحریک کے بعض پہلوؤں پر دہائی تحریک کا بالواسطہ اثر بھی معنی خیز ہے۔ دہائیوں کی پختہ و مستقل تنظیم نے جو تمام شمالی ہند پر حاوی تھی، ہندوستانی فوجوں میں ان کے خفیہ گوشوں نے اور مختلف دسی یا ستوں جیسے ٹونک حیدر آباد وغیرہ سے ان کے ساز باز ان کو ایک پختہ تنظیمی مرکز مہیا کر دیا تھا جس کی ۵۷-۵۹ کے قائدین نے براہ راست تقلید کی اور کام میں لائے۔

پٹنہ کی مرکزی حیثیت : ۵۷-۵۹ء کی تحریک میں دہائیوں کی روش کو صحیح طور پر سمجھنے کے لئے دونوں تحریکوں کے ان فرقوں کو ذہن نشین کر لینا ضروری ہے بہار میں ہم دیکھتے ہیں کہ سید احمد کے زمانہ سے ہی پٹنہ انگریزوں کے خلاف جدوجہد و فعال مرکز کی حیثیت کا کام کر رہا تھا۔ وقتاً فوقتاً دہائی شورش انگریزوں کی ایک جماعت کے باوجود اور اسکی کارروائیوں کی رپورٹیں حکومت کو بھیجی جاتی رہی ہیں۔ بعد کے دس بیس سال کے دوران میں یہی مختلف جمعوں کا مرکز اجتماع رہا جو ایک دوسرے کے علم کے ساتھ مگر زیادہ تر اپنی مرہی سے حکومت کی مخالفت کارروائیوں میں مصروف رہا۔ درحقیقت پٹنہ میں ۱۸۳۷ء سے وسط ۱۸۵۷ء کی شورش تک ان جمعوں کے قائدین کی کارگزاریوں کا مطالعہ ایک بڑا دلچسپ و دلکش میدان ہے جس کی طرف اب تک کافی توجہ نہیں دی گئی۔

ولیم ٹیلر جو ۱۸۵۵ء میں پٹنہ کا ڈویژنل کمشنر بہار کے معاوہ چند دورانیہ افسروں میں سے تھا۔ وہ صوبائی حکومت کو بار بار شہر میں حکومت کے خلاف جدوجہد کے بڑھتے ہوئے زور سے متنبہ کرتا رہا۔ اس بات کی اسے داد دیتا پڑتی ہے کہ وہ بہار میں کام کرنے والے مختلف جمعوں کی علیحدہ علیحدہ شخصیتوں سے واقفیت رکھتا تھا اسے اس حقیقت کا خاص طور پر احساس تھا کہ دہائی ایک منفرد جماعت ہے۔ وسط جون ۱۸۵۷ء میں اس ڈویژن کی صورت حال جن اطراف سے اسے شورش کا احتمال تھا اور ان میں سے ہر ایک کے سدباجے لئے اقدامات کے لئے سب کچھ لکھ کر وہ تبصرہ کرتا ہے

لے کمشنر پٹنہ کا خط سکریٹری حکومت بنگال کے نام مورخہ، ۱۸ جون ۱۸۵۷ء

”اگرچہ میرا خیال ہے کہ مخالف مسیحی لیگ کے چلانے میں..... تمام فرقے اس وقت اپنے فرقہ وارانہ تفرقوں کو محو کر دینگے اور نہاری کے مقابلے میں متحد ہو جائیں گے، مگر دو خاص حلقے ایسے ہیں جن سے پٹنہ میں خطرے کا اندیشہ کیا جاسکتا ہے۔ ایک تو اودھ کے الحاق کے بعد سے لکھنؤ کی پارٹی کے طرفداروں کی طرف سے، دوسرے وہابیوں کے متشدد اور کثیر التعداد فرقے کی طرف سے۔ ان کے علاوہ ایک بڑا خطرہ شورش بھوٹ پڑنے پر عوام الناس کی پیرا فروختگی سے بھی متوقع ہے“

پیر علی کی خدمات: ٹیلر کے اس موازنہ کی تائید ۳ جولائی ۱۸۵۷ء کو پٹنہ کی اس مختصر اور شاندار شورش کی بنا سے بھی ہوتی ہے، اس اہم واقعہ کی تفصیلات سے ابھی ہمیں یہاں کوئی بحث نہیں، صرف اتنا بتادینا کافی ہوگا کہ حکومت کی بعض پالیسیوں کے سبب سے تمام بہار اور بالخصوص پٹنہ میں عام بے چینی پھیلی ہوئی تھی جسے ٹیلر ”غذاری کا گندہ حوض“ کہتا ہے۔ کئی جتنے حکومت کے خلاف کام کر رہے تھے۔ لکھنؤ کے جتنے کا بڑا کار گزار پیر علی تھا۔ جو ۳ جولائی کی شورش کا ہیرو تھا اور پٹنہ کے تھانہ کوٹ گشت کے داروغہ مہدی علی کے ساتھ ملکر کام کرتا تھا۔ ڈمری ضلع پٹنہ کا ایک دو تہندز میندار علی کریم تھا نہ بندراج (بہار راج) مبلغ مظفر پور کے جمعدار وارث علی کے ساتھ ملکر کام کرتا تھا۔ یہ دہلی کے جتنے کے نمائندے تھے۔ پھر مقامی وہابی تھے جو زیادہ عرصہ سے حکومت کے خلاف کام کر رہے تھے مگر ان کی کارروائیاں زیادہ ان کی اصل جدوجہد کے مرکز یعنی سرحد پر آزاد ریاست کے استحکام و ترقی کے لئے مخصوص تھیں۔ پیر علی کا بڑا مقصد اپنے ساتھی مسیح الزماں لکھنوی کی ہدایت کے مطابق ان علیحدہ علیحدہ جتنوں کی کارروائیوں میں ہم آہنگی پیدا کرنا اور بے چینی کے نسبتہ منتشر احساسات کو ملا جلا کر حکومت کے خلاف ایک زبردست اور متجانس طاقت میں منتقل کر دینا تھا۔ پیر علی کے نام مسیح الزماں کے بہت سے خطوط

۱۵۔ علی کریم کی زندگی اور کارروائیوں کے مفصل بیان کے لئے۔ پچیسے مولف کا انڈین سٹوریٹل ریکارڈس کمیشن کے جلد ۲۲ ۱۹۵۸ء صفحہ ۹-۱۵

جو شورش دہلی کے بعد پکڑے گئے وہ اس کے اس مقصد کے حصول کی جدوجہد کی
 بین دلیل ہیں۔ پیر علی کے نام ایک خط میں وہ اسے ہدایت کرتا ہے کہ علی کریم سے رابطہ قائم
 کرے جس کا تعاون بہت قیمتی اور ضروری ہے۔ اس نے مزید لکھا کہ ”وہابیوں کے سرداروں
 ولایت علی یا مقصود علی کے خاندان میں سے کسی ایسے فرد سے تمہارے دوستانہ تعلقاً
 ہوں جسے تم ہمارے کام کے لائق سمجھتے ہو تو مجھے مطلع کرو۔ میرا خیال ہے ہمیں کسی ذات
 یا نسل سے اختلاف نہ کرنا چاہیے ہندو سے بھی نہیں۔ کیونکہ ہمیں محنت سے اپنا کام انجام
 دینا ہے اور اختلاف میں بیکار بھگڑے ہوتے ہیں۔ میں اپنی نسبت کہتا ہوں کہ میرے تعلقاً
 وہابیوں سے، ان لوگوں سے جو کمزور اور منزلزل ہیں اور بہتوں سے، شیعہ اور افضی
 سے بھی اچھے ہیں۔ اس معاصر خط سے ظاہر ہے کہ وہابی ایک علیحدہ جماعت تھی۔

پیر علی پٹنہ کے وہابیوں کے سردار فرحت حسین سے مجوزہ شورش میں شرکت کے متعلق
 گفتگو کا ذکر جو صاحب تذکرہ صادرہ نے کیا ہے ایک قیمتی شہادت ہے۔ فرحت حسین نے اس
 تجویز سے جن اسباب سے اختلاف کیا ان سے ابھی بحث کی جائیگی۔

ٹیلر نے اپنے مخصوص مکمل گو خلاف ریاست
 انداز میں سازش کے تینوں جھٹوں سے بحث کی ہے۔ ہمیں یہاں دراصل وہابیوں کے ساتھ
 اس کے سلوک سے بحث ہے۔ چونکہ یہ ان اہم وقائع میں سے ہے جن میں مقامی وہابی
 قائدین نمایاں حصہ رکھتے تھے اس کا ذکر خود ٹیلر کی روایت کی بنا پر کیا جاتا ہے جو اس حوزہ ڈراما کا سب
 سے نمایاں کردار ہے۔

وہابیوں کی غیر معمولی تنظیم و اطاعت: ٹیلر کے مطابق وہابیوں کی سب سے نمایاں
 خصوصیت اپنے سردار یا پیر کی کامل اطاعت ہے۔ ایک وہابی سردار ایک سطر کھے بغیر ایک
 خضیہ پیغام ناقابل یقین قبیل مدت میں پٹنہ سے لاہور پہنچا سکتا تھا۔ اور سردار کے حکم کی تعمیل
 بے جہن و حیرا ہوتی تھی۔ اس لئے ٹیلر نے فیصلہ کر لیا کہ ان کے سرداروں کو گرفتار کر لیا
 جائے نہ صرف اس امید پر کہ ان کو سزا دینے کے لئے کافی ثبوت حاصل کئے جائیں بلکہ زیادہ

۱۔ ٹیلر کی ”اور کراسس“ کلکتہ ۱۸۵۸ء صفحہ ۲۶-۳۶

ان کی پوری برادری کی نیک چلنی کے لئے برہمنوں کے طور پر مگر وہ ان کو کھلم کھلا گرفتار کرنے سے خائف تھا کہ کہیں گرفتاری سے مدافعت کی نوبت نہ آجائے۔ اس لئے اس نے ایک انوکھا اور غیر معمولی منصوبہ گمانٹھا۔ اس نے شہر کے معزز باشندوں کے نام ایک گنتی چھٹی جاری کر کے ان کو کسی شورش پافساد کے برپا ہونے کی صورت میں کچھ امتناعی اقدامات پر بحث کرنے کے لئے اپنی کوٹھی پر بلایا۔

قائدین وہابی تحریک کی گرفتاری: دوسرے دن ۱۹ جون کو یہ معززین حاضر ہوئے جن میں احمد اللہ محمدین اور واعظ الحق بھی شامل تھے۔ ان کے لئے کھانے کی میز کے گرد نشستیں مرتب کر دی گئیں۔ جب سب جمع ہوئے تو ٹیلر خود کپتان روڈ سے کلکٹر، صوبہ دار ہدایت علی اور کچھ اور لوگوں کے ساتھ داخل ہوا۔ مفروضہ مشاورہ شروع ہوا اور ٹیلر اس دوران میں تین مقصود شکاروں کے طرز و انداز پر متحیر تھا جنہیں ہونے والی گرفتاری کا کچھ علم تھا۔ لیکن اس نے ان کے صبر و استقلال کی تعریف کی۔ جب جلسہ کی برخاستگی کا اعلان ہوا تو ان تینوں وہابی سرداروں سے شایستگی کے ساتھ درخواست کی گئی کہ وہ اپنی جگہ پر بیٹھے رہیں۔ جب اور سب لوگ جا چکے تو ٹیلر نے اعلان کیا کہ اگرچہ ہمارے پاس آپ کے جرم کا کوئی قطعی ثبوت تو نہیں مگر میں آپ کی گرفتاری کو ضروری احتیاطی اقدام سمجھتا ہوں۔ ان مولویوں نے اس ضرب کو ایسی حیرتناک حاضر دماغی اور شائستگی کے انداز سے سہارا لیا جتنا تو تحسین ہے۔ جب وہ ایک مسکند رحمت کی حفاظت میں اس وقت کے سرکٹ ہاؤس کو لجا کر نظر بند کر دئے گئے۔ ٹیلر پھر آکر ایک دھمکی دے گیا اس نے احمد اللہ سے کہا کہ میں نے تمہارے والد اہی بخش کو جو بوڑھے اور ضعیف ہیں گرفتار نہیں کیا۔ مگر یہ بھی جتا دیا کہ تمہارے ساتھ عارضی رعایت منحصر ہوگی تمہارے ساتھیوں کی نیک چلنی پر یاد رکھو کہ کہ ان کو (اہی بخش کی زندگی تمہارے ہاتھ میں ہے اور تمہاری ان کے ہاتھ میں۔)

ٹیلر کا غلط دعویٰ: ٹیلر اپنی ان شیطانی حرکات پر فخر سے اپنی پیٹھ یوں ٹھونکتا ہے آج تک میں ان لوگوں کی نظر بندی کو سب سے کامیاب چال سمجھتا ہوں جو میں چل سکتا تھا۔

مورخوں میں ٹیلر کا فعل گرما گرم بحث کا موضوع رہا ہے۔ کسی نے اسے جنگ افغان میں اکبریا کے ہاتھوں میکناٹن کے قتل سے تشبیہ دی ہے کسی نے اسے عاقلانہ اور دلیرانہ پالیسی کا فعل قرار دیا ہے۔ ماضی کے پیش نظر یہ واضح ہے کہ محض حکومت کے مفاد کے لحاظ سے اس فعل نے وہ غرض پوری کر دی جس کے لئے اس کا ارتکاب کیا گیا۔ ان قائدین کی گرفتاری نے بے شک وہابیوں کے سرحد پر روپے کی ترسیل کا انتظام درہم برہم کر دیا جس سے وہاں سخت تنگ حالی اور مفلسی پھیل گئی۔ لیکن ٹیلر کا یہ دعویٰ غلط تھا کہ اس فعل نے وہابیوں کو ۱۸۵۷ء کی تحریک میں شرکت سے باز رکھا معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلر ان وسیع تر نظریاتی اثرات سے بے خبر تھا جن کے تحت یہ تحریک چل رہی تھی۔ جس بات کو وہ سمجھ نہ سکا وہ یہ تھی کہ اگر احتیاطی نظربندی عمل میں نہ آتی جب بھی وہابیوں کا طرز عمل وہی رہتا۔ اس معاملے میں وہابیوں کا عمل سطحی و شخصی مصالح کی بجائے اصول کی عمیق تر نظر سے تھا۔

وہابیوں کی غیر آئینی نظربندی معلوم ہوتا ہے کہ ٹیلر اس خیال خام میں مبتلا تھا کہ وہابیوں کے قائدین کی احتیاطی نظربندی اور ساتھ ہی آلہی بخش کو صاف صاف دھمکی ہی نے اس نازک وقت میں وہابیوں کو روک رکھا۔ وہابیوں کے اس غیر آئینی نظربندی کو جائز قرار دینے کے لئے ٹیلر نے یہ دلیل پیش کی کہ اس عمل نے احمد اللہ کے والد آلہی بخش کو پیر علی کی متوقع شورش کے متعلق مفامی مجسٹریٹ کو اطلاع دینے پر مجبور کیا مگر اس میں ٹیلر واقعات کے قصداً چھپانے اور غلط تعبیر کرنے کا مجرم تھا۔ ان تمام چھٹیوں میں جو اس نے اس زمانہ میں لکھیں وہ یہی کہتا رہا ہے کہ اطلاع احمد اللہ کے والد آلہی بخش نے دی تھی، اس کے بعد اس موضوع پر ایک حالیہ مصنف نے اس غلط الزام کا اعادہ کیا ہے

اصلی مجرم: مگر اس واقعہ کا اصلی اطلاع دینے والا ٹیلر کے پاس نہیں پٹنہ کے مجسٹریٹ لویس کے پاس آیا تھا اور اس کا بیان مجسٹریٹ سے لکھ لیا تھا جو یہ ہے: "آلہی بخش ولد صفدر علی ساکن موضع دروہ، تھانہ بارٹھ، یکم جولائی ۱۸۵۷ء کا بیان، پیر علی خاں کتب فروش علاقہ تھانہ خواجہ کلاں کے گھر میں اسکو اور آدمی جمع کئے گئے ہیں۔ مجھے مولوی آلہی بخش (والد احمد اللہ) نے یہ اطلاع دینے کو بھیجا ہے۔ انھوں نے یہ بعض لوگوں سے سنا ہے جن کے نام میں نہیں

جانتا "اے اس طرح ظاہر ہے کہ اصل مخبر ایک لڑکا کلمسٹی آہی بخش ساکن بارٹھ تھا جس نے کہا کہ میں آہی بخش کے پاس سے آیا ہوں جو احمد اللہ کے بوڑھے ضعیف باپ تھے۔ ہمارے پاس اس لڑکے کے اس بیان کی تصدیق کے لئے کوئی دلیل نہیں کہ وہ واقعی اپنے ہم نام کا بھیجا ہوا تھا۔ لڑکا بارٹھ کا باشندہ تھا اور صنادیقہ کے آہی بخش سے اس کا کوئی واسطہ نہیں۔ بہت ممکن ہے کسی کے اپنے مخالف یا دشمن کے خلاف غلط الزامات عائد کر کے پھینسانے کا معاملہ ہو۔ ایسے طلسماتی اور چھوٹے الزامات کی اس زمانہ میں پٹنہ کی نقاب میں بہتات تھی۔

سرکاری گوبندوں کی حرکات نتیجہ: اس زمانے میں معزز باشندوں کے خلاف جن سے بے ایمان گوبندے روپے اینٹھنا چاہتے، جھوٹے اور بے سرو پا الزامات اور جوابی الزامات کے متعلق پٹنہ کے مجسٹریٹ کا کہنا ہے "میں نے تمام گوبندوں اور ان کی خفیہ اطلاعات کو صرف آپ کے گوبندے سے فریب کھا کر ناقابل اعتماد قرار نہیں دیا بلکہ مجھے بعد میں اس گوبندے کے جو کثوت معلوم ہوئے ان سے بھی میری اس بے اعتمادی کی تائید ہوئی ہے۔ یہ گوبندہ آپ کا پروانہ لیکر شہر کے بہت سے معزز ہندوں اور دوسرے لوگوں سے ریش و رسول کرتا پھرتا تھا ایسے اختیارات عارضی طور پر سہی بے ایمان آدمیوں کے ہاتھ میں دے دینے سے بڑا فساد ہوتا رہا ہے۔" یہ مجسٹریٹ ٹیلر کے ایک اور گوبندے کا حوالہ دیتا ہے جس نے اُسے (مجسٹریٹ) کو دھوکا دیکر ۲۰ جون ۱۸۵۷ء کو ایک وہابی مونی کے گھر کی تلاش کرانی جہاں سے سخت تلاش کے بعد کچھ بھی نہ ملا۔ مجسٹریٹ کو بعد میں معلوم ہوا کہ گوبندہ مذکورہ ایک امین تھا جس نے وہابی مذکور سے پانچ روپے کا ناجائز مطالبہ کیا تھا اور اس نے دینے سے انکار کیا تھا۔

ایک اور معاصر افسر، ٹیلر کا جانشین کمشنر بھی اس موضوع پر یہ معنی خیز تبصرہ کرتا ہے۔ وہ لکھتا ہے "اس ملک میں گوبندے بے گناہ آدمیوں کو ملزم ٹھہرا دینے کی دھمکی دیکر روپے اینٹھنے میں

لے دفتر ڈویژنل کمشنر ٹیلر کاغذات بعد میں جے ٹیس مجسٹریٹ پٹنہ کی جٹی میں ٹیلر کمشنر پٹنہ کے نام سے ۲۰ جولائی ۱۸۵۷ء ٹیلر نے اس موضوع پر اپنی ایک جٹی میں آہی بخش گوبندے کے لئے یہ لفظ استعمال کیا پس ظاہر ہے کہ آہی بخش احمد اللہ کا باپ نہیں ہو سکتا تھا جو بہت بوڑھے تھے۔

لے ٹیس کی جٹی محوہ بالا۔

شدید ہو جاتا ہے جب ہم دیکھتے ہیں کہ ٹیلر نے جان بوجھ کر اس عجیب اتفاق سے کام لیا کہ اصل گویندہ کا نام بھی الہی بخش تھا، مجسٹریٹ نے اپنی منقولہ بالا جھٹی میں خاص طور پر ٹیلر کی توجہ (خلط ملط سے بچنے کے لئے) اس امر کی طرف معطوف کی ہے کہ اصلی گویندہ کا اور اس شخص کا جس کی طرف سے اطلاع منسوب کی جاتی ہے، نام ایک ہی ہے۔ پھر بھی ٹیلر اس نام کو ہر موقع پر احمد اللہ کے والد کے نام سے ہی چلاتا رہا۔ بین طور پر وہ یہ حرکت احمد اللہ اور دوسرے لوگوں کو گرفتار کرنے کا جواز ثابت کرنے کی فضول کوشش میں کرتا رہا۔

دہائیوں کی سیاسی بصیرت: جیسا کہ پہلے کہا جا چکا دہائی تحریک نہایت اجتماعی مرکزی تھی جو خاص اصول کی بنا پر چلتی تھی۔ ایک طرف سرحد اور دوسری طرف بہار اور نیگال دو دھڑے تھے جن پر یہ گاڑی چلتی تھی۔ ان میں سے ہر ایک کے ذمہ الگ الگ کام تھے جن کی سمجھتی سے پابندی کی جاتی تھی۔ ہندوستان کے اندر کے مرکزوں کا اصل کام آدمی اور دیے فراہم کرنا اور ان کو سرحد پر بھیجنا تھا۔ دہائی قائدین نے اپنی اعلیٰ سیاسی دانائی سے یہ بات سمجھ رکھی تھی کہ اگر ہندوستانی مرکزوں کی جدوجہد زیادہ نمایاں طور پر انجام دی گئی تو قدر کا حکومت ان کو کچلنے کے اقدامات کریگی اور اس طرح ان کے آدمیوں اور ذخائر کی فراہمی کا راستہ ہی کٹ جائیگا۔ یہ ہے وہ اساسی منطق جو بظاہر اس متضاد مظہر کی نشتر کے زناویل کر دیتی ہے کہ یہاں دہائیوں کا ایک گروہ عنایت علی کے زیرِ نگرانی ۱۸۵۲-۵۸ء میں سرحد پر مشرف جنگ تھا وہاں ان کے ہم وطن ہندوستان اور بالخصوص بہار میں خاوش رہے۔ اس زمانہ میں مرکزیت کے سردار عنایت علی کے چھوٹے بھائی فرحت حسین تھے اور ان کے بیٹوں کے ساتھ ان کا برتاؤ ان کے بڑے بھائی کے برتاؤ سے مختلف نہ تھا۔ انھوں نے بھائیوں کے مختلف بیٹوں کو مل لیا اس کا سبب تنظیم کی آہنی تربیت و نادیب تھا جس نے ان کو مختلف فوجی سرزبانوں پر توجہ دینے سے سختی سے پابند رکھا۔ واقعات کے پیش نظر ماننا پڑتا ہے کہ دہائیوں کے سیاسی صورت حال کا جو اندازہ لگایا جاتا ہے صحیح تھا۔ اگر دہائی بہار میں عنایت علی کے لئے اٹھ کھڑے ہوتے تو وہ بھی چل دینے جاتے اور پھر کیا اس سے بہت پہلے ختم ہو چکی ہوتی جب کہ واقعی ختم ہوئی۔

دہائیوں کے سیاسی اور فوجی حالات کے متعلق دہائیوں کے بڑے بھائیوں کے لئے ایک شدید طور پر ناپسندیدہ واقعہ یہ ہے کہ ان کے بھائیوں کی

طرح برقرار رہا اور کام کمرتا رہا اور ۱۸۶۳ء کے غزوہ امبیلہ میں جب کہ دہلیوں نے سب سے شدید جنگ کی پیش بہا خدمات انجام دیں اگر دہلی بہار میں ۱۸۵۶ء میں وہ نہ کرتے جو کیا تو ۱۸۶۳ء کا معرکہ امبیلہ وقوع پذیر نہ ہوتا۔

مگر اس طرح پختہ مرکزہ کو زندگی کا جو نیا پٹا ملا وہ بہت مختصر تھا۔ سچ یہ ہے کہ تمام ماوی سہارے کے نئے دہلیوں کا ہندوستان کے مرکزوں پر کامل انحصار ہی تحریک کی سب سے بڑی کمزوری تھی۔

۱۸۵۶ء کی تحریک میں دہلیوں کی حکمت عملی: ۱۸۵۶ء کی تحریک کے حالیہ مورخین میں

صرف ڈاکٹر ڈی این سین اور ڈاکٹر آر سی محمود نے یہ معنی خیز نکتہ پیش کیا ہے کہ دہلیوں نے من حیث الجماعت اس "بغاوت" کا ساتھ نہیں دیا۔ اگرچہ دہلیوں کے مرکزہ بہار کے متعلق یہ صحیح ہے (جس نے اپنے بعض اسامی پالیسی کی بنا پر ایسا کیا جس پر اوپر بحث ہو چکی)۔ مگر ان دونوں مورخین نے یہ عمومی اظہار رائے کیا ہے جو تمام دہلی مرکزوں پر منطبق ہوتا ہے۔ انہوں نے یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ اگر سرحد اور پنجاب میں بغاوت کے سرغنہ کے ساتھ اپنی قسمت وابستہ کر لینے کا فیصلہ کر لیتے تو لارنس کے لئے پنجاب کو یورپی سپاہ سے خالی کرنا مشکل ہو جاتا۔ ۱۸۵۶ء میں عنایت علی کی متذکرہ بالاکاروائیوں سے ہمیں معلوم ہو چکا ہے کہ وہ کچھ یوں ۱۷۰۱ (دسی فوج) کے سپاہیوں سے مل گئے تھے جو بھاگ کر سرحد پار چلے گئے تھے۔ ان کو پناہ دی اور ان کے دوش بدوش سرحد میں کتنی لڑائیاں لڑے۔ یہ کہنا صحیح نہیں کہ ۱۸۵۶ء کے نازک دور میں دہلیوں نے انگریزوں سے بالکل نہیں لڑے۔ یہ صحیح ہے کہ وہ اس تحریک کے سرغنہ اور سرداروں سے نہیں ملے مگر عنایت علی کے زیرک ان کی سرحدی جماعت اس زمانے میں انگریزوں سے برابر لڑائی کی ہے۔ مگر جہاں انگریزوں نے اپنے افضل اور بہتر منظم وسائل سے تمام شمالی ہند میں بغاوت کے منتشر مرکزوں کے صلج کا مقابلہ کیا وہاں ایک اور پریشانی کا بھی مقابلہ کرنا انگریزوں کو اپنے ہندوستانی غنیم پر وہ مادی اور فنی برتری حاصل تھی کہ دہلیوں کی کاروائیوں سے اسے کوئی مادی ضرر نہیں پہنچ سکتا تھا۔ ڈاکٹر سین کا متذکرہ خیال اس معنی میں اہم صحیح معلوم ہوتا ہے کہ اس نازک وقت میں اگر پورا پنجاب انگریزوں کے خلاف اٹھ کھڑا ہوتا۔

تو یہی نہیں کہ لارنس پنجاب کی فوجوں کو حکم نہ دے سکتا بلکہ تحریک کی تاریخ کچھ اور ہوتی۔ مگر سارا پنجاب وہابیوں کے زیر اثر خطہ بن گیا تھا اور وہابی عام اہل پنجاب کے طرز عمل کے ذمہ دار نہیں قرار پا سکتے۔ دوسری طرف یہ سکھوں کا طرز عمل تھا (گو رکھا کو چھوڑ کر) جس نے اس کشمکش کو اس انجام پر پہنچایا۔

۱۸۵۶ء کی تحریک میں اہل پنجاب کی عدم شمولیت ۱۸۵۶ء کی تحریک سے اہل پنجاب کے عام احترام کے اسباب متعدد اور مختلف تھے۔ طرح طرح کے اغراض و مقاصد نے جو اکثر ایک دوسرے کے متضاد تھے آبادی کے سرکردہ طبقوں، سکھ، ہندو، مسلمان کو اس نازک وقت میں خاموش رکھا۔

سکھ سپاہ کو "پوریہ سپاہیوں" کے خلاف جو صرف دس سال پیشتر انگریزوں کے ہاتھوں سکھ فوج کی تباہی میں آلا کارہ چلے تھے، لارنس کی شاطرانہ چال کا ذکر کیا جا چکا ہے اور سکھوں کے طرز عمل میں بھی اسی کا کچھ دخل تھا۔

ڈاکٹر سین لٹنٹ گورنر بنگال کے نام اس کی ایک روداد مورخہ ۳۰ ستمبر ۱۸۵۸ء میں اس کا یہ قول بھی نقل کرتا ہے کہ "کسی زمانہ میں وہابیوں کے خلاف نہ کچھ ثابت نہ کوئی الزام عائد کیا گیا" لٹنٹ گورنر کا یہ قول صرف گمراہ کن ہی نہیں بلکہ اس کا پچھلا فقرہ قطعی غلط ہے۔ یہ واضح کیا جا چکا ہے کہ ۱۸۳۹ء سے اور زیادہ خصوصیت سے ۱۸۵۲ء سے ہزارہ، اٹلہ، ران شاہی جیسی جگہوں سے مقامی حکام صوبائی حکومتوں نیز حکومت ہند کی توجہ سرحد پر ہندوستان کے مہاجرین کے ایک بڑے آشیانے اور ملک کے اندران کی باغیانہ جدوجہد کی طرف منعطف کرتے رہے ہیں۔ مقامی حکام کے خدشات کی طرف اعلیٰ حکام نے زیادہ اعتنائے کی۔ بہر حال یہ بات قابل ذکر ہے کہ خود لٹنٹ گورنر بنگال نے ۲۶ اگست ۱۸۵۲ء کو ایک روداد میں لکھا تھا کہ "پٹنہ کے آدمیوں اور ستھانہ اور سوات کے مذہبی ریوانوں کے درمیان مراسلت کا سلسلہ موجود ہے۔ اور یہ کہ جو جماعتیں ان میں ملوث ہیں ان کی حرکات و سکنات پر نظر رکھنا مناسب ہے" ان بیانات کے مقابلے میں یہ خیال کہ وہابیوں کے خلاف کوئی لہان اغراض و مقاصد کی تفصیل کیلئے ملاحظہ ہو بغاوت عظیم، مولفہ تلیمند خدوئا "بیلیں" ایک مجلس مذاکرہ ۱۹۵۰ء

الزام عائد ہی نہیں کیا گیا عجیب بات ہے۔ واقعہ یہ ہے کہ شروع میں اعلیٰ حکام نے وہابیوں کی کارروائیوں کے متعلق اطمینان کا عجیب انماض کا رویہ رکھا۔ واقعات کی سنگین اور اٹل منطق نیز غزوہ امبیلہ میں انگریزی فوج کی زبردست پٹائی نے بعد میں ان عالی مرتبت حکام کی آنکھیں خطرے کی واقعی حد و غایت اور شدت کی طرف سے کھول دیں۔

وہابی تحریک کے متعلق ایک غلط خیال: ایک غلط خیال عام طور پر پھیل گیا کہ اگر یہ سمجھ لیا جائے

کہ وہابی برطانوی ہند اور خصوصاً بہار میں من حیث الجماعۃ ۱۸۵۷-۵۹ء کی تحریک سے الگ رہے تو یہ تحریک کے مخالف انگریز اصول کے خلاف ہوگا۔ یہ عجیب گمان دوہرے منطقی مغالطے پر مبنی

ہے۔ اولاً یہ فرض کر لینا پڑتا ہے کہ بہار کے وہابی پوری جماعت سے مختلف لوگ تھے اور

یہ کہ پوری تحریک کا طرز عمل صرف ۱۸۵۷-۵۹ء میں ان کے رویہ کی بنا پر کرنا چاہئے (مقدمہ کبریٰ)

ثانیاً یہ کہ انگریزوں کے خلاف کشمکش میں انھوں نے کوئی حصہ لیا ہی نہیں (مصدقہ صغریٰ) دونوں

قضیے صریحاً بالکل غلط ہیں۔ اور تمام صوبوں کی طرح بہار کے وہابی بھی ایک وسیع و ہمہ گیر گل کے

جزو لادمی تھے۔ اور وہ سب کے سب ایک مرکزی نقشے کے مطابق کام کر رہے تھے۔ ایک

ایک ہی قسم کے لوگ اخوت کے سخت بندھن میں بندھے ہوئے بہار اور سرحد دونوں جگہوں

میں کام کر رہے تھے، بلکہ ایک ہی اشخاص، مثلاً برادران علی، سیدی علی، فیاض علی اور دوسرے

باری باری دونوں جگہوں میں کام کرتے رہے۔ انگریزوں کے حق میں بہار کے وہابی سرحد کے

وہابیوں سے زیادہ نرم نہ تھے۔ دونوں گروہوں نے اپنے اپنے مرکزوں میں حالات کے

مطابق جنگ جاری رکھی جیسا کسی کی بعض بنیادی اصول کی بنا پر بہار میں سرحد کی سی کھلم کھلا

جنگ تو ممکن نہ تھی لیکن زیادہ زبردست مادی وسائل، شاندار نہ سہی مگر جانفزا اور قوت بخش، کی

فراہمی بے روک جاری رہی۔

ہم میں سے اکثر اشخاص کسی ہم انداز کے قطارہ راں کے کارناموں کو تعجب کی نظر سے دیکھتے

ہیں جو کسی ہم انداز می کی ڈیوٹی پر دشمن کی سز میں پر حیرت انگیز پرواز کرتا ہے اور اس کے فخر و ناز و تحسین و

آفریں میں شریک ہو جاتے ہیں۔ مگر ہم میں سے کتنے ہیں جو زمینی فوج کے ان افراد کی لگاتار محنت و

مشقت کی طرف کوئی دھیان دیتے ہوں جن کی خاموش گو غیر دلچسپ کار گزاروں کے بغیر

ایسی پروازیں ممکن نہیں؟ اگر زمینی سپاہی اپنے کاموں میں کسی ادنیٰ سے بخزردی کام میں غفلت برتتے تو کام کا بالکل ٹھپ ہو جاتا تو الگ رہا طیارہ راں اور اس کا بلند پرواز طیارہ کہاں ہوتے؟ پٹنہ کے مرکز کا کام بھی ایسا ہی تھا۔

قائدین پٹنہ کا ایثار و استقامت: ان دو مختلف قسم کے کاموں کی جدا جدا صفات بیان کرتے ہوئے مہر لکھتے ہیں اس میدانِ عمل (تنظیم و ترسیل) کی مصہبتیں کسی طرح میدانِ جنگ کی آزمائشوں سے کم نہ تھیں۔ بلکہ اس کے برعکس میں تو کہہ سکتے ہیں کہ میدانِ جنگ کی لہکتی ہوئی آگ میں گر کر فوراً مر جانا دائمی پریشانیوں اور ہر وقت کے خطرات کے طویل اور غیر مختتم دنوں کے طویل مسرت رفتار گھنٹوں میں بسر کرنے سے سہل تر ہے۔ ان جنگ آوروں (قائدین پٹنہ) نے گھر بار سے دور زندانوں کے تاریک تہ خانوں اور جزائرِ اندمان کے ہولناک ویرانوں میں ایک دوسرے سے دائمی مفارقت کے دن اس طرح گزارے ہیں کہ مرنے کے بعد بھی ان بھائیوں (احمد اللہ و یحییٰ علی) کے ساتھ اتنی سی رعایت بھی روانہ رکھی گئی کہ ان کی قبریں ایک جگہ پر ہوتیں۔ باایں ہمہ نہ ان کے عزم میں تزلزل ہوا نہ ان کے قدم لڑکھڑائے۔“

خاندان صادق پور کا کارنامہ: یہ قابل توجہ حقیقت ہے کہ نصف صدی سے زیادہ ایک زبردست غیر ملکی حکومت کے خلاف ایک زوردار تحریک کی قیادت کا عملاً سارا بوجھ ایک واحد خاندان اہل صادق پور نے اٹھایا۔ انھوں نے محاربین و غیر محاربین دونوں کے کاموں کی نگرانی کی اور دونوں مرکزوں میں کام کئے۔ اور یہ سب کچھ انھوں نے اُس زمانے میں کیا جب کہ انھیں کے بہت سے ہوطنوں کی طرف سے تعاون درکنار، قدر دانی کی بھی کوئی امید نہ تھی۔ یہ ہے ملک کی آزادی کے لئے ان کے خود فراموشانہ جوش اور قربانیوں کے جانچنے کا حقیقی معیار۔

۱۔ مہر جدم ۲ صفحہ ۲۷۲۔ عبارت منقولہ اصل متن کا انگریزی ترجمہ تھی (جس کا یہ دوبارہ اردو ترجمہ ہے) (دمترجم)

باب

۱۸۶۳-۶۵ء میں کچھ وہابیوں پر سرکاری مقدمات

ایک گذشتہ باب میں بتایا جا چکا ہے کہ آدمی اور روپے کی تحصیل اور سرحد شمالی و مغربی میں ان کی ترسیل اندرون ملک میں وہابی مرکزوں کا اصل کام تھا۔ اس قیمتی امداد کی مسلسل و مستقل روانی ہی نے سرحد پر وہابیوں کی بدو جہد قائم رکھی و تنہا وقتاً متعدد مقامی افسران وہابی مرکزوں اور ان کے ناظموں کی خطرناک اور باغیانہ کاروائیوں کی طرف توجہ دلاتے رہے تھے مگر حکومت نے ان بروقت تنبیہوں کی طرف کوئی اعتنا نہیں کیا۔ وہابیوں یا ان کے قبائلی حلیفوں کے خلاف سرحدی مہموں نے بالخصوص معرکہ امبیلہ میں انگریزی فوج کی ہزیمت نے اعلیٰ حکام کو جھنجھوڑ کر وہابیوں کی سازشوں کے گھونسلوں یعنی ملک کے اندران کے مرکزوں کے ساتھ اپنے طرز عمل کے احساس کو زیادہ بیدار کر دیا۔ ہندوستان میں وہابی مرکزوں کی خطرناک طاقت اور ساتھ ہی کچھ اتفاقی واقعات کے بڑھتے ہوئے احساس ہی کا نتیجہ تھا ملک میں کچھ سربراہان و وہابی قائدین کے خلاف سرکاری مقدمات کا سلسلہ ان میں مقدمات انبالہ اور ٹیٹنہ اولین اور اہم ترین تھے۔

(۱) ۱۸۶۳ء کا مقدمہ انبالہ

واقعات کا وہ سلسلہ جو مقدمہ انبالہ تک پہنچا اردو ستمبر ۱۸۶۳ء کو ضلع انبالہ کے شہر تھانیر کے ایک لمبر دار محمد تنفر کی گرفتاری سے شروع ہوا۔ یہ گرفتاری ایک اتفاقی واقعہ کا نتیجہ تھی جو کئی ماہ لہ لمبر دار چھوٹے شہر کاکی مالیات کا نمائندہ ہوتا تھا جو اس شہر کی طرف سے حکومت کے اعلیٰ افسران مالیات سے تعلق رکھتا

قبل وقوع میں آیا تھا۔ مئی ۱۸۶۳ء میں چوکی پانی پت ضلع کرنال میں ایک پٹھان پولیس سارجنٹ غزان خاں نے چند آدمی دیکھے تھے جن کے قیافوں سے معلوم ہوتا تھا کہ وہ گریڈ ٹرنک روڈ (شاہ فیروز شاہ) سے آنے والے مشرقی صوبوں کے لوگ ہیں۔ سرجنٹ کے جذبہ تجسس کو حرکت ہوئی اور ان سے پوچھا کہ کہاں جا رہے ہیں۔ اس کو بتایا گیا کہ وہ بنگال سے آرہے ہیں اور حکومت برطانیہ سے جنگ کرنے کو سرحد جا رہے ہیں۔ انہوں نے سرجنٹ کو دعوت کی کہ وہ بھی ان سے مل جائے مگر اس نے ان کو فوراً گرفتار کر کے مقامی حکام کے سامنے پیش کر دیا۔ مقدمہ کی سماعت کٹر اسٹنٹ کمشنر انبالہ کی عدالت میں ہوئی۔ اس نے فیصلہ کیا کہ گرفتار لوگ واقعی مسافر ہیں اور ان کی رہائی کا حکم دیا۔ غزاں خاں نے اس رہائی کو اپنی خفت کا موجب سمجھا۔ اور اپنے الزام کی صحت ثابت کرنے پر تل گیا۔ اس نے اپنے بیٹے کو سرحد کے مرکز پر جانے، اس میں شریک ہونے اور وہاں دہائیوں کی کارروائیوں کے متعلق جو کچھ معلومات حاصل کر سکے فراہم کرنے پر متعین کیا۔ فرمانبردار لڑنے کے لیے یہ کام بوجہ حسن انجام دیا۔ وہابی ریاست سے ٹوٹ کر اس نے رپورٹ کی کہ تمام ہندوستان سے سرحد کے لئے آدمی اور روپے کی فراہمی کا ایک وسیع جال پھیلا ہوا ہے، ان میں سے تھانیس بھی ایک اہم کوٹھی ہے اور جعفر اس کے منتظمین اعلیٰ میں سے ہے۔

مہر اس بات پر زور دیتے ہیں کہ غزاں خاں کی منقسمانہ کارروائیاں معرکہ امبیلہ سے بہت پہلے سے شروع ہو چکی تھیں۔ وہ بتاتے ہیں کہ جعفر کے بیان کردہ واقعات سے مترشح ہوتا ہے کہ وہ غزوہ امبیلہ کے شروع ہونے سے پہلے وقوع پذیر ہو چکی تھیں۔ گویہ صحیح ہے کہ وہابی رضا کاروں کی گرفتاری بہت پہلے عمل میں آچکی تھی مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ یہ غزاں خاں کا ذاتی فعل تھا اور حکومت سے اس کا کوئی واسطہ نہ تھا۔ حکومت نے اس مقدمے کی باقاعدہ تحقیقات اکتوبر نومبر کے لگ بھگ شروع کی تھی جب کہ اہرکاری فوجیں درہ جیلا میں بتلائے آگت تھیں البتہ فوجی صورت حال کی نزاکت نے ان تحقیقات کو اہمیت ضرور دے دی۔ ہنٹر بھی یہی رائے رکھتا ہے کہ ۱۸۶۲ء کا مقدمہ ۱۸۶۳ء کی مذہبی جنگ کا قدرتی نتیجہ تھا۔

۱۸۶۲ء کا مقدمہ ۱۸۶۳ء کی مذہبی جنگ کا قدرتی نتیجہ تھا۔ (باقی صفحہ ۲۶۶ پر)

جعفر تھا نیسری: غزان خاں نے وہ ساری اطلاعات حکومت کو پہنچا دیں جو اس کا بیٹا لایا تھا۔ حکومت پنجاب نے تفتیش شروع کر دی۔ اور سپرنٹنڈنٹ پولیس، پارسن نے ۱۲ دسمبر ۱۸۶۳ء کی صبح کو ٹھانیسر میں جعفر کے گھر کا محاصرہ کر لیا۔ اس نے اسی وقت اور اسی جگہ گھر کی تلاشی پر اصرار کیا جعفر کے گھر سے کچھ خطوط برآمد ہوئے جن میں انبالہ کے ایک ٹھیکیدار گوشت محمد شفیع اور انبالہ کے دوسرے ٹھیکیداروں اور پٹنہ کے کچھ آدمیوں کے نام برآمد ہو گئے۔ اگرچہ بہت سے موز خطوط کا پورا مطلب حکام کو بعد میں معلوم ہوا۔ ان تمام مقامات کے پولیس انسپکٹروں کو تار سے حکم دیا گیا کہ کل مشتبہین کے گھروں کی تلاشی لی جائے اور ان کو گرفتار کر لیا جائے۔ ہزاری باغ کے ایک عبد العفور اور ایک بنگالی لڑکا بھی جو جعفر کے گھر میں موجود تھے اسی رات گرفتار کر لئے گئے۔ تعجب ہے کہ خود جعفر اُس رات گرفتار نہیں کئے گئے اور اس موقع سے فائدہ اٹھا کر انھوں نے فرار کرنے کا دلیرانہ ارادہ کر لیا۔ چنانچہ اسی رات وہ انبالہ سے نکل بھاگے اور پانی پت کے راستے سے دلی چلے گئے۔ دلی میں وہ اپنے ایک ہم پیشہ بشیر الدین کے ہاں ٹھہرے۔ وہاں ان کو پٹنہ کے دو شخص حسینی اور عبداللہ عرف معظم سردار ملے جو پٹنہ سے سرحد کو اشرافیاں لے جا رہے تھے۔ جعفر نے حسینی سے رقم لے لی اور اس نام کے ایک دوسرے شخص باشندہ تھا نیسری کو دے دی اور اسے ہدایت کر دی کہ اُسے سرحد پہنچا دے جعفر خود پٹنہ کے حسینی اور عبداللہ کے ہمراہ مشرق کی طرف سفر پر چل پڑے۔

..... اس دوران میں شفیع اور اس کا بھتیجا عبدالکریم انبالہ میں گرفتار کر لئے گئے۔ دوسری شام (۱۳ دسمبر) کو جب پارسن جعفر کے گرفتار کرنے تھا نیسری پہنچا تو اسے ان کے فرار کرنے کی خبر ملی۔ اس نے فوراً جعفر کے خاندان اور رشتہ داران پر دہشت کا مہینہ برسا دیا۔ ان کو خوب مارا پٹیا اور آبروریزی کی۔ جعفر کے چھوٹے بھائی سے یہ معلوم کر کے کہ وہ

(بقیہ حاشیہ صفحہ ۲۶۵) ————— تعیناتی وہاں اس کے

قیام و مراجعت میں کچھ وقت صرف ہوا گا۔ چنانچہ جعفر کی گرفتاری ۱۱ دسمبر کو وقوع میں آئی اور باقی تحقیقات شروع ہوئی۔ ۱۵ اور انڈین مسلمان صفحہ ۶۴

دہلی فرار ہو گئے پارس فوراً ان کے چھوٹے بھائی کو ساتھ لیکر دہلی روانہ ہو گیا۔ دہلی میں بھی چند گھنٹوں کے فرق سے اس نے جعفر کو ہاتھ سے کھو دیا وہ بڑک سے کوئل (علی گڑھ) جا چکے تھے۔ جعفر کا کھوج لگانے کے لئے علی گڑھ برقی پیغام بھیجے گئے۔ وہ اور ان کے رفقاء وہاں گرفتار کر لئے گئے اور انبالہ واپس لائے گئے۔ حسینی تھانیسری بھی جسے جعفر نے اشرفیاں سرحد لے جانے پر تعینات کیا تھا راستے میں تھانیسر کے تحصیل صدر مقام پپلی میں گرفتار کر لیا گیا حکام سازش میں ملوث پنجاب والوں کو گھیر کھڑے پٹنہ والوں کو گھیرنے کی طرف متوجہ ہوئے۔

الہی بخش اور محی الدین: جعفر کے گھر سے جو کاغذات ضبط ہوئے تھے ان میں پٹنہ کے دو دیوبند الہی بخش اور محی الدین کے لکھے ہوئے دو خط بھی تھے۔ پٹنہ کا حسینی جب جعفر کے ساتھ گرفتار ہوا تھا تو اس نے یہ بیان بھی دیا تھا کہ الہی بخش مذکور نے اسے ڈھائی ہزار کی ہنڈی ایک شخص علاء الدین دہلی کے کفش سازا کے پاس جمع کرنے کو بھیجا تھا۔ دوسرا حسینی تھانیسری جو پپلی میں گرفتار ہوا تھا اس کے جسم پر سے بھی کچھ اشرفیاں برآمد ہوئی تھیں ان اشرفیوں کی تعداد ٹھیک وہی تھی جو تھانیسر میں گرفتار ہونے والے عبدالغفور کے نام محی الدین کے خط میں درج تھی۔ اس محی الدین کی شناخت بعد میں متعین ہو گئی۔

الہی بخش: — پنجاب پولیس نے الہی بخش کے گرفتار کرنے کے لئے پٹنہ کے حکام کو خفیہ اور ضروری خطوط کا ایک طومار بھیجا۔ شروع میں اس الہی بخش کی شناخت میں کچھ پیچیدگیاں تھیں۔ پنجاب پولیس نے جو تفصیلات دی تھیں وہ ان معلومات سے پوری مطابقت نہ رکھتی تھیں جو پٹنہ کے مجسٹریٹ کو مہیا کی گئی تھیں۔ مجسٹریٹ نے ۱۸ دسمبر کو احتیاطاً ایک سوداگر یا پوش مسمی الہی بخش کے گھر کی تلاشی بھی لی جو شہر میں رہتا تھا اور جو کچھ کاغذات تھے ضبط کر لئے۔ تحقیقات سے مجسٹریٹ کو معلوم ہوا کہ الہی بخش کریم بخش کا بیٹا تھا اور وہ بھی زندہ تھا۔ وہ ندر کے وقت مفوک الحال دہلی گیا تھا اور کچھ عرصہ کے بعد وہ لٹمنڈ لوٹا اور مجسٹریٹ پٹنہ سٹی میں ایک جوتے کی دوکان قائم کی۔ وہ مختلف مقامی مہاجنوں سے قرض لیکر دہلی سے جوتے درآمد کرتا اور منافع میں وہ خود اور مہاجن

۱۷ خطوں کی موز زمان میں اشرفیوں کو ۱۹۴۱ بڑے پتروں اور ۹۶ چھوٹے پتروں سے تعبیر کیا گیا تھا اور حسینی کے کوٹ میں جو اشرفیاں سلی ہوئی تھیں وہ انھیں تعدادوں میں پائی گئیں۔ یہ ایک کاغذ میں کسکے باندھے ہوئے تھیں تاکہ جھنکار نہ ہو۔

برابر برابر کے حصہ دار ہوتے۔ پٹنہ کے مجسٹریٹ جیمز الکنز نیڈرنے اسے گرفتار کر لیا اور پانچ پانچ ہزار کی دو ضمانتیں طلب کیں۔ اس کے فوراً بعد پنجاب کے حکام نے تار سے اطلاع دی کہ پارسی تحقیقات کے لئے پٹنہ جا رہا ہے۔ چنانچہ ۱۰ جنوری ۱۸۶۲ء کو وہ پٹنہ پہنچا۔

خاندان صادق پور کی خانہ تلاشی الہی بخش کے گھر سے بہت سے خطوط برآمد ہوئے جن سے ظاہر ہوا کہ الہی بخش نے حسینی کی معرفت وقتاً فوقتاً جعفر اور علی میں مختلف اشخاص کو جوئے اور دوسرے سودے خریدنے کو متفرق رقوم بھیجی تھیں۔ ان کاغذات میں ایک خط یحییٰ علی صادق پوری کا نغز الدین ساکن آرہ کے نام ملا جس سے سب سے اہم انکشاف ہوا۔ اس خط کا خط (طرز تحریر) مجسٹریٹ ہی تھا جو مذکورہ بالا عبدالغفور کے نام محمد الدین کے خط کا تھا اس سے ثابت ہو گیا کہ محمد الدین کوئی اور شخص نہ تھا بلکہ خود یحییٰ علی تھے جو "پوری جماعت کے سردار اور بڑے صاحب اثر تھے" اس لئے اب تحقیقات صادق پور کی طرف مڑ گئی۔ ۲۱ جنوری کو الیکز نیڈر اور پارسی نے ایک مسلح فوجی ٹولی کے ساتھ صادق پور کے مکانات پر دھاوا کیا اور احمد اللہ اور یحییٰ علی کے گھر کی تلاشی لی۔ احمد اللہ لفٹنٹ گورنر کے ایک جلسہ میں شرکت کیلئے کلکتہ چلے گئے تھے۔ تمام کاغذات، مسودات اور یہی کھاتے جو کچھ بھی گھر میں ملے سب ضبط کر لئے گئے۔ عبدالرحیم پر بھی صبح سے شام جرعی سوالات ہوتے رہے۔

عبدالرحیم اور عبدالغفار کی گرفتاریاں؛ ایک شخص عبدالغفار جو گھر میں موجود تھا اس نے استفسار کے جواب میں بتایا کہ وہ عبدالرحیم کا ملازم ہے۔ اس سے بھی سوالات کئے گئے اس نے بیان کیا کہ "میرے آقا عبدالرحیم میرے نام سے الہی بخش کے ساتھ لین دین کیا کرتے تھے"۔ الہی بخش کا کھانا دیکھنے سے ظاہر ہوا کہ عبدالغفار نے الہی بخش کے پاس اپنی جمع کی مد سے بڑی بڑی رقمیں نکالی تھیں۔ یہ شبہہ عائد کیا گیا کہ بر آوردہ رقوم جن کے خرچ کا کوئی حساب نظر نہ آیا جعفر کی معرفت سرحد پہنچے گی نہیں، عبدالرحیم کے گھر سے ایک خط کا مسودہ برآمد ہوا جس سے اور باتوں کے ساتھ بعض آدمیوں (یعقوب، نصیر الدین وغیرہ) کے نام ظاہر ہوئے جن کے بارے میں معلوم تھا کہ سرحد پر تھے۔ آخر عبدالرحیم اور عبدالغفار دونوں گرفتار کر لئے گئے۔ دونوں دور روز حوالات میں رکھے گئے پھر جیل بھیج دئے گئے۔ یحییٰ علی سے بھی دس ہزار کی ضمانت طلب کی گئی۔ ان کے بھتیجے عبدالحمید (احمد اللہ کے بڑے بیٹے) نے اس کا بندوبست کر دیا۔

یحییٰ علی کی گرفتاری: اس کے فوراً بعد ہی دو گواہ سلیم الدین اور امین الدین ڈھا کہ سے لائے گئے۔ انہوں نے بیان کیا کہ ہم اپنے سرحد کے راستے میں صاوقپوری کے مکان قافلہ میں ٹھہرائے گئے۔ وہاں یحییٰ علی انگریزوں سے جہاد کرنے کی نفییت پر وعظ کہا کرتے تھے۔ ہمارے علاوہ اور بہت سے اپنے راستے میں قافلہ میں ٹھہرے تھے۔ یہ اطلاع ملنے پر یحییٰ علی کی ضمانت منسوخ ہو گئی اور ۸ فروری ۱۸۶۲ء کو گرفتار کر کے عبدالرحیم اور عبدالغفار کے ساتھ ان کو کھلی جیل میں ڈال دیا گیا۔

قیدیوں سے انسانیت سوز سلوک اوائل مارچ ۱۸۶۲ء میں ان تینوں قیدیوں کو انبالہ چلان کر دیا گیا۔ مارچ سے سشن کی سماعت کے اختتام تک یہ قیدی علیحہ علیحدہ تنہا تہ خانوں میں ڈال دئے گئے جن کا رقبہ ۴ × ۵ فٹ تھا، چھت بہت بلند تھی اور دیواروں میں بہت بلندی پر ایک چھوٹا سا سوراخ تھا۔ اس زندان کا دروازہ چوبیس گھنٹوں میں ایک بار کھلتا، جمعہ اور قیدیوں کو ایک کٹورہ پانی اور کچھ روٹی اور زال دسے جایا کرتا اور عہتر گلا صاف کر جاتا۔ اس تمام مدت میں قیدیوں کے ساتھ نہایت خلاف انسانیت سلوک کیا جاتا۔

قیدیوں کے اسمائے گرامی حکم منرا کی ابتدائی کارروائیاں نیچے ڈپٹی کمشنر انبالہ کی عدالت میں ایک ہفتہ سے زیادہ جاری رہیں۔ اپریل ۱۸۶۲ء میں سہریٹ سشن جج انبالہ کی عدالت میں سشن کی سماعت شروع ہوئی۔ جج کے معاون چار ایسٹریٹس مقرر کئے گئے تھے اور ہندو اور دو مسلمان ملکہ (وکٹوریہ) کے خلاف جنگ کرنے کے الزام میں کل گیارہ آدمیوں پر مقدمہ چلایا گیا۔ وہ یہ تھے۔

- ۱۔ یحییٰ علی صاوقپوری۔ عمر ۲۷ سال (سوانح حیات کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ)
- ۲۔ محمد جعفر ولد میاں جیون، لمبزار تھا نیس۔ ایک خوشحال تاجر اور گورنمنٹ سروس میں ملازم تھا۔
- ۳۔ عبدالرحیم ساکن صاوقپوری پٹنہ۔ عمر ۲۸ سال (سوانح حیات کے لئے ملاحظہ ہو مقدمہ)
- ۴۔ محمد شفیع ولد محمد تقی، فوجی بھاونی کا ٹھیکہ دار گوشت بخوشحال تاجر۔ سرکاری گواہ بن گیا، مرموز خطوط میں شفاعت علی کے نام سے موسوم۔

۶۔ عبدالغفار۔ ملازم عبدالرحیم۔ حقیقتہً وہ تحریک کے ایک معتمد کارکن تھے اور قادیان میں
کے ایک شریک کار بھی۔

۷۔ قاضی میاں جہان ساکن کوہر کوئی ضلع پبہ ان کے عرفی نام کئی تھے۔ گرفتاری کے وقت
بہت بوڑھے تھے۔ انبالہ کی نظر بندی کے دوران جب کہ انڈمان میں حبس دوام کی تجویز
زیر غور تھی انتقال کر گئے۔

۸۔ عبدالغفور پیر شاہ علی ساکن ہزاری باغ۔ عمر ۲۵ سال۔ جعفر کے گھر سے گرفتار کئے گئے۔

۹۔ حسینی ولد میگھو ساکن پٹنہ سٹی۔ عمر ۳۵ سال۔ ملازم الہی بخش۔

۱۰۔ حسینی ساکن تھانگیر ولد محمد بخش۔ عمر ۲۵ سال۔ عنایت علی کے زیر کمان سرحد پر
جہاد کیا تھا۔

۱۱۔ الہی بخش ولد کریم بخش۔ تاجر پاپوش پٹنہ سٹی۔ احمد اللہ کے مختار کی حیثیت سے بھی کام کیا تھا۔
احمد اللہ کے خلاف مقدمہ میں سرکاری گواہ بن گیا۔ ۱۸۶۵ء میں رہا کیا گیا۔

مقدمہ کا آغاز: یہ قیدی تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۲۱ کے تحت ملکہ (وکتوریہ) کے خلاف جنگ کھینے
کے ملزم قرار دئے گئے تھے۔ اس مقدمے کے قانونی مباحثوں سے ہمیں یہاں بحث نہیں مقدم
کی سرکاری ضخیم رودادوں میں ان کی تلخیص موجود ہے۔ اور دوسرا یافتہ شخصوں کی تفانیف میں
بھی شامل ہیں جو انہی گرفتاری اور مقدمات کے بارے میں لکھنے کو زندہ پچ رہے تھے۔ استغاثہ
کے موٹے موٹے واقعات بہت حد تک درست تھے مگر حکومت کے پاس ان تمام ملزموں کے
واقعی جرم کے ثبوت میں کافی مواد اور گواہ نہ تھے جیسا کہ آگے چل کر تفصیل سے بحث کی جائیگی۔
جس طور سے گواہوں کو سکھایا پڑھا یا جاتا سخت جسمانی ایذا میں اور پھانسی کی دھمکی بھی دی
جاتی۔ اس نے ان کا رویوں کی قانونی حیثیت اور وقار کی مٹی اور زیادہ پلید کی۔

قیدیوں کے وکلاء: جو اب دعویٰ میں قیدیوں کی طرف سے زیادہ کچھ نہیں کہا گیا۔ صرف شفیع
نے جو ایک دو ممتاز آدمی تھا شروع میں ایک وکیل مقرر کیا۔ جعفر نے اپنی طرف سے خود جرح
کی اور اپنے مقدمے میں خود بحث کی یعنی علی نے وکیل مقرر کرنے سے انکار کیا اور اپنی مدافعت
میں کچھ نہیں کہا۔ تمام دوران سماعت مقدمہ میں قرآن کی آیتیں تلاوت کرتے یا عربی قطعہ

پڑھتے رہے جس کا مضمون یہ تھا کہ انسان کو اس کی پروا نہ کرنا چاہیے کہ اس کی موت کس طرح واقع ہوتی ہے، کیونکہ بہر حال انسان کو خدا کے ہاں واپس جانا ہی ہے۔

مگر بعد میں عبدالرحیم شفیق کے اصرار سے اپنے اور یحییٰ علی کے لئے کلکتہ کے ایک مشہور بیرسٹری پلوڈن کو وکیل مقرر کیا۔ وہ ناقابل قیاس فیس اکیس ہزار روپے پر کام کرنے کو راضی ہوا۔ ولایت علی کے چھوٹے بیٹے محمد حسن جو اس وقت اٹھارہ سال کے تھے اور حاجی مبارک علی نے مدافعت کے ضروری انتظامات میں غیر معمولی سوجھ بوجھ کا ثبوت دیا۔

عدالت کا فیصلہ: ۲۰ مئی کو فیصلہ سنایا گیا۔ یحییٰ علی، محمد جعفر اور محمد شفیق کو سزائے موت اور باقی کو جس دوام بعور دریاے شوب کی سزائیں سنائی گئیں اور ملازمین کی تمام جائیدادوں کی ضبطی کا حکم صادر ہوا۔ فیصلہ دو دار کے ایک سو صفحوں سے زیادہ پر محیط ایک طویل دستاویز ہے، نہڑ نے فیصلہ کے متن سے جو کچھ نقل کیا ہے اس میں ہر قیدی کے علیحدہ علیحدہ جرم کا یہاں خلاصہ دنیا کافی ہوگا۔

یحییٰ علی اس عظیم بغاوت کی بڑی کمانی تھے جسے اس مقدمہ کی سماعت نے کھول دیا ہے۔ اس نے اپنے سیکڑوں ہزاروں ہموطنوں کو بہکا کر غر اور بغاوت پر آمادہ کیا۔ اس نے اپنی سازشوں سے برطانوی حکومت ہند کو سرحد کی جنگ میں مبتلا کر دیا جس میں سیکڑوں جاہل ضائع ہو گئیں۔ وہ اعلیٰ تعلیم یافتہ شخص ہے اور نادراقت کا عذر پیش نہیں کر سکتا۔ جو کچھ اس نے کیا ہے پہلے سے سمجھ بوجھ کر، پختہ ارادے اور سخت غداری سے کیا ہے۔ جعفر۔ اس قیدی کی شدید عداوت اور باغیانہ مفسدانہ قابلیت کا اندازہ کرنا ناممکن ہے۔ وہ ایک تعلیم یافتہ شخص ہے اور اپنے گناہوں کا مکھیا ہے۔ اس کے جرم میں کوئی شک و شبہ نہیں، نہ اس میں تخفیف کی کوئی وجہ ہے۔

۱۷ تاریخ احمدی صفحہ ۲۵۔ تذکرہ صادقہ ۱۹۶۹ء

۱۷ اس کے انبار آنے پہنچنے سے اسے جیل میں اپنے نوٹوں سے ملنے کی اجازت دی ہوڈسٹیل کمرے میں تھی کی اس نے بھی عذر سننے سے انکار کر دیا۔ آخر لقمہ گریز کے پاس اپنی کی نو اپنے نوٹوں سے ملنے کی اجازت ملی۔ اس طرح ایک وکیل و فارغ کورسٹے سے معمولی قانونی حق حاصل کرنے میں دو تین گھنٹے ہر گز نہ لگے۔

عبدالغفار۔ یہ مہمان خانے کے تمام دنیاوی معاملات کا بندوبست کرتا اور روزانہ رنگروٹوں کو جہاد کے فرض عظیم پر بکچر دیا کرتا۔ جو کچھ اس نے کیا کامل خلوص دل سے کیا اور آخر آخر تک انبالہ میں گواہوں کے کپڑے میں اپنے آقا کے پہلو میں بیباکانہ کھڑا رہا۔ قیدی عبدالرحیم کے خلاف یہ ثابت ہے کہ یہ غدارانہ کاروائیاں اسی کے مکان میں ہوتی تھیں۔ اسی کا نوکر خزانچی بھی تھا، رنگروٹوں کو کھلاتا پلاتا اور مذہبی دیرانوں کو چندے کی رقمیں بھی بھجتا۔ جو کچھ اس کے بس میں تھا اس نے حکومت کے خلاف کیا حسینی ساکن پٹنہ (آہی بخش کے نوکر) کے خلاف ثابت ہے کہ۔ مالک نے اُسے باغیانہ اغراض کے لئے ترسیل رقوم پر مامور کیا تھا۔ اور یہ کہ جس خدمت پر وہ مامور تھا اس کی باغیانہ نوعیت کو وہ خوب سمجھتا تھا۔ عبدالغفور کے خلاف یہ ثابت ہے کہ وہ پٹنہ کے سخی علی کامرید تھا، اور سخی علی نے اس کو تھانیسور میں باغیوں کو بھرتی کرنے والے گورام میں قیدی جعفر کا مددگار متعین کیا تھا اور مدد کرتا رہا۔

قاضی میاں جان کے خلاف یہ ثابت ہے کہ وہ بنگال میں جہاد کی تبلیغ کرتا اور آدمی بھرتی کرتا۔ روپے تحصیل کرتا اور بھجتا اور خطوط کو آگے بڑھاتا وغیرہ وغیرہ۔ اس کے گھر سے نہایت باغیانہ قسم کی مراسلت پکڑی گئی۔ وہ چار عینی نام استعمال کرتا تھا۔

آہی بخش کے خلاف یہ ثابت ہے کہ یہی واسطہ تھا جس سے پٹنہ کے مولوی اپنی تحصیل کردہ رقوم بالائی حصہ ملک میں جعفر تھانیسوری کو ملکہ اور ستھانہ منتقل کر دینے کے لئے بھیجا کرتے تھے۔

عبدالکریم کے خلاف ثابت ہے کہ باغیانہ کاموں کے لئے پٹنہ کے منی آرڈروں کو بھنانے کے لئے محمد شفیع ٹھیکہ دار گوشت کا خفیہ کار پرواز تھا۔ حسینی تھانیسوری محمد جعفر اور محمد شفیع قیدیوں کا ان کی غداروں کا خفیہ کار پرواز اور

۹۱ صفحہ نمبر ۱۱

دلال تھا۔ اور جعفر کی طرف سے محمد شفیع کے پاس ملکہ (دکٹوریہ) کے دشمنوں کو پہنچانے کے لئے دوسرے اثر فیاں لے جاتے ہوئے پکڑا گیا۔

شفیع کو پہلے موت کی سزا کا حکم دیا گیا۔ لیکن سرکاری گواہ ہو جانے کے بعد یہ حکم منسوخ کر دیا گیا اور دو برس جیل میں رہنے کے بعد بری ہو گیا۔ مگر اس کی جایداد جو پہلے ضبط کر لی گئی تھی واپس نہیں کی گئی۔

عدالتی فیصلے کی توثیق: یہ فیصلے توثیق کے لئے جوڈیشیل کمشنر روبرٹس کے پاس بھیجے گئے۔ وہی حکومت سے مشورہ کرنے میں مسلسل التواؤں کے بعد فیصلہ ۲۸ اگست ۱۸۶۲ء کو صادر ہوا۔ سزاؤں میں حقیقت کی ترمیم کر دی گئی۔ تین ملزموں کیلئے جو موت کی سزا مقرر کی گئی تھی اسے سس و دام میں بدل دیا گیا۔ لفٹنٹ گورنر کا آخری حکم ستمبر میں صادر ہوا۔ قیدی مقدمہ کے آغاز سے فروری ۱۸۶۵ء تک انبالہ جیل میں رہے۔ بھادنی کے احاطے میں جو یورپی خاندان رہتے تھے وہ آکر ان کو اچھو بہ نظر کی حیثیت سے دیکھا کرتے۔ اس زمانہ میں ایک بار جیل کے وارڈ (محافظ) نے یہ پیشکش کر دی کہ وہ ان کو نکل بھاگنے کا موقع دے گا اور فرض منصب میں غفلت کی جو سزا بھی ہو وہ بھگت لیگا۔ مگر قیدیوں نے اسے قبول نہ کیا۔

ہنٹر کا قیدیوں کو خراج تحسین: سرکردہ "سازشیوں" کے چال چلن اور "جرائم" پر تبصرہ کرتے ہوئے ہنٹر اپنے آپ کو مجبور پاتا ہے کہ چاروناچار، بھٹی علی اور جعفر کے خلوس اور ایمانداری کی تحسین کرے "جنہوں نے نہ کبھی وفاداری کا اظہار کیا نہ ہم سے کوئی رعایت طلب کی۔ یہ مخلص اور ایماندار لوگ تھے جنہوں نے اپنے تئیں زہر میں بچھے ہوئے ہتھیار چھو لئے تھے جو ایک باطل دین نے ان کے ہاتھ میں د رکھے تھے۔ اور اب جب کہ انہوں نے اپنی غداری کا خمیازہ بھگت لیا تو تاریخ ان کے حشر کو جذبے سے یاد رکھے گی جو تو غم و تاسف سے ملنا جلتا ہوگا۔"

شفیع کے بارے میں جس نے اپنی جان بچانے کو اپنے رفتار اور مقصد دونوں سے غداری کی ہنٹر لکھتا ہے۔ "مگر محمد شفیع کے لئے ایسا کوئی جذبہ ابھر نہیں سکتا۔ اس نے ہمارا ہاتھ چاٹا اور اسی کو کاٹا، اور وہ شروع سے آخر تک ذہین چالاک اور کمینہ منصوبہ ساز دکھائی دیتا ہے۔"

قیدیوں پر ظلم و تعدی: فروری ۱۸۶۵ء سے جب کہ قیدیوں کی پہلی کھیپ جزائر انڈمان کی مہیب نوآبادی کے سفر میں جہاں وہ تقریباً ایک سال میں پہنچی راستے میں لاہور میں رگی تو قیدیوں کے لئے ہولناک بد خوابیوں اور خلاف انسانیت ایذا رسانیوں کا دور شروع ہوا۔ ۲۲ فروری کو وہ انبالہ سے لاہور منتقل کئے گئے۔ ان دونوں مقامات کے درمیان پیدل سفر کیا گیا۔ عبدالرحیم کو کچھ دنوں کے لئے اس امید میں انبالہ میں روک لیا گیا کہ سرحد پر عبداللہ اور دوسرے رفقا سے اطاعت قبول کرنے کی تجویز میں ان کو واسطہ بنایا جائے۔ مگر انھوں نے اپنے گرفتار کرنے والوں کی بات نہ مانی اور فوراً ہی انڈمان چلان کر دئے گئے۔ قیدی ہی سال اکتوبر کے آخر میں لاہور سے ملتان کے جیل میں منتقل کر دئے گئے۔ سفر کے دوران سب قیدی اکٹھے زنجیریں بندھے ایک منتقل ڈبے میں بند رہتے جو منزل پر پہنچ کر ہی کھولا جاتا۔ ملتان کے قریب ایک مقام سے ایٹیم میں بٹھائے گئے اور دیارے سندھ سے کراچی لائے گئے۔ سفر کے دوران پورے ایک ہفتہ قیدی اسٹے ایک تختوں کے فرش پر بٹھائے گئے اور ان کی زنجیروں سے ایک اور زنجیر ایک سرے سے دوسرے سرے تک یوں گزادی گئی تھی کہ وہ اپنی جگہوں پر کھڑے بھی نہ ہو سکتے تھے۔ اسی جگہ بندہایت میں حاجت ضروری سے بھی مٹا جاتا تھا۔ اس زمانہ میں ان کی آہنی ہنگڑیوں اور بیڑیوں کا مجموعی وزن فی کس آدھ من سے کم نہ ہو گا۔ کراچی سے وہ ممبئی لائے گئے اور اس زمانہ کے ہولناک تھانہ جیل میں رکھے گئے جو ایک پرانے ویران مہرٹھ قلعہ میں واقع تھا۔ یہ قیدخانہ قیدیوں پر نہایت سخت اور بے دردانہ ایذاؤں کے لئے مشہور تھا اور صرف بدترین قسم کے مجرم یہاں رکھے جاتے تھے۔ اس مختصر بیان سے ہمیں ان جسمانی ایذاؤں کا کچھ اندازہ ہو سکتا ہے جو وہابیوں کو انڈمان جاتے ہوئے راہ میں جھیلنا پڑی۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اس زمانہ کی سیاہی قیدیوں جن میں اخباروں وغیرہ تک کی فراہمی کا انتظام ہوتا ہے اس زمانے میں قیدیوں پر شدید کے مقابلہ میں کتنی آسان ہیں۔ انڈمان کا سفر ۸ دسمبر کو شروع ہوا اور ۱۱ جنوری ۱۸۶۶ء کو ختم ہوا۔ اس کے بعد جزیرہ انڈمان میں قیدیوں کی زندگیوں کو علیحدہ بیان کیا گیا ہے۔

اب ۱۸۶۵ء کا مقدمہ پٹنہ

انبالہ کے مقدمہ کا لازمی نتیجہ تھا پٹنہ کا مقدمہ اُس زمانہ میں پٹنہ میں تلاشیاں ہونی تھیں تو احمد اللہ کے گھر کی بھی تلاشی لی گئی تھی۔ مگر پنجاب اور پٹنہ کے حکام کے درمیان ان کی گرفتاری کے مناسب ہونے پر اختلاف رائے کے سبب سے وہ اُس وقت گرفتار نہیں کئے گئے۔

احمد اللہ ادا ائل اکتوبر ۱۸۶۲ء میں حکومت پنجاب کے سکریٹری نے حکومت بنگال کے سکریٹری کے نام ایک چھٹی بھیجی جس میں ڈپٹی کمشنر انبالہ کے دو مراسلے مورخہ ۱۶ اور ۱۹ ستمبر ۱۹۶۲ء احمد اللہ کے حکومت کے خلاف سازش میں ملوث ہونے کے موضوع پر منسلک تھے۔ ان میں لکھا تھا کہ انبالہ کے مقدمہ میں استغاثہ کے بعض گواہوں کے بیانات سے ظاہر ہوا کہ احمد اللہ اکثر ان خفیہ جلسوں میں موجود ہوتا تھا جن میں یحییٰ علی تقریر کرتا تھا مقدمہ انبالہ کے ایک ملزم الہی بخش کے بیان سے یہ بھی ثابت ہوا کہ کچھ قوم جو ہر ہڈی بھیننے کیلئے اسکے پاس جمع کی جاتی تھیں۔ وہ احمد اللہ ہی کی معرفت جمع ہوتی تھیں۔ اور یہ کہ اسی کے حکم سے قمیص برآمد کی جاتی اور بھیجی جاتی تھیں۔ اسی کی ہدایت سے الہی بخش حسابات بجائے اس کے (احمد اللہ کے نام) کے عبدالغفار کے نام رکھا تھا۔

دہلیوں کی کارروائیوں کے موضوع پر حکومت پنجاب کے محافظ خانوں میں پرانے کاغذات کی چھان بین کی گئی۔ ان میں سے ایک سے احمد اللہ کے متعلق یہ رپورٹ برآمد ہوئی۔ جس زمانے میں فیاض علی اور یحییٰ علی کا پڑاؤ ستھانہ میں تھا "عظیم آباد میں مولوی فرست حسین برادر مولوی دلایت علی اور..... مولوی احمد اللہ اپنے گھروں میں اپنے گاؤں سے روپے تحصیل کرتے اور سلمہ پور سامان جمع کرتے۔"

احمد اللہ پر الزامات: ان حالات کے پیش نظر جبکہ دیگر تفصیلات میں مسئلہ کیلئے کہنے سے یہ عقیدت کی امید کی جاتی تھی (ڈپٹی کمشنر انبالہ نے پٹنہ کے حکام کو مشورہ دیا کہ بالخصوص ان الزامات پر احمد اللہ کو گرفتار کر لیا جائے اور ان حکامات کو جن میں وہ خود غائبانہ کے اور ایک ان کے ساتھ رہتے تھے ستھانہ کے مذہبی دیوانوں کے ساتھ رہتے تھے۔

کرنے کے دفتر کے طور پر استعمال کرنا (۲) پچھلے غدر کے ایام میں پٹنہ میں سازش کرنا (۳) اس خاندان کا سردار ہونا جسے بہت پیشتر پنجاب کے بورڈ آف منسٹریشن (مجلس منظمہ) نے ۱۸۴۶ء میں متنبہ کر دیا تھا کہ سرحد پر گڑ بڑ نہ پھیلائے (۴) ایسی کارروائیوں کو اپنے گھر میں موقوف کرنے میں قاصر رہنا ہی نہیں بلکہ برعکس ان کی حوصلہ افزائی اور اعانت کرنا۔

احمد اللہ کے خلاف شکایات: حکومت پنجاب کا یہ مراسلہ اپنے وقت پر یا کچھ قبل تو نہیں پہنچا۔ واقعہ یہ ہے کہ احمد اللہ پر یحییٰ علی کی گرفتاری کے وقت سے ہی ایک دھند چھائی ہوئی تھی۔ پٹنہ کے مقامی حکام ان حرکات میں جن کے لئے یحییٰ علی اور دوسرے ملزموں پر مقدمہ چل رہا تھا احمد اللہ کی شرکت کا شدید شبہ رکھتے تھے۔ ۱۸۶۲ء کے وسط میں ہی جب کہ ملزمین انبالہ کی اپیل ہائی کورٹ میں دائر تھی بلوڈن وکیل صفائی نے قیدیوں کو احمد اللہ کی متوقع گرفتاری کی خبر دی تھی۔ عظیم آباد کے کچھ خود غرض آدمیوں نے جو احمد اللہ کے سماجی مرتبہ اور سرکاری اعزاز پر ان سے حسد رکھتے تھے ان کی شرکت سازش کے متعلق افسروں کے کان بھردئے تھے ٹیلر پٹنہ کا بر طرف کردہ ڈویژنل کمشنر اور وہابیوں کے خلاف زبردست پیروکار ابھی شہر ہی میں تھا۔ اگلی نے اور ایک جوان سارجنٹ پولیس ایشری پرشاد نے وہابیوں پر مقدمہ چلانے کی جدوجہد میں حکومت پر اپنے جوش و مستوری کے اظہار کے لئے اپنی خدمات پیش کیں۔ ایشری پرشاد نے اس نفع بخش تفویض نامے کے لئے ایسی سرگرمی دکھائی کہ بعد میں حکومت نے اس کی خدمات دوبارہ طلب کر لیں۔

احمد اللہ کا وہابی تحریک میں حصہ: احمد اللہ کی ان باغیانہ سازشوں میں شرکت کے سوال پر کچھ تشریح کی ضرورت ہے کیونکہ بعض لوگوں نے اس تحریک میں ان کے حصہ کی مقدار پر شک کا اظہار کیا ہے۔ مہر کہتے ہیں کہ احمد اللہ نے اس تحریک کی تنظیم یا زیادہ عملی کاموں میں

۱۵ ادا ایل جون ۱۸۵۶ء میں احمد اللہ کے گھر کی تلاشی لی گئی تھی اور اس کے چند دنوں بعد ٹیلر نے خود ان کو گرفتار کر لیا تھا۔ ان مقدمات میں ایشری پرشاد کو اس کی خدمات کے صلے میں ڈیپٹی کلکٹر کا عہد ملا اور ڈھائی ہزار روپے نقد انعام بھی (تاریخ عجیب صفحہ ۷۹) گورنمنٹ بینکال جوڈیشیل ڈیپارٹمنٹ

نمبر ۱۳۶ مورخہ اکتوبر ۱۸۶۵ء

زیادہ عملی حصہ نہیں لیا۔ صرف یہی نہیں کہ یہ دعویٰ بے دلیل ہے بلکہ اس مقدمہ میں جو بہت سارے دستاویزی ثبوت پیش کئے گئے ہیں ان کے خلاف ہے استغاثہ کا ایک جفا داری گواہ آئی بیٹش کا بیان ہے کہ احمد اللہ کو سید احمد کے ایک خلیفہ نے ان تمام رقوم کا جو جمع ہوں ذمہ دار اور تمام متعلقہ امور کا نگران بنایا تھا۔ اور جعفر کی طرف سے احمد علی کے فرضی نام سے جو خط و ولادت تھے ان کو وہی وصول کرتے تھے اور پرہم دیکھ آئے ہیں کہ یحییٰ علی کی وفات کے بعد احمد اللہ صاحب پور کی مجلس عاملہ کے صرف سردار ہی نہ تھے بلکہ پہلے سے شیر کی حیثیت سے کام بھی کرتے تھے۔ اسی حیثیت سے رقوم کو جمع کرنے اور تقسیم کرنے کا کام بھی انھیں کے ذمہ تھے اصلاً اسی بنا پر ۱۸۶۵ء میں ان کی سزا ہوئی تھی۔ یہ صحیح ہے کہ وہ سرحد نہیں گئے اور وہاں کے معرکوں میں حصہ نہیں لیا۔ مگر یحییٰ علی کی غیر حاضری کی پوری مدت میں پس منظر میں وہ خاموش اور غیر نمایاں روح تنظیم رہے۔ یہ بھی یاد رکھنا چاہیے کہ احمد اللہ صرف ایک تنخواہ دار سرکاری افسر ہی نہ تھے بلکہ کئی اور اعزازی عہدے بھی رکھتے تھے اور اس حیثیت سے خاندان کے اور ارکان کی طرح وہ کھلم کھلا حکومت کے خلاف کارروائیوں میں حصہ نہ لے سکتے تھے۔

احمد اللہ کی گرفتاری: احمد اللہ کی بغاوت میں شرکت سے متعلق حکومت پنجاب کے خیال سے حکومت بنگال نے پٹنہ کے ڈویژنل کمشنر اور مجسٹریٹ کو تحقیقات اور ان کی رائے کے لئے باقاعدہ لکھ بھیجا۔ لفٹننٹ گورنر نے بھی ہدایت جاری کر دی کہ احمد اللہ کو فوراً سرکاری عہدوں سے برطرف کر دیا جائے اور آئندہ کبھی کسی حیثیت سے حکومت کے تحت کسی ملازمت کے لائق نہ سمجھا جائے۔ مجسٹریٹ نے بنگالیوں کو جان بوجھ کر ان مقاصد کے لئے:

لے یہاں مولانا یحییٰ علی کے لئے وفات (ڈیپو) کا لفظ بظاہر مولف کی لغزش قلم معلوم ہوتا ہے۔ صحیح لفظ "سرحد کو رخصت" ہونا چاہیے دونوں بھائیوں کی رحلت جزیرہ انڈمان کے جس دوام میں ہوئی۔ مولانا یحییٰ علی کی ۱۸۶۸ء میں اور مولانا احمد اللہ کی ۱۸۷۱ء میں صحیح یہ ہے کہ جب مولانا یحییٰ علی پٹنہ سے سرحد کو رخصت ہو گئے تو پٹنہ میں مولانا احمد اللہ تحریک کے ذمہ دار سربراہوں میں سے تھے۔ (مترجم) لے مہر خود اقرار کرتے ہیں کہ ان کو احمد اللہ کے مقدمہ کی پوری داد و ستاب نہیں ہوئی۔ یہ انتخاب دستاویزات حکومت بنگال جلد ۲۲ میں شائع ہو چکی ہے ان کے مطالعہ سے انکو یہ تحریک میں ان کی قیمتی خدمات کی حقیقت معلوم ہو جاتی۔

جن کو وہ باغیانہ جانتے تھے اپنے گھر میں جمع ہونے دینے کے الزام کو ایک قانونی عدالت میں ثابت کرنے کے لئے کافی قانونی دلائل حاصل کرنے میں سخت تسکوک کا اظہار کیا تھا۔ اس نے یہ بھی لکھا تھا کہ احمد اللہ کے جرم کے سوال کو نا کامیابی سے اٹھانے سے بہتر ہوگا کہ اس قضیہ ہی سے ہاتھ اٹھایا جائے۔ مگر آخر میں بڑی موثر گمانی کے بعد اس نے یہ خیال ظاہر کیا کہ اس مقدمے میں اصل ثبوت پچھلے مقدمہ کے گواہان استغاثہ کے بیانات پر مبنی ہونگے اور ان کا مزید اثبات تو ثبوتی ان اطلاعات سے ہوگی جو مقامی تحقیقات سے حاصل ہوں۔ اس لئے اس نے یہ رائے ظاہر کی کہ ملزم کے خلاف تفتیش شروع کر دی جائے۔

احمد اللہ نومبر میں گرفتار کئے گئے تھے۔ اس سے ایک سال پیشتر ہی محکمہ انکم ٹیکس کی تخفیف کے ساتھ وہ اس کی ڈپٹی کلکٹر سے علیحدہ کئے جا چکے تھے۔ مقدمہ انبالہ کے فیصلے کے اعلان اور اپنے بھائی یحییٰ علی کے جرم "عداری" میں سنزایابی کے بعد وہ پٹنہ کی کمیٹی پبلک انسٹرکشن سے برطرف کر دیئے گئے۔

احمد اللہ کے خلاف جرائم کی فہرست: اس مقدمہ کے چلانے کا کام پٹنہ کے مجسٹریٹ راونشا کے ذمہ کیا گیا تھا جو رخصت پر شملہ چلا گیا تھا۔ اس کو ہدایت کی گئی کہ وہ انبالہ ہوتا ہوا پٹنہ آجائے اور یہاں کے حکام سے ضروری صلاح و مشورہ کرے۔ تمام مقامی افسروں کو ہدایت کر دی گئی۔ کہ راونشا کو اس کی تفتیش میں ہر طرح کی مدد ہم پہنچائیں۔

الزامات کے تعین کے متعلق تمام ابتدائی کارروائیاں قائم مقام مجسٹریٹ پٹنہ مونرو کی عدالت میں انجام پائیں۔ ۱۶ جنوری ۱۸۶۵ء کو احمد اللہ پر یہ الزامات عائد کئے گئے۔

- ۱۔ کہ ۱۸۶۱ء، ۱۸۶۲ء اور ۱۸۶۳ء کو یا ان کے قریب قریب انھوں نے ملکہ (وکٹوریہ) کے خلاف جنگ کا ارادہ کیا۔ یہ جرم دفعہ ۱۲۱ تعزیرات ہند کے تحت قابل سزا ہے۔
- ۲۔ کہ اسی زمانے میں ملکہ (وکٹوریہ) کے خلاف جنگ میں اعانت کی یہ دفعہ ۱۲۱ کی رو سے جرم ہے۔

۳۔ کہ اسی زمانے میں انھوں نے ملکہ کے خلاف جنگ کے ارادے میں اعانت کی (تعزیرات ہند ۱۰۹ و ۱۲۱) یہ اقلام اسی اعانت کے نتیجے میں کیا گیا۔

۴۔ کہ اسی زمانہ میں انھوں نے ملکہ کے خلاف جنگ کرنے کے ارادے سے آزمیوں کو جمع کرنے میں اعانت کی۔

۵۔ کہ انھوں نے اپنے عمل اور ناجائز فروگذاشتوں سے ملکہ کے خلاف جنگ آوری کے منصوبے کی موجودگی کا اظہار کیا۔

سشن کی سماعت ایسلی ڈسٹرکٹ جج پٹنہ کی عدالت میں منعقد ہوئی۔ ایسیسز کا ایک بورڈ اس کا مددگار مقرر ہوا۔ انبالہ سے بہت سے گواہان استغاثہ بلائے گئے جن میں سب سے اہم آہی بخش اور عبدالکریم تھے۔

احمد اللہ کے خلاف عدالت کا فیصلہ: وکیل صفائی نے بحث میں دکھایا کہ دفعہ ۲۱ ملک کے اندر سے جنگ کرنے کے ارادے سے تعلق رکھتی ہے اور یہ بھی دکھایا کہ کوئی شخص دو آدمیوں کی شہادت کے بغیر بغاوت کا مجرم قرار نہیں دیا جاسکتا (دفعہ ۲۸ ایکٹ ۲-۱۸۵۵) اور یہ کہ اس مقدمہ میں احمد اللہ کو صرف ایک آہی بخش کی شہادت پر ملزم قرار دیا گیا ہے اس نے آہی بخش کی شہادت کی قدر و قیمت پر بحث کرتے ہوئے کہا کہ وہ اس لائق بھی نہیں کہ ایک کتے کو بھی پھانسی دینے کے لئے کافی سمجھی جائے۔ یہ وہ شخص ہے جس کے خلاف جس دوام بصورت ریائے شور اور اضطرابی جا بیدار کی سزا کا حکم ہوا تھا۔ جس کے پاس کچھ نہ رہا تھا جس کا اسے اندیشہ ہو نہ کوئی امید باقی رہی تھی۔ اس نے یہ بھی واضح کیا کہ گواہان استغاثہ جنھوں نے احمد اللہ کی شناخت اب کی ہے۔ اب سے پہلے انبالہ یا ہوڑا میں نہیں کی تھی مگر جج نے یہ تمام دلائل رد کر دئے اور اپنے فیصلے میں لکھا کہ ”یہ امر بالکل صاف ہے کہ حکومت برطانیہ کے خلاف جنگ جاری رکھنے کے لئے آدمی اور وچے سرحد پر بھیجنے کا ایک باقاعدہ منظم سلسلہ تھا۔ اور یہ کہ اس باغیانہ کام کے لئے جو شخصیں مقرر تھے ان میں قیدی (احمد اللہ) کے بعض بہت قریبی قرابت مند تھے۔ اور یہ کہ قیدی قافلہ کی املاک کا جنرل مینجر مقرر کیا گیا تھا اور یہ کہ وہ روپے وصول کرتا اور ان جلسوں میں شریک ہوتا جہاں بغاوت کی تبلیغ کی جاتی اور یہ کہ وہ اس کمیٹی کا ممبر تھا جس

نے بغاوت کی تنظیم کی تھی۔" لہ

نہج نے قیدی کو دوسرے چوتھے اور پانچویں الزامات کا مجرم قرار دیا۔ اس نے پہلے الزام سے اُسے بری کر دیا اور دوسرے الزام کو تیسرے میں مدغم تصور کیا۔ اسیروں نے بھی اس کو پانچویں الزام کا مجرم تسلیم کیا۔ ۲۷ فروری ۱۸۶۵ء کو قیدی کو سزا سے موت کا حکم سنایا اور اس کی املاک کو ضبط کرنے کی ہدایت کی۔

احمد اللہ کو جس دوام کی سزا، فیصلہ توثیق کے لئے ہائی کورٹ کے سپرد کیا گیا۔ ہائی کورٹ نے سشن کورٹ کی تمام کاروائیوں کو پیش نظر رکھ کر ۱۳ اپریل ۱۹۶۵ء کو طے کیا کہ ان کے سامنے جو شہادتیں ہیں وہ قیدی پر دوسرے الزام کے لئے تعزیرات ہند کی دفعہ ۱۳۱ کی رو سے سزا کی تائید میں کافی ہیں۔ لیکن شہادتوں سے ہم یہ نہیں پاتے کہ قیدی نے اس سازش میں دوسرے سزایافتگان سے زیادہ سے زیادہ عملی حصہ نہیں لیا۔ اس لئے سیشن نہج کی دی ہوئی سزا سے موت کی توثیق سے انکار کرتے ہیں بلکہ ہدایت کرتے ہیں کہ قیدی احمد اللہ کو جس دوام عبور دیا جائے اور اس کی تمام املاک بحق سرکار ضبط کی جائے۔

احمد اللہ کی جزا ٹرانڈیمان روانگی: چنانچہ احمد اللہ جزا ٹرانڈیمان منتقل کر دئے گئے۔ وہ کلکتہ کے راستے سے بھیجے گئے۔ اور جون ۱۸۶۵ء میں انبالہ کے پہلے مقدمہ کے اور سزایافتہ ملزموں سے پہلے وہاں پہنچے۔

انبالہ اور پٹنہ کے مقدمات ایک دوسرے سے بالکل وابستہ تھے۔ دونوں مقدموں میں گواہان استغاثہ کا ایک ہی گروہ اور بہت حد تک ایک ہی طرز کی شہادتیں کام میں لائی گئیں۔ سزایافتگان میں جعفر اور شفیق کے سوا دونوں مقدموں کے اہم ملزمین ایک ہی مخصوص جگہ کے باشندے اور قریبی قرابتدار تھے۔ درحقیقت انبالہ اور پٹنہ کے افسروں میں کچھ بیشتر ہم آہنگی اور منصوبہ بندی ہوتی تو احمد اللہ پہلے گرفتار کر لئے جاتے۔ پٹنہ کا مجسٹریٹ اس عدم

ہم آہنگی پر اپنے افسوس کے اظہار سے باز نہ رہا۔

مقدمہ انبالہ کے نمایاں پہلو مقدمہ انبالہ کے تین نمایاں ترین پہلوؤں پر تبصرہ کرتے ہوئے، ہنٹر کہتا ہے کہ قابل تعریف ہے وہ دانشمندی جس سے ایسی وسیع الذیل بغاوت کی تنظیم کی گئی، وہ اخفا جس سے اس کی پیچیدہ کارروائیاں چلائی گئیں اور وہ کامل وفاداری جو اس کے ممبروں نے ایک دوسرے کے ساتھ قائم رکھی۔ بے شبہہ منصوبہ پر عمل درآمد بڑی ذہانت سے منظم کیا گیا تھا۔ قانوناً درست اور جائز مشاغل خلاف حکومت کارروائیوں سے اس عیاری سے خلط ملط کر دئے گئے تھے کہ حکام کے لئے ان دنوں میں میں تمیز کرنا سخت دشوار تھا۔ مثلاً الہی بخش ان قوم کے علاوہ جو وہ مہر حد بھیجتا تھا وہ واقعی جوتوں اور دوسری چیزوں کی جائز خریداری کے لئے بھی روپے بھیجا کرتا تھا۔ تحریک کے جمہور کارکنوں کی ایمانداری بھی بہت نمایاں تھی۔

ان دنوں مقدموں میں استعانتہ نے جو طریقے اختیار کئے وہ بھی غور طلب ہیں یہ سچ ہے کہ دنوں مقدموں میں قیدیوں پر جو الزامات عائد کئے وہ نفس الامر میں درست تھے۔ یہ بھی سچ ہے کہ صفائی کی تمام بجٹوں میں بھی آدمی اور روپے کی فراہمی کے ایک وسیع وسیع جال کے وجود سے انکار نہیں کیا گیا۔ ملزمین میں سے کئی علی نے کوئی بھی صفائی دینے سے قطعاً انکار کیا۔

بہر حال ان تمام واقعات کو بجا کر کے یہ معنی نہیں نکلتے کہ ان کے جرائم رتاریہ اور زبانی شہادتوں کی بنیاد پر ایک قانونی عدالت میں قانوناً ثابت ہو سکے۔ جیسا کہ اوپر بیان کیا گیا حکام استغاثہ خود مشتبہ تھے ایا اللہ کا باغیانہ منشا تشفی بخش طور پر ثابت کیا جاسکتا ہے احمدیہ کے مقدمہ کی سماعت کے موقع پر پٹنہ کے مجسٹریٹ نے کہا تھا کہ اس مقدمہ میں انبالہ کے گواہوں کے بیانات بنیادی ثبوت ہو گئے، باقی دوسرے ثبوت جو مقامی طور پر مہیا ہوں گے وہ انہیں کا تکملہ ہوں گے اور ہم یہ بھی دیکھ آئے ہیں کہ انبالہ کے گواہوں کے بیانات پکت کر ایک ہی شخص الہی بخش کی شہادت کی شکل میں تیار ہوتے ہیں جیسا کہ راؤ نشانے خود اقرار کیا یہ وہی شخص جو خود اس قسم کا سزا یافتہ تھا اور جسے مجسٹریٹ نے سماعت مقدمہ

دوران عملاً حراست میں رکھا اور کسی سے ملنے کی کبھی اجازت نہ دی۔

قیدیوں کے خاندانوں کو دھمکیاں: جعفر اور عبدالرحیم نے دوران تفتیش اور بعد میں جیل کے اندر پولیس نے جو بہمانہ سلوک کئے ان میں سے بعض تفصیلی تذکرہ اپنی تصنیفوں میں کیا ہے۔ ملزموں کے خلاف بہت سے لوگوں کو خوفزدہ کر کے شہادت دلوانے کے لئے بے تحاشا اور بلا امتیاز گرفتار کر لیا گیا۔ مقدمہ انبالہ میں جعفر اور شفیع کے خاندان کے بعض افراد کو جعفر کے انبالہ سے فرار ہوجانے کے بعد ان کا پتہ بتانے کے لئے بہت مارا پیٹا گیا۔ پارسن نے جعفر کی تلاش میں دہلی پہنچ کر شہر میں دہشت دہرا س کا عالم برپا کر دیا۔ شہر کے سب دروازے اور سرائیں بند کر دی گئیں، ہزاروں آدمیوں کو تحویل، گرفتاری اور پھانسی تک دھمکیوں اور مالی ترغیب و ترہیب سے کبھی ملزموں کے خلاف شہادت دینے کے لئے پھانس لیا گیا۔

سہ کاری گواہوں پر نوازشات، خود سہ کاری کاغذات بھی گواہوں کو روپے دینے کی تصدیق کرتے ہیں۔ مقدمہ کے اختتام کے بعد آہی بخش کو صرف معاف اور بری کر دیا گیا۔ بلکہ پٹہ سٹی محلہ نگلا میں اس کا مکان جو پہلے ضبط کر لیا گیا تھا اسے واپس کر دیا گیا۔ اس کے علاوہ اس کے اور ضبط شدہ مال کی فروخت سے جو زر ثمن حاصل ہوا تھا اس میں سے پانسو روپے کوئی کاروبار کرنے کے لئے اسے دئے گئے۔ اور گواہوں کو جو پنجاب سے لائے گئے تھے اور جن کی تعداد دس تھی ۴۰ روپے دئے گئے۔ نو کو پچاس پچاس روپے فی کس اور ایک کو بیس روپے)۔ یہ بظاہر ان کے وقت کی بربادی اور اپنے مختلف کاموں سے غیر حاضری کی تلافی کے طور پر دئے گئے تھے۔ مجسٹریٹ نے اپنی رپورٹ میں ان عطیات کی سفارش کرتے ہوئے اس امر پر بہت زور دیا کہ یہ گواہ اپنی مرضی سے رخصت تھے۔ لیکن ہمیں اسی مجسٹریٹ کی ایک دوسری چٹھی سے معلوم ہوتا ہے کہ یہ گواہ پٹنہ کے قیام کے دوران میں مجسٹریٹ کے احاطے میں رکھے گئے تھے اور ان کو باہر جانے یا کسی سے ملنے کی اجازت نہ تھی۔ اس لئے قرین قیاس ہے کہ ان کو کھانا بھی مجسٹریٹ کے ہاں سے ہی ملتا ہوگا۔ پھر تلافی کی رقم کا جواز کہاں رہا؟

ہمیں یہ بھی معلوم ہے کہ انبالہ کے مقدمہ میں بھی ایسے ہی عطیات دئے گئے تھے۔ ایک گواہ سے پہچانہ سلوک: جیل میں قیدیوں کے ساتھ ساتھ طرح طرح کے بہمانہ سلوک کئے گئے۔ جعفر اس وحشیانہ خوشی کا ذکر کرتے ہیں جو جیل کے افسروں نے سزا یافتہ قیدیوں کے پھانسی دینے کے سامان دہائی ریشمی ڈوری اور چوٹی تختے خرید کر، فراہم کرنے میں دکھائی گئے ساتھ ہی ساتھ قیدیوں سے معلومات حاصل کرنے کے لئے ان کی رہائی یا جیل میں بہتر سلوک کی پیشکش کر کے ان کو ونگلایا جاتا تھا۔ شفیق کو جو سرکاری گواہ بن گیا تھا دوسرے قیدیوں کے سامنے جو مرض یا مشقت کے سخت حملے کے بعد فاقہ زدہ ہوتے تھے، بہترین غذا ملتی تھی۔ جعفر ایک چودہ سالہ لڑکے کا واقعہ بھی بیان کرتے ہیں جسے استغاثہ ایک خاص طرز پر شہادت دینے کی تعلیم کرتا تھا۔ کٹھڑے میں پہنچکر اپنا پڑھایا ہوا سبق بھول گیا۔ اس پر پولیس نے اسے مارنے مارنے مار ڈالا۔ بعد میں ظاہر کیا گیا کہ وہ قدرتی موت کے گیا۔

جج کا انتقامی رویہ: جعفر کے خیال کے مطابق سزائے موت کی تنسیخ جو ڈیشنل کمشنر کے ترمیم کا اعزاز بھی خواہش انتقام کے تحت تھا۔ اس نے لکھا کہ جب حکام کو معلوم ہوا کہ قیدی نے سزا سے موت کا خیر مقدم کیا کہ اب وہ اپنے مقصد عظیم کے لئے مر کر شہادت کا درجہ پائیگی انھوں نے ان کو اس خوشی سے محروم کرنے کے لئے ان کی سزائیں بدل دیں۔ نیز بھی "ان میں سے بدترین غدار باغیوں دلتزین انبالہ کو شہادت کی سعادت سے محروم کر کے حکام نے جو دانشمندانہ انتقام لیا اس کی تحسین" کر کے جعفر کے قول کی تصدیق کرتے آئے۔ پٹنہ کے مقدمہ کے متعلق عبدالرسیم پٹنہ کے سیشن جج احمد اللہ کی سماعت کے آغاز میں پٹنہ کے سیشن جج کے تہادے کا ذکر کرتے ہیں۔ یہ جج اپنے جذبہ عدالت اور آزادی رائے کے لئے معروف تھا۔

یہ عجیب اتفاق تھا کہ جعفر اور دوسرے قیدیوں کی سزائے موت میں تیسف ہوئی اور وہ ڈوری اور چوٹی تختے اس جیل میں ایک یورپی کو پھانسی دینے کے لئے استعمال ہوئے۔

اس امر کو ملحوظ رکھتے ہوئے بھی کہ یہ بیانات ان لوگوں کے ہیں جو خود سزا سیدہ تھے

کم سے کم یہ حقیقت صاف عیان ہے کہ استغاثہ نے غیر معمولی طریقے استعمال کئے۔

جعفر تھا نبی ساری کی صاف گوئی: اس باب میں یہ ذکر ہے جانہ ہو گا کہ جعفر گرفتاری مقدمہ کی سماعت اور فیصلے سے متعلق واقعات بیان کرتے ہوئے اپنی کمزوریوں اور کوتاہیوں کی وارداتیں بھی آزادانہ بیان کرتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں کہ جب شفیع کو عمدہ عمدہ غذائیں دی گئیں اور دوسرے فاقہ کھینچ رہے تھے ایک بار انھوں نے شفیع کے کھانے میں سے کچھ پلاؤ چیر لیا تھا۔ اسی طرح شفیع کو جو روپے بھیجے گئے تھے ان انھوں نے دس روپے رکھ لئے تھے (انھوں نے انڈمان میں کچھ روپے کما لئے تو وہ رقم اس کو واپس کر دی)۔ یہ واقعات انسانی کمزوریوں کو ظاہر کرتے ہیں جو قیاس کئے جاسکتے ہیں۔ ان سے جعفر کے بیانات کی صداقت و وقعت بھی ثابت ہوتی ہے۔

الہی بخش پر غیر معمولی نگرانی: سرکاری روادوں سے بھی استغاثہ کے بطور اور نیت کا پتہ چلتا ہے۔ خود پٹنہ کے مجسٹریٹ نے کمشنر کو رپورٹ دی کہ الہی بخش چھپا کر انبالہ سے لایا گیا اور کھگول اسٹیشن پر اتار دیا گیا، وہاں سے عورت کے بھیس میں لیکر لایا گیا اور مجسٹریٹ کے احاطے میں ایک بنگلے میں سخت پہرے میں رکھا گیا۔ پٹنہ میں اس کی موجودگی کی خبر کسی کو نہ تھی جب تک کہ وہ گواہ کے کٹہرے میں کھڑا نہ کر دیا گیا۔ اور قیدی بھی جو پنجاب سے لائے گئے اسی طرح مجسٹریٹ کے احاطے میں بند رکھے گئے۔ الہی بخش کو اس کی نظر بندی کے دوران پنجاب پولیس فورس کے تین آدمیوں کی نگرانی میں رکھا گیا۔ وہ بھی خاص طور پر پنجاب سے ہی بلائے گئے تھے۔ بعد میں احمد اللہ کے متعلق فیصلے کے بعد پولیس کے ان تین افسروں کو ان کے پٹنہ میں اقامت کے صلے میں جملہ چار سو روپے انعام میں عطا کئے گئے جب ہم یہ یاد کرتے ہیں کہ الہی بخش ہی کی شہادت پر احمد اللہ سزا یاب ہوئے اور اس بات پر نظر کرتے ہیں کہ تمام دوران سماعت مقدمہ میں حکام نے کس طرح اس کو بند رکھا

اور پھر اس کو کثیر رقم انعام میں دی تو معاملہ سخت مشتبہ ہو جاتا ہے۔ ایک مقامی معمولی افسر ایشری پر شاد کے متعلق جس نے مقدمہ کی تفتیش میں اتنی سرگرمی دکھائی مجسٹریٹ لکھتا ہے کہ میں اس کی کما حقہ تعریف نہیں کر سکتا۔ اس کو بھی ملازمت میں ترقی کے علاوہ نقد انعام دیا گیا۔

(ج) سزا رسیدگان کی زندگی جزائر انڈمان میں

جزائر انڈمان جسے عام طور پر "کالا پانی" کہتے ہیں سزا یافتہ قیدیوں کی نوآبادی ہے۔ یہ مختلف رقبوں کے کئی جزیروں کا مجموعہ ہے جن کو اٹھلا سمندر اور چوڑی ندیاں ایک دوسرے سے جدا کرتی ہیں۔ زیادہ تر جزائر جنگلات سے ڈھکے اور پہاڑوں کے سلسلے سے بھرے ہیں۔ کوہ ایریٹ کی بلند ترین چوٹی گیارہ ہزار فٹ سے زیادہ بلند ہے۔ ان اسباب سے مزدور زمین کا رقبہ کچھ زیادہ نہیں۔ جزائر کے قدیم باشندے جنگلوں میں رہتے ہیں، جہاں انھوں نے مزدور کے چھوٹے چھوٹے قطعے تیار کر لئے ہیں۔ قیدیوں اور ان کی نوآبادی کے افسروں کے لئے غلے کلکتہ سے آتے تھے جو اسٹیمر سے پانچ دن کا راستہ ہے، غلے یکساں شرح سے تقسیم کر دئے جاتے تھے۔ ذرائع آمد و رفت قریب قریب نابود ہیں اور ضروری اشیاء کی فراہمی شاذ و نادر۔ آب و ہوا ایسی مسموم ہے کہ کسی کو کوئی زخم یا خراش لگ جائے تو ناسور ہو جاتا ہے اور عموماً زخمی جلد ہی مر جاتا ہے۔

قیدیوں کے لئے قواعد و ضوابط، ایک اعتبار سے قیدیوں کو اس نوآبادی میں منتقل کر دینا دوسرے قید خانوں میں بند کرنے سے بہتر تھا۔ خاص طور پر خطرناک قیدیوں کے گروہ کے سوا باقی تہ خانوں کو ٹھہریوں میں بند نہیں کئے جاتے تھے۔ جزیروں میں پانچ قیدیوں کی زنجیریں کاٹ دی جاتیں اور بعض جسمانی مشقیں جو نوآبادی کے مجریہ قواعد و ضوابط کے مطابق عائد کی جاتی تھیں ان کو ختم کرنے کے بعد ان کو معمولی طور پر زندگی بسر کرنے کی اجازت ہوتی پڑے لکھے لوگ کسی محرمی یا فنی شغل میں لگاؤے جاتے جس کی لئے ان کو معارضے دئے جاتے۔ اگر ان کو قدرت ہوتی تو نوکر رکھنے کی اجازت بھی ہوتی۔

بارہ برس قید بھگتنے کے بعد قیدی اپنے پس انداختہ سرمایہ سے کوئی کاروبار بھی چلا سکتا تھا۔ وہ اپنا گھر رکھ سکتا اور کسی مقامی یا قیدی عورت سے شادی بھی کر سکتا اور بچوں کی پرورش بھی کر سکتا تھا۔

غیر انسانی رواج کا خاتمہ: ایک غیر انسانی حرکت جو جزیروں میں پہلے رائج تھی یہ تھی کہ قیدی کے ماتھے پر "دائم الحبس" کے لفظ داغ دئے جاتے تھے۔ وہابی قیدیوں کے وہاں پہنچنے سے کچھ پہلے سے یہ رواج ترک ہو چکا تھا اور وہ اس ازیت سے محفوظ رہے۔ پھر بھی ہر قیدی کو ایک نمبر دے دیا جاتا اور نام کی جگہ وہی استعمال کیا جاتا۔ ۱۸۸۲ء میں جب وہابی قیدیوں کی رہائی کا سوال اٹھا تو جزیروں کے سپرنٹنڈنٹ نے قیدیوں کے چال چلن پر ایک مفصل رپورٹ دی۔ اس میں ان قیدیوں کا ان کے نمبروں کے ساتھ ذکر کیا عبدالرحیم کا نمبر ۱۱۵۶۱ محمد جعفر کا نمبر ۱۱۲۵۰ عبدالغفار کا نمبر ۱۱۲۵۱ تھا۔

یورپی قیدیوں کے ساتھ تہجیحی سلوک: جزیروں کی زندگی کا ایک نفرت انگیز پہلو جو حکام نے پیدا کر دیا تھا وہ سماجی مذہبی امتیاز تھا جو جدید تفرقہ اندازی کی پالیسی کی ابتدائی شکل تھا۔ یورپی قیدیوں بلکہ ہندوستانی عیسائیوں کے ساتھ تہجیحی برتاؤ کیا جاتا۔ ان کو نہ صرف اول درجے کے بنگلے ملتے بلکہ مفت نوکر بھی دئے جاتے جعفر راجہ جگر ناتھ پوری کا ایک افسوسناک قصہ بیان کرتے ہیں جو ۱۸۴۹ء میں اس جزیرے میں بھیجے گئے تھے۔ وہ کالے تھے اس لئے ان کو موچیوں کے ساتھ کام پر لگایا گیا اور نہایت گھسیا کھانا ملتا، نگر ایک نیچی قوم کے دو غلے عیسائی (انینگلو انڈین) کے ساتھ جو ان کے ساتھ ہی آیا تھا نہایت تہجیحی سلوک کیا جاتا۔ یہ منشیب راجہ ان ذلتوں اور جسمانی سزاؤں کی تاب نہ لا سکا اور جلد ہی مر گیا۔

احمد اللہ کی پورٹ بلیر میں آمد: جیسا کہ پہلے ذکر ہو چکا وہابی قیدیوں میں احمد اللہ سب سے پہلے پورٹ بلیر پہنچے۔ اور سب سے پہلے جزیروں کے چیف کمشنر کے رمدل ناشی اکبر زماں ان سے ملے۔ وہ خود ۱۸۵۶ء کی تحریک میں حصہ لینے کے جرم میں بیس سال کی قید کے سزا

ملنے والے تھے اور احمد اللہ اس وقت تک اس وقت تک اس نے ان کے نام نہیں لئے گئے

یافتہ تھے لہ۔ بعد میں ان کا منشی کی حیثیت سے تقرر ہو گیا۔ انھوں نے احمد اللہ کو اپنے ساتھ ٹھہرانے اور اپنے نائب کے طور پر کام لینے کی اجازت حاصل کر لی۔ احمد اللہ پانچ سال ان کے ساتھ رہے یہ ان کے لئے نسبتاً عافیت کی مدت تھی۔ جنوری ۱۸۶۶ء میں جب یحییٰ علی اور عبدالغفار آئے تو احمد اللہ غالباً اکبر زماں پٹنشی سے ان کے آنے کی خبر سنکر ان کے خیر مقدم کے لئے تیار ہو گئے۔ ان دونوں کو بھی اکبر زماں نے اپنی اسٹنٹی (نیابت) دلوادی۔ اس طرح ایک مدت کے بعد یعنی ۸ فروری ۱۸۶۷ء کی منجوس تاریخ کے بعد جب کہ یحییٰ علی کو یک بیک گرفتار کر کے انبالہ بھیج دیا گیا تھا دونوں بھائی ملے اور کچھ دن ایک ہی چھت کے نیچے رہے۔ عبدالرحیم جو دسمبر ۱۸۶۷ء کو پہنچے گھاٹ منشی بنا دئے گئے۔ اس وقت تک وہابی قیدی جزیرہ آس میں رہتے تھے جہاں زیادہ تر حکام بھی مقیم تھے۔ یحییٰ علی کی وفات: یحییٰ علی پر رفتہ رفتہ پیری اور کمزوری غالب آ رہی تھی اور طویل شدائد جھیلے جھیلے آخر فروری ۱۸۶۸ء میں بیمار پڑ گئے اور جزیرہ کے ہسپتال میں داخل کر دئے گئے۔ عبدالرحیم اس وقت محکمہ بحریہ میں مقرر تھے اور دور کے جزیرے میں رہتے تھے۔ روزانہ ان کو دیکھنے آیا کرتے۔ یہ ضروری تھا۔ اس لئے کہ ان کے بڑے بھائی احمد اللہ خود ایسے بوڑھے اور کمزور تھے کہ روزانہ ہسپتال جانہ سکتے تھے، جو اونچی سطح پر واقع تھا۔ آخر یحییٰ علی دو ہفتے بیمار رہ کر ۲ فروری ۱۸۶۸ء کو قضا کر گئے اور جزیرہ راس کے مقبرہ میں دفن ہوئے۔ مختلف جزیروں سے کوئی ڈھائی ہزار مسلمان اور بہت سے ہندو بھی شریک جنازہ ہوئے۔

لارڈ میو کے قتل کا وہابیوں پر الزام: فروری ۱۸۷۳ء میں انڈمان کے دوران قتل و غارتگری میں ایک ایسا زلزلہ خیز واقعہ رونما ہوا جس کا جھٹکا سارے ملک میں محسوس کیا گیا۔ ایک سرحدی پٹھان منشی شیر علی کے ہاتھوں لارڈ میو کا قتل تھا۔ لارڈ میو ان قتل سے وہابیوں کا کسی طرح کا تعلق نہ تھا ان کو اس میں ملوث کرنے اور حکام ہرنانہ کے انتقام

لہ اپنی مدت قید تمام کر کے وہ اپنے وطن آگئے۔ واپس آئے اور ۱۹۰۱ء میں وفات پائی۔

اور غنیمت و عصب کا نشانہ بنانے کی کوشش کی گئی۔

ایشیائی پرشاد کی روانگی انڈمان: بنگال صوبائی سرورس کے افسر وہابی تحریک کی پوری تاریخ اور حکومت کے لئے تحریک کے حضرات کی کیفیت و کیفیت سے خوب واقف تھے اس لئے وہابی قیدی ان کے انتقام اور بہیمیت کا خاص نشانہ بنے۔ لارڈ میو کے قتل کی خبر جیسے ہی کلکتہ پہنچی مخالف وہابی افسروں کے پرانے طبقے نے اس حادثہ میں وہابیوں کو ملوث کرنے کی کوشش شروع کر دی ایشیائی پرشاد جس نے اب تک سرکاری حلقوں میں سدا وہابیات کا باہر ہونے کی شہرت حاصل کر لی تھی پولیس کمشنر پٹنہ کے ساتھ وہابیوں کی مفروضہ شرکت کا سراغ لگانے کے لئے فوراً جزائر انڈمان روانہ کیا گیا۔ مگر ایک مدد راسی صوبائی افسر جنرل اسٹوارٹ نے جو جزیرے کا ذمہ دار حاکم اور وہابیوں کے پس منظر سے نا آشنا اور قیدیوں سے کوئی تعصب نہ رکھتا تھا اس فضول جستجو کی حوصلہ افزائی کو نا منظور کر دیا۔

جنرل اسٹوارٹ کا غیر جانبدارانہ رویہ، لیکن جنرل اسٹوارٹ کی غیر جانبدارانہ رویہ کے باوجود وہابیوں کو شبہہ کی نظر سے دیکھا جانے لگا۔ اب تک ان میں سے اکثر بڑے جزیرے میں جہاں زیادہ تر افسر رہتے تھے مختلف ملازمتوں پر مقرر کئے جاتے تھے۔ مگر اب وہ جنگلوں سے بھرے ہوئے چھوٹے دور افتادہ جزیروں میں منتقل کر دئے گئے احمد اللہ جزیرہ و ایپر میں بھیج دئے گئے جہاں بدترین قسم کے عادی مجرم رکھے جاتے تھے۔ وہ میڈیکل ڈیپارٹمنٹ میں دس روپے ماہانہ تنخواہ پر مقرر کئے گئے اور پہنے کو بغیر کرائے کا مکان دیا گیا۔ عبدالرحیم ایک دوسرے دور افتادہ جزیرے میں منتقل کر دئے گئے جہاں وہ ایک ہسپتال میں مقرر ہوئے۔

احمد اللہ کی حالت زار: احمد اللہ اب زیادہ بوڑھے اور کمزور ہوتے جاتے تھے۔ ان کی دیکھ بھال کرنے والا کوئی نہ تھا۔ بھئی علی کا انتقال ہو چکا تھا۔ اس لئے عبدالرحیم روزانہ ان کی خدمت کو آیا کرتے۔ مدت قید کے بارہ برس پورے کرنے کے بعد اس قیدیوں کی نو آبادی کے ضابطے کے مطابق ان کو اپنے پس انداختہ سے کوئی کاروبار کرنے

کی اجازت ملی گئی اور انھوں نے بڑے جزیرے کے قریب ابروین میں ایک دوکان کھول لی۔ ان کے بیٹے عبدالفتاح کو جزیرے میں ان سے آملنے کی اجازت دے دی گئی تھی۔ وہ ایک سال سے کچھ زیادہ باپ کے پاس ٹھہرے رہے، مگر اس جگہ کی آب و ہوا کی ناسازگاری کے سبب سے اُن کو واپس چلے جانا پڑا۔ اسی قسم کی ایک درخواست احمد اللہ نے بھی دی تھی کہ ان کے بیٹے محمد یقین کو جو اُن دنوں کلکتہ میں رہتے تھے ان سے ملنے دیا جائے مگر منظور نہ کی گئی۔

احمد اللہ کی حسرتناک موت: کاروبار سے عبدالرحیم کی مالی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ احمد اللہ کی صحت تیزی سے گرتی جاتی تھی۔ اس لئے عبدالرحیم نے حکام سے درخواست کی کہ ان کو اپنے چچا کو اپنے ساتھ رہنے کی اجازت دی جائے مگر یہ منظور نہ ہوئی۔ اس کے بعد بھی بار بار اس سلسلہ میں کوششیں ہوتی رہیں اور سب ناکام ہوئیں۔ عبدالرحیم ان کی خدمت کے لئے بار بار جاتے رہے مگر ان کے پاس ٹھہرنے کی اجازت نہ ملی۔ دو ہفتے تک وہ روزانہ ان کو دیکھنے جاتے۔ اس ضرورت سے صبح سویرے ان کو ٹھہرے تھکنا پڑتا، دو میل پیدل گھاٹ پر پہنچتے۔ دو میل سے زیادہ چوڑی انتہائی ندی پار کر کے جزیرہ دایپر کے گھاٹ اور پھر احمد اللہ کے گھر پیدل جاتے۔ ان کی غیر حاضری میں ان کے بیٹے عبدالفتاح دوکان پر بیٹھتے۔ ایک روز ۲۲ نومبر ۱۸۸۱ء کو جب

عبدالرحیم حسب معمول جزیرہ دایپر کو چلے جا رہے تھے انھوں نے سنا کہ پچھلی رات احمد اللہ تنہائی اور بے کسی میں انتقال کر گئے۔ عبدالرحیم اس ناگہانی صدمہ سے بدحواس ہو گئے، ان کی تدفین کے فروری انتظامات کے لئے گھر لوٹ گئے۔ مرحوم کی طرف سے ایک آخری درخواست ان کے چھوٹے بھائی یحییٰ علی کے پہلو میں دفن کرنے کی اجازت کے لئے دی گئی مگر مقامی حاکموں کو ان کے مرنے پر بھی اتنا رحم نہ آیا کہ ان کے لئے اتنی سی رعایت روار کھتے۔ جزائر اندمان کے ویرانوں میں بھی دونوں بھائیوں کو ایک جگہ مدفون ہونا نصیب نہ ہوا۔ احمد اللہ جزیرہ دایپر میں ڈونڈا از پوائنٹ میں سپرد خاک کئے گئے لے

لے [مجھ کو دیار غیر میں مارا وطن سے دود رکھ لی مرے خدا نے مری بیسی کی شرم] غالب (مترجم)

(د) وہابیوں کی جاہلادوں کی ضبطی

اگرچہ ٹپنہ کے وہابیوں کی جسمانی سزاؤں کا کچھ بیان کتنا ہی مختصر سہی، موجود ہے مگر ان کی گرفتاریوں اور سزاؤں کے بعد ان کے باری نقصانات کی کوئی اطلاع دستیاب نہیں۔ اس خصوص میں وہابی ذرائع بھی خاموش ہیں۔

وہابیوں کا سماجی مرتبہ: وہابی خاندان جو سید احمد کی وفات کے بعد اس تحریک کا مشعل بردار تھا، صرف علمی سر بلندی کے سبب سے نمایاں نہ تھا بلکہ اعلیٰ سماجی رتبے کے لئے بھی جو اس کے ارکان کو حاصل تھے ممتاز تھا۔ خاندان تین بڑی شاخوں میں منقسم تھا جس کے ارکان ایک دوسرے سے مضبوطی سے وابستہ اور منسلک تھے۔ ان تین شاخوں کی اصل یہ تھے (۱) محمد حسین (۲۲) الہی بخش (۳) فتح علی۔ محمد حسین کے چھ بیٹیاں تھیں جن میں سے چار الہی بخش کے بیٹوں سے بیاہی گئیں اس طرح دو شاخیں ملکر ایک ہو گئیں۔ فتح علی اور الہی بخش بھی شادیوں کے بندھن سے باہم وابستہ تھے۔

الہی بخش نوابان مرشد آباد کی ریاست میں بہت اعلیٰ خدمات پر مامور تھے اور ان خدمات کے صلے میں ان کو موضع بھولی (جس کا رقبہ ۷۰۰ بیگھہ اور آمدنی ڈیڑھ ہزار روپے تھی) اور بیکھے رگوپال پور (جس کا رقبہ ۷۰۰ بیگھہ اور آمدنی چار ہزار روپے تھی) ضلع ٹپنہ میں عطا ہوئے۔ یہ احمد اللہ بھٹی علی اور دوسرے ورثہ کو پہنچے اور حکومت کی ضبط کردہ جاہلادوں کے حلقے تھے۔ احمد اللہ خود کبھی اپنے زمانے میں ٹپنہ کی نہایت اہم سماجی شخصیتوں میں سے تھے اور متعدد اعزازی اور باتخواہ عہدوں پر بھی مامور رہے۔

فتح علی، رفیع الدین حسین ولد روح الدین حسین خاں کے داماد تھے۔ آخر الذکر کو شاہ عالم ثانی نے نائب ناظم بہار مقرر کیا تھا۔ عہد یوہانی میں بھی وہ اسی عہدے پر برقرار رہے۔ ۱۷۳۳ء کی شورش کے زمانے میں ٹپنہ کے ایک انگریز حاکم ایس کی جان بچانے کے صلے میں ایسٹ انڈیا کمپنی نے ان کو معین الملک امین الدولہ نامہ جنگ کا خطاب بخشا تھا۔ ان کے بیٹے رفیع الدین حسین اپنے باپ کے عہدے اور

جاگیروں کے وارث ہوئے۔ اس کا ایک حصہ ان کے داماد کوتر کے میں ملا۔ انا حصہ بھی لقمہ بڑا بیش قیمت ہوگا کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ فتح علی کے ایک بیٹے عنایت علی نے ۱۸۵۱ء میں ہندوستان سے آخری ہجرت کے وقت اپنا جو حصہ بیچا اس کا زر ثمن بیس ہزار روپے سے زائد تھا۔

خاندان صادق پور کی املاک کی ضبطی: ہم ان حقائق سے خاندان صادق پور کی جائیداد غیر منقولہ کی کمیت اور قیمت کا کچھ اندازہ لگا سکتے ہیں۔ مقدمہ انبالہ کے فیصلے کے اعلان کے بعد ملزمین پٹنہ کی ایک فہرست حکومت بنگال کو اس ہدایت کے ساتھ روانہ کی گئی کہ ان کی جائیدادیں ضبط کر لی جائیں۔ چنانچہ ایک گوشوارہ تیار کیا گیا۔

لنٹ گورنر نے بھی کمشنر کو از روئے دفعہ ضابطہ ۱۹ سنہ ۱۸۱۰ء رپورٹ کرنے کی ہدایت کی کہ جائیداد غیر منقولہ کا کیا کیا جائے اور کس طرح نمٹا جائے۔ ساتھ ہی اُس نے حکومت ہند کو مشورہ دیا کہ شہر کے اندر اراضی اور مکانات شہر کے مصروف کے لئے میونسپل کمشنر کے سپرد کر دئے جائیں۔ اس مشورے کے جواب میں حکومت ہند نے ہدایت کی کہ صادق پور کی عمارت جہاں سازش چل رہی تھی میونسپلٹی کو دی جائے کہ "منہدم کر دی جائیں اور اس جگہ ایک کھلا بازار بسایا جائے اور باغیوں کی ضبط کردہ جائیداد کے زر ثمن کا ایک حصہ میونسپلٹی کے لئے وقف کر دیا جائے۔"

حکومت ہند کے اس حکم کی تعمیل میں بعد میں ایک قانونی روٹا پڑ گیا۔ دیکھا گیا کہ صادق پور کی عمارت مشترکہ طور پر خاندان کی ملکیت تھیں۔ سب سے زیادہ حصہ تینوں بھائیوں احمد اللہ، کبھی علی اور فیاض علی کی ملک تھا۔ چھوٹا حصہ ولایت علی اور ان کے بھائیوں عنایت علی و فرحت حسین کی ملک تھا۔ ولایت علی کے چار بیٹے تھے۔ ان میں سے دو عبداللہ اور عبدالقادر تھے۔ ان کے باقی بیٹوں کا اعلان کیا جا چکا تھا۔ دو سے دو بیٹے

۱۵۔ تذکرہ صادق صمدی، ۱۳۷ مولوی عبدالرحیم کی اس ذکرہ صادق میں اس کا کوئی ذکر نہیں ہے۔ وہ سے یہ سنی ہے اور اس انسان کی حقیقت چوتھے میں مترجم نے اپنے لوگوں میں واضح کر دی ہے اس ذکرہ صحت سے ناشر کا عرفیہ ثابت کرنا مفہوم ہے کہ مولانا عنایت علی نے ہجرت کے وقت اپنے حصہ فرحت کو دیا تھا اور اپنے ورثہ کے لئے کوئی جائیداد غیر منقولہ باقی نہ چھوڑی تھی۔ اور یہ اطلاع فرحت مرثیہ انھیں کے متعلق مخصوصاً کیوں کیا گیا، مولانا ولایت علی کے متعلق کیوں نہیں ہے؟ مترجم

محمد حسن پٹنہ میں اور ہدایت اللہ ہاڑھ میں رہتے تھے۔ ان کے حصے ضبط نہیں کئے جا سکے۔ عنایت علی کے صرف ایک بیٹے عبدالمجید^{۱۸} تھے۔ وہ بھی باغی اعلان کئے جا چکے تھے، اس لئے ان کا حصہ بھی ضبط کر لیا گیا۔ فرحت حسین کے دو بیٹے تھے۔ ان میں سے عبدالرحیم نے انبالہ میں سزا پائی، دوسرے عبدالرؤف پٹنہ میں رہتے تھے اور ان کا حصہ ضبط نہ کیا جاسکا۔

اس پھیدگی کے پیش نظر لفٹنٹ گورنر نے سفارش کی کہ بقیہ حصے جو ضبط نہ ہوئے ضابطہ ۱۸۵۶ء کے تحت رفاہ عام کے لئے رکھ لئے جائیں اور ان حصوں کا معاوضہ ضبط شدہ جائیداد کے ذریعہ سے ادا کر دیا جائے۔ اور پورا حصہ میونسپلٹی کو دے دیا جائے۔

خاندان پٹنہ کی املاک کا حشر: آبائی مکانات کے علاوہ قائدین پٹنہ کی جائیداد غیر منقولہ پٹنہ اور دوسرے ضلعوں میں بھی تھی۔ بھینی علی اور احمد اللہ کی غیر منقولہ جائیداد کی مجموعی سالانہ آمدنی ۷۹۷۱ روپے سات آنے۔ اپائی تھی۔ عبدالرحیم کی جائیداد کی کل سالانہ آمدنی ۱۳۹۵ روپے سات آنے ایک پائی تھی۔ یہ ساری قیمتی جائیدادیں ایک جنبش قلم سے ضبط کر لی گئیں اور گاجرمولی کی طرح بیچ دی گئیں (گھروں کی ضبطی کے نتیجے میں) عورتیں بچے بغوی معنی میں گلیوں کو چوں میں ڈال دئے گئے۔ اور کوڑی کوڑی کے محتاج بنا دئے گئے۔

مکینوں کو صرف اپنے تئوں پر کپڑے پہننے ہوئے خانہ بدر ہونا پڑا۔ ان کو اپنے ساتھ ایک سوئی بھی لے جانے کی اجازت نہ تھی۔ ایک ایک چیز جو گھروں میں تھی اور پہلے سے تیار کئے ہوئے گوشوارے میں درج کر لی گئی تھی حوالہ کر دینا پڑی ان میں سے اگر کوئی چیز

۱۸۵۱ء حافظ عبدالمجید کی صحیح تاریخ وفات کہیں نہیں ملتی۔ مولانا عبد الرحیم نے اصلی تذکرہ صادقہ طبع اول ۱۹۰۱ء صفحہ ۱۹ میں لکھا ہے کہ ”جب منجھ حضرت مولانا عنایت علی کا انتقال سوات میں ۱۸۵۸ء میں ہوا تو آپ کی زوجہ ثانیہ و حافظ عبدالمجید کا بھی انتقال تھوڑے ہی عرصہ میں وہیں ہوا“ بقول مولانا غلام رسول مہر وہ مولانا عنایت علی کے مرض موت کے زمانے میں ہی اس وقت طبع تھی۔ بہر حال ان کا انتقال بھی ۱۸۵۸ء کے لگ بھگ یعنی ۱۸۵۴ء کے قریب ہو چکا تھا۔ اور مقدمات ۱۸۶۳ء سے شروع ہوئے۔ اس لئے حافظ عبدالمجید کے باغی اعلان کئے جانے اور ان کی جائیداد کی ضبطی کا سوال پیدا ہی نہیں ہوتا۔ اس لئے مولف کا یہ قول نظر ہی نہیں بلکہ غرض مند پارٹی سے سموخ وغیر مستند ہے۔ مقصد ظاہر کیا جا چکا ہے [مترجم

غائب پائی گئی تو اس کی قیمت تخمیناً قیمت سے دس گناہ زیادہ ادا کرنا پڑتی تھی۔
 احمد اللہ کے خاندان کی تباہی: احمد اللہ کے بڑے بیٹے عبد الحمید جی کو خاندان کے سب
 سے مُعتر رکن کی حیثیت سے حکم اخراج کا بار گران اٹھانا پڑا ان معصوم عورتوں اور بچوں
 کی خاموش فریاد کا اپنی فارسی مثنوی میں جامع و مانع طرز میں نقشہ کھینچتے اور خاندان کی تباہی
 کا ذکر کرتے ہوئے کہتے ہیں۔

” احمد اللہ بود مجرم شاہ طفلک بے گناہ راجہ گناہ“

گردش تقدیر سے خاندان کے ان بد نصیب مکینوں کے سر دہ پد یہ آفت ٹھیک عید
 کے خوشی کے نہوار کے دن پڑی۔ احمد اللہ نے بجا طور پر یوں فریاد کی ہے۔

” چون شبِ عبد را سحر کردند ہمہ را از مکان بدر کردند

مایہ عیش ساز ما تم شد عید ما غترہ محرم شد“

(حب عید کی صبح ہوئی، سب گھر سے نکال دیئے گئے عید کا نغمہ عیش ساز ما تم

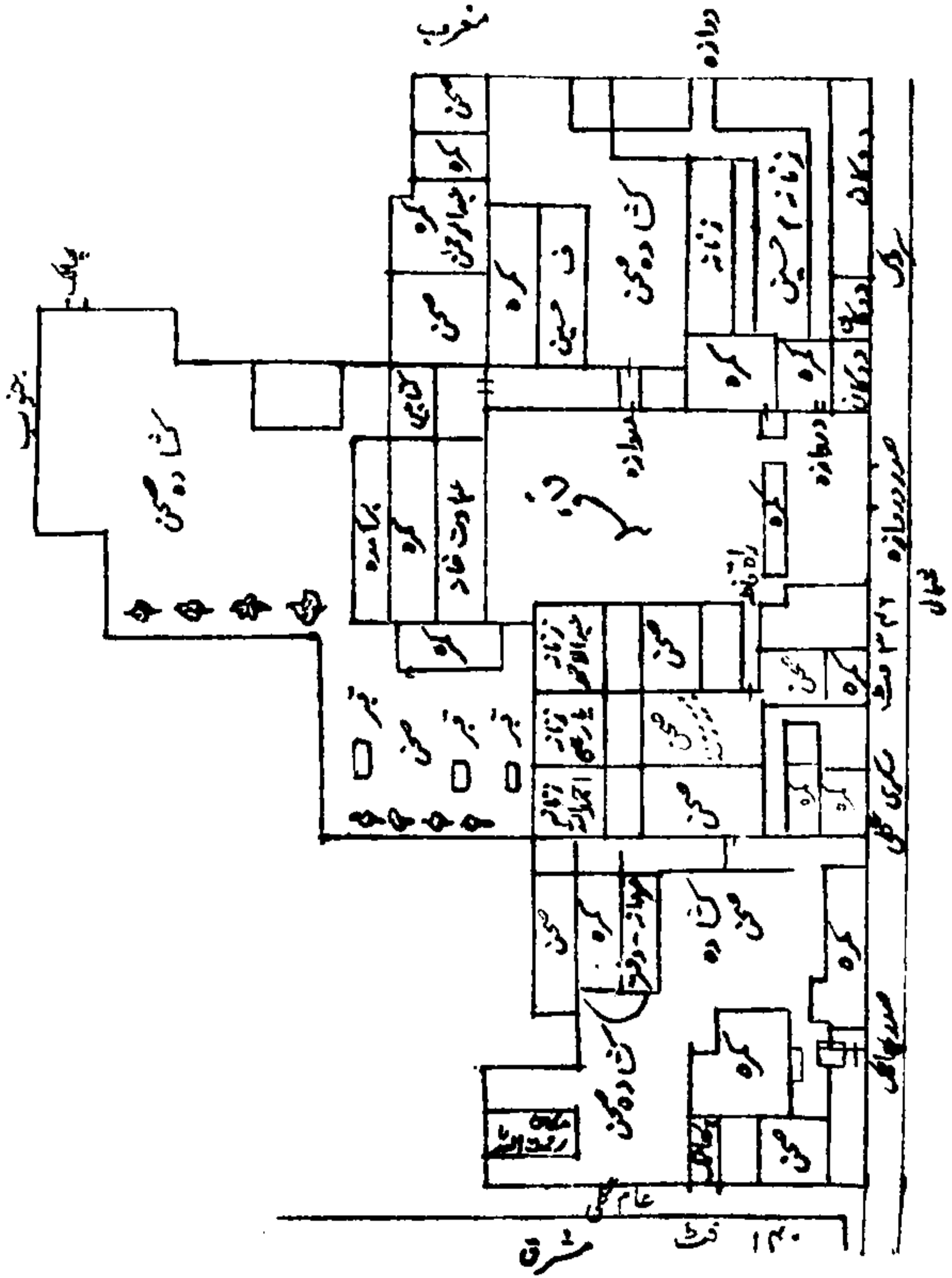
بن گیا۔ ہماری عید محرم کی پہلی تاریخ ہو گئی)۔

لائٹنٹ گورنر نے مشورہ دیا کہ مناسب ہے کہ جاہلادوں کا زرمین عام مالگنڈاریوں
 میں جذب کر لیا جائے۔ اور زیادہ موزوں یہ ہوگا کہ یہ روپے مقامی ضرورتوں پر صرف کئے جائیں۔

..... ملے تانہین صادقپور ہجرت کے وقت یا پہلے ہی اپنی غیر مشورہ بنا دیا اور عورتوں
 کے نام منتقل کر گئے تھے۔ وہ سب پڑ گئیں حکومت نے ان پر قبضہ نہیں کیا۔ اور آخر تک جو ان کا حق تھا
 ملوث نہ تھے وہ اور ان کے ورثہ ان جاہلادوں پر قابض و مستفید ہے جہاں تباہوں اور سرکاری کاغذات میں
 جاہلاد غیر منقولہ کی فروخت کا کثرت سے ذکر ہے وہاں املاک منقولہ کی فروخت کا ذکر کہیں نہیں ملتا۔ مستوران بے
 خانماں ہو کر گلیوں میں تو ماری نہ پھرن بلکہ چند دن ان قزاقوں کے گھروں میں پناہ گزیں ہو گئیں جو الزام بغاوت سے
 بری تھے مگر وہ کبھی اُردو تلاش بے مایہ نہ ہوئیں کہ مالی امداد کی محتاج ہوتیں۔ سر حبیبا نے کے لئے مکان یا جائے امن
 حاصل ہوتے ہی مطمئن ہو گئیں اور کئی پشت تک مردھی تنگ دست نہ ہوئے وہ عورتوں کے نام غیر منقولہ
 جاہلادوں سے عزت آبرو سے بسر کرتے رہے۔ ان کی مالیت لاکھوں روپے تھی [مترجم

نقشه سطحی مکان مملوک مولوی احمد اللہ و قافلہ ملحقہ آن در محلہ صادق پورہ پٹنہ سیٹی

نقل از نقشہ مندرجہ پیریکیشنز



حکومت ہند نے لفٹنٹ گورنر کے تمام مشورے قبول کر لئے۔ غیر منقولہ جاہدوں کے ذمہ کے
کے مصرف کے بارے میں کہا گیا کہ جب حکومت ہند اس راے سے متفق نہیں کہ یہ سارا زر مٹن
عام مالگزاروں میں مخلوط کر دیا جائے اس خاص صورت میں اسے لفٹنٹ گورنر کی تجویز میں
کوئی عذر نہیں۔ چنانچہ یہ حکم نافذ کر دیا گیا۔

وہابی فنڈ کا مصرف: وہابیوں کی جاہد غیر منقولہ کی فروخت سے حکومت نے جو خطیر
رقمیں فراہم کیں اور جسے وہابی فنڈ کہا گیا اس کی بعد کی تاریخ بھی بہت دلچسپ ہے۔

فروخت سے جو مجموعی رقم حاصل ہوئی اس کی تعداد ۱۲۱۹۲۸ روپے ۴ آنے ایک پائی
تھی۔ اس میں سے احمد اللہ کے حصے کی رقم ۲۲۱۱۹ روپے ۱۰ آنے ۳ پائی تھی۔ یہ رقم حکومت
نے اپنے خزانے میں جمع کر لی، کیونکہ ان کی بیوی نے ایک مقدمہ دائر کر کے دعویٰ کیا تھا کہ یہ
جاہدوں میں ان کو حق مہر میں ملی تھیں۔ باقی ۹۸۲۸ روپے ۹ آنے دس پائی میں سے ۳۳۲۰۷
روپے ۷ آنے ۶ پائی ۱۸۶۹ کو پٹنہ میونسپلٹی کو اسی جگہ پر جہاں وہابیوں کے آبائی مکانات
بنے ہوئے تھے ایک میونسپل مارکیٹ (بازار) کی تعمیر کے لئے بطور عطیہ امداد دے دئے گئے۔

یہ فعل میونسپل کمشنر کی اس تجویز کے جواب میں عمل میں لایا گیا کہ ایک مربع رقبہ کے
تین طرف ایک منزلہ بچتہ دوکانیں تعمیر کی جائیں اور چوتھی طرف شمالی کی جانب کا حصہ سڑک
کے مقابل راستے کے لئے کھلا چھوڑ دیا جائے۔ تخمینہ کیا گیا کہ ان دوکانوں سے تین ہزار روپیہ
سالانہ کرایہ وصول ہوگا۔ مزید تین ہزار کی رقم پٹنہ سٹی ریلوے اسٹیشن سے پٹنہ گھاٹ اسٹیشن تک
ایک سڑک کی تعمیر صرف کی گئی۔ مزید تیس ہزار روپے پٹنہ کالج کی عمارتوں کی توسیع و تجدید کے
کچھ کاموں پر صرف ہوئے۔ ان میں پرانے قطعہ کے مشرقی بازو پر ایک لکچر روم، ایک دارالجمہور،
بڑا زینہ میوزیم (عجائب خانہ) کی تعمیر اور سڑک پر ڈام بچھانا شامل تھا۔ ان کاموں پر مجموعی خرچ

۱۵ یہ تفصیلات خفیہ کاغذات کے ایک پلندے سے لی گئی ہیں جو پٹنہ کمشنری کے دفتر میں علیحدہ
محفوظ ہیں۔ یہ رسمی سرکاری چھٹیاں نہیں بلکہ دفتر کے نوٹ اور مسودات ہیں جن پر پینسل کے مختصر دستخط ہیں۔
بہر حال ان کاغذات کے غائر مطالعے اور جائزے سے یہ بات معلوم ہو جاتی ہے کہ کون سا مسودہ کس
کی طرف سے اور کس کے نام ہے۔

کا تخمینہ ۱۲۷۰۱۷ تھا جس میں سے متذکرہ بالا رقم وہابی فنڈ سے اور باقی اخراجات کالج فنڈ اور دوسرے ذرائع سے پورے کئے گئے۔

مقامی افسروں نے صادقپور میں وہابی تعمیرات کو منہدم کرنے کے لئے حکومت کے احکام کی تعمیل کرتے ہوئے خاندان کے مقبرے کو بھی نہیں بخشا قبروں کو توڑ کر زمین کے برابر کر دیا اور ان کو کھود ڈالا۔ عبدالرحیم بھی جنہوں نے اپنی تالیف (تذکرہ صادقہ) میں نہایت احتیاط سے وہابیوں کے ساتھ حکومت کی معاندانہ حرکات پر متشددانہ تبصرے سے بہت احتراز کیا ہے۔ اس گنڈے بن کی حرکت کے خلاف اپنے دلی رنج اور فریاد پر قابو نہ رکھ سکے۔ اپنے آباد اجداد کی اکھاڑ ہوئی اور بے نشان قبروں کو دیکھ کر اپنے تاثر کا یوں اظہار کرتے ہیں: "اپنے مردوں کے ساتھ یہ سلوک دیکھ کر اُس حد سے اسے احساس کو الفاظ میں ظاہر کرنا دشوار ہے۔ آج تک اُسے یاد کر کے میرے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ ہمارے اسلاف کی قبریں کیوں کھود ڈالی گئیں؟ وہ مقبرہ کیوں ضبط کر لیا گیا؟ اور ہماری عادل حکومت نے اس طرح کی حرکت کیوں کی؟"

خاندان صادقپور کی نشاۃ ثانیہ: خاندان کے سرمایہ کے شکستہ اور منتشر اجزا پھر آہستہ آہستہ اور رفتہ رفتہ اکٹھے کئے گئے۔ خاندان کے کچھ ارکان بالخصوص عبداللہ ایک چھوٹا سا سیوٹی کھڑا کرنے کے لئے جو اب بھی وہاں موجود ہے سرحد پر ہی اقامت پذیر رہے۔ باقی دوسرے ارکان نے دوبارہ گھٹنوں پر اٹھ کھڑے ہو جانے کی صلاحیت اور قوت ارادی کا ثبوت دیکر اپنی ایک نئی راہ نکالی، اور ایک جدا معاشرت اختیار کی۔ وہ سرحد سے لوٹ آئے، اپنے نام بدل لئے، انگریزی تعلیم حاصل کی اور اس نئے میدان عمل میں بھی نمایاں فہمیت حاصل کی۔ احمد اللہ کے بیٹے اشرف علی علی گڑھ کالج میں ریاضی کے پروفیسر ہوئے اور مختلف ریاستوں، بہاولپور، جونا گڑھ وغیرہ میں اعلیٰ عہدوں پر فائز رہے یحییٰ علی کے بیٹے امجد علی نے بھی اعلیٰ تعلیمی امتیاز حاصل کیا اور شمس العلماء کے خطاب سے بھی سرفراز ہوئے۔ انھوں نے بنارس ہندو یونیورسٹی سے ایم اے کیا اور علی گڑھ سے اس وقت بنارس میں نہ ہندو یونیورسٹی تھی نہ ایم اے کا امتحان جو صرف کلکتہ یونیورسٹی میں ہوتا تھا۔ مولانا اشرف علی مولانا امجد علی نے کلکتہ یونیورسٹی سے ایم اے کا امتحان پاس کیا تھا۔ مترجم۔

لے مری خاک بھی لحد میں نہ رہی امیر باقی
انہیں میرے مرنے ہی کا نہیں اعتبار ہوتا (مترجم)

کالج میں فلسفہ کے پروفیسر مقرر ہوئے۔ احمد اللہ کے بڑے بیٹے عبدالحمید نے علم کے دوسرے میدان (طب) میں بے نظیر عزت و شہرت حاصل کی۔ وہ اپنے زمانہ کے ایک مشہور ترین طبیب تھے اور کثیر دولت کمائی۔ ولایت علی کے چھوٹے بیٹے محمد حسن پٹنہ کے قدیم ترین اردو اخباروں میں سے ایک اخبار انسٹیٹوٹ گزٹ اور مقامی ایم۔ اے، اے اسکول (محمدن اینگلو عربک اسکول) کے بانی تھے، اور کلکتہ میں ایک کامیاب کاروبار قائم کیا۔ ان سربراہ آورہ ارکان کی مشترکہ جدوجہد سے خاندان کی قسمت نے پھر پلٹا کھایا۔ خاندان کے سب سے کبیر السن رکن جو ابھی بقید حیات ہیں، حکیم عبدالنجیر کا خاندانی مکان میونسپل عمارت کے جو قدیم عمارت کے مقام پر بنی ہے، عین مقابل واقع ہے۔ اس کے پہلو میں ولایت علی کے پوپوتے سکونت پذیر ہیں، عبدالحمید اپنے مکان کی صنبلی کے بعد ایک مشرق محلہ خواجہ کلاں میں جا بسے، وہاں مطلب قائم کیا اور ایک مکان بھی خریدا جس کی ان کے نواسے ڈاکٹر عظیم الدین احمد تجدید و توسیع کی۔ ان کے بیٹے اب بھی وہیں سکونت پذیر ہیں۔

(۵) وہابی قیدیوں کی رہائی

وہابی قیدیوں کی رہائی اگرچہ ترتیب زمانی میں بہت بعد کے زمانے سے تعلق رکھتی ہے اُسے ۱۸۶۳-۶۵ کے سرکاری مقدمات کے بیان کی تکمیل کے لئے یہاں بیان کیا جاتا ہے۔ رہائی ۱۸۸۳ء میں عمل میں آئی۔ ۱۸۶۳ء اور ۱۸۸۰ء کی درمیانی مدت میں حکومت وہابی تحریک کو کچلنے میں بہت حد تک کامیاب ہو چکی تھی اس سے بھی اس فیصلے کو تقویت پہنچی اور ان کی رہائی کے مسئلے پر زیادہ نرم اور اعتدال کی نظر ڈال سکی۔ ۱۸۸۳ء تک وہابی تحریک بالکل کچلی جا چکی تھی۔ اب حکومت ہند کے لئے یہ بیباک خطرہ باقی نہ رہا تھا۔

۱۵ صرف اردو نہیں انگریزی بھی علی گڑھ انسٹیٹوٹ گزٹ کے نمونے پر اردو اور اس کے انگریزی ترجمے کے دو کالم پہلو پہلو ہوتے تھے [ماتہ جم]۔ وہ پٹنہ کالج میں عربی کے پروفیسر اور صدر شعبہ عربی تھے ۱۹۳۶ء میں وفات پائی۔

اس صورت حال میں ۱۸۸۲ء میں عبدالرحیم کی بیوی نے گورنر جنرل کو ایک عرضداشت روانہ کی جس میں انہوں نے گزارش کی کہ اہبالہ کے سشن جج نے عبدالرحیم کے متعلق کہا تھا کہ ۱۵ برس کے بعد ان کی میعاد سزا پر نظر ثانی کی جاسکتی ہے بشرطیکہ قید میں ان کا چال چلن تشفی بخش رہا ہو۔ انہوں نے استدعا کی کہ اب پندرہ کے عوض اٹھارہ سال گزر گئے۔ حکومت ہند نے یہ معاملہ حکومت پنجاب کو اس کی رائے کے لئے بھیج دیا۔ اس نے سفارش کی کہ ان کی سزا پر مدت دراز گڑھکی اور بدے ہوئے حالات کی بنا پر صرف عبدالرحیم ہی نہیں بلکہ دوسرے سزا یافتگان بھی جن کو بعد میں سزائیں دی گئی تھیں رہا کئے جائیں۔ تب حکومت ہند نے حکومت بنگال کو اس سفارش سے مطلع کر کے اس کی رائے طلب کی۔ مگر اس نے رہائی کی تجویز سے اتفاق نہ کیا۔ اس نے ہیلیڈے مکشنر پٹنہ کی رائے کا حوالہ دیا جس سے مشورہ کیا گیا تھا۔ اس نے لکھا تھا کہ احمد اللہ کے تین بیٹے شہر میں موجود ہیں۔ اور اگر عبدالرحیم اور عبدالغفار واپس لائے گئے تو موقع ملنے پر فساد کھڑا کرنے کی کوشش کر سکتے ہیں۔

تب نوآبادی سزایافتگان انڈمان کے سپرنٹنڈنٹ سے قیدیوں کے چال چلن پر رپورٹ دینے کو کہا گیا۔ اس میں بھی حکومت کو قیدیوں کے خلاف کوئی تفسیر نہ ملی۔ جزیرے میں تمام وہابی قیدیوں کا چال چلن نہایت محتاط، متدین اور بے داغ رہا تھا۔ احمد اللہ، یحییٰ علی اور دیگر اسیر اپنے معمولی دفتری فرائض ختم کر کے اپنا وقت عبادت اور وعظ پر صرف کرتے تھے۔ نوآبادی انڈمان کے سپرنٹنڈنٹ کی مُرسلہ رپورٹ سے ظاہر ہوا کہ اٹھارہ سال کی مدت میں قیدیوں کا چال چلن غیر معمولی طور پر عمدہ رہا۔ اس تمام مدت میں عبدالرحیم سے کوئی مقامی تفسیر بھی سرزد نہ ہوئی۔ عبدالغفار پر صرف ایک بار یکم فروری ۱۸۷۰ء کو غیر حاضری کے لئے جرمانہ ہوا۔ جعفر کو کسی ضمنی ضابطہ کی خلاف ورزی کے لئے ایک بار اسم نویسی اور تفسیر کی گئی تھی۔ پھر بھی جعفر کا چال چلن مجموعی طور پر اچھا تھا اور وہ نمایاں طور پر لائق اور ذہین آدمی ہے۔

۱۵ مگر اس تحقیقات کے وقت نہ مولانا احمد اللہ زندہ تھے نہ مولانا یحییٰ علی

دہائیوں کی رہائی اور پابندیاں: ان تمام تحقیقات کے ختم ہونے کے بعد حکومت ہند نے دسمبر ۱۸۸۲ء میں فیصلہ کیا کہ تمام دہائی قیدی جو اب تک سزائے قید بھگت رہے ہیں رہا کر دیئے جائیں، انہیں اپنے اپنے گھروں کو واپس جانے کی اجازت دی جائے اس شرط کے ساتھ کہ پولیس کے زیر نگرانی رہیں اور رہنے سہنے میں مقامی حکومت کے عائد کردہ احکام کے پابند رہیں۔

۵ فروری ۱۸۸۳ء کو چھٹوں قیدی رہا کر دیئے گئے۔ ان میں سے عبدالرحیم، عبدالغفار پٹنہ کے تھے اور یہیں رہنے کی اجازت چاہی۔ پٹنہ کے مجسٹریٹ نے ان کو اس شہر میں واپس آنے دینے کی درخواست کی مخالفت کی۔ اس نے یہ عذر پیش کیا کہ ”اگرچہ دہائی قصبہ دب گیا ہے، اس فریقے کا مذہبی جوش اب بھی موجود ہے اس لئے بے شبہ رہا کر وہ دہائی باعث ہمدردی بن جائینگے۔۔۔۔۔ اور ان کے فرضی جرائم کا چہرہ چا اور ان کی سزایابی اور حبس دوام جذبات کو ابھار دینگے۔ لیکن اس نے مزید لکھا کہ اگر حکومت ان کی رہائی کے ہی حق میں ہے تو بہتر یہ ہوگا کہ ان سے پٹنہ کے عوض بھاگلپور میں سکونت اختیار کرنے کو کہا جائے۔ پٹنہ جیسے کثیر آبادی کے شہر میں پولیس کی نگرانی مشکل سے قابل عمل ہوگی۔ رانا پور اور پھلواری کے متصل شہر بھی دہائیوں سے بھرے پڑے ہیں اور وہاں کی آمد و رفت کے روابط کا رد کنا بھی مشکل ہوگا۔“

مگر حکومت نے اس خیال سے اتفاق نہ کیا اور پٹنہ کے دہائیوں کو اس شرط کے ساتھ اپنے گھروں کو لوٹنے کی اجازت دے دی گئی کہ اپنے نقل و حرکت کی باقاعدہ رپورٹ پولیس کو دیتے رہیں۔

عبدالرحیم کی مراجعت پٹنہ: چھ رہا شدہ دہائیوں میں سے عبدالرحیم اور چار اور قیدی^۱ اوائل مارچ ۱۸۸۳ء میں پورٹ بلیر سے روانہ ہوئے اور دوسرے مہینے میں پٹنہ پہنچے۔ ان سے کہا گیا کہ اقرار ناموں پر دستخط کر کے اقرار کریں کہ بہ باہ کی پہلی تاریخ کو ذاتی طور پر مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے ہاں حاضری دیں اور پہلے سے اجازت لئے بغیر کہیں باہر نہ جائیں۔ سات سال تک یہ حکم سختی سے نافذ رہا۔ اس کے بعد جزو ڈھیلا کروایا گیا۔ باقی دو قیدیوں میں سے مسعود نے پہلے اپنے معاملات کے ختم کرنے کے لئے چھ

۱۔ عبدالرحیم، تبارک علی، جعفر اور عبدالغفار تھے۔

ماہ اور ٹھہرنے کی اجازت چاہی اور دے دی گئی۔ بعد میں اس نے اس حکم میں ترمیم کرا لی اور ۲۸ اپریل ۱۸۸۳ء کو ایس ایس بہارانی جہاز سے رخصت ہو گیا۔

جعفر تھا تیسری کی رہائی: جعفر کی رہائی کچھ دنوں کے لئے ملتوی رہی اس لئے کہ ان کی دوام حبس کی منزا یافتہ بیوی رہا نہ ہوتی تھی۔ آخر مئی ۱۸۸۳ء میں جعفر کی عرضداشت کے جواب میں وہ بھی رہا کر دی گئی اور وہ گھر جانے کی تیاری میں مصروف ہو گئے۔ جعفر نے اپنی رخصت کے وقت چاہا کہ اپنے گھر کو مسجد میں تبدیل کر دیا اور مقامی مسلمانوں کے لئے وقف کر دیں۔ مگر ڈپٹی کمشنر برچ نے اس کی اجازت نہ دی تاکہ کہیں مزید وہابی سازشوں کا مرکز نہ بن جائے۔ آخر جعفر نومبر میں روانہ ہوئے اور سال کے آخر میں اپنے وطن پہنچ گئے۔

باب ۹

تحریک کا آخری منظر

وہابی جدوجہد ہندوستان میں ^{۱۸۶۸-۸۲}

احمد اللہ کا مقدمہ وہابی تحریک کی تاریخ میں ایک ستون منظر تھا۔ ان کی گرفتاری اور مزائے ہندوستان میں وہابی تنظیم کو کمزور ضرور کر دیا مگر جیسا کہ ملاحظہ کیا جاتا ہے یہ اس کے خاتمے کی نشان دہی نہیں کرتی بلکہ انجام کا آغاز تھی۔ وہابیوں کے کام کے جاری رہنے کا ثبوت ۱۸۶۵ء کے مقدمات کے بعد کئی اور مقدمات کے چلانے سے ملتا ہے۔ جو تفتیشیں ان مقدمات پر منتج ہوئیں وہ بہت ہمہ گیر تھیں اور عملاً قریب قریب سارے ملک پر چھا گئیں۔ پولیس کے حکام کے علاوہ بالخصوص ریلی ڈی آئی جی پولیس حکمہ خاص اعلیٰ افسر تحقیقات تھا۔ انھوں نے پچھلے تحقیقات میں اور پشاور ڈھاکہ اور راولپنڈی پونا جیسی بعید المسافت جگہوں میں اُلجھے ہوئے سلسلوں کا کھوج لگانے اور مربوط کرنے میں نمایاں مستعدی اور قابلیت دکھائی۔ اس وقت کے ریلی اور انس کے نائبین نو بوسٹو گھوش اور ایشی پرنسڈ کے روزنامے اور ان کی تحقیقات کی رپورٹیں جو اس زمانے میں معلومات کے اصل ذرائع ہیں سرسری نظر میں بہت اُلجھے ہوئے سے ہیں۔ ایک دن یہ مورخہ ایٹ آباد ہے دوسرے ہفتے میں مورخہ مالده یاراج محل ہے۔ ذیل کے بیان میں مختلف وہابی مرکزوں کی تحقیقات کا ذکر ان کے سیاق و سباق اور ترتیب زمانی کے لحاظ سے پیش کرنے کی کوشش کی جاتی ہے۔ اس

موضوع کا مطالعہ دو نمایاں عنوانات کے تحت کیا گیا ہے (۱) برطانوی ہند کے اندر تحریک کی کارکردگی اور مقدمات (۲) دہلیوں کی سرحدی ریاست میں اس کا آخری منظر۔ احمد اللہ کی گرفتاری پر دہلیوں میں بے چینی: احمد اللہ کی ایک بیک گرفتاری اور پھر جزیرہ انڈمان میں قید عمر نے دہلیوں کو حواس باختہ اور کچھ مدت کے لئے تنظیم کو مفلوج ضرور کر دیا۔ تاہم حاجی پور ضلع مظفر پور کے حاجی مبارک علی نے کام پھر شروع کر دیا۔ وہ ولایت علی کے قدیم رفقا میں سے تھے۔ اُن سے اپنے تعلقات مستحکم کرنے کے بعد مبارک علی پٹنہ چلے آئے اور ولایت علی کے مکان کے برابر ایک گھر میں رہ پڑے۔ احمد اللہ نے اپنی گرفتاری کے وقت تنظیم کا کام ان کے سپرد کر دیا۔ کچھ عرصہ تک وہ احمد اللہ کی مدافعت اور مقدمہ سے متعلق دوسرے امور میں مصروف رہے۔ مقدمہ کے اختتام کے بعد تنظیم کی طرف توجہ کی۔ بہار اور بنگال میں بعض مرکز ابھی کام کر رہے تھے۔ مرکز مالده اور اس کے قائد رفیق منڈل کا ذکر ہو چکا ہے۔ ۱۸۶۵ء میں ان کے بیٹے امیر الدین کی کاروائیوں کی کچھ اطلاع حکام کو مل چکی تھی لیکن اس وقت ان کے خلاف کوئی کارروائی نہیں کی گئی، غالباً اس لئے کہ حکام اس وقت احمد اللہ کے معاملہ میں زیادہ الجھے ہوئے تھے۔

۱۸۶۸ء کے اواخر میں حکومت کی توجہ اُن مراکز خصوصاً راج محل اور مالده کی جاری کارروائیوں کی طرف مبذول کی گئی۔ ریڈی ڈی آئی جی پولیس نے اپنی دو مسلسل چٹھیوں میں ان دنوں مقامات پر دہلی کارروائیوں کی بنا اور طریق کار پر ایک سیر حاصل رپورٹ دی۔

راج محل کے ابراہیم منڈل :-

اس علاقے میں دہلیوں کی کاروائیوں پر راج شاہی اور بھاگلپور کے کمشنروں نے پہلی رپورٹ دی۔ دہلی اسٹیشن کمشنر راج محل نے ریلی کو ہدایت کی کہ نو بوشٹروں کے اسٹیشن کمشنر پولیس کو موضع کلیا چک ضلع مالده میں جو اصل مرکز معلوم ہوتا ہے تعینات لے۔ راج محل پہلے سے مالده تھا، بعد میں وہ ضلع مرشد آباد میں داخل کر دیا گیا۔ فی الحال وہ بہار کے ضلع سنتھال پرگنہ کا ایک سب ڈویژن ضلع مالده اگرچہ بنگال میں ہے مگر راج محل علاقہ کے مقابل گنگا کے پار واقع ہے۔ دونوں مرکز باہم مل جلنے کا کام کر رہے تھے۔

کر دیا جائے۔ چنانچہ گھوش وہاں چلا گیا اور ایک ہفتہ تک تاجر پارچہ جات ریشمی کے بھیس میں قیام کر کے بہت سی اطلاعات اور شہادتیں جمع کیں جن سے یہ ثابت کرنا مقصود تھا کہ کلیا چک سے متصل کئی گاؤں میں اس مقصد سے کھلم کھلا چندے جمع کئے جاتے تھے تاکہ اسلامی حکومت قائم کی جائے اور انگریز کفار کو ملک سے نکال باہر کیا جائے۔ اس نے یہ پتہ بھی لگایا کہ ایک شخص نظیر سردار اس علاقے میں چندوں کی تحصیل کے خاص کارکنوں میں تھا۔ کچھ دنوں کے بعد گھوش نے دیکھا کہ اس کی شخصیت کاراز کھل گیا، اور اب اس کے پھرنے کا کوئی فائدہ نہیں تو وہ مجسٹریٹ مالده کے پاس گیا اور آٹھ آدمیوں لہ کے خلاف جن پر وہابیوں کے لئے چندے کی تحصیل کے کام میں مصروفیت کا شبہہ تھا گرفتاری کے وارنٹوں کی درخواست کی۔

شہادتوں سے ظاہر ہوا کہ نظیر سردار ساکن قاضی گرام مقامی سردار ہے، کئی سال سے (تحریک میں) عملی اور نمایاں حصہ لیتا رہا ہے اور یہ کہ اس نے ضلع کے بہت سے آدمیوں کو سرحد جانے کی ترغیب دی ہے۔ جیسا کہ بتایا جا چکا ہے چندوں کی تحصیل مختلف شکلوں میں ہوتی تھی۔ جو چندہ نہ دیتے ان کا سماجی بائیکاٹ (مقاطعہ) کیا جاتا۔

ابراہیم منڈل کی گرفتاری: شہادتوں سے ایک شخص ابراہیم منڈل کو بھی مرکز کے سردار کی حیثیت سے جن کے پاس نظیر سردار ساری محصلہ قوم بھیج دیا کرتا تھا، سان لیا گیا۔ ابراہیم منڈل پاکر میں ڈپٹی مجسٹریٹ کی عدالت کے قریب موضع اسلام پور میں رہتے تھے۔ جو ریلوے لائن سے کچھ دور نہ تھا۔ مجسٹریٹ مالده سے درخواست کی گئی۔ کہ ابراہیم کے خلاف وارنٹ جاری کر دے۔ ریلی احتیاطاً خود براہ راست راج محل نہیں گیا تاکہ کہیں اس کی آہٹ پا کر ابراہیم نکل نہ بھاگے۔ اس نے گھوش کو مٹرک سے اسلام پور بھیج دیا۔ گھوش

لہ یہ تھے نظیر سردار ساکن موضع قاضی گرام، عبد الواحد ساکن موضع نکئی پور، گھورن خان ساکن موضع معظم پور، جمورن شیخ ساکن موضع لاکھو پور، بنو عاصی ساکن موضع معظم پور، سورکن ملا ساکن موضع معظم پور اور دھوکا ملا ساکن موضع آغا ملکی۔

ایک مسلمان معلم کے بھیس میں ٹیوشن (معلمی) کی تلاش کے بہانے سے وہاں جا کھڑا اتفاق سے اس کی ڈبھیڑ ابراہیم کے ایک بھتیجے سے ہو گئی جو سیدھا اسے اپنے چچا کے گھر لے گیا جو مطلوب شکار تھا۔ لڑکے نے بتایا تھا کہ میرے چچا کسی معلم کی اعانت کے لئے گاؤں بھر میں سب سے موزوں آدمی ہیں۔ الغرض ابراہیم دوکانسٹبلوں کی مدد سے جو گھوش کے پیچھے پیچھے آئے تھے گرفتار کر لئے گئے۔ اسٹنٹ کمشنر ولوٹ اور اس کا نائب ہینر بھی اس جگہ پہنچ گئے۔ وہ ابراہیم کی گرفتاری میں گھوش کی مدد کے لئے راج محل سے ہاتھی پر آئے تھے۔ وہابی تحریک متعلق شہادتیں: جو شہادتیں لی گئی تھیں ان کی روشنی میں ریلی نے رپورٹ دی کہ دوسرے ضلعوں میں بھی مسلمانوں میں اسی طرح کی تحصیل و تبلیغ عام ہے اور جب تک اس مجنونانہ تحریک کو بند کرنے کے لئے عملی اقدامات نہ کئے جائیں اس کے اور پھیلنے کا امکان ہے۔ اس نے اس خیال کا اظہار بھی کیا کہ ”اس تحریک میں کوئی بااثر زمیندار یا کاشتکار شامل نہیں۔“ زمین نہ رکھنے والے کاشتکاروں کو زیادہ تر یہ امیدواری کہ راغب کیا گیا کہ کامیابی کے بعد ان کی زمین پر سے لگان اٹھا لیا جائیگا۔ اس لئے قدرۃ زمینداروں سے یہ امید نہ تھی کہ وہ اس تحریک میں ساتھ دیں۔

یہ امر قابل توجہ ہے کہ بہار اور بنگال میں ہمیشہ اس تحریک پر سرگرمی سے لبیک کہنے والے زیادہ تر یہی بے زمین کاشتکار تھے۔ باراسٹ کی شورش میں بھی یہی لوگ پیش پیش تھے۔ اگرچہ تحریک کی زیر سطح اعتقادی لہریں خصوصاً بنگال میں اس کے سیاسی دھارے میں دیکر رہ گئیں اور اس لئے ہنر اور اوکنیل جیسے مصنفین نے اس کی دم میں مذہبی لیبیل (چٹ) باندھ دیا، بہر حال وہ معنی خیز اور لائق توجہ ہیں۔

گرے کی تحقیقات: یہ بات دلچسپی سے خالی نہیں کہ ایک نیل کاشتکار گرے نے ان تحقیقات میں نمایاں طور پر اوکنیل کا شریک اور اس کا بڑا مددگار تھا۔ باراسٹ کے بلوے سے بھی نیل کے کاشتکاروں کی غرض بہت کچھ متعلق تھی اور پہلا جوابی حملہ انھیں نے کیا تھا وہ وہابیوں کے اس علاقے کے کاشتکاروں میں کام کرنے اور اپنے مفاد پر اس کے ممکنہ ردعمل سے اب تک مشغول تھے۔

وہابی تحریک کے متعلق رسائل: روپیہ تحصیل کرنے کے متعلق شہادت کے علاوہ
 بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ باغیانہ رسالے بھی تقسیم کئے جا رہے تھے۔ والدہ کے
 جسٹریٹ نے رپورٹ کی کہ پولیس نے جو رسائل پکڑے ہیں ان میں سے دو کا اس نے
 مطالعہ کیا۔ ایک تھا تفسیر مرادویہ جو ۱۲۸۰ھ ہجری میں مہری گنج میں طبع ہوا۔ یہ ایک
 بہت کثیر الاستعمال پارہ عم کی تفسیر تھا۔ دوسرا رسالہ مشرقی بنگال میں پٹنہ کے سازشیوں
 کے ایک نہایت سرگرم حامی ڈھاکہ کے حاجی بدرالدین کے مختلف مذہبی مسائل پر
 فتاویٰ کا مجموعہ تھا۔ یہ جاہل بنگالیوں کی ترغیب کے لئے "بڑی خوبی سے بنگلہ میں
 نظم کیا گیا تھا۔"

مقدمہ قائم کرنے میں حکومت کی بے بسی: آخر میں ریلی نے اپنی رپورٹ میں یہ
 ارادہ ظاہر کیا کہ گرفتار شدہ لوگوں کو تعزیرات ہند کی دفعات ۱۰۸ اور ۱۲۲ کے تحت
 ملکہ (دکٹوریہ) کے خلاف جنگ کرنے کی کوشش میں اعانت کا مجرم قرار دے اس لئے
 اقرار کیا کہ اگرچہ اس بات کا کوئی ثبوت نہیں کہ فراہم کردہ روپے ابراہیم منڈل کی تحویل
 سے آگے گزرے لیکن اس مقصد کے لئے گرفتار شدہ آدمیوں کا طرز عمل قلمبند شہادتوں
 سے ثابت ہے۔

صوبائی حکومت نے اس معاملے کو گرفتار شدہ آدمیوں کے خلاف الزامات قائم کرنے
 کے لئے مشورے کے لئے قانونی مشیر کے حوالہ کر دیا۔ اس نے جواب دیا کہ اگرچہ یہ واضح
 ہے کہ کئی اضلاع میں باغیانہ نفرت پھیلانے کی تبلیغ برابر جاری رہی لیکن تحقیق کردہ
 رقم کی آخری حوالگی کے متعلق کسی ثبوت کی بغیر موجودگی باعث دشواری ہے۔ احمد اللہ
 کے مقدمے کی طرف توجہ دلاتے ہوئے جو اسی نوعیت کا تھا اس نے لکھا کہ اس مقدمے
 میں روپے کا کھوج پٹنہ سے سرحد تک دکھایا گیا تھا۔ اس مقدمے میں یہ بات نہیں۔ اس
 نے شبہ ظاہر کیا ایا جب تک روپے کی حوالگی کے متعلق مزید ثبوت مہیا نہ ہو تعزیرات ہند
 کی دفعات ۱۲۰ اور ۱۲۲ کے تحت ان پر الزامات عائد ہو سکتے ہیں۔ اس نے یہ مشورہ بھی
 دیا کہ ان تمام افسروں میں جو اس مقدمے میں کام کر رہے ہیں احمد اللہ کے مقدمے کی

مطیوعہ روداو کے نسخے تقسیم کر دئے جائیں کیونکہ وہابیوں، ان کی تنظیم اور ان کے بعض سربراہوں کی گرفتاری اور قانونی چارہ جوئی کے موضوع پر یہ کارآمد رہتا ہے۔

حکومت ایک قانونی دشواری سے دوچار ہو گئی۔ متذکرہ بالا اشخاص گرفتار تو کئے گئے تھے بعض بدہی شہادتوں پر، مگر ان کے جرم کے واقعی ثبوت جمع کرنے کے لئے کئی مقامات میں بالتفصیل تفتیش چلانا ضروری تھا۔ جب تک حکومت ہند سے ۱۸۱۸ء کے آئین کے لئے التجانہ کی جائے یہ سب اشخاص غیر معینہ مدت تک بند نہیں رکھے جاسکتے تھے۔ اس آئین نے جو قانون تحفظ ہند کا پیش خیمہ تھا، کمزری حکومت کو آدمیوں کی احتیاطی نظر بندی اور ان کو جس مدت تک ضروری سمجھے مقدمہ چلاتے بغیر زندان میں محبوس رکھنے کے لئے کچھ غیر معمولی اختیارات سے مسلح کر دیا تھا۔ لفٹنٹ گورنر نے حکومت ہند سے اپنی رپورٹ میں سفارش کی کہ تحریک کے صرف سرکردہ کو گرفتار رکھا جائے اور باقی کو رہا کر دیا جائے مگر رہا کر وہ اشخاص کی حرکات پر نظر رکھی جائے۔

..... لفٹنٹ گورنر

نے اس رستے کا اظہار بھی کیا کہ اگرچہ تحصیل کردہ رقوم کے سرحد پہنچنے کا کوئی ثبوت نہیں خود موضوع اسلام پور میں ان لوگوں کے خاندان موجود ہیں جو سرحد پر ہیں یا وہیں مر گئے۔ ان کے خاندانوں کے ارکان کی پر داحت ابراہیم ہی تحصیل کردہ رقوم سے کرتے تھے۔ دونوں صورتوں میں مقصد حقیقتہً ایک ہی تھا، وہابیوں کی امداد اس رستے کے مطابق لفٹنٹ گورنر نے حکم دیا کہ صرف ابراہیم منڈل اور نظیر سردار کو مقید رکھا جائے، باقی رہا کر دئے جائیں۔

ابراہیم منڈل سے ناروا سلوک: ابراہیم منڈل راج محل جیل میں قید کئے گئے۔ وہ کافی عمر رسیدہ تھے مگر وہ ایک بہت چھوٹی سی مرطوب کوٹھڑی میں رکھے گئے جس کی تشریح خود جیل کے ڈاکٹر نے یوں کی ہے کہ ”یہ مرطوب اور غیر ہوادار ہے، سونے کے لئے کوئی چار پائی نہیں۔ اس سے متصل کوئی بیت الخلاء نہیں، کوٹھڑی ہی کا ایک گوشہ اس مقصد کے لئے استعمال ہوتا ہے۔ اس طریقے سے لامحالہ بعض اوقات اس کوٹھڑی ہی کا خوابگاہ کے طور پر استعمال کرنا بالکل ناپسندیدہ اور تکلیف دہ ہو جاتا ہے۔“ ملحوظ ہے کہ یہ تھا وہ سلوک جو

اس شخص کے ساتھ روار کھا گیا جو ضابطہ ۳ کے تحت گرفتار کیا گیا تھا۔ اس قانون کی وجہ اجرا میں صاف صاف درج ہے کہ اس کے تحت قیدی کی صحت کی طرف "مناسب توجہ" رکھی جائے اور قیدی کے "سماجی رتبے" کے مطابق "مناسب سامان" مہیا کیا جائے۔ علاوہ بریں حکومت بنگال نے ہر جیل کے جس میں ایسے قیدی رکھے جائیں، ذمہ دار افسر کو متنبہ کر دیا تھا کہ یہ ریاست کے قیدی ہیں اور ان کے ساتھ مجرموں جیسا برتاؤ نہ کیا جائے ابراہیم کو بعد میں راج محل سے مونگیر جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

مبارک علی عظیم آبادی :-

ان گواہوں میں جنہوں نے والدہ میں بیان دئے تھے عنایت اللہ ولد فیض اللہ ساکن موضع شیخپورہ ضلع مونگیر بھی تھا۔ اس کے تفصیلی بیان سے ظاہر ہوتا ہے کہ پٹنہ کلیدی مرکز تھا اور بنگال اور سرحد کے درمیان رابطہ کی کڑی کا کام دیتا تھا۔

عنایت اللہ ولد فیض اللہ کی شہادت: عنایت اللہ نے بیان کیا کہ میرے سر حاجی مبارک علی عظیم آبادی کے مرید ہیں جو احمد اللہ کی گرفتاری کے بعد سردار ہو گئے۔ انہوں نے ذی قعد ۱۲۸۱ھ (۱۸۶۲ء) کو مجھے بلا بھیجا اور روپے کی ترسیل کی خدمت کے بارے میں مجھ سے گفتگو کی اور اس کام میں حصہ لینے کے فضائل بتائے۔ مزید استفسارات پر انہوں نے فرمایا کہ راج محل جا کر ابراہیم سے ملو وہ تمہیں مفصل ہدایات دینگے۔ انہوں نے مجھے ابراہیم کو دینے کے لئے کچھ کتابیں بھی دیں۔ میں جا کر دو ہفتے ابراہیم کے ہاں ٹھہرا اس مدت میں نظیر سردار اور بیت سے دوسرے لوگوں کو ابراہیم کے ہاں آتے اور مختلف رقوم جمع کرتے دیکھا۔ بالخصوص بقرعید کے موقع پر بڑی بڑی رقمیں جمع کی گئیں، کبھی کبھی پچاس ہزار اور ساٹھ ہزار تک جمع کی گئیں۔ روپے اکثر پٹنہ کے ایک مشہور سوداگر جرم میر خاں کی مدد سے جس کی آڑھت کلکتہ میں تھی اشرفیوں میں تبدیل کرا لئے جاتے۔ تب یہ رقمیں مبارک علی کو بھیج دی جائیں، خفیہ کار پر وازوں کی معرفت ان کو سرحد بھیج دیتے۔ ان میں ایک منیر ضلع پٹنہ کا باشندہ مولا بخش بھی تھا یہ ایک پست قد گندی رنگ کا آدمی تھا، پشتو

روانی سے بولتا اور بڑا ہوشیار اور معتبر شخص تھا۔ اور کار پر واز بھی کام کرتے تھے۔ سرحد کے راستے پر بنارس ایک اہم منزل تھی۔

ایشری پرشاد کی پٹنہ میں تقرری: عنایت اللہ کی شہادت نے پٹنہ کے کئی آدمیوں کو بھی پھنسا دیا۔ ریلی نے کوشش کی کہ ایشری پرشاد کو جو وہابیوں کے خلاف پچھلے مقدمات میں اتنا ہوشیار اور کارآمد ثابت ہوا تھا پٹنہ میں تعینات کر دے۔ لیکن وہ مونگیر میں اپنے محکمہ جاتی امتحان کی تیاری کر رہا تھا۔ اس نے وہاں سے ٹھننا نہ چاہا۔ اس لئے گھوش کو پٹنہ میں تعینات کیا گیا۔ لیکن وہ ایسا ناپسندیدہ اور پٹنہ کے عوام الناس کی پہلے کی بعض حرکات سے اس کے اتنے خلاف تھے کہ کمشنر نے اسے فوراً پٹنہ چھوڑ دینے کا حکم دیا اور اس کے مشورے کے بغیر گھوش کو پٹنہ تعینات کرنے پر ریلی سے باز پرس کی۔ گھوش کی حمایت میں ریلی کا احتجاج مسموع نہ ہوا۔ اس کی بجائے الہی بخش پورینہ سے تیسرے اکسٹرا اسٹنٹ کمشنر کو پٹنہ بلا یا گیا اور تفتیش کا کام اس کے سپرد کیا گیا۔ بعد میں ایشری پرشاد کو ریلی کی اعانت کے لئے پٹنہ میں تعینات کیا گیا۔

ایشری پرشاد کی تحقیقات: ایشری پرشاد کی آمد کے بعد تحقیقات پورے زور شور سے شروع ہو گئی۔ پتہ چلا کہ سازشی تنظیم عملاً سارے شمالی ہند میں پھیلی ہوئی ہے حکومت پنجاب و صوبہ شمالی مغربی (یوپی) کو مزاحمت کی گئی کہ ان سے درخواست کی گئی کہ ریلی اور اس کے معاونوں کو ان کی تحقیقات میں تمام سہولتیں بہم پہنچائیں۔ مدراس اور بمبئی کی حکومتوں سے بھی کہا گیا کہ اپنے علاقوں میں وہابیوں کی کاروائیوں کی صورت حال کی رپورٹ دیں۔ بہر حال اصلی تحقیقات پٹنہ میں ہوتی رہی۔

وہابیوں کی کارروائیاں مدراس اور بمبئی کے صوبوں میں؛

جس زمانے میں ریلی بنگال میں وہابی کارروائیوں کی تفتیش میں مصروف تھا اس کو معلوم ہوا کہ روپے اکثر ہندوستان سے مکہ کو بمبئی کے راستے بھیجے جاتے تھے جو حاجیوں کے بحری سفر کی سب سے بڑی بندرگاہ ہے۔ اس کے بعد روپے وہاں سے سرحد کو

بھیج دئے جاتے۔ اس نے انسپکٹر جنرل پولیس سے کہا کہ حکومت بنگال سے تحریک کرے کہ وہ صوبہ مدراس و بمبئی کی حکومتوں سے رابطہ قائم کر کے ان علاقوں میں وہابیوں کی کارروائیوں کی تحقیقات کرائے اور یہ بھی پتہ چلائے ایا ان کے اور بہادر بنگال کے وہابیوں کے درمیان کوئی تعلق موجود ہے۔ جنوبی مغربی ہندوستان میں اس تحریک کا مندرجہ ذیل مختصر تذکرہ دونوں حکومتوں کی دو رپورٹوں پر مبنی ہے۔ اگرچہ یہ رپورٹیں ۱۸۶۹ء میں وہابیوں کی عام تحقیقات کے متعلق روادوں کا ایک حصہ ہیں تاہم ایک علیحدہ مجموعہ دستاویزات ہیں۔ ریلی کو خاص طور پر یہ معلوم کرنا مقصود تھا آیا سرحد اور جنوب مغرب کے وہابیوں کے درمیان کسی رابطے کا امکان موجود ہے۔ اس سوال کا جواب اکثر حالات میں یہ تھا کہ اس مسئلہ پر کوئی نمایاں اور کھلی شہادت موجود نہیں۔ اس لئے ریلی نے جس طرح شمالی اور مغربی علاقوں کا معائنہ کیا، ان علاقوں کا بذات خود نہیں کیا اور ان میں کوئی دلچسپی نہ لی اور معاملہ جہاں کا تھا رہ گیا۔

بہر حال وہابی جنوبی مغربی ہند کے خطوں میں کافی چاق و چوبند رہے۔ دو بڑے کام جو اندرون ہندوستان میں وہابیوں کو کرنا تھے یعنی چندے جمع کرنا اور انگمہ یزوں کے خلاف لٹریچر کا پھیلانا، سرگرمی سے ہوتے رہے۔ فوج میں داخل (اپنے آدمیوں کے گھانے) کا کام جو ۱۸۳۹ء میں شروع ہوا تھا۔ اب بھی جاری تھا۔ اخبار اور رسائل بھی شہر کے جاتے اور ان میں کثرت سے مضامین شائع کئے جاتے۔

وہابی تبلیغ اسماعیل کی مدراس میں خدمات: انسپکٹر جنرل پولیس مدراس نے رپورٹ دی کہ کچھ عرصہ سے مدراس میں وہابی تحریک پر نگرانی رکھی جاتی رہی ہے۔ ۱۸۶۶ء میں ایک شخص..... مسٹی اسماعیل جو پہلے ایک ڈپٹی فوج میں سپاہی تھا اور ایک پرتوش وہابی مبلغ ہے ۱۸۱۹ء کے ضابطہ ۲ کے تحت (جو بنگال کے ۱۸۱۸ء کے ضابطہ ۱ کے مساوی ہے) مدراس میں مقید ہے۔ وہ پہلے ۱۸۵۲ء میں بغاوت پھیلانے کی علت میں فوجی لائیوں سے خارج کر دیا گیا تھا۔ ۱۸۵۶ء میں گنتور میں اس پر اس قسم کی حرکات کا شبہ ہوا۔ اس کے بعد وہ برما چلا گیا جہاں وہ ڈپٹی فوجوں میں وہابی تعلیمات کی تبلیغ کرتا رہا اس لئے وہ

تھیٹیویو (برما) سے کلکتہ چلان کر دیا گیا۔ اور پھر ۱۸۶۳ء میں اُس پر وزیرانگرم میں باغیانہ حرکات کا شبہہ کیا گیا۔ آخر ۱۸۶۶ء میں شمالی سرکار میں ایسی ہی حرکات کے لئے قید کر دیا گیا۔ وہابی مبلغ احمد اللہ کی بنگال میں کاروائیاں: ایک اور وہابی مبلغ جس نے مدراس خاص کر کے مدراس میں مقیم دیسی پیدل فوج کی رجمنٹ میں بہت کام کیا وہ بنگال کا ایک شخص مستی احمد اللہ تھا۔ اس کی کارروائیوں نے بالخصوص فوج میں کچھ اعلیٰ فوجی حکام کو چونکا دیا۔ چنانچہ مدراس کے ایڈجوٹنٹ جنرل نے کمانڈر انچیف مدراس کی ہدایت پر مدراس کے تمام کمانڈنگ افسروں کے نام حکم جاری کر دیا کہ ”وہ ایک کٹر وہابی متوطن بنگال احمد اللہ سے ہوشیار رہیں جس کا اصل مقصد سپاہیوں کو بغاوت پر اکسانا ہے۔ وہ جگہ جگہ جہاں کہیں مدراس کی فوجیں ہیں گھومتا پھرتا اور باغیانہ پیغامات پہنچایا کرتا ہے“

احمد اللہ مبلغ کی رائے پور میں گرفتاری: احمد اللہ ۱۸۶۹ء میں رائے پور میں گرفتار کر لیا گیا۔ سپرنٹنڈنٹ پولیس نے انسپکٹر جنرل پولیس صوبہ جات زیریں کے پاس اس کی گرفتاری کی رپورٹ میں لکھا کہ یہ شخص گذشتہ ستمبر میں رائے پور سے آیا تھا۔ بعض معروف وہابی اس سے ملے۔ پولیس افسر نے جن کے پاس ایڈجوٹنٹ جنرل مذکورہ کا گشتی حکمانہ موجود تھا۔ احمد اللہ کو گرفتار کر لیا۔ گرفتاری کے بعد اس نے اقرار کیا کہ ۱۸۶۰ء میں وہ وزیرانگرم گیا تھا اور وہاں ایک دیسی فوج کے کچھ جوانوں سے ملا تھا۔ پولیس سپرنٹنڈنٹ نے یہ بھی بتایا کہ اب وہ رجمنٹ رائے پور میں مقیم ہے۔ اس نے مزید لکھا کہ احمد اللہ اسماعیل خاں کا پیر ہے جو ایک معروف وہابی ہے اور چند سال ہوئے ۲۵ مدراس دیسی فوج کے سپاہیوں میں بغاوت کی تبلیغ کے لئے برہامپور میں گرفتار کیا گیا اور قید عمر کی سزا دیکر کوئم بٹور کے جیل میں مقید کیا گیا۔ احمد اللہ ۱۸۶۳ء میں ایلور (ضلع گوداوری) بھی گیا تھا اور اُس وقت سے وہاں ہابیت رو بہ ترقی ہے۔

احمد اللہ نے بیان دیا کہ وہ کپڑے، چمچہ اور ہڈی کی تجارت کرتا ہے۔ بمبئی سے کپڑے خریدتا اور مختلف جگہوں میں بیچتا ہے۔ اس بیان سے اس کی لگاتار سیر و سیاحت کی توجیہ تو ہو گئی۔ یہ بھی صاف ظاہر ہے کہ وہ تبلیغی کاموں کو اصلی کاروباری کاموں کے ساتھ

خط ملط کر دینے کی وہابی چال بھی چلتا تھا۔ کہ ضرورت پڑنے پر اپنی باقاعدہ سوداگری کو تشغی بخش طور پر ثابت کر سکے۔

سپرٹنڈنٹ پولیس رائے پور نے احمد اللہ کے متعلق مزید تفصیلی معلومات طلب کیں جو اس کے خلاف مقدمہ چلانے کی تیاری میں کام دے سکین۔ ریلی نے جواب دیا کہ مجھے پٹنہ کے علی کریم سے احمد اللہ کے متعلق کچھ اطلاعات ملی ہیں۔ ۱۸۵۶-۵۹ء کی تحریک میں علی کریم بہار کے مشہور سربراہوں میں تھے۔ وہ جون ۱۸۵۶ء کو بہار سے نکل بھاگے تھے، گورکھپور اور مانڈہ میں کئی ٹرائیوں میں لڑے تھے۔ اس تحریک کے فرو ہونے کے بعد وہ بھوپال چلے گئے۔ ان کی گرفتاری کا وارنٹ جو بہار میں پڑا رہا بیگم بھوپال کی سفارش سے اٹھا لیا گیا۔ وہ واپس آئے اور پٹنہ میں آباد ہو گئے۔ پٹنہ واپس آ کر انھوں نے وہابیوں کے متعلق معلومات بہم پہنچانے کے لئے ریلی کو اپنی خدمات پیش کیں۔ ریلی نے سفارش کی کہ حکومت ان کی پیشکش قبول کرے لیکن نامنظور کر دی گئی۔ ریلی نے لکھا کہ اب علی کریم سے احمد اللہ کے متعلق کسی مزید اطلاع کی توقع نہیں لیکن احمد اللہ کو گرفتار کرنے کے لئے ضابطہ ۳ مہر بہ ۱۸۱۸ء کے تحت کافی شہادت موجود ہے۔

انسپیکٹر جنرل مدراس نے مدراس میں وہابیوں کی کاروائیوں پر اپنے عام تاثر کا اظہار کرتے ہوئے رپورٹ دی کہ یہ زیادہ تر ان کے مذہبی عقائد سے متعلق رکھتی ہیں اور یہ کہ اگرچہ انھوں نے کسی فعل کا علانیہ ارتکاب تو نہیں کیا۔ "لیکن" ممکن ہے کہ جبری عیسائی قانون کے تحت کبھی کبھی ان کے طبعی جذبات ابل پڑیں۔"

شہر مدراس میں وہابیوں نے ایک اخبار بلیچی (میٹوک) کے نام سے نکالا جس کے خریدار تمام صوبے پر چھائے ہوئے تھے۔ اس سے بھی ظاہر ہے کہ یہ لوگ دوسری جگہوں میں بھی تحریک کی رفتار سے تعلق رکھتے تھے ورنہ ایک دور دراز کے شہر میں ایک گمنام اخبار کی خریداری نہ کرتے۔

۱۸۶۹ء
۱۵ جے۔ ایچ۔ ریلی ڈی آئی جی کا جی بی بنام آئی جی پولیس ایل بی نمبر ۲۲۳ مورخہ کلکتہ یکم دسمبر ۱۸۶۹ء

صوبہ بمبئی کے پولیس کمشنروں کی رپورٹیں، حکومت بنگال کے ایک اسی قسم کے سوال کے جواب میں حکومت بمبئی نے رپورٹ دی کہ صوبہ (بمبئی) کے مختلف پولیس کمشنروں نے اپنے اپنے علاقوں کے متعلق مندرجہ ذیل رپورٹ دی ہے:-

شہر بمبئی کے پولیس کمشنر نے رپورٹ دی ہے کہ اس شہر میں ایک سو کے قریب وہابی میں کسی شہادت سے یہ ظاہر نہیں ہوتا کہ بنگال میں ان کے مہوطنوں سے ان کا کوئی تعلق ہے۔

کیرا کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے رپورٹ دی ہے کہ چھ مہینے ہوئے کچھ وہابیوں نے نیر یاد میں ایک مسجد قائم کر لی تھی، لیکن بوہروں نے ان کو نکال دیا۔ سورت اور بروج میں بھی وہابی اکثر کچھ زیادہ نہیں کیونکہ ان کے فرقے کے عقائد مقامی آبادی کے عقائد سے اتنے مختلف نہیں۔ لیکن جب مزبدا کے پاس ریل کا پل مرمت کیا جا رہا تھا وہاں کے کچھ کاریگر (غیر بمبئی والے) جیسا کہ کہا جاتا ہے وہابی بھی تھے کام ختم ہونے کے بعد چلے گئے۔

جنوبی علاقے کے کمشنر پولیس نے رپورٹ دی کہ ضلع کلا دکھی میں کچھ وہابی خاندان ٹالیکوٹ میں رہتے ہیں۔ وہ زیادہ تر جولائے میں۔ پنج محل کے سپرنٹنڈنٹ پولیس نے رپورٹ دی کہ کوئی سات سال ہوئے ۱۸۶۲ء میں وہابیوں کی ایک معتدبہ تعداد اپنے شرب کی اشاعت کے لئے ٹونگ سے گوندھرا آئی تھی

پونا میں کچھ عرصہ ہوا ایک شخص برکت اللہ ساکن فرشتخانہ پٹی آیا اور جہاد کی تبلیغ کی۔

”پونا میں کسی مولوی کو اس زور شور سے ایسی تیز زبان میں وعظ کہتے نہیں سنا گیا جیسا اس شخص نے کیا۔ اسے ایک ایسی رجسٹر کے احاطے سے نکل جانے کی تنبیہ بھی کی گئی۔ وہ مکہ جانے کے بہانے نکل

تو گیا مگر بمبئی چلا گیا جہاں ایک متمول وہابی عثمانیت اللہ کے پاس مہر گیا۔ چند وہابی جو شہر اور صد بازار میں رہتے ہیں وہ اپنے مشغلہ کے بابے میں کچھ نہیں بتاتے۔ بجاپور سے بھی رپورٹ ملی ہے کہ مدراس کی طرف سے ایک وہابی مولوی ہاں آیا تھا۔ زیادہ تر مقامی وہابی جو لاہوں سے لئے گئے ہیں مذکورہ بالا تحقیقات کے ساتھ صدر مقام پٹنہ میں بھی تفتیش جاری رہی۔

خورشید علی اور مبارک علی کی گرفتاری: دہلی کو ایک مخبر سے معلوم ہوا کہ احمد اللہ کے مقدمے کے سرکاری گواہ الہی بخش متوفی کا بھائی خورشید علی جو اب الہی بخش کے بچے کی طرف سے اس کی دوکان کی نگرانی کرتا ہے وہ شخص ہے جس کی معرفت مبارک علی دہلی اور سرحد کو روپے بھیجتا ہے۔ الہی بخش کی جوتوں کی دوکان متعلق بہ دہلی (جہاں سے جوتے خریدتا اور اس کام کے لئے روپے بھیجا کرتا) ایک بڑا سہل واسطہ تھی اسی دوکان کو جس کی پہلے پولیس تلاشی لے چکی تھی یہ سمجھا کہ حکام اب اس پر شبہ نہ کرینگے منتخب کرنے کے لئے دہلی نے مبارک علی کی ڈھٹائی پر رائے زنی کی خورشید کی دوکان کی تلاشی لی گئی اور کاغذات پر قبضہ کر لیا گیا۔ ان سے مختلف رقوم کے جمع کرنے اور ۱۲۸۲ھ، ۱۲۸۵ھ ہجری (۱۸۶۶ھ) میں دو رقوم ۹۷۲۸ روپیہ اور ۱۱۹۱۲ روپیہ کی ترسیل کا پتہ چلا۔ نہ ان ترسیلات کی کوئی توجیہ پیش کی گئی نہ کارروہار کے سرمایہ نے ایسے منافع کی تائید و توثیق کی۔ چنانچہ دسمبر ۱۸۶۸ھ کو خورشید علی اور مبارک علی دونوں گرفتار کر لئے گئے۔

دہلی میں تحقیقات:

پٹنہ میں تحقیقات کے دوران میں ایشری بے شاد کو معلوم ہوا کہ مبارک علی نے ایک شخص امید علی ساکن باقر گنج دنگال، کو جو دہلی میں مقیم تھا چند خط لکھے تھے۔ ایشری پر شاد فوراً دہلی پہنچا، امید علی کا پتہ لگا کر اس کے گھر کی تلاشی کرائی اور کاغذات پر قبضہ کر لیا۔ اس تلاشی سے منبہد مطلب نتائج حاصل ہوئے اور پنجاب، سرحد شمالی مغربی اور بہار میں مختلف مقامات میں وہابیوں کے متعلق اہم سراغ ملے۔

امید علی نے اقرار کیا کہ اس کو مبارک علی سے خطوط اور روپے وصول ہوئے تھے اور سرحد سے اس کے نام آئے ہوئے خطوط بھی اُس کے پاس بھیجے تھے۔ اُس نے چند دہائی کارپروازوں کے نام بھی بتائے جو سرحد کو روپے لے جاتے تھے۔ ان میں مبارک علی عظیم آبادی کا بیٹا تبارک علی (معروف یہ قاور بخش) بھی شامل تھا۔ چنانچہ تبارک علی ٹپنہ میں گرفتار کر لیا گیا۔

شاہزادہ فیروز شاہ: امید علی نے ایک اور معنی نیز اطلاع دی اُس نے کہا کہ ایک روز صبا میں اپنے رفیق کار محمد امین کی دوکان پر بیٹھا تھا میں نے کئی آدمیوں کو دیکھا جو محمد امین سے ملنے آئے تھے۔ ان کے بارے میں دریافت کرنے پر اس نے مجھے بتایا کہ وہ شاہزادہ فیروز شاہ کے پاس سے آئے ہیں جو سرحد پر رہتے ہیں وہ فیروز شاہ کی طرف سے وکن کے بعض راجاؤں کے نام خطوط لائے ہیں۔ شاہزادے نے ان کو مدد کے اُن وعدوں کی یاد دہانی کی ہے جو انھوں نے گذر ۱۸۵۷ء میں ان سے (شاہزادے سے) کئے تھے اور ان سے درخواست کی ہے کہ دریا سے آکس (جیوں) پر اُن سے آئیں۔ ان خطوط پر فیروز شاہ کی مہریں بھی تھیں۔ مہر قطر میں باشت بھر تھی، ایک دائرے میں خانوادہ تیموریہ کے کل بادشاہوں کے نام تھے اور خود فیروز شاہ کا نام مرکز میں تھا۔ یہ خط فیروز شاہ کے بھائی شہزادہ ایزاد (ایزد) بخش کو پہنچانے تھے جو اپنی ماں کے ساتھ دہلی میں ایک جھونپڑے میں رہتا تھا اور ایک کپڑے کی دکان رکھتا تھا۔ سوال کرنے پر ایزاد بخش نے کہا کہ میں بھائی کے قاصدوں کے ہاتھ سے خط لینا نہیں چاہتا۔ آخر نذیر حسین کے ہاں جاتے ہوئے جو دہلی میں پھانگ حبش خاں کے قریب رہتے تھے راستے میں ان سے ملنے پر رضامند ہو گیا۔

۱۷ فیروز شاہ اکبر ثانی کا بھتیجا اور بہادر شاہ ثانی کا چچرا بھائی تھا۔ ۱۸۵۲ء میں سفر حج کو چلا گیا تھا اور اُس وقت ٹوٹا جب کہ شورش جاری تھی۔ اس میں اس نے نمایاں حصہ لیا تھا اور اس کے استیصال کے بعد ۱۸۶۸ء میں سرحد کے علاقے میں جڑ ہا اور کچھ عرصہ تک احمد کے پاس رہا۔ اسی نے شہزادہ ایزاد بخش کے بارے میں لکھا تھا دہلی میں کوئی شخص بھی دہلی کے ایک شاہزادے سے گز بھر لٹھا خرید سکتا ہے۔ دنیا کا جاہ و جلال یوں ہی گذر جاتا ہے۔“

نذیر حسین محدث دہلوی: نذیر حسین تفسیر اور فقہ اسلامی کے مشہور استاد شروع میں سورجگڑھ ضلع ہونگیر کے متوطن تھے۔ بعد میں وہ دہلی میں جا بسے شروع میں سید احمد سے ان کی ملاقات نے ان کو کچھ متاثر اور اس تحریک کا ہمدرد بنایا ہو گا گو اس کا کوئی یقینی ثبوت نظر نہیں آتا۔ مگر امید علی کے بیان نے نذیر حسین کو یہ کہہ کر صاف صاف ٹوٹ کر لیا کہ فیروز شاہ کے قاصد آئے تھے تو وہ بھی موجود تھے۔ نذیر حسین کے گھر کی تلاش سے بہت مشتتبہ قسم کے خطوط نکلے۔ ان میں سے بعض معروف و نامور جیسے جعفر تھانی سوری اور مبارک علی عظیم آبادی کے خطوط بھی نذیر حسین کے نام تھے۔ ایک خط نذیر حسین کا لکھا ہوا سرحد کے وہابی سردار عبداللہ کے نام بھی تھا۔ ریلی نے ضابطہ ۲ کے تحت ان کی گرفتاری کی سفارش کی لیکن وہ ایک مشہور و معروف عالم تھے، اور ان کے خلاف سی اٹینان بخش شہادت کے بغیر حکومت اس انتہائی اقدام سے متامل تھی۔ حکومت نے اس معاملے کی رپورٹ حکومت پنجاب کو (جس کے ماتحت خطہ دہلی تھا) بھیج دی اور درخواست کی کہ وہ جو اقدام مناسب سمجھے کرے حکومت پنجاب نے ان کو احتیاطی طور پر چھ ماہ جیل میں قید رکھنے کا حکم نافذ کیا مگر اس کے فوراً بعد ہی ان کو رہا کر دیا۔

دسمبر ۱۸۶۵ء میں عبداللہ نے راولپنڈی میں جو بیان دیا تھا۔

اس کے مطابق نذیر حسین دہلی میں وہابی کارکنوں کے صدر تھے۔ راج محل کے ایک اور گواہ نے بھی شہادت دی کہ نذیر حسین نے اس کو سرحد جانے پر آمادہ کیا تھا۔ ریلی نے سفارش کی کہ نذیر حسین کے معاملے کی دوبارہ جانچ کی جائے اور گواہوں سے ان کا مقابلہ کرایا جائے۔ کاغذات حکومت پنجاب کو پھر بھیجے گئے مگر معلوم ہوتا ہے کہ ان کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ مگر بعد کی تحقیقات میں وہ نمایاں طور پر نظر آئے۔

امید علی کی گرفتاری :- امید علی کی بعض اور آدمیوں کے ساتھ احتیاطی نظر بندی کی گئی تاکہ وہ لازم محمد امین یا امین الدین بھی جو باقر گنج کا باشندہ تھا اور امید علی کی گرفتاری کے بعد بھاگ کر ڈھاگ چلا گیا تھا گرفتار کر لیا گیا۔

دہلی کے مجسٹریٹ کار اسٹیفن نے جس نے امید علی اور دوسروں کے بیان قلمبند کئے

تھے رپورٹ دی کہ امید علی نے دوسرے صوبوں میں وہابی کارہ پر فائزوں کے متعلق جو رپورٹ بہم پہنچائے ہیں ان پر کام کرنا چاہیے اور اس دوران میں امید علی کو قید رکھنا اور اسے کو رہا کر دینا چاہیے۔

امیر الدین ساکن مالده:

ریلی جب ابراہیم منڈل کی گرفتاری کے سلسلے میں مالده میں تھا اس کو معلوم ہوا کہ مالده کے سب سے بااثر لوگوں میں ابراہیم منڈل کے بعد دوسرا نمبر ایک شخص امیر الدین ساکن موضع سندیا نراین پور ہے۔ اس کی کاہنیاں بہت عرصے سے جاری ہیں اور حکام ان سے ناواقف نہیں۔ مارچ ۱۸۶۹ء میں گھوش کو ہدایت کی گئی کہ مالده جائے۔ وہاں جا کر اسے ۳۰ مارچ ۱۸۶۹ء کو امیر الدین کو گرفتار کر لیا۔ یہ بات معنی خیر ہے کہ اس موقع پر بھی یہ اطلاع کہ جس ضلع میں گھر سے (متذکرہ بالا) کے کارخانے واقع تھے وہاں نیل والوں کے جھگڑوں میں امیر الدین ایک نہایت مستعد کارکن پایا گیا تھا جو برسوں کام کر رہا تھا۔ اس پر مقدمہ چلانے کے لئے حکومت کی منظوری کے انتظار کے دوران میں ہی وہ گرفتار کر لیا گیا۔ مالده کے مجسٹریٹ نے رپورٹ دی کہ سر دست اس پر الزام عائد نہیں کیا جا رہا ہے اور اس کے خلاف تحقیقات ابتدائی کارروائی سمجھی جائیگی تاکہ بعد میں اس پر باقاعدہ مقدمہ چلانے کے لئے حکومت حلفیہ شہادت مہیا کر لے۔

لنٹن گورنر بنگال نے مختلف مقامات میں ان تمام تفتیشوں پر حکومت ہند کو رپورٹ دیتے ہوئے ایک جٹھی میں رائے ظاہر کی کہ ”وہابی تحریک نہایت پھیلتی جا رہی ہے۔ اس کے کارپرداز سہارنپور، تھلم، روڑکی، دانا پور، اور متفرق جگہوں میں پھیلے ہوئے ہیں۔“ لنٹن گورنر کو شبہ تھا یا ان مشتبہ لوگوں کے خلاف مقدمہ کی کاہنیاں فوجداری عدالتوں میں کامیابی سے چل سکیں گی۔ اس کی رائے تھی کہ تعزیرات ہند میں بصورت موجودہ کوئی ایسی دفعہ نہیں جس کی رو سے اس قسم کے افعال کا جو وہابیوں سے سرزد ہونے مقابلہ اور توڑ کیا جاسکے۔ ہنٹر حکام کی درگت کی ان لفظوں میں تشریح

رہتا ہے۔" فساد اتنا وسیع و ہمہ گیر ہے کہ یہ سمجھنا مشکل ہے کہ کارروائی کہاں سے شروع کی جائے۔ ہر ضلعی مرکز ہزاروں خاندانوں میں بے چینی پھیلا دیتا ہے۔ ملزم کے خلاف ممکن الحصول گواہ اسی کے وہ نئے عقیدتمند ہیں جو اپنے مالک کے ساتھ دغا کرنے پر مرنے کو ترجیح دیتے ہیں۔"

پٹنہ اور دانا پور میں تحقیقات:

تحقیقات کے دوسرے منظر میں مشعل کی شعاع پٹنہ اور دانا پور کی طرف مڑ گئی۔ تحقیقات سے ظاہر ہوا کہ دانا پور بھی ایک بڑا مصروف کار مرکز ہے۔ زیادہ اہم انکشاف یہ تھا کہ بعض نوٹ افراد ۱۸۵۷ء میں بھی سرگرم کارکن پائے گئے تھے۔ پتہ چلا کہ اردلی بازار دانا پور کے ایک باشندے پیر محمد کوراؤ لپنڈی سے خطوط لکھے گئے تھے۔ دانا پور کے ایک اور باشندے حاجی دین محمد کو اور کچھ اور آدمیوں کو وہابی قائد سرحد عبداللہ نے راولپنڈی میں متعین کر رکھا تھا۔ راولپنڈی وہابی کارپردازوں کا ایک اہم مقام تھا اور دین محمد کے ذمہ یہ کام تھا کہ پٹنہ سے آنی والی رقوم وصول کر کے ان کو سرحد منتقل کر دے۔ دین محمد کے خط میں دودھ لیا گیا موز زبان میں روپے کی خلاف قانون ترسیل کے متعلق اشارات تھے۔ ریلی نے حکومت کی توجہ اس بات کی طرف منحطف کی کہ "دانا پور جیسے اہم مقام میں جہاں ایسی رجمنٹوں کی چھاوٹی ہے مناسب ہے کہ وہابی سازشیوں کے پورے ہتھے کو گرفت میں لے لیا جائے" اس نے پیر محمد کو ضابطہ ۱۷ کے تحت گرفتار کر لینے کی درخواست کی۔ صوبائی حکومت زیادہ محتاط تھی اور پیر محمد کے ماضی کے رویہ پر کوشش سے رپورٹ مانگی۔ پٹنہ کے مجسٹریٹ نے ریلی کی درخواست کی تائید کرتے ہوئے رپورٹ دی کہ پیر محمد کی کوئی اپنی آزادانہ کمائی نہیں اور وہابیوں کا کام کرنے کے لئے جو نہیں وصول ہوتی ہیں انہیں پر گزارا کرتا ہے۔ اس نے چھاوٹی کے مجسٹریٹ ایمرسن کا قول بھی نقل کر دیا کہ پیر محمد پر ۱۸۵۷ء میں شبہہ کیا گیا تھا۔ اگرچہ اس وقت ٹیلر نے اسے چھوٹی مچھلی سمجھا تھا، لیکن اس پر حکومت کے خلاف کسی سازش میں شریک

ہو جانے کا احتمال ظاہر کیا تھا۔ وہ تبارک علی ولد مبارک علی کا خسر بھی تھا اور دونوں کے دونوں جانے بوجھے وہابی تھے اور گرفتاروں میں تھے۔ پچانچہ ضابطہ ۱۸۶۹ء کے تحت اس کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا گیا اور ۱۴ جون ۱۸۶۹ء کو اسے گرفتار کر کے دیکھا جیل میں ڈال دیا گیا۔ بعد میں انسپٹر جنرل پولیس کی درخواست پر وہ بھاگلپورہ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس کے کچھ ہی بعد حاجی دین محمد جب سرحد شمالی مغربی سے وانا پور آیا ہوا تھا تاکہ وہاں کے مقامی آدمیوں کو تحصیل زر کے کام میں غفلت سے چونکائے اسے گرفتار کر لیا گیا۔ مگر جب وہ دوکانسٹیبلوں کی حراست میں دہلی بھیجا جا رہا تھا چلتی ریل سے کود کر نکل بھاگا۔

امیر خاں اور حسمت داو خاں :-

پیر محمد کے متعلق جو اطلاعات فراہم ہوئیں ان میں کئی آدمی ملوث ہو گئے۔ ان میں پٹنہ کے مشہور و معروف سوداگران چرم امیر خاں اور حسمت داو خاں بھی شامل تھے۔ حکام بہت پہلے سے ان کی طرف مشکوک تھے۔ ان کے ہارے میں رپورٹ تھی کہ جب برادران علی کو نیک چلتی کے محلکے دینے کو کہا گیا تھا تو یہی لوگ ضامن ہوئے تھے اب صاف صاف ثبوت بھی ہاتھ آ گئے جن میں امیر خاں کا ایک خط بھی تھا۔

ترسیل زر کے لئے وہابیوں کا طریقہ کار: پیر محمد کی گرفتاری کے موقع پر بہت لوگوں نے شہادت دی تھی۔ ان میں سے شیخ جھنگڑو کا بیان خاص اہمیت رکھتا ہے کیونکہ اس سے روپے کی ترسیل میں وہابیوں کے طریق کار اور بعض محصلوں کو سونپے ہوئے علاقوں کے انکشافات ہوتے ہیں۔ گواہ نے اور باتوں کے ساتھ یہ اظہار بھی دیا کہ روپے عورت کارکنوں کی معرفت بھی بھیجے جاتے تھے (ان پر اشتباہ کا امکان کم تھا۔ آدمی اور روپے دستوں اور جھنڈوں کے سپاہیوں کے ساتھ کوچ کے دوران بھیجا بھی ایک عام ترکیب تھی۔ ایسے موقعوں پر یہ وہابی کارکن لشکروں کے شاگرد و پیشہ کی سرورس اور طور طریقے اختیار کر لیتے۔

وہابی منصوبوں میں دہلی رجمنٹوں کا کردار: یہ بیان اس بات کا بھی مزید ثبوت مہیا کرتا ہے کہ عملی منصوبے میں دہلی رجمنٹیں اہم مقام رکھتی تھیں۔ سپاہیوں پر ہوشیاری سے اپنے اعتقاد تو کھوپتے ہی تھے رجمنٹوں کی نقل و حرکت سے بھی ایک نہایت دشوار اور خطرناک کام میں مدد لیتے تھے۔ وہابی دلیرانہ جہالوں کے قائل تھے، فوجی دستوں کے ساتھ کوچ کرتے ہوتے تو فوج کے ساتھ ہاتھ دشمن کے کارکن (مخبروں) اور عذاروں سے چوکنے رہتے۔

جھگڑونے مزید بتایا کہ حاجی دین محمد اور کریم بخش حاجی پورا اور علی گنج سیوان میں، عبدالرحمن دانا پوری مہنپورا، سلطان پور اور شکتا میں (جو سب پڑوسی گاؤں ہیں) اور خدا بخش پرانے دانا پور اور دہلی گنج میں تحصیل کرتے۔ بھولے خاں اور عمدو خاں بھی آس پاس کے علاقوں میں چندہ جمع کرتے تھے۔

دانا پور، مالده اور کلکتہ میں گرفتاریاں ان تفتیشوں کے بعد دانا پور کے تقریباً ایک درجن اشخاص اور سوداگران جرم امیر خاں اور حشمت داد خاں ضابطہ ۱۳ کے تحت گرفتار کر لئے گئے۔ مالده کے امیر الدین پر بھی جو پہلے گرفتار کے مجاہد تھے ضابطہ ۱۳ عائد کیا گیا۔ حشمت داد خاں اور ان کے مختار آلی بخش اُس وقت پٹنہ میں تھے لیکن فوراً گرفتار نہیں کئے گئے تاکہ کلکتہ میں پرانے شریک کار و بار امیر خاں جو کئے نہ ہو جائیں۔ ان کو ۹ جولائی ۱۸۶۹ء کو کلکتہ میں گرفتار کیا گیا۔ اور گجیل جیل میں لایا گیا مگر جلد ہی ان کو علی پور کلکتہ جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ بعد میں حشمت داد خاں اور ان کے مختار کو بھی گرفتار کر لیا گیا۔

کرامت علی کے تمام خطوط کی جانچ پڑتال تحقیقات کے دوران ایشری پرشاد کو یہ بھی معلوم ہوا کہ سرحد شمالی مغربی میں وہابیوں کے خفیہ خطوط کرامت علی دانا پور کے نام روانہ کئے گئے تھے۔ کرامت علی کو ان خطوط کی وصولی اور بہار میں متعلق اشخاص (مکتوب الیہم) تک پہنچانے کے لئے بارہ بجلی اور دھامیں تعینات کیا گیا تھا۔ شبہ تھا کہ بھٹا، بہیا اور کبسر (واقع ضلع شاہ آباد) کے ڈاک خانوں کے

علاقوں میں کئی گاؤں میں ایسے لوگ ہیں جن کے نام ایسے خطوط آتے ہیں۔ انسپکٹر جنرل پولیس نے ان خطوط کی جانچ پر تال کے اختیار کی درخواست کی مگر صوبائی حکومت نے اس انتہائی اقدام کی ضرورت کو تسلیم نہیں کیا۔ مگر جب اس سوال پر صوبائی حکومت ہند سے رجوع کیا گیا تو اس نے پولیس کے افسر اعلیٰ کی درخواست منظور کر لی اور پوسٹ ماسٹر جنرل کو ہدایت کی کہ وہ متعلق پوسٹ ماسٹروں کو حکم دے کہ ان کے ڈاک خانوں سے گزرنے والے خطوط کا سنسر (جانچ پڑتال) ہونے دے۔ اسی طرح کمشنر اودھ کو اختیار دیا گیا۔ اس مدت میں بہت سے خطوط پر قبضہ کیا گیا اور ان کی جانچ پر تال کی گئی۔

واعظ الحق کی گرفتاری: واعظ الحق جن کو ٹیلر نے ۱۸۵۶ء میں گرفتار کیا تھا اب پھر وہ شبہ میں پکڑے گئے۔ اپنی پہلی رہائی کے بعد وہ مکہ چلے گئے اور گھر واپس آگئے تھے۔ چونکہ روپے سرحد شمالی مغربی کو زیادہ تر مکہ ہی کے راستے سے بھیجے جاتے تھے اس لئے واعظ الحق پر شبہ کیا گیا۔ واعظ الحق کے خلاف ان کے بھتیجے عزیز الحق نے اطلاع درج کرائی تھی۔ کمشنر نے ان الزامات کی پوری تحقیقات کی مگر ان کی شرکت کے متعلق وہ پوری طرح متیقن نہ ہوا۔

ایلی کی روانگی پنجاب: بہار اور بنگال میں تحقیقات کی اصل تصویر اب تک مکمل ہو چکی تھی اور تحریک کے اکثر سربراہ آدرہ سردار گرفتار کئے جا چکے تھے۔ مگر دوسرے مقامات خصوصاً پنجاب اور سرحد شمالی و مغربی میں تفتیشیں اب بھی جاری رکھنا تھیں۔ اس لئے ریلی پنجاب روانہ ہوا۔

بہار اور بنگال میں گرفتار شدہ اشخاص کے خلاف مقدمات دائر نہیں کئے گئے تھے کیونکہ اس سے پہلے شمال و مغرب میں تفتیشوں کی تکمیل ضروری سمجھی گئی۔ تمام تنظیمیں ایک دوسرے میں گھٹی ہوئی تھیں اور حکومت چاہتی تھی کہ مقدمے چلانے سے پہلے جتنی اطلاعات مہیا ہو سکیں ان سے اپنے آپ کو مسلح کر لے۔ اس سے ان لوگوں کی دسمبر ۱۸۶۸ء سے جولائی ۱۸۶۹ء تک گرفتاری اور ان کے خلاف اکتوبر ۱۸۶۸ء سے مارچ ۱۸۶۹ء تک کے درمیان غیر معمولی تاخیر کا سبب واضح ہو جاتا ہے۔

اس مدت میں بہت سے قیدی اپنے بیانات دینے اور مختلف مقامات میں جہاں ایک ہی وقت میں تفتیشیں جاری تھیں مشتبہ اشخاص سے مواجہہ و مقابلہ کرنے کے لئے ایک سے دوسرے جیل میں منتقل کر دئے گئے۔

مرتضیٰ کی نشان دہی: ریلی ستمبر ۱۸۶۹ء میں اپنے سفر پنجاب میں اپنے ساتھ ایک شخص مرتضیٰ نامی باشندہ مالہ کو جو کبھی سرحد شمالی مغربی کے دہلی مرکز میں رہا تھا اپنے ساتھ لے گیا تھا۔ ریلی اُس کو اس خاص مقصد سے لے گیا تھا کہ اُن لوگوں کی نشان دہی کرے جن کو اُس نے دہلیوں کے ساتھ ان کے مرکز میں دیکھا ہو یا جن کے بارے میں اُسے علم ہو کہ وہ دہلیوں کے شریک کلمہ ہوں۔ مرتضیٰ نے ریلی کی توقع سے زیادہ اس کا مقصد پورا کیا۔ اُس نے پشاور میں متعدد آدمیوں کو دہلیوں کا کارکن بتایا۔

پشاور میں دہلیوں کی گرفتاری: ان میں مفتی حسینی (معروف بہ محمد حسین و غلام حسین وغیرہ) احمد علی دانا پوری، وہ معروف قاصد جو بار بار پٹنہ سے پشاور تک ہماری پولیس کے گھرے سے کامیابی کے ساتھ نکل بھاگتا رہا ہے، غلام ربانی شہر پشاور میں عطر اور شربت کا بساطی، سید خان، مقامی کماندار جنرل ہیلی کا خاناں جس کی گرفتاری نے شہر میں سنسنی پھیلا دی، فیاض علی دانا پور کا ایک نو مسلم پہلے پہلے تھا اور کئی اور آدمی تھے۔ مفتی حسینی کا مقدمہ بہت دل چسپ ہے۔ بہت دنوں تک وہ اپنے آپ کو حکومت کا جاسوس ظاہر کرتا رہا اور اس زب کو اس کامیابی سے نبھاتا رہا کہ حکام کو اس پر کبھی شبہ نہ ہوا۔ اس کے برعکس جب وہ گرفتار کیا گیا اور جامعہ تلاشی ہوئی تو اس کے قبضے سے بڑے بڑے اعلیٰ عہدہ داران فوجی دہلی کی دی ہوئی ٹیک چلنی کی سرٹیفیکٹس نکلیں۔ لیکن آخر ایک بیک مرتضیٰ نے مواجہے سے اس کا راز فاش کر دیا۔ اس کے گھر سے جو کاغذات پکڑے گئے ان میں سے ایک شخص امار علی کا خط تھا جو کبھی فرخ آباد پولی کا ڈپٹی مجسٹریٹ تھا اور ۱۸۵۷ء میں باغیوں میں شریک تھا بھاگ کر سرحد پہلا گیا تھا اور اُس وقت شہزادہ فیروز شاہ کے ساتھ تھا۔

عبداللہ کی گواہی: اسی مہینے ریلی مرتضیٰ کو لیکر اور بالائی حصے قبائلی علاقے میں چلا گیا جو دہلی مرکز سے بخط مستقیم (کوڑے کی پرواز سے) تیس میل پر واقع تھا۔ وہاں سے اُس نے جو اطلاعات سمجھیں وہ اس راست کی تاریخ کی دوبارہ ترتیب میں بڑی گراں قدر ہیں جس کا ذکر ابھی آتا ہے۔ اسی درمیان میں ریلی کو ایک اور اہم گواہ عبداللہ ساکن حاجی پور مل گیا جس نے ۱۲ اکتوبر ۱۸۶۹ء کو راولپنڈی کے اسسٹنٹ کمشنر کے ساتھ ایک بیان دیا جس

کا پہلے ذکر ہو چکا اس بیان نے شمالی بہاؤ خصوصاً ضلع تربت میں جسے بقول ربی اب تک پوسن افسروں نے ہاتھ نہیں لگایا اور جہاں سے معتدبہ رقوم ارسال کی گئیں، وہابی تنظیم کے متعلق قیمتی اطلاعات بہم پہنچائیں، اور پنجاب وغیرہ میں بھی وہابی کارپردازوں کے بارے میں اطلاع مہیا کی۔

عبداللہ نے اور باتوں کے ساتھ یہ اظہار بھی دیا کہ احمد اللہ ساکن مظفر پور، ولایت علی کا ایک خلیفہ، تربت کا ایک بااثر وہابی ہے۔ اور بارہ سو روپے سالانہ چندہ دیا کرتا ہے، ضلع میں اس کے بہت سے مرید اور کارکن، مولانا بخش اور حافظ جعفر علی ساکن مظفر پور، مظفر پور، مصطفیٰ علی ساکن درجنگ، عابد حسین ساکن موضع شیوہر (درجنگ)، اور شیخ سبحان علی ساکن موضع مہنا (درجنگ) وہ مقامی سردار ہیں جو باقائدہ پابندی کے ساتھ مرکز پٹنہ کو روپے بھیجے رہتے ہیں۔ مظفر پور اور شیرگھاٹی (گیا) کے روپے پیر محمد فراہم کرتا ہے۔ ان کارپردازوں میں جو یہ رقوم سرحد کو پہنچاتے ہیں مولانا بخش، احمد علی عظیم آبادی اور نظام الدین لکھنوی سب سے زیادہ معتبر اور تاجر کارکن ہیں۔ عبدالحق ساکن سورج گڑھ (مونگیر) اور عبد الغنی ایک اور معتد کارپرداز ہیں۔

تحریک کے سرپرستوں میں امیر خاں اور زور آور خاں عظیم آبادی سب سے زیادہ ممتاز ہیں۔ اول الذکر کے چندے کی رقم بارہ سو روپے سالانہ ہے عبداللہ (میں) جب سرحد کو ہجرت کر رہا تھا تو امیر خاں نے اُسے (مجھے) سات ہزار روپے دئے تھے۔ تحریک کے زیادہ مہتمم بالشان سرپرست نواب ٹونگ ہیں سید احمد کے بھانجے محمد اسمعیل اور عبدالرحمن نواب ٹونگ سے روپے لیتے اور سرحد کو چلا دیتے ہیں۔

اس سے پہلے مئی ۱۸۶۹ء میں حکومت پنجاب نے حکومت بنگال کو کشتراؤ لپنڈی کی ایک چٹھی بھیجی تھی جس میں ایک شخص مستی نخر اللہ (فقیر اللہ؟) کی گرفتاری کی خبر دی تھی جس پر وہابی کارکن ہونے کا شبہ تھا۔

پنجاب میں وہابی کارکنوں کی گرفتاری: عبداللہ کے بیان متذکرہ بالا میں پنجاب کے کارکنوں کا ذکر حسب ذیل ہے:-

فخر اللہ کی راولپنڈی میں گرفتاری کے بعد ایک اور کارکن عبدالعزیز کو ہدایت کی گئی کہ وہ روپوش ہو جائے، چنانچہ وہ داناپور بھاگ گیا۔ مفتی حسین ایشوری اس کی جگہ لینے چلے گئے اور راولپنڈی میں لال کوٹھی میں رہنے لگے۔ وہاں ایک اور کارکن پچی مسجد کے امام علیم الدین تھے۔ ان کے ذمہ یہ کام تھا کہ لال کوٹھی اور دوسرے مقامات سے تحصیل کردہ رقوم سرحد پار کے قاصدوں تک پہنچادیں ان قاصدوں میں ایک مراد علی تھے جو ہزارہ کے ایک ویران قبرستان میں تارک الدنیا بنکر رہا کرتے۔ جھلم کا کارکن محمد نعمان تھا۔ وہ بھی روپے مراد علی ہی کی معرفت بھیجا کرتا۔ اس نے دین محمد عظیم آبادی سے دو کتابیں بھی، صراطِ مستقیم و بلوغ المرام (مجموعہ احادیث) طلب کی تھیں جس کی اس نے فوراً تعمیل کی۔

غلام شاہ حاجی کی گرفتاری یہ ساری تفتیشیں جو ۱۸۶۹ء میں سارے ملک میں لگاتار چلتی رہیں، دوسرے سال بھی جاری رہیں۔ اوائل مارچ ۱۸۷۰ء میں سنتھال پریگنہ کے ڈپٹی کمشنر نے غلام شاہ حاجی کو آٹھ اور آدمیوں کے ساتھ جن پر وہابی ہونے کا شبہہ تھا گرفتار کر لیا۔ رپورٹ کی گئی تھی کہ غلام شاہ حاجی ساکی راج محل ابراہیم منڈل کی گرفتاری کے بعد سردار بننے میں کامیاب ہو گئے اور اپنا کام جاری کر لیا۔ کمشنر ہانگلو نے حکومت کو یہ اطلاع دیتے ہوئے اپنا خیال ظاہر کیا کہ اس علاقے میں وہابیوں کی جدوجہد دوبارہ شروع ہو گئی ہے اور بہتر ہو گا کہ ریلی ایک بار پھر راج محل آئے۔ اس نے یہ اطلاع بھی دی کہ میں نے دو ڈپٹی کمشنر کو ہدایت کر دی ہے کہ حکومت کی اس پالیسی کے مطابق کہ صرف سرداروں کو گرفتار کیا جائے اور چھوٹی چھوٹی گرفتاریوں اور تفتیشوں کے جاں میں نہ اٹھایا جائے، صرف غلام شاہ کو گرفتار کر کے رہا کر دے۔

ریلی کی راج محل کے وہابیوں کے متعلق رپورٹ، چنانچہ ریلی راج محل آیا اور رپورٹ دی کہ اکتوبر ۱۸۶۰ء میں جب میں پھلی بار اس حصہ ملک میں آیا تھا اس وقت سے اب میں ان مذہبی دیوانوں میں نمایاں تغیرات ہوں۔ بے شبہہ وہ اب بہت زیادہ دیہاتوں کے لئے تیار ہیں، اس نے آشوبش کے ساتھ دیکھا کہ جو لوگ فراہمی چندہ میں حصہ لینے

یا تحریک کے کام میں عام طور پر تعاون کرنے میں شرکت نہ کریں ان کے خلاف سماجی مقاطعہ کی دہشتناک سزا موثر طور پر استعمال کی جاتی ہے۔ سماجی مقاطعہ کی دھمکی جسے اُس نے حق پائی بند کی اصطلاح سے تعبیر کیا جاہل دیہاتیوں میں تحریف کا ایک ہتیناک آکر کار سے اور وہابی اس سے پورا کام لے رہے ہیں۔ بالخصوص غلام شاہ کے بارے میں ریلی نے لکھا کہ پہلے وہ کلکتہ کا باشندہ تھا، عبد الجبار کا مرید ہو گیا اور سترہ برس ہو سے کہ راج محل کے علاقے میں تعینات کیا گیا، جب سے وہ یہاں مقیم ہے، ورزی کی دوکان کھول رکھی ہے۔ مگر درحقیقت وہ ابراہیم منڈل کے سب سے قابل نائبین میں سے ہے اور روپیہ تحصیل کرنے اور ہم عقیدہ بنانے میں اُس کی بڑی مدد کی ہے۔ ابراہیم منڈل کی گرفتاری کے بعد سے وہی مقامی سردار تھا۔

ابراہیم کا بھتیجا مولا بخش (جو غلام شاہ کے ساتھ گرفتار ہوا اور بعد میں کشر کے حکم سے رہا کر دیا گیا) ایک دوسرا اہم وہابی کارپرداز تھا۔ وہ صرف سنہالی پرگنہ میں سرگرم کارکن نہ تھا بلکہ ضلع مالده میں بغاوت کی تبلیغ کرتا تھا۔ ریلی نے نہ صرف غلام شاہ کے ضابطہ ۱۳ کے تحت گرفتار کرنے کی سفارش کی بلکہ مولا بخش کے دوبارہ گرفتار کر لینے پر بھی زور دیا۔

موضع ہنس پوکھر کے متعلق رپورٹ: ریلی مالده بھی گیا اور رپورٹ دی کہ اس ضلع کا موضع ہنس پوکھر بغاوت کا دوسرا سرگرم مرکز ہے۔ اُس نے یاد دلایا کہ ۱۸۶۵ء ہی میں اس گاؤں کے وہابیوں کی کاروائیوں کی طرف حکومت کی توجہ منطف کی جا چکی ہے۔ اب تک گاؤں کی مسجد میں جہاد کے لئے تحصیل جاری ہے۔ یہاں کے باشندے مرکز سرحد سے جہاں اس گاؤں سے رنکوٹوں کی بہت بڑی تعداد مقیم ہے کثرت سے مراسلت رکھتے ہیں۔ امانت منڈل مقامی سردار ہے۔ میرے خیال سے اس کی گرفتاری سے باغیانہ کارروائیوں کا خاتمہ ہو جائیگا۔ اس نے ضابطہ کے تحت اس کی گرفتاری کی سفارش کی۔ اس نے لکھا میں چاہتا ہوں کہ عام باشندوں کی تہنیک کے لئے اس گاؤں کی مشتبہ وہابیوں کی نظر بندی: آئندہ چند مہینوں تک بہار اور بنگال میں اور بہت سے مشتبہ وہابیوں کو نظر بند کر دیا گیا۔ مئی ۱۸۶۵ء میں لال محمد مقدمہ انبار کے ایک گواہ

استغاثہ سے ریلی کو اطلاع ملی کہ تین آدمی شرف اللہ، نظیر محمد ساکن موضع وھنارو ضلع رنگپور اور نظیر محمد ساکن بوگرا جو سرحد پر وہابی رنگروٹوں کو فوجی تربیت دیتے تھے اور سرحد پر انگریزوں کے خلاف کئی معرکوں میں شریک رہے ہیں، اب ہندوستان واپس آگئے ہیں اور اپنے گاؤں میں رہتے ہیں۔ ریلی نے ان کے خلاف ضابطہ ۳ کے تحت گرفتاری کی درخواست کی، لیکن اس کو ہدایت کی گئی کہ ان لوگوں کے بیانات کسی مجسٹریٹ کے سامنے قلمبند کرائے اور اگر مجسٹریٹ سمجھے کہ ان کے خلاف یہی طور پر مقدمہ چلایا جا سکتا ہے جیسی اس کو ضروری کارروائی کرنا چاہئے۔

بکسر میں وہابیوں کے متعلق تحقیقات ریلی کی توجہ بکسر اور اس کے مضافاتی علاقوں کی طرف بھی منعطف کی گئی۔ پہلے جب وہ تفتیشی کے ساتھ شمالی مغربی سرحد پر کام کر رہا تھا تو مرتضیٰ نے اسے بخردی کھتی کہ ضلع شاہ آباد وہابیوں کے بھرتی کے اہم ترین مرکزوں میں سے ہے۔ معلوم ہوا کہ اس علاقے کے رنگروٹ سرحد جابا کرتے اور وہاں وہابی سپاہ کی ناک (چھیرہ جزو) بن جاتے۔ ریلی نے سوچا کہ تفتیشیں جو اب تک صرف پٹنہ اور دانا پور تک محدود رہی ہیں ان کو صوبہ کے اور حصوں تک وسعت دی جائے اور جون سنہ ۱۸ کو ایشوری پر شاد کو بکسر جانے کی ہدایت کی۔

اب تحقیقات کا رخ بکسر اور اس کے قریب بہت سے قریوں کی طرف ہو گیا جو ضلع غازی پور (یوپی) تک پھیلے ہوئے تھے۔ اس گاؤں کا حائینہ کر کے ایشوری پور نے رپورٹ دی کہ سید جانے سفر میں ہمارے گزرتے ہوئے اس علاقے کے ایک گاؤں بڑا چوسا بھی نہیں تھے، اس گاؤں میں پٹھانوں کے ۵ گھر ہیں اور مشرقی و مغربی دونوں طرف میں ٹاہا ہے۔ ان میں سے ہر ایک چار چار بٹیوں میں منقسم ہے۔ مغربی بٹی کے باشندوں نے سید احمد سے بیعت کی تھی۔ وہ صادق پور کے مولویوں کے پیرو ہیں اور اپنی آمدنی کا چالیسواں حصہ زکوٰۃ میں پابندی سے پٹنہ بھیجا کرتے ہیں۔ یہ اطلال ایک لڑکے محمد علی خاں نے ایشوری پر شاد کو پہنچائی۔ وہ مشرقی بٹی باشندہ ہے جہاں کے لوگ ایک دوسرے حریف حنفی مولوی، محمد غازی پور کے پیرو ہیں۔

محمد اسحاق کی مخبری، ایک اور نوجوان مخبر محمد اسحاق ساکن موضع ڈہری تھانہ موڑھی ضلع پٹنہ نے ایشری پر شاد کو دو اور دہائی کارکنوں محمد عمر دانا پوری و مشرف علی دانا پوری کے بارے میں خبر دی۔۔۔۔۔ کہ یہ دونوں کارکن بہار کے مختلف حصوں سے چندے کے روپے جمع کرتے ہیں۔ اس نے ایک کتاب بھی پیش کی جو اس کے قول کے مطابق محمد عمر کی تھی اور جس میں پچھلے کئی سال سے تحصیل کردہ چندے کی تفصیلات درج تھیں۔ ابتدائی تحقیقات سے ظاہر ہوا کہ مشرف علی کے خلاف کوئی زیادہ شہادت نہیں اور اس کے خلاف کوئی کارروائی نہ کی گئی۔ مگر محمد عمر کے گھر کی تلاشی لی گئی اور مختلف اشخاص نے اس کو جو خطوط لکھے تھے، اور ان میں کچھ رجمنٹ ۳۲ کی پلٹنوں میں مددگی اور نینی تال میں متعین سپاہی بھی شامل تھے، پکڑے گئے۔ ان کے کاتبوں نے عمر سے خواہش ظاہر کی تھی کہ ہمارے ان اعزاء و متوسلین کی جنھیں ہم ہندوستان میں چھوڑ جائیں امداد کی جائے یا ان کے سرحد جانے کے لئے مالی اعانت کی جائے۔ ان میں کچھ ایسے بھی تھے جو سرحد سے لوٹے تھے راستے میں رگ جانا پڑا۔ اور مدد کے طالب تھے۔ ان تمام خطوط نے اس اطلاع کو موثقت کر دیا کہ پیر محمد کی گرفتاری کے بعد وہی سردار تھا۔ اور اسی لئے اس سے مدد کی درخواست کی گئی تھی۔ ۲۲ جولائی ۱۸۷۰ء کو محمد عمر گرفتار کر لیا گیا حوالات میں ڈال دیا گیا اور حکومت ہند سے درخواست کی گئی کہ ضابطہ ۲ کے تحت اس کے خلاف گرفتاری کا وارنٹ جاری کیا جائے۔ مگر حکومت بنگال نے ضابطہ ۲ کے اجراء کے لئے وجوہ ناکافی سمجھیں اور حکومت ہند سے درخواست کرنے سے پہلے عمر کے متعلق مزید جزئیات طلب کیں۔

محمد عمر کی گرفتاری و دہائی، اس درمیان میں ریلی اور ایشری پر شاد سے کہا گیا کہ متذکرہ خطوط کے کاتبوں کا کھوج لگائیں۔ بعد میں حکام کو معلوم ہوا کہ محمد عمر راحت علی کا بھانجا ہے جو ۱۸۲۵ء کی سازش پٹنہ کے سرکردہ منتظموں میں سے تھا۔ اس تازہ اطلاع نے مزید

لہ یہ مشرف علی کا بیٹا تھا جس کے خلاف اس نے کسی سرکاری نوکری کی امید پر مخبری کی۔

سرکاری تحقیقات کی رفتار تیز کر دی۔ یہ پتہ بھی چلا کہ عمر کی قرابت اور بہتے بااثر شخص سے تھی۔ جنہوں نے ۱۸۵۷ء کی تحریک میں عملی حصہ لیا تھا۔ مجسٹریٹ نے یہ خیال ظاہر کیا کہ چونکہ صوبہ کی قریب قریب تمام عدالتوں میں عمر کے قرا تہند موجود ہیں اس لئے اگر وہ مقید بھی کیا گیا تو اس کے خلاف شہادتوں کو تلف کرنے کے لئے زبردست اثرات کام کرنے لگیں گے۔ وہ صرف ایک ہفتے کے لئے حوالات میں رکھا گیا تھا اور ایک عرصے سے یہ مدت تمام بلوچکی تھی۔ اب وہ ضابطہ ۱۷ کے اجراء کے بغیر مزید قید میں نہیں رکھا جاسکتا تھا۔ اس لئے مجسٹریٹ نے اس کو ضمانت پر رہا کر دینا، اس کی نقل و حرکت پر نظر رکھنا اور اس کے خلاف شہادتیں جمع کی جانا زیادہ مناسب سمجھا۔ عمر کے کسی مزید ذکر کی غیر موجودگی سے قرین قیاس معلوم ہوتا ہے کہ آخر کار ضابطہ ۱۷ اس کے خلاف نافذ نہ ہوا۔

ہند میں وہابیوں کی وسیع پیمانے پر گرفتاری: سنہ ۱۸۷۰ء کے وسط تک سارے ہند میں اکثر ممتاز وہابی قائدین ڈھونڈ نکالے گئے اور گرفتار کر لئے گئے تھے مگر باوجودیکہ ایک سال سے زیادہ عرصے تک زبردست تفتیشیں جاری رہیں، حکومت اب تک غیر متیقن تھی ایا اس کے قبضے میں جو شہادتیں ہیں وہ قانونی عدالت میں گرفتار شدہ قائدین کے خلاف چارہ جوئی کے لئے کافی ہیں۔ اگرچہ زیادہ تر گرفتاریاں ۱۸۶۹ء میں عمل میں آئی تھیں اور اس وقت سے برابر اکثر قیدی قید سے لیکن سنہ ۱۸۷۰ء کے وسط تک نہ ان کو گرفتاری کی وجوہ کی اطلاع دی گئی نہ ان پر کسی معین جرم کا الزام عائد کیا گیا۔ بیشتر قیدی اپنی اوسط طبقے کے تھے جن کی معمولی مالی حالت نے اس غیر قانونی ایذا رسانی کو چیلنج کرنا ناممکن کر دیا تھا۔ مگر ان میں سے دو امیر خاں اور حشمت دادخاں اور پنجہ ماہی رتے اور مادی وسائل رکھتے تھے انہوں نے اس جبر و ستم کو یونہی درگزر نہیں کر دیا۔ انہوں نے مسلسل و متواتر قانونی تنازعات میں حکومت کے کرتوت کو چیلنج کیا جس نے ان کے معاملے کو زماہ کا معرکہ الا را مقدمہ بنایا۔

امیر خاں اور حشمت دادخاں کا حکومت سے مطالبہ!

دونوں بھائی ایک میوات کے پٹھان خاندان کے ممتاز ارکان تھے جن کی جڑیں بابر کے

عہد تک پہنچتی ہیں وہ عالم گنج پٹنہ سٹی کے باشندے تھے، کلکتہ میں چمڑے کی ایک چلتی ہوئی آرٹھت کے مالک تھے اور جن کا سرمایہ دس لاکھ سے زائد کا ہوگا۔ دونوں پختہ عمر کے تھے۔ گرفتاری کے وقت امیر خاں پچھتر سال کے اور حشمت دادخاں ۶۷ سال کے تھے اور دونوں امیرانہ معاشرت کے پروردہ اور خوکرہ تھے۔ دونوں ایک سال سے زیادہ سخت ایذاؤں میں رکھے گئے۔ ان کی طویل مدت قید ان کی صحت کو متاثر کرنے کے علاوہ ان کے کاروبار کو بھی جس کا اب کوئی ننگرہاں نہ تھا غارت کر رہی تھی۔ اس زمانہ میں انھوں نے حکومت کو کئی عرضداشتیں بھیج کر گزارش کی کہ خواہ ان کو گرفتاری کی وجہ بتائی جائے یا جلد ان پر مقدمہ چلایا جائے مگر سب کوششیں بے سود ثابت ہوئیں،

امیر خاں اور حشمت دادخاں کے مقدمے کا آغاز ۱۸۷۰ء اگست ۱۸۷۰ء میں قانون کی رو سے جو آخری علاج ان کے سامنے تھا اس کا سہارا لیا۔ انھوں نے کلکتہ ہائی کورٹ میں تحریک کی کہ عدالت اجرائے پروانہ کرے۔ اس وقت ہندوستان کے تین چوٹی کے بیرسٹرانسٹی، انگریز ام اور ایوانس مستغیثوں کی طرف سے کھڑے ہوئے۔ حکومت کی نمائندگی ایڈووکیٹ جنرل گراہم اور مستقل مشیر حکومت پال نے کی۔ دعووں کی سماعت جسٹس ٹارن کی عدالت میں ہوئی۔ پہلے امیر خاں کا دعویٰ پیش ہوا لیکن چونکہ دونوں دعووں کے واقعات ایک سے تھے۔ ایک کے دعوے پر جو بحث کی گئی وہ دوسرے کے دعوے پر بھی صادق آتی تھی۔ بحثوں کی تفصیلات میں اور باتوں کے ساتھ اساسی سوال بھی اٹھایا کھل برطانوی رعایا مع ہندوستانی، کو بے قاعدہ گرفتاریوں سے آزادی کا وہی حق حاصل ہے جو انگلستان میں میگنا کارٹا، بل آف رائٹس اور پارلیمنٹ کے دوسرے پاس کردہ قوانین کے تحت انگلستان میں نافذ ہیں، اس سے ہم یہاں بحث نہیں کرتے۔ سائلوں کے بیرسٹروں کی بالخصوص انگریز کی بحثیں جو آج بھی کسی فرد کی مدافعت میں جذباتیت اور عصبیت سے پاک، فصاحت کا اعلیٰ نمونہ معلوم ہوتی ہیں کچھ بھی کام نہ آئیں۔ ۲۹ اگست کو فیصلہ ہوا اور اجرائے پروانہ نامنظور کر دیا گیا۔

۱۵ ان کے ہم جدار اور اولاد خلاف ابھی تک محلہ پٹنہ ٹولی عالم گنج پٹنہ سٹی میں موجود ہیں۔

جسٹس نارمن کے قتل کا واقعہ: بے محل نہ ہوگا اگر یہاں جسٹس نارمن کے قتل کا ذکر کر دیا جائے جو لارڈ میو کے قتل کے مشہور افسانے کی طرح غلط طور پر وہابیوں کے سر تھوپا گیا تھا۔ امیر خاں کے مقدمے کے فیصلے کے اعلان کے ایک سال بعد نارمن پر حملہ وقوع میں آیا تھا۔ قتل ایک پنجابی مسیحی عبد اللہ تھا جس کا وہابیوں سے کوئی تعلق نہ تھا اور سرکاری طور پر جسے پاگل قرار دیا گیا تھا۔ جیسا کہ اوپر کہا جا چکا، امیر خاں کا مقدمہ اس وقت کا ایک مشہور و معروف مقدمہ تھا۔ اور حملہ اس کے اتنا جلد بعد واقع ہوا کہ حکام کے مخالف وہابی گروہ اور کچھ عام آدمیوں نے اس گندہ فعل کے از نکاب میں وہابیوں کو ملوث کر دینے کا اچھا موقع تاک لیا۔ جس دوران میں اجریے پروانہ کے مسئلہ کی سماعت جاری تھی، انگلستان کی ایک عدالت میں لارڈ میو گورنر جنرل اور لارڈ گرے لفٹنٹ گورنر کے خلاف مستغیثوں کی طرف سے ان کی ایذا رسانی اور جسمانی حملہ کے لئے ایک مقدمہ دائر کیا گیا تھا۔ مگر خبر نہیں کہ اس کا کیا ہوا

جسٹس نارمن کے فیصلے کے اعلان کے فوراً بعد انیسٹی نے چیف جسٹس اور جسٹس مارکبی کی عدالت میں اس فیصلہ کے خلاف اپیل کی درخواستیں دیں چیف جسٹس نے درخواست قبول کرنے سے انکار کیا مگر اپیل کرنے والوں کو ہدایت کی کہ اگر مناسب سمجھیں تو عدالت کے دستور کے مطابق ان کو رجسٹرار کے دفتر میں داخل کریں۔ چونکہ ہائی کورٹ کا ایک جج مصروف ہوگا اس لئے اس نے اپیل کی کوئی قریب تاریخ مقرر کرنا بھی منظور کیا۔ ۱۲ ستمبر کو انیسٹی نے جسٹس نارمن اور چیف جسٹس دونوں کے فیصلوں کے خلاف پیلوی کانسٹبل میں اپیل کی اجازت طلب کی۔ اسی تاریخ کو اسے بھی نامنظور کر دیا گیا۔ اس طرح حکومت اور ایک فرد کے درمیان قانونی کشتی کا پہلا دور ختم ہوا اور اندھا دھند گرفتاری سے آزادی کے ناقابل انقطاع حق کا مدعی تھا۔

امیر الدین اور ابراہیم منڈل کو سزا ملی: ایک لحاظ سے امیر خاں کی مساعی کا مہاب ہوئی جن قیدیوں کے خلاف اتنے زمانے سے مقدمہ کے بغیر کارروائی کی ہوئی تھی اس کو جلد انجام دینے کے لئے ان کوششوں نے حکومت کو مجبور کر دیا۔ امیر الدین

اور ابراہیم منڈل کے مقدمات کی سماعت پہلے شروع ہوئی۔ اکتوبر ۱۸۴۱ء میں امیر الدین کا مقدمہ مالدہ میں اور ابراہیم منڈل کا راج محل میں مسموع ہوا۔ دونوں کو جزیرہ انڈمان میں عمر قید کی سزا دی گئی اور ان کی جائیدادوں کی ضبطی کا حکم صادر ہوا۔

امیر الدین مارچ ۱۸۴۲ء میں انڈمان پہنچے۔ بعض رعایتیں جو جزیرہ کے قیدیوں کو دی گئی تھیں، جن کا ذکر ہو چکا، وہ اب منسوخ کر دی گئی تھیں اور زیادہ سخت قاعدے نافذ کر دئے گئے تھے۔ اس لئے بعد کے چند سال تک امیر الدین کو سخت سخت مصائب جھیلنا پڑے۔ بعد میں انھیں ایک مقامی مدرسے میں معلم مقرر کر دیا گیا۔

۱۸۸۳ء میں اور وہابی قیدیوں کے ساتھ انھیں بھی رہا کیا گیا۔ اپنے مولد شہر میں رہنے کی اجازت کی منظوری کے وقفے میں وہ عبدالرحیم کے ساتھ پٹنہ میں رہے۔ چند اور آدمیوں کی طرح مہینے میں ایک بار مقامی سپرنٹنڈنٹ پولیس کے سامنے حاضری دینا ہوتی تھی، اور پولیس کو اطلاع دئے بغیر کہیں باہر نہ جاسکتے تھے۔

اگرچہ ابراہیم منڈل کو بھی عمر قید کی سزا دی گئی تھی معلوم نہیں کہ وہ واقعی انڈمان بھیجے گئے یا نہیں اس بارے میں جعفر کا بیان واضح نہیں۔ ایک مقام پر وہ ایک عام خیال ظاہر کرتے ہیں کہ امیر الدین تبارک ٹلی اور ابراہیم سب گرفتار کئے گئے اور وہ "انڈمان بھیج دئے گئے مگر یہ واضح نہیں آیا وہ" میں ابراہیم بھی شامل تھے۔ کیونکہ جعفر اگرچہ بعد میں پہلے دو کے جزیرے میں پہنچے اور ۱۸۸۳ء میں ان کے رہا ہونے کا ذکر کرتے ہیں وہ ابراہیم کا ذکر کہیں نہیں کرتے۔ ایک دوسرا مولف لکھتا ہے کہ ابراہیم فی الواقع انڈمان نہیں بھیجے گئے۔ وہ ۱۸۶۸ء میں امیر خاں کے ساتھ رہا کر دئے گئے تھے اور اس صدی کے اوائل میں وفات پا گئے۔ یہ زیادہ قرین قیاس معلوم ہوتا ہے۔

ملتان پٹنہ کے مقدمہ کا آغاز: وہابی قائدین کے مقدمات کی سماعت کا دوسرا دور مارچ ۱۸۶۱ء میں پٹنہ میں شروع ہوا۔ اس میں سات آدمیوں کا چالان ہوا تھا جو تعزیرات

ہند کی مختلف دفعات کے تحت ملزم قرار دئے گئے تھے۔ ملزمین تبارک علی، پیر محمد، دین محمد، امیر الدین، امیر خاں، حسمت دادخاں اور مبارک علی تھے۔ امیر خاں اور حسمت دادخاں پر تحریک کی مالی امداد کا جرم عائد کیا گیا۔ مبارک علی پر چندے کی رقوم کی تحصیل و ترسیل کا الزام لگایا گیا۔ ان کے بیٹے تبارک علی پر یہ الزام تھا کہ وہابی فوج کے ایک دستے کی انگریزوں کے خلاف معرکہ امبیلہ میں قیادت کی تھی۔ ان پر یہ الزام بھی تھا کہ وہ فوجی تعلیم دیتے اور سرحد پر دستگیر وٹوں کو قواعد کراتے تھے۔ باقی تین پر باغیوں کی مختلف طریقوں سے اعانت کا الزام تھا۔

یہ ملزمین مختلف وقتوں میں اور مختلف جگہوں میں گرفتار کئے گئے تھے۔ ان میں سے بعض جیسے مبارک علی، کو وقفے کے دوران میں رہا کر دیا گیا۔ دوسرے ملزمین جلد جلد تمام صوبہ بنگال کے ایک جیل سے دوسرے میں منتقل ہوتے رہتے تھے لیکن بعض اور جیسے برادران خاں اور غالباً تبارک علی بھی جولائی ۱۸۶۹ء سے برابر قید رہے، لیکن سماعت مقدمہ کے وقت وہ سب اکٹھے حاضر کئے جاتے تھے۔ اور مبارک علی کو بھی دوبارہ گرفتار کر لیا گیا۔

وہابیوں کے املاک کی ضبطی اور سزا دینا، تجویز سزا کی کارروائیاں ڈی ایم باربر جانٹ مینسٹر کی عدالت میں منعقد ہوئیں۔ ۲ مارچ کے سارے ملزمین کو عدالت سیشن کے سپرد کیا گیا۔ پرنسپ ڈسٹرکٹ مجسٹریٹ کی عدالت میں مقدمہ کی سماعت ہوئی جو ۲۹ مئی ۱۸۶۹ء کو شروع ہوئی، سماعت کے دوران میں سارے ملک بلا کر لائے جانے والے ایک سو سے زیادہ گواہوں کے اظہارے لئے گئے۔ سماعت و قفوں کے ساتھ ۱۹ جولائی ۱۸۶۹ء تک جاری رہی۔ اینٹے اور انگرام جو اہرائے پروانہ کے مسئلہ کی سماعتوں میں برادران خاں کی طرف سے وکالت کر چکے تھے اس مقدمہ میں بھی ان کی نمائندگی کی۔

سارے ملزمین کو وہابی بنیادیں سنرا میں عمر قید درجزیرہ انڈمان اور تمام باقیوں کی ضبطی سنا گیا۔ یہ استثنائے حسمت دادخاں جو رہا کر دئے گئے۔ کیونکہ ان کے خلاف

۱۸۶۹ء کی قیمتیں جاہل جن میں کو لوٹوہ اسٹریٹ کلکٹر کی شاندار عمارت بھی تھی فروخت کر دی گئیں اور املاک جن کی مالیت لاکھوں لاکھ کی تھی ضبط کر لی گئیں۔

کوئی بدیہی شہادت نہ ملی اور مقدمہ قائم نہ بھیجا جاسکا۔ پیر محمد بعد میں ہائی کورٹ سے اپیل پر رہا ہوئے۔

امیر خاں وحشمت دادخاں کا انتقال: امیر خاں کی عمر اب ۸۰ برس سے زیادہ ہو چکی تھی۔ ان کی جان توڑ کوششوں سے ان کو انڈمان نہ بھیجا گیا۔ نو برس سے زیادہ جیل کاٹنے کے بعد نومبر ۱۸۴۸ء میں گورنر جنرل لارڈ لیٹن کی سفارش سے رہا کئے گئے۔ رہائی کے جلد ہی بعد ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بھائی وحشمت دادخاں نے کچھ پہلے ۱۸۴۸ء میں وفات پائی۔ دونوں پٹنہ میں مدفون ہیں۔ مبارک علی مقدمہ کے دوران شدید زد و کوب کے نتیجے میں فوت ہو گئے۔ باقی قیدی انڈمان بھیج دئے گئے۔ تہارک علی امیر الدین کے ساتھ مارچ ۱۸۴۲ء میں وہاں پہنچے۔ کئی سال سخت مصائب بھیننے کے بعد وہ ایشیائی محترم مقرر کئے گئے۔ ۱۸۸۲ء میں عام معافی کے وقت رہا کئے گئے، اور عبدالرحیم کے ہمراہ پٹنہ واپس آئے۔

یہ تھا انجام وہابیوں کے خلاف کاروائیوں کے آخری دور کا۔ وہابی سربراہوں کو گرفتار کر کے ان کو انڈمان کی دور افتادہ قیدیوں کی نوآبادی میں طویل المعیاد سزائے قید دیکر اور ان کی مادی املاک کو ضبط کر کے تحریک کو جڑ سے اکھاڑ پھینکے کے لئے حکومت کے بس میں جو کچھ بھی تھا سب کر گزری۔ مگر سید احمد نے جو شعلہ روشن کیا تھا وہ بالکل نہ بجھا سطح کے نیچے نیچے چنگاری سنگتی رہی اور کبھی کبھی شرارے بھڑک اٹھتے۔

۱۸۴۵ء: وہابی بھوپال اور رنگون میں۔

بہار میں پرنس وینز کی آمد کے وقت حکومت کو وہابیوں سے کچھ گڑ بڑ پھیلانے کا اندیشہ ہوا۔ ان کے موجودہ تنظیمی مرکزوں اور کارروائیوں کی تحقیقات کی گئی۔ ایشیائی پرنس نے دسمبر ۱۸۴۵ء میں ذیل کی خفیہ رپورٹ تیار کی۔

اس نے ظاہر کیا کہ "اس ملک میں وہابیوں کی کارروائیوں کے تین مرکز ہیں جو پٹنہ بھوپال اور رنگون میں واقع ہیں۔ ان میں سے پہلا مرکز مقامی وہابیوں کی گرفتاریوں اور قید و بند سے بہت کمزور ہو گیا ہے اس لئے انھوں نے اپنی جدوجہد وسیع تر خطوں

میں پھیلا دی ہے۔ پٹنہ میں دو مستعد کارکن ولایت علی کے بیٹے محمد حسن اور عبداللہ میں
 آخر الذکر نے افغانی قومیت اختیار کر لی ہے۔ اون الذکر کے ایک بیٹے کے بارے میں رپورٹ
 کی گئی کہ وہ لارڈ میو کے قتل کے وقت انڈیا گیا اور اس وقت ارتکاب قتل میں ملوث ہونے
 کا شبہ کیا گیا۔ دوسرے کارکن عبداللہ کی گزری پٹنہ سٹی میں پھلوں کی دوکان ہے مگر
 یہ محض نمائش ہے۔ وہ قیمتی موتی کی فروخت کے بہانے سے مختلف دسی ریاستوں کا چکر
 لگاتا پھرتا ہے۔ مگر اس کا اصل مقصد ریاستوں سے چندہ جمع کرنا ہے۔ پٹنہ کے
 مرکز سے بہت ملتا جلتا سورج گڑھ کا مرکز ہے جو نذیر حسین کی جاسے پیدائش ہے۔ یہ
 اب بھی ہندوستان میں وہابیوں کا ایک ممتاز قائد سمجھا جاتا ہے اور مدارالمہام کہلاتا ہے۔
 دوسرا مرکز بھوپال تھا جس کے سردار منشی جمال الدین تھے جنہوں نے بھوپال کی ایک
 سابقہ بیگم سے شادی کر لی تھی۔ وہاں دوسرے ممتاز وہابی صادق حسن، عبدالجبار، عبدالرحمن
 اور علی کریم تھے۔ آخر الذکر شخص خاص طور پر ایک بیباک و بے اصول کروڑ تھا۔
 تیسرا مرکز رنگون تھا۔ وہاں کے وہابیوں کی بھوپال کے مرکز سے کثرت سے مراسلت
 ہوتی۔ محمد حسین کے ایک بیٹے کے بارے میں کہا جاتا ہے کہ وہاں بھی گیا تھا۔

۱۸۸۳ء: وہابیوں کی جدوجہد شاہ آباد میں

۱۸۸۱ء میں بہار کا ضلع شاہ آباد وہابی اثر کے ایک اہم مرکز کی حیثیت سے بہت
 نمایاں ہوا۔ وہاں کے سربراہ ابراہیم ولد حکیم عبدالعلی تھے جو غدر کے زمانے میں آ رہے کی
 عدالت میں ناظر فوجداری تھے۔ ابراہیم کے بڑے بھائی علی نے ۱۸۵۷ء کی شورش میں نمایاں
 حصہ لیا تھا۔ بعد میں وہ گرفتار ہوئے اور موت کی سزا کا فیصلہ ہوا۔ ناظر کی حیثیت سے

لے لارڈ میو کے قتل میں وہابی ملوث نہ تھے (اوپر دیکھئے) یہ خیال غالباً ایشوری پرشاد کے وہابیوں
 کو قتل میں ملوث کرنے کی دھن کا نتیجہ ہے۔ علا غائباً یہ بیان غلط ہے۔ کیونکہ اُس زمانہ میں محمد حسن
 کے کسی بیٹے کے وہاں جانے کی اصلیت معلوم نہیں ہوتی۔

باپ پر فرض عائد ہوتا تھا کہ بیٹے کی پھانسی کے انتظامات کرے اس لئے انہوں نے ملازمت سے استعفا دے دیا۔ اس کے کچھ ہی عرصے کے بعد کچھ جاہل و غیر منقولہ جس کی سالانہ آمدنی تین ہزار تھی، چھوڑ کر انتقال کیا۔

کلکتہ پولس کی وہابیوں کے متعلق رپورٹ: کلکتہ پولس کی رپورٹوں سے ۱۸۸۰-۸۱

میں ابراہیم کی جدوجہد کا حال معلوم ہوتا ہے۔ ان میں سے ایک سے معلوم ہوتا ہے کہ ستمبر ۱۸۸۰ میں ڈھاکہ کے ایک شخص بدیع الزماں نے ممتاز وہابیوں کا ایک جلسہ کرنے کی کوشش کی تھی جس میں نذیر حسین دہلوی بھی شامل کئے گئے تھے۔ چونکہ وہ پولیس کے زیر نگرانی تھے۔ نذیر حسین نے دہلی میں جلسہ کرنے سے اختلاف کیا۔ اس مقصد کے لئے انہوں نے

کوئی دوردراز کا اندرونی قصبہ منتخب کرنے کی راے دی۔ ابراہیم نے مشورہ دیا کہ یہ

جلسہ مظفر پور کے قریب ایک گاؤں تاجپور میں منعقد کیا جائے۔ جلسے میں کوئی نہیں ہزار

وہابی مولوی جمع ہوئے۔ جلسے کا اصل مقصد یہ تھا کہ بغاوت پھیلانے کے لئے حکمت علی

تیار کی جائے۔ یہ بھی طے پایا کہ مختلف فرقہ وارانہ اغراض کے لئے چندے فراہم کئے جائیں

دہلی، پٹنہ اور آراہ میں مدرسے کھولے جائیں جن میں وہابی عقائد کی تعلیم دی جائے۔

تقسیم کے لئے کتابیں اور رسالے چھاپے جائیں۔ چندے کے لئے مطبوعہ اپیلیں جلسے میں

تقسیم کی گئیں اور دوسری جگہوں میں شائع کی گئیں۔ رپورٹ کے بیان کے بیان کے

مطابق "اپیل کی پذیرائی بہت حوصلہ افزا ہوئی۔ اور غریب طبقوں نے بھی جیسے درزیوں

دھوبیوں اور ستھوں نے بھی مستعدی سے چندے دئے کیے مولویوں کو جو حاضر تھے رسالے

دئے گئے اور ان سے تبلیغی دوروں کے لئے مکتبے کو کہا گیا۔ ابراہیم نے کلکتہ، دہلی، لکھنؤ

غازی پور، بنارس وغیرہ کے دورے کئے اور ان جگہوں میں تقریریں کیں۔

وہابیوں کے خفیہ اجلاس پر پولس کا چھاپہ: اس کے بعد کی ایک پولس رپورٹ

۱۸۸۱ء کا کلکتہ پولس کی خفیہ اطلاعات سے ملخص جو ڈپٹی کمشنر پولس کلکتہ لمبرٹ نے کمشنر پٹنہ کو بھیجی تھی۔ دیکھئے

میمو ۶۵۳ مورخہ ۲۳ فروری ۱۸۸۱ء ایضاً میمو ۱۲۶۲ مورخہ ۵ مئی ۱۸۸۱ء

میں کمشنر پٹنہ کو اطلاع دی گئی کہ ممتاز دہائیوں کا ایک اور جلسہ سراج گنج میں منعقد ہوا، جہاں نذیر حسین بھی اپنی بھانجی کی شادی کی شرکت کے بہانے سے گئے ہوئے تھے۔ اس تقریب نے دہائیوں کے اجتماع کے لئے ایک آسان حیلہ مہیا کر دیا۔ سربراہ آوروہ حاضرین میں نذیر حسین، محمد حسین لاہوری اور ابراہیم آردی تھے۔ جلسہ کے بانی و مہتمم ابراہیم تھے اور مقصد یہ تھا کہ ان کا تعاون حاصل کیا جائے اور۔۔۔۔۔۔ اس ملک کے دارالحرب ہونے کا اعلان کر دیا جائے۔ یہ بھی فیصلہ کیا گیا کہ چونکہ سرحد پر وہابی ریاست کا ہندوستان سے رابطہ اور اعانت نسبت بہت کمزور رہ گئی ہے، ہندوستان سے مزید رضا کاروں اور امداد کی ترسیل کی کوششیں کرنا چاہئیں۔ خفیہ اجلاس کی خبر حکام کو ملی اور مجسٹریٹ مولویوں کو اچانک جالینے کے لئے جھپٹے، لیکن اس جگہ نہ کوئی قابل مواخذہ چیز دستیاب ہوئی نہ کوئی گرفتار کیا جاسکا۔ ابراہیم آردی کی تبلیغی مہم: جولائی ۱۸۸۱ء میں پی نولن سپرنٹنڈنٹ پولیس پٹنہ نے کمشنر کو رپورٹ کی کہ ابراہیم نے اپنے کلکتہ کے ایک دورے میں تبلیغ کی ہے کہ ہر مسلمان پر واجب ہے کہ سرکاری ملازمت سے مستعفی ہو جائے اور یہ کہ کسی غیر سرکاری شغل میں آدھے معاوضے پر کام کرنا حکومت کے ماتحت اس قسم کے کام پر دوڑنے معاوضے پر کام کرنے سے بہتر ہے۔ نولن نے ابراہیم کی تقریر کے بعض خاص خطرناک پہلوؤں پر اظہار خیال کرتے ہوئے لکھا کہ ابراہیم نے احتجاج، شورش، مقدمہ بازی، فراہمی چندہ سرکاری ملازمین کو استعفا کی ترغیب و اغوا، اس طور پر کہ فوجی سپاہیوں پر اثر انداز ہوں، کے تمام طریقے استعمال کئے۔ نولن نے مزید اظہار رائے کیا کہ ابراہیم یقیناً ایسا آدمی معلوم ہوتا ہے جس پر نگرانی رکھنا چاہیے۔ اس نے یہ رپورٹ بھی کی کہ ابراہیم ایک طور کا آردی ٹیکس روپے میں ایک پیسہ لگا کر روپے جمع کر رہا ہے۔ بیگم بھوپال اس فنڈ میں چندہ

۱۵ کلکتہ پولیس کی خفیہ اطلاعات سے ملخص جو ڈپٹی کمشنر پولیس بھاکاٹہ سمیٹ نے کمشنر پٹنہ کو بھیجی تھیں۔ دیکھئے میمو ۶۵۲ مورخہ ۲۳ فروری ۱۸۸۱ء

دہندگان میں نمایاں حصہ یعنی تھیں جو بظاہر جمع تو کیا جاتا تھا ایک دیوانی مقدمہ میں مالی اعانت کے لئے جس میں ضلع آره کے وہابی اچھے ہوئے تھے مگر دراصل یہ مستحانہ کے مذہبی دیوانوں کے لئے مقصود تھا۔

متذکرہ بالا بیانات سے ظاہر ہے کہ ۱۸۸۱ء تک وہی طریق کار جاری تھا جو ہر دور میں علی یا ان سے بھی پہلے شروع کیا گیا تھا۔ ابھی تک رنگرٹ جمع کرنے، روپے فراہم کرنے اور سپاہیوں کو درغلانے پر زور دیا جاتا تھا۔ تنظیم کی عظیم تر بنی و تاویہی طاقت اس بات سے ظاہر ہوتی ہے۔ اگرچہ پے در پے ضربوں سے پرانے ڈھانچے میں سے بہت کچھ ٹوٹ بھوٹ گیا تھا پھر بھی بے بھجک پرانے طریق عمل پر کام ہوتا تھا۔

ابراہیم آروی کے خلاف تحقیقات: دوسرے سال بھی ابراہیم کے خلاف تحقیقات جاری تھی۔ پولیس انسپکٹروں نے سپرنٹنڈنٹ پولیس شاہ آباد کو ان کے بارے میں ایک مفصل رپورٹ بھیجی۔ جس میں خبر دی کہ محمد عمر کی طرح ابراہیم کے تعلقات بھی اعلیٰ درجے کے ہیں اور طاقتور اور ذی اثر رشتہ داروں سے مربوط ہیں۔ شادیوں کے ذریعہ سے ان کا رابطہ خاندان صادق پور سے بھی ہے۔ وہ عبدالعزیز ساکن رحیم آباد ضلع درہننگہ، عظمت حسین مختار کلکتہ، عبدالرحیم کے (بھائی) عبدالرؤف، لطیف حسین اور ان کے بھائی عبدالغفور (عبدالغفار) ساکن مہدادان کی شمولیت سے روپے کی تحصیل میں مشغول ہیں۔ اس سال جو روپے جمع ہوئے ان کی میزان دس ہزار سے زائد ہے۔ اس کی تقسیم ابراہیم نے کی مگر معلوم نہ ہوا کہ انہوں نے اس کو جمع کہا گیا۔ ان تحصیل کردہ رقوم میں سے بہت قلیل حصہ مدرسہ اور دوسرے ظاہر کردہ رقوم میں سے بہت قلیل حصہ مدرسہ اور دوسرے ظاہر کردہ مدات پر صرف ہوا۔ باقی رقم کثیر غیر محسوب اور نامندرج رہی کیونکہ غالباً

اس کا تعلق آره کے سینوں (حنفیوں) اور وہابیوں کے درمیان عام مسجد میں نمازوں میں آمین بالجہر سے تھا۔ یہ سینوں (حنفیوں) اور وہابیوں کے درمیان نہایت بے حقیقت و میانہ اختلافات میں ایک ہے اور اکثر جھگڑوں اور جھوٹوں کا باعث ہوا ہے، مذکورہ مقدمہ میں سینوں (حنفیوں) کو عدالت میں کامیابی حاصل ہوئی تھی لیکن وہابیوں نے ہائی کورٹ میں اپیل کی تھی۔ اٹھ مہدادان پٹنہ اور دانا پور کے درمیان شارع عام پر ایک گاڑی ہے۔ خاندان صادق پور کی ایک شاخ (الہی بخش کے اسلاف) پہلے مہدادان کے باشندے تھے۔

سرحدی کو بھیج دی گئی۔

وہابی تحریک کے خلاف موثر کارروائی: آخر میں رپورٹ میں دکھایا گیا کہ وہابی بالعموم ۱۸۷۰-۷۱ء میں اور اس سے پہلے ۱۸۶۲-۶۵ء میں اپنے سربراہوں کی سزایابی سے سخت تنگ حال بن گئے لیکن ان سزاؤں کے خلاف اندر اندر سخت بے چینی پھیلی ہوئی ہے۔ مزید متنبہ کیا گیا کہ جب کبھی ان کو طاقت ہو جائے تو یہ بے چینی حکومت کے خلاف پھوٹ پڑ سکتی ہے۔

گذشتہ صدی کے آخری عشرہ میں یہ بات ہندوستان میں وہابیوں کی صورت حال کا صحیح اندازہ تھا۔ حکومت کی زبردست پولیس کی تنظیم کا بے رحمانہ نشانہ بنکر اور پے درپے سزاؤں اور اخراج ملک کی ضربوں سے بے دست و پا ہو کر وہابی بالعموم بے ضرر مفلوج ہو گئے اور ان کے پیروں کی علم جماعت بے شک بہت کمزور اور مجبور ہو گئی۔ پھر بھی پھیلی نفی صدی میں انہوں نے جو کچھ کیا تھا اس کا اثر یہ تھا کہ حکومت ۱۸۷۰ء سے بہت عرصہ بعد تک اس کمزور جماعت سے خائف رہی۔ یہ وہ تاریخ ہے جو عموماً ہندوستان میں وہابیوں کی کشمکش کے اختتام کی نشان دہی سمجھی جاتی ہے۔

سرحد پر وہابی ریاست ۱۸۶۳-۱۹۰۲ء

آخوند سوات: معرکہ اہیلہ (۱۸۶۳ء) کے بعد زیادہ تر وہابی عبداللہ کی سرکردگی میں دریائے برندو کے شمالی چاگر زئی ملک میں جا رہے۔ آخوند سے ان کے تعلقات اب تک مخلصانہ تھے، اس علاقے میں ان کے قیام کے لئے اس نے کچھ انتظامات کر دیے۔ کچھ عرصے کے بعد وہابیوں نے چاگر زئیوں سے دو گاؤں ٹنگور اور ٹورا کی بستیاں حاصل کر لیں اور ۱۸۶۸ء کے آغاز تک امن و امان سے وہاں ٹھہرے رہے۔ لیکن وہاں وہ بعض ہمایہ قبائل کی پوشیدہ عداوت کے سائے میں بسر کرتے تھے۔ اس صورت حال کے پیدا ہونے کے اہم اسباب میں سے ایک سبب آخوند سوات اور علاقہ کے ایک دوسرے روحانی اقتدار والے کوٹھا کے ملا کے مابین اختلاف رائے اور کشیدگی تھا۔ یہ ملا کبھی سید احمد

ملا سید امیر معروف بہ کوٹھا ملا سوات اور نیکے علاقوں میں ایک بااثر پیر تھا۔ کوٹھا یوسف زئی علاقے میں جنوبی منجی گوشے میں واقع ہے۔

کے رفق میں سے تھا اور اب تک اس کے پیرو کھلم کھلا وہابی کہہ کر ہی پکارے جاتے تھے یہ نام ایک قسم کا مذہبی و شام ہو گیا تھا، وہابیوں کے ساتھ آخوند کے تعاون میں کچھ ذہنی قیود داخل کھتیں روہ کو ٹھا ملا کا کھلم کھلا مخالف تھا، کیونکہ ملا کو کوٹھا اور سوات ہی کے علاقوں میں خاصہ اثر اور اتباع حاصل تھا۔ آخوند کو اپنے حریف کے بڑھے ہوئے اثر سے اندیشہ رہتا تھا۔ مگر علاقہ سے سیدھے سادھے اور بے تعصب مسلمانوں میں وہابیت کا داغ کوٹھا ملا پر ضرب لگانے کے لئے ایک آسان ڈنڈا بن گیا اور اس کے متبعین وہابی کی حیثیت سے مبعوض و مردود قرار دیئے گئے۔ آخوند کے متبعین کی نظروں میں ہندوستانی زیادہ مشتبہ تھے۔ وہ اب بھی ایک ایسی طاقت کی نمائندگی کرتے تھے جس کی بنا سید احمد نے ڈالی تھی علاوہ بریں وہ ایک مسلح اور ترتیب یافتہ جماعت تھی جو اس کے حریف کو ٹھا کے ملا کے لئے طاقت کا ذریعہ ثابت ہو سکتی تھی۔

وہابی اور نچ کٹا : ————— اس زلزلے میں بعض حالات اور آخوند کی پوشیدہ عداوت نے وہابیوں کو بعض ایسے اقدام کے لئے مجبور کر دیا جس نے آخوند کو زیادہ مشتبہ کر دیا۔ اب تک وہ چکار زئی علاقے میں رہتے رہے لیکن مقامی لوگوں نے پناہ دینے اور سامان ہیا کرتے کے معاوضے میں ان پر اتنے لگان لگائے اور سخت محاصل ادا کرنے پر مجبور کیا کہ ان کی زندگی بہت دشوار ہو گئی۔ چکار زئیوں پر آخوند نے وہابوں کو نکال باہر کر کے کیونکہ عبداللہ اور ان کے متبعین کو ان کے درمیان نگو بنا دیا گیا۔ ان حالات میں وہابیوں نے بنیر میں نچ کٹا کے عظیم خاں کی اس کے علاقے میں منتقلی اور سکونت کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیا۔ چنانچہ وہابی بٹورا کو ترک کر کے نچ کٹا کے عظیم خاں کی اس کے علاقے میں منتقلی اور سکونت کی پیشکش کو فوراً قبول کر لیا۔ چنانچہ وہابی بٹورا کو ترک کر کے نچ کٹا کو مستقل ہو گئے جہاں شاہزادہ فیروز شاہ ان سے آ ملا۔ اس جماعت کی بنیر میں آمد کو جسے آخوند اپنا رقبہ اثر تصور کرتا تھا، اور ساتھ ہی اس حقیقت کو کہ ان کا سرپرست عظیم خاں ملا کوٹھا کا زبردست حامی تھا آخوند نے اپنے اثر کے لئے صاف خطرہ تصور کیا۔ اس نے جو کچھ اس بات پر آمادہ کر لیا کہ ہندوستانیوں کو بنیر سے خارج کر دے۔ اپنے آپ کو

اقلیت میں پا کر ہندوستانی عظیم خاں کے ساتھ بیچ کٹا کو بھڑوڑ کر اپنے قدیم مرکز ملکا کو لوٹ گئے جہاں انہوں نے اپنے قدیم متروک مکانات اور استحکامات کی از سر نو تعمیر شروع کر دی۔ اس کے کچھ ہی بعد عبداللہ آخوند سے ملے اور غلط فہمیوں کو دور کر دیا اور ہندوستانیوں کے بیچ کٹا واپس آنے کے لئے اس کی رضا حاصل کر لی۔ لیکن وہاں زیادہ عرصے تک اُن کو رہنا نصیب نہ ہوا۔ عظیم خاں اور مقرب خاں پنج تار کے محروم کردہ سردار نے پھر آخوند کے اثر کو توڑنے اور مقرب خاں کو اس کی غضب کردہ ملکیت واپس دلانے کے لئے کچھ بیبر کے قبائل اور امزیوں کی ایک لیگ قائم کرنے کی کوشش کی۔ عبداللہ کو بھی اس گٹھ جوڑ میں شریک ہونے کی ترغیب دی گئی۔ ستمبر ۱۸۶۳ء میں آخوند نے اپنے متبعین کو جمع کیا، بیچ کٹا کے سامنے اکھڑا ہوا اور ہندوستانیوں کو اس جگہ سے فوراً نکل جانے کا مطالبہ کیا۔ پہلے انہوں نے مدافعت کا ارادہ کیا اور حملہ آور گروہ سے کچھ گولیاں چلانے کا مبادلہ بھی ہوا، مگر عظیم خاں نے انخلا پر راضی ہو جانے کی صلاح دی دوسرے ہی روز انخلا شروع ہو گیا۔ عورتیں اور بچے آگے بھیج دئے گئے اور عقبی صفیں پچاس ساٹھ ریفیل سے مسلح مردوں پر مشتمل تھیں۔ جب یہ تارکین بڑے اور بیچ کٹا کے درمیان ایک تنگ گھاٹی سے گزر رہے تھے آخوند کے متبعین نے دھوکے سے اُن پر حملہ کر دیا۔ صدر دستے نے جس میں عظیم خاں اور عبداللہ تھے ڈھکے مقابلہ کیا اور درے سے گزر گئے مگر عقبی دستہ شجاعانہ مقابلے کے بعد بالکل کٹ مرا۔

وہابیوں کا پلوسی میں قیام: اس ازبیش کے بعد ہندوستانی کچھ عرصہ تک چکار زئی کے علاقہ گولیا بوری میں سمجھ سے جہاں امزائی قبیلہ والوں اور چکار زئی کے ایک طبقے نے ان سے آخوند کے مزید دباؤ کے غلامانہ اعانت کا وعدہ کیا۔ مگر آخوند کی طاقت اپنے حریف پر فتیابی سے اور بڑھ چکی تھی۔ اس نے چکار زئیوں پر زور دیا کہ ہندوستانیوں کو اپنے علاقے سے بھی نکال دینے وہابی پھر کسی پناہ گاہ کی تلاش میں نکلے۔ دریائے سندھ کے داہنے کنارے پر بہاڑ میں کچھ دن قیام کیا، پھر ستمبر ۱۸۶۸ء کے اواخر میں جد ہانی پہنچے۔ کھاری کے سردار نے

۱۵۔ یہ ہندوستان کا صوبہ بہار نہیں [مترجم نے ایک کھاری چھوڑ ضلع کیا میں ہے۔ یہ وہ نہیں] [مترجم

ان سے امداد کا وعدہ کیا، اپنے قلعہ میں پناہ اور وادی میں کچھ زمین پیش کی۔ تھا کوٹ کے سردار الائی جرگے نے بھی انگریزوں کے خلاف مدافعت کے اقدامات پر ان سے صلاح مشورے کئے۔ لیکن حکام بھی ان جنگی تیاریوں پر نگاہ رکھتے تھے۔ چنانچہ قبل اس کے کہ یہ حلیف اپنے اجتماع سے قوت پیدا کریں میجر جنرل راید ۱۸۶۸ء میں اچانک ان پر آپڑا، اور حلیف پھرتی سے منتشر ہو گئے۔ تب ہندوستانی پوسی میں جو دریاے سندھ کے پار کے حسن زامیوں کا ایک گاؤں تھا جارہے ہندوستان کے آفات میں ایک جگہ سے دوسری جگہ منتقل ہوتے رہنے کا لانا ہی سلسلہ یہاں ختم ہوا۔ اس وقت سے ایک کافی طویل مدت تک پوسی وہابیوں کا مرکز رہا۔ وہابی نوآبادی، وہابی نوآبادی کی ریاست کا منصل بیان، ان کی حربی طاقت کی ساخت اور تعداد اور آخوند کے ساتھ ان کے تعلقات ہمیں ریلی کی بعض رپورٹوں سے معلوم ہوتے ہیں جو اُس نے اُس وقت بھیجی تھیں جب وہ متذکرہ بالا امور کی تفتیش کے لئے سرحد گیا تھا۔ اُس نے رپورٹ کی تھی کہ ہندوستانیوں کی جماعت جو تین سو قابل محاربہ افراد پر مشتمل ہے دریاے سندھ کے پار بہار میں رہتی ہے اس کے خاص سربراہ عبداللہ کے علاوہ فیاض علی برادر محمد اللہ اور عبداللہ کے عین بیٹے امان اللہ مطیع اللہ اور عبدالقدوس ہیں۔ ایک اور ذمہ دار شخص اسحاق برادر مقصود علی اس وقت ملک میں تھے ان کو اپنے رفقا کو چھوڑ کر ہندوستان واپس آنے کی ترغیب کی کوششیں کی گئیں۔ محاربہ فوج آٹھ دستوں میں منقسم ہے، ہر ایک دستہ ایک جمعہ دار کے زیرِ کمان ہے اور وہ یہ ہیں: مالہ کے رجب اور دریا نتر اللہ حکیم پور کا عبدالغفور رامپور بولیہ کے معین الدین اور شریعۃ اللہ جسور کا نور الدین، عظیم گڑھ کا محمد اکبر اور زینت اللہ محاربین یا سپاہیوں کی تعداد ۳۶۳ ہے جن میں ۵۶ آرہ اور غازی پور سے آئے ہیں۔ عورتوں اور بچوں کی تعداد ستر ہے۔ ان کے پاس ۲۴ گھوڑے اور ۲۴ خچر ہیں جو بڑا آہ میں رکھے جاتے ہیں۔ رپورٹ کے مطابق ان کے پاس دو چھوٹی توپیں، ٹوپوں والی گزدار بندوقیں اور سنگینیں ہیں اور ان کے لئے ٹوپیاں بھی بہم پہنچائی ہیں۔ مگر ان میں امداد کے رک جانے سے عام بد حالی پھیلی ہوئی ہے۔ ریلی کی رپورٹ کے مطابق اس صورت حال نے عبداللہ کے کچھ معین کو وہاں سے نکل جانے پر مجبور کر دیا۔ لیکن عبداللہ نے ان کو تنبہ کر دیا ہے کہ ان میں سے جواب واپس آئیں گے ان کے لئے زنداں اور پھانسی ہے۔ ریلی نے سفارش کی کہ اگر یہ اعلان کر دیا جائے تو بہت مناسب ہو گا کہ فیاض علی

اور عبداللہ کے سوا جو لوگ واپس آئیں ان کو معاف کر دیا جائیگا۔ اس تدبیر سے عبداللہ کے آدمیوں میں غداری کی لہر دوڑ جائیگی، وہ تنہا رہ جائیگا اور غالباً مکہ کو ہجرت کر جائیگا۔“

حسن زئیوں کی وہابیوں کو پیشکش: آخر میں ریلی نے اپنی رپورٹ میں مزید لکھا کہ حسن زئیوں نے ہندوستانیوں کو آباد ہونے کے لئے اراضی کی پیشکش کے ساتھ دعوت دی ہے بہار میں عبداللہ کی علالت کے سبب سے اس دعوت کے ایجاب میں کچھ تاخیر واقع ہو گئی ہے۔ ریلی کہتا ہے کوئی شک نہیں کہ صحتیاب ہوتے ہی وہ ہمارے خلاف لڑنا شروع کر دیں گے۔ ریلی کو تعجب ہوتا ہے کہ اس حقیقت کے لئے ثبوت ڈھونڈا جا رہا ہے کہ یہ مذہبی دیوانے مکہ (وکتوریہ) سے برسر جنگ ہیں۔ وہ تو انگریزوں کے خلاف برابر مصروف ہیں۔ ان کا علانیہ مقصد انگریزوں کو ملک سے نکال باہر کرنا ہے اور ان کا رویہ دائمی مخالفت رہا ہے۔ (ریلی نے یہ اس وقت لکھا تھا جب وہ مالہ اور پٹنہ کے مقدمات سے متعلق تفتیش میں مصروف تھا۔)

فیض اللہ کی وہابیوں کے متعلق رپورٹ: ریلی نے اپنی رپورٹ کے ساتھ ایک شخص فیض اللہ کی رپورٹ بھی منسلک کی تھی، اس شخص کو ایٹ آباد کے ڈپٹی کمشنر نے ہندوستانیوں پر نگاہ رکھنے پر متعین کیا تھا۔ اس کے روزنامے کا خلاصہ دسمبر ۱۸۶۸ء سے اپریل ۱۸۶۹ء تک پڑھاوی ہے۔ اس سے ہندوستان کے خلاف اسٹونڈ کی مخالفت ظاہر ہوتی ہے۔ جس کا کچھ ذکر اوپر ہو چکا۔

۳۰ مارچ ۱۸۶۹ء کے ذیل میں فیض اللہ کی رپورٹ ہے کہ فیض علی نے اعلان کر دیا ہے کہ اگر اس کے بھائی احمد اللہ اور بھائی علی جو انڈمان میں قید ہیں رہا کر دئے جائیں اور ان کو پٹنہ واپس آنے کی اجازت دی جائے اور اگر اسلامپور کے ابراہیم منڈل کو بھی ہو اس وقت قید میں ہے رہا کر دیا جائے تو وہ اپنے تین سو متبعین کے ساتھ جنگ ترک کر کے مکہ چلے جائیں گے، اور ان کے سفر نذر کے اخراجات حکومت کو ادا کرنا پڑیں گے۔ اس اطلاع میں ریلی نے ابراہیم منڈل کے خلاف توجہ دلائی کہ وہ نمایاں طور پر وہابیوں میں ایک اہم شخصیت تھا اور اس کی گرفتاری عبداللہ کے لئے ایک شدید ضرب ہے۔ چنانچہ اس

کیونکہ یہ اس کے وقار کے خلاف متصور تھا۔ اس کے علاوہ حکومت یہ بھی نہ چاہتی تھی کہ کچھ معمولی سپاہیوں اور شاگرد پیشوں کو مراجعت کی اجازت دیدے اور سربراہوں کو سرحد ہی پر رہنے دے۔ اس سے حکومت کے خیال میں زخم میں مواد فاسد بھرتا جاتا۔ پوسٹی میں نسبتاً طویل المدت قیام نے وہابیوں کو اپنے منتشر و پراگندہ وسائل کو دوبارہ مجتمع کرنے کی مہمت دے دی جس کی سخت ضرورت تھی۔ پچھلے دس سال میں اکثر قبائل نے زیادہ تر آخوند کے مخاصمانہ اثر کے تحت ان کو بہت پریشان رکھا تھا۔ اس صورت حال نے اور مضر نتائج سے قطع نظر ان کی زوال پذیر صفوں میں مزید شکاف پیدا کرنا شروع کر دیا۔ شکایت کرنے لگے کہ انھوں نے اپنے گھربا قبائلیوں سے نہیں بلکہ انگریزوں سے لڑنے کو چھوڑے تھے۔ وہ یہ سمجھنے سے قاصر تھے کہ یہ لڑائیاں وہ اپنی مرضی سے نہیں لڑے بلکہ یہ قلیل اور شجاع جماعت بالکل تنگ نظرانہ فرقہ وارانہ اختلافات کا شکار ہو گئی جنھوں نے اس کے عظیم مقصد کو ڈبو کر رکھ دیا۔ یہ ہندوستانی جماعت اب تک ایک بڑی صلاحیتوں والی محارب طاقت تھی اب بھی وہ ہمسایہ قبائل سے زیادہ مسلح تھی۔ اس حقیقت نے اس کے افضل علم و دانش کے ساتھ مل جمل کر اسے بہت حد تک اثر بخش دیا تھا۔ چالاک قبائلی اس حقیقت کو خوب سمجھتے تھے۔ عبداللہ قبائلیوں کے ساتھ ان افسوسناک خانہ جنگیوں کو ختم کر دینے اور اپنے متبعین کو اصلی مگر عارضی طور پر ترک کئے ہوئے مقصد عظیم کی راہ پر واپس لانے کے لئے سخت عہد و جہد کر رہے تھے۔

کوہ سیاہ کی مہمات میں وہابیوں کا کردار؛ بعد میں (۱۸۸۱-۸۸ء میں)
انگریزی فوجوں کی کوہ سیاہ والی مہموں میں وہابیوں نے نمایاں کردار ادا کئے۔ اس زمانے میں کئی جھڑپوں میں وہ بڑی بہادری اور جوش سے لڑے۔ مگر ان جھڑپوں میں ان کا کردار نمایاں طور پر ثانوی تھا۔ وہ زیادہ تر مظلوم قبائلیوں کے حریف کی حیثیت سے نظر آئے۔ وہ ایک ایسی کمزور جماعت ہو گئے تھے کہ انگریزوں کے لئے کوئی بڑا خطرہ نہ ہو سکتے تھے۔ لیکن اس پر بھی وہ ایک مضمحل مگر

جوشِ آزادی کے ایک زندہ نمونہ تھے۔ اپنے ہندوستانی ہموطنوں کے دلوں میں مردہ امیدوں میں جان ڈالنے کے علاوہ نیم آزاد قبائلی علاقوں میں انگریزوں کے اثر کے نفوذ کے خلاف مدافعت کی گاڑی میں ایک مضبوط دھرا ثابت ہوئے۔ اب بھی ان میں یہ صلاحیت باقی تھی کہ قبائلیوں میں انگریزوں کے خلاف مستقل جذبے کو منظم کر کے ایک متحد اور زبردست تحریک کی شکل دے دیں، اس لئے آگے بڑھتی ہوئی انگریزی فوجوں کے جارحانہ حملوں کا بار بار شکار وہی ہوتے تھے اور اس زمانہ میں ان کا طرزِ مقابلہ مدافعتی ہوتا تھا۔

امیر عبداللہ کی فیروز شاہ سے درخواست: کوہ سیاہ کی چوتھی مہم ۱۹۱۱ء کے بعد حسن زئی کو بھی مجبور کیا گیا کہ ہندوستانیوں کو اپنے علاقے سے خارج کر دیں۔ عبداللہ کے لئے یہ سخت مصیبت کا زمانہ تھا۔ دوسرے قبائل سے کچھ اراضی چٹے پر دینے کی درخواست کی تاکہ ان کے لوگ اپنی ایک بستی بسا سکیں، مگر انگریزوں کے دباؤ سے یہ درخواست منظور نہ ہوئی۔ آخر میں عبداللہ نے اپنے پرانے سرپرست اور حامی فیروز شاہ ولد مبارک شاہ سے درخواست کی کہ وہ اپنا ایک گاؤں تلوائی آباد کرنے کے لئے دیدے۔ کچھ تامل کے بعد اس نے یہ درخواست منظور کر لی۔ مرکز میں جماعت کا یہ غیر مستقل وجود ۱۹۱۱ء میں عبداللہ کی رحلت تک باقی رہا۔

امیر عبداللہ کی عظیم قیادت: ان کی قیادت کی مدت چالیس سال سے زیادہ تھی۔ ان کی قیادت کا سب سے مہتمم بالشان کا زمانہ نمایاں طور پر مغزوہ امبیلہ کے دوران وقوع پذیر ہوا۔ لیکن ان کی ہمت و استقلال اور قیادت کی اصل آزمائش اس کے بعد ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا۔ جب وہ پیہم مصائب اور قبائلوں کی مخالفت کے سلسلہ لاتناہی میں جکڑے ہوئے تھے، اور یہ کسی شخص کے ایمان کے ڈانڈول کر دینے کے لئے کافی سے زیادہ تھا۔ مگر ان کی زبردست قوت ارادی میں کبھی نرمی نہ آئی

انہوں نے قبولِ اطاعت کی ہر تجویز یا دہم کو بھی سختی سے ٹھکرا دیا۔ قوتِ ارادی میں روئی سے ادنیٰ ضعف جو ان کے بعض متبعین میں تھوڑی دیر کے لئے بھی ظاہر ہو جاتا اس کا موثر طور پر مقابلہ کرتے اور دفع کر دیتے۔

ان کی وفات کے بعد ان کے بھائی عبدالکریم سردار منتخب ہوئے۔ ان کے عہد (۱۹۰۲ء) میں مرکزِ اہمست میں منتقل کر دیا گیا۔ یہ برنڈونڈی کے کنارے ایک زرخیز گاؤں تھا۔ اس وقت تک ہندوستان سے ہر قسم کا فائدہ بخش تعلق منقطع ہو چکا تھا اور مرکز 'اہر چند' اب بھی موجود ہے، مقامی بیابانی ماحول میں مدغم ہو گیا۔

باب

وہابی تحریک کا جائزہ

(۱) وہابی تحریک کی نوعیت :

وہابی تحریک کا آغاز تو ایک سماجی مذہبی جذبہ کے تحت ہوا تھا لیکن جلد ہی اس نے خصوصاً برادران علی کی قیادت میں اور بعد میں سیاسی رخ لے لیا۔ بعد میں بعض بندہ غرض مہنفوں نے پوشیدہ اغراض سے اس کے مذہبی پہلو کے دکھانے میں بالقصہ مبالغہ اور غلوے کام لیا۔ اس تحریک کے متعلق جو غلط خیالات پھیلے ہوئے ہیں ان میں سے ایک یہ ہے کہ یہ خالص مذہبی تحریک تھی اور خالصتہً سکھوں کے خلاف چلائی گئی تھی۔ یہ اس کی تمام تاریخ کے درخت کو حد سے زیادہ کاٹ چھانٹ کر ننگا کر دینا ہی نہیں بلکہ اس کے اصلی اغراض و مقاصد کا جان بوجھ کر حلیہ بگاڑ دینا ہے۔

وہابی انگریزوں کے خلاف جو لڑائیاں لڑے ان میں سے بعض کا بیان اوپر کیا گیا۔ یہ بھی دکھایا جا چکا کہ جب سکھوں کا وجود ایک سیاسی وحدت کی حیثیت سے ختم ہو چکا تھا اس کے بعد بھی مدت دراز تک ان کی حربی کشمکش جاری رہی، گو یہ بھی صحیح ہے کہ سید احمد کے حین حیات میں سرحد شمالی مغربی کو بنیادِ عمل منتخب کر لیا گیا تھا اور پہلا دور سکھوں ہی کے خلاف پیکار سے شروع ہوا تھا۔

عقدہ ہجرت کی توضیح: ان دونوں پہلوؤں کو کا حق سمجھنے کے لئے اسلامی عقیدہ ہجرت کی مختصراً توضیح ضروری ہے۔ یہ لازمی شرط قرار دیتا ہے کہ اگر کسی ملک پر جو پہلے اسلامی حکومت میں ہو کوئی غیر مسلم طاقت مسلط ہو جائے یا جب وہاں کی اندرونی حالات ایسی ہو جائیں کہ احکام شریعت کی پیروی ناممکن ہو جائے تو ایسے ملک کے رہنے والے مسلمانوں کا فرض ہو جاتا ہے کہ کسی اسلامی ملک میں یا جہاں ان کے مذہبی حقوق میں کوئی مداخلت نہ ہو ہجرت کر جائیں۔ اول الذکر قسم کے ملک کو دارالحرب اور دوسری قسم کو دارالاسلام کہتے ہیں۔ دارالحرب میں اپنے حقوق کی بازیابی کے لئے جنگ کرنا بھی مسلمان کا فرض ہے۔ یہ جنگ کسی امام کی رہنمائی اور سربراہی میں ہونا چاہیے اور اُسے اعلیٰ روحانی اور انتظامی قابلیتوں کا آدمی ہونا چاہیے۔ ہندوستانی علماء کے ایک طبقے نے بہت دقیق اور چھپیدہ مباحث کھڑے کئے ہیں۔ ایا ہندوستان کو دارالحرب قرار دیا جاسکتا ہے اور ایا ایک امام کی صحیح اہلیتیں کیا ہونا چاہئیں۔ ان جھگڑوں میں اُسے بغیر اتنا بتا دینا بہتر ہوگا کہ سید احمد نے اپنے ضمیر کی روشنی میں محسوس کیا کہ انگریزوں کے برسرِ اقتدار ہو جانے اور پھر ہندوستان کے آزادی سے محروم ہو جانے کے بعد یہ ملک دارالاسلام باقی نہ رہا۔ اس لئے اُنہوں نے اپنے لئے فرض سمجھ لیا کہ وہ کسی آزاد علاقے میں جو انگریزوں کے احاطہ اقتدار سے باہر ہو ہجرت کر جائیں اور وہاں سے جہاد شروع کریں۔ اس نتیجے پر پہنچ کر سید احمد کے لئے ایسے مناسب مرکز کا انتخاب کرنا رہ گیا تھا۔ ہندوستان اس وقت تک بہت حد تک یا تو انگریزوں کے براہِ راست قبضے میں آچکا تھا یا مقامی ریاستوں کے زیرِ حکومت تھا، جو ذیلی اتحادات کے لئے ایک جال کے ہندھن میں بندھی ہوئی انگریزوں سے وابستہ اور زیرِ نگیں تھیں وہ معدودہ چند ریاستیں بھی جو انگریزوں کے زیرِ اثر نہ تھیں کسی طور سے بھی ان کی مخالفت سے خائف رہتی تھیں۔

شمالی مغربی سرحد کو مرکز بنانے کی وجہ: شمالی مغربی سرحد ہی ایک علاقہ تھا جو اُس وقت تک انگریزوں کے اثر سے باہر تھا۔ یہاں کے لوگ اپنی جنگجوئی اور آزادی کی محبت کے لئے مشہور تھے۔ وہ سکھوں کے منتشر دانہ نیم فوجی تسلط سے بچ و تاپ کھا رہے تھے۔ وہ کسی شخص سے بھی ہاتھ ملانے کو تیار تھے جو ان کو آزادی کی راہ پر لانے کی معقول امید دلا سکے۔ اس علاقے کی ہیئت کذا ئی بھی ایسی

معنی کہ سید احمد اپنے پیچھے کسی مخالفانہ کارروائی کے خطرے سے محفوظ تھے۔ اس کے پیچھے بعض ریاستوں کا بلا مداخلت غیر سے ایک محفوظ خطہ تھا جس کے سرداروں سے وہ کئی سال سے مراسلہ و رابطہ کر چکے تھے اور اپنا مقصد عظیم ان پر واضح کر چکے تھے، اور جنوب اور مشرق کی طرف اپنی مجوزہ پیش قدمی کی صورت میں وہ بلوچستان، بہاولپور اور سندھ کی ریاستوں سے جو ان کے مجوزہ راستے میں پڑتی تھیں دوستانہ تعاون کی امید رکھ سکتے تھے۔

وہابی تحریک کا بنیادی مقصد: سید احمد کا سرحد کو مرکز منتخب کرنا زیادہ تر انہیں خیالات کے زیر اثر تھا۔ لیکن اس انتخاب سے ناگزیر ہو گیا کہ پہلی جھڑپ سکھوں سے ہو جن کا علاقہ سید احمد کی مشرق کی طرف پیش قدمی میں پڑتا تھا۔ کہا جاسکتا ہے کہ وہابیوں کو انگریزوں کے خلاف سکھوں سے ملکر ایک متحدہ محاذ قائم کرنا تھا، لیکن کسی فریق نے یہ سیاسی نچنگی نہیں دکھائی۔ اس کے برخلاف سکھ انگریزوں سے دوستی کا معاہدہ کر چکے تھے۔ سکھوں سے تصادم ایک ناگہانی واقعہ تھا اور اس سے تحریک کا اصل مقصد ظاہر نہیں ہوتا۔ یہ انگریزوں کے ساتھ طاقت کی آزمائش ابتدائی قدم تھا۔ کیونکہ خود سید احمد کی تحریر اس بات کی شہادت دیتی ہے کہ ان کے دماغ میں یہ خیال رچا ہوا تھا کہ ان کے اصل دشمن "سوداگر اور بنیے" (انگریز نہیں)۔

سید احمد نے اپنے مکتوب میں بار بار اس امر کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ان میں سے بعض کے اقتباسات یہاں درج کئے جاتے ہیں۔ سید احمد سکندر جاہ حیدرآباد کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں "مشیئت ایزوی سے ہندوستانی مشرکین اور یورپی کفار نے کئی معزز و موثر لوگوں کی زمینوں پر تغاب و تصرف کر لیا ہے۔ اہل علم و اہل صدق کی شان اور وقار کو خاک میں ملادیا ہے"۔ ایک اور خط میں دولت راؤ سندھیا کے بہنوئی ایک ہندو راؤ کو لکھا ہے "وہ دراز ممالک کے اجنبی ملکوں کے حکمران بن گئے ہیں اور سوداگر اور بنیوں نے سلطنت کا درجہ حاصل کر لیا ہے،

ایک اور مکتوب میں "میراصل مقصد جہاد قائم کرنا اور جنگ کو ہندوستان لے جانا ہے، خراسان کی سرزمین میں پڑا رہتا نہیں" شاہ اسماعیل نے جوکان میں سید احمد کے دو مہرے نمبر پر تھے تحریک کے اصل مقاصد کے متعلق چند سوالات کے جواب میں زیادہ وضاحت سے تشریح کی ہے۔ میر شاہ علی کے جواب میں لکھتے ہیں "ہماری طاقت رنجیت سنگھ اور کمپنی کے برابر تو نہیں مگر یہ تم سے کس نے کہا کہ امام کا ارادہ اس چھوٹی سی فوج کے ساتھ لاہور اور کلکتہ کی طرف پیش قدمی کرنے کا ہے؟ اس کے برعکس وہ دن رات مسلم فوج کی تکثیر و ترقی میں مصروف ہیں....." یہ افسانے اپنی دلیل آپ ہیں اور کسی تبصرے کی ضرورت نہیں۔

یہ امر قابل غور ہے کہ سید احمد کے مکتوب کے علو ماتہ ہندوؤں کی طرف کوئی معاندانہ اشارہ یا کوئی ایسا حوالہ جس سے اس تحریک کا ہندوؤں کے من حیث ہندو ہونے کے خلاف ہونا ظاہر ہو۔ اس کے برخلاف ان کا ایک معنی خیر مکتوب ایک بااثر ہندو سردار ہندو راؤ گوالیار کے نام ہے جس میں اُسے یقین دلایا ہے کہ جب انگریزوں کو شکست ہو جائیگی تو کچھ شرائط کے ساتھ ہندو حکمران سرداروں کے اختیارات بحال کروئے جائیں گے۔ سید احمد نے لکھا تھا "جوں ہی ارض ہندوستان غیر ملکی دشمنوں سے پاک ہو جائے اور اہل ہند کی جدوجہد سے ان کا مقصد حاصل ہو جائے، ریاست اور منظمہ کے مہرے اور ملازمین مستحقین کو دے دی جائیگی اور ان کی طاقت اور اختیارات کی بنیاد مستحکم ہو جائیگی"۔ سید احمد نے اُس کو مزید فہمائش کی کہ ان رضا کاروں کے خاندان کی نگرانی کرے اور مدد دے جو ان کے ساتھ سرحد کی ہجرت کر کے آگئے ہیں۔ سید احمد کا ہندو راؤ کو متذکرہ یقین دہانی ہی نہیں بلکہ کھوس امداد کا مطالبہ نہایت معنی خیر اور غور طلب ہے۔

متعدد ایسی مثالیں بھی موجود ہیں کہ وہابیوں نے جو چندے جاری کئے تھے ان میں ہندوؤں نے بھی شرکت کی۔ یہاں تک کہ بیٹنی کے ایک جلسے کے واقعے پر تعجب کا اظہار کیا ہے جس میں ایک وہابی مقرر کے سامعین میں زیادہ تر ہندو تھے اور مقرر نے عیسائی مذہب کے متعلق اپنے خیالات کا اظہار کیا تھا۔

یہ بات بھی قابل غور ہے کہ سرحد کو روپیہ بھیجنے کا نہایت رازدارانہ اور خطرناک کام اُن ساہوکاروں کی معرفت ہوتا تھا جن میں بہت سے ہندو تھے۔

وہابی تحریک کا دینی پہلو: ان تمام باتوں کے معنی تحریک کے دینی پہلو سے چشم پوشی نہیں۔ درحقیقت تحریک کی بڑی کمافی کم سے کم سید احمد کے جین حیات میں دینی تھی، مگر مذہبی پہلو کا نشا قوم کی حیات ملی سے بعض سماجی مذہبی برائیوں کی اصلاح تھا نہ کہ دوسرے فرقوں کے خلاف مذہبی تعصب کے بیج بونا۔ سید احمد غیر خدا کے پرستار اور منافق و ریاکار مسلمانوں کی مذمت میں بہت بیباک تھے۔ حقیقتاً سکھوں کی مخالفت سے زیادہ وہ ایسے مسلمانوں کی مخالفت پر زیادہ وقت صرف کرتے تھے۔ امت مسلمہ میں سماجی مذہبی اصلاحات کی ضرورت کا پیر چار اسی لئے کیا جاتا تھا کہ اسے آنے والی سیاسی کشمکش کے لئے قومی تر اور لائق تر بنایا جائے جیسے اوبیلی، سرمد اور ان کے بعد کچھ اوروں نے اس کے مذہبی پہلو کی نشان دہی میں (جو کھسی چیز ہے) ہی نہیں بلکہ پوری تحریک کو مذہبی اور صرف سکھوں کے خلاف قرار دینے میں غلطی کی ہے۔ ایسی رائے قائم کرنا جرح و دلائل کے مقابلے میں تحریک کی پوری تاریخ سے آنکھیں بند کر لینا ہے۔

وہابی تحریک کے متعلق ہنٹر کا نظر یہ: وہابی تحریک کی تاریخ کی ستم ظریفیوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ اس کی اصلی غرض و غایت کی غلط ترجمانی کرنے والے صرف ہنٹر اور دوسرے یورپی مصنفین جیسے نقاد ہی نہیں بلکہ بہت سے ہندوستانی بھی ہیں اور زیادہ عجیب بات یہ ہے کہ خود اس کے کچھ متبعین بھی ہیں۔

جیسا کہ سب کو معلوم ہے کہ تحریک کے سب سے پہلے اور سب سے بسیدہ حالات لکھنے والا اور شائع کرنے والا ڈبلیو ڈبلیو ہنٹر تھا۔ اُس نے لکھا کہ بعض سیاسی اقتصاداتی اسباب کی بنا پر سارے مسلمان من جٹ مسلمان حکومت (برطانوی) کے مخالف ہیں، یہ خیال اُس کی کتاب کے نام ہی سے ظاہر ہے "ہمارے ہندوستانی مسلمان۔ ایادہ ایمان سے ملکہ کے خلاف بغاوت کے لئے مجبور ہیں؟" وہابی تحریک کی تاریخ کی جدید تدوین اور بالخصوص اس کے طرز تنظیم کے سمجھنے میں ہنٹر کی تحریر بے شک بڑی

قدر و قیمت رکھتی ہے۔ اس نے اپنے غور و فکر سے تحریک کی علت غائی مخالفت انگریز ہونے کا جو نتیجہ نکالا ہے وہ ہے تو بالکل ٹھیک مگر اس موضوع پر اس کے عام طرز بیاباں میں ایک بڑا نقص یہ ہے کہ اس نے تحریک کے فرقہ وارانہ پہلو پر مبالغہ کے ساتھ زور دیا ہے۔ اس نے ہر بات کو ہندو مسلم فرقہ وارانہ تصادمِ اغراض سے تعبیر کرنے کی کوشش کی ہے۔ اس کوشش میں اس نے تحریک کے زیادہ وسیع سیاسی مذہبی پس منظر سے اغماض کیا ہے۔

ہنٹر کے استدلال سے مسلمانوں کے ماتھے پر مخالفتِ حکومت کا جو ٹیکہ لگتا ہے۔ ہندوستانی مسلمانوں کے ایک طبقے نے برامان کر اس کی تردید کی۔ اس طبقے کے لکھنے والوں نے حکومت کی وفاداری کے بلند بانگ اعلانات میں نگارشات کا ایک ڈھیر لگا دیا ہے اور وہابی تعلیمات کی تردید میں وہابیوں کو مسلمان ماننے سے بھی انکار کیا ہے، اس کی مقدار اتنی ہے اور صاف طور پر ایسی قدویانہ و غلامانہ ہے کہ یہاں تفصیل سے اس پر بحث کرنے کی گنجائش نہیں۔ اتنا بنا دینا کافی ہو گا کہ خود ہنٹر^۱ اس بلند بانگ اعلان وفاداری کے متعلق مشتبہ ہو گیا۔

ہنٹر کے نظریہ کی تردید: ہندوستانی مسلمانوں کے اور زیادہ ذمہ دار طبقے نے بھی ہنٹر کے نظریہ کی تردید کی۔ ان میں سر سید احمد خاں سب سے زیادہ اہم ہیں۔ اور ہنٹر کی کتاب پر ان کا تبصرہ و تنقید اس طبقے کی تحریرات کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ انھوں نے یہ تنقید ہنٹر^۲ کے دعویٰ کی صاف صاف تردید میں لکھی۔ انھوں نے ثابت کیا کہ وہابی نہ انگریزوں کے خلاف ہیں نہ حکومت کے انھوں نے اس نکتے پر زور دیا کہ وہابی تحریک خالصتاً سکھوں کے خلاف چلائی گئی تھی۔ تحریک پر ان کی بعض رائیں قابل توجہ ہیں۔ شاہ اسماعیل کے بارے میں انھوں نے کہا کہ اس مبلغ نے اپنی تمام زندگی میں

۱۔ اور انڈین مسلمانوں صفحہ ۱۴۲ ۲۔ یہ تنقید جو علیحدہ شائع کی گئی ہے وہ گراہم کی "سر سید احمد کی زندگی اور کارناموں" میں ۱۸۸۵ء لندن میں دوبارہ منقلاً شائع کی گئی ہے۔ ملاحظہ ہو صفحہ ۲۰۵ تا ۲۲۲۔ یہ اقتباسات اسی سے ماخوذ ہیں۔

ایک لفظ بھی ایسا نہیں نکالا جسے اس کے ہم مشربوں کو انگریزوں کے خلاف آکسانے سے تعبیر کیا جاسکے۔ ایک اور مقام پر انھوں نے ظاہر کیا کہ انھوں نے کہا تھا کہ ”انگریزی حکومت میں مسلمانوں پر کوئی ظلم نہیں ہوتا۔“ برادرانِ علی کے متعلق انھوں نے لکھا کہ ولایتِ علی اور عنایتِ علی اور ان کے ادنیٰ متبعین نے کبھی کوئی ایسی بات نہیں کی جس سے مترشح ہو کہ انھوں نے ہندوستان میں انگریزی طاقت کے خلاف کوئی سازش کی ہو۔ آخر میں انھوں نے نتیجہ نکالا کہ وہابی جہاد جسے ہمارے مؤلف (بڑے) نے انگریزوں کے خلاف ظاہر کیا ہے دراصل صرف سکھوں پر فتحیابی کے لئے مقصود تھا۔“

سر سید احمد خاں کا طرزِ اصلاح، مسلمانوں کی سماجی اور تعلیمی احیاء میں سرسید کی خدمات رہنمائی اتنی مسلم ہیں کہ یہاں ان کے تذکرے کی ضرورت نہیں لیکن وہابی تحریک کے سیاسی پہلو کے متعلق ان کا نظریہ حقیقت سے مطابقت نہیں رکھتا۔ اگر ہم قوم میں مغربی خیالات کی نشروانت کرنے اور تعلیم عامہ کے لئے ان کی جدوجہد کے پس منظر میں اس موضوع پر ان کے نظریوں کو دیکھیں تو ہم ان کی توجیہ کو سمجھ سکتے ہیں۔ انھوں نے ایک نیا مکتب فکر پیش کیا جس نے ثابت کیا کہ ہندوستانی مسلمانوں کا مستقبل مغربی خیالات سے کنارہ کش رہنے یا مخالفت کرنے میں نہیں بلکہ ان خیالات کے اپنانے اور اپنے آپ کو ان کے مطابق کر لینے میں مضمر ہے۔ انگریزی حکومت اور مغربی خیالات کے خلاف کسی سیاسی تحریک کا اجرا و قیام ان کے مکتب فکر سے متضاد تھا اسی لئے انھیں اس تحریک کی نوعیت کی یہ عجیب تاویل و تعبیر کرنا پڑی تاکہ کے ساتھ ہی بعض نہایت ضروری سماجی مذہبی اصلاحات جاری کرنے کے لئے وہابیوں کی مساعی سے ہمدردی اور تحسین کا احساس بھی اس تنقید کے اکثر حصوں میں صاف نمایاں ہے۔

حریف سکھ تھے یا انگریز؟؛ مصنفوں کے ایک گروہ میں خود کو کچھ بھی ہیں جنھوں نے معلوم اسباب کی بنا پر ہی لنگڑی لولی تاویل پیش کی ہے۔ ان میں سب سے پہلے جعفر تھانیسری تھے۔ اپنی تصنیف کے آخری حصے میں انھوں نے سید احمد کے کوئی ۵۹ مکتوبات کا متن اور بعض اور اصحاب جیسے شاہ اسماعیل کی تحریر شایع کی واضح رہے کہ سید احمد کے مکتوبات کے کئی اور مجموعے بھی موجود تھے مگر یہ سب مخطوطات تھے اور آسانی سے دستیاب نہ تھے، ان کے مطبوعہ نسخے سہل الحصول تھے، اور تحریک کے ایک سرکردہ رکن کے قلم سے نکلی ہوئی

تحریر کی حیثیت سے اس کی بڑی قدر و منزلت تھی۔ مطبوعہ مکتوبات کی اصیبت بلا تاخیر مان لی گئی تھی یہاں تک کہ فی الحال محفوظ نسخوں سے مقابلہ کیا گیا اور یہ حیرت انگیز انکشاف ہوا کہ بعض مکتوبات میں کئی دقیق تبدیل الفاظ اور دوسرے تصرقات کئے گئے ہیں۔ یہ ترمیمات یا تصرقات ایسے ہیں کہ بعض بنیادی باتوں میں پورے مفہوم کو بدل دیتے ہیں۔

واقعات کے متعلق عمداً تحریف: جعفر کے اس طریق کار پر یہ عذر پیش کیا جاسکتا ہے کہ ان کی تالیف ایسے وقت میں شائع ہوئی جب انگریز پوری طاقت سے برسر اقتدار آچکے تھے اور ان کو یہ حقیقت پیش نظر رکھنا تھی۔ لیکن وہ ان مکتوبات کی اشاعت سے قطعی احتراز کر کے اپنے ضمیر کو سلامت رکھ سکتے تھے۔ الفاظ میں عمداً تحریف کر کے وہ واقعات کے توڑ مروڑ یا غلط بیانی اور تحریک کی ضرر رسانی کے مجرم بھی ٹھہرتے ہیں۔ ایک دوسرے مولف جو اسی تذبذب کا شکار ہوئے وہ عبدالرحیم عظیم آبادی تھے۔ وہ اپنی بیش بہا کتاب تذکرہ عمادہ میں بالقصد غلط بیانی کے مرتکب تو نہ ہوئے مگر انگریز حاکموں کی رواداری عدل گستری اور رحمدلی کی مدھکونی ہی نہیں کی ہے بلکہ برادران علی کے انگریزوں کے خلاف جدوجہد کو خفیف کر کے دکھایا ہے۔

تحریک پر خود وہابیوں کی ان نگارشوں کے ساتھ دلچسپی سے غالی نہ ہوگا اگر کچھ انگریز مولفوں کے تبصروں کا ذکر بھی کر دیا جائے۔ جنہوں نے خود سید احمد کے زمانے میں تحریک کی اشکریہ دشمنی کے اظہار میں زیادہ صاف گوئی سے کام لیا ہے۔ بیو، یوسف زئیوں پر اپنی رپورٹ میں سید احمد کے بارے میں لکھتا ہے: "یہ شخص کوئی اور نہ تھا بلکہ میر سید احمد بریلوی ہی تھا جو ان علاقوں میں سید پادشاہ کے نام سے معروف تھا۔ جس کا کردار ایک مختصر عرصے تک کامیاب رہا جب کہ وہ مختلف ہمسایہ سنی مسلم حکومتموں کے حکمرانوں اور لوگوں کو اکسایا کرتا تھا کہ اُس کے جھنڈے کے نیچے جمع ہو جائیں جو اسلامی سلطنت کے

دوبارہ قیام کے لئے اور جزیرہ نما سے ہندکو کفار انگریزوں اور سکھوں سے آزاد کرانے کے لئے بند کیا گیا ہے۔ ایک اور مصنف سرحد پر سولہویں صدی کی روشنیہ تحریک کا ذکر کرتے ہوئے رقمطراز ہے کہ روشنیہ کا سربراہ بایزید پیر روشن اور اس کے متبعین اکبر کے حق میں وہی ہو گئے تھے جو وہابی سکھوں کے حق میں، اور ہندوستانی مذہبی دیوانے برطانوی حکومت کے حق میں ہو گئے تھے۔ یہی مصنف ایک دوسرے مقام پر یوں رائے زنی کرتا ہے۔ "باہیں ہمہ میر احمد کے نائبین نے جو نو آبادیاں چھوڑی تھیں وہ برطانوی حکومت کو ورثہ میں ملیں۔ پنجاب کے ساتھ ہمیں جو متروکات ملے ان میں شاید یہ سب سے زیادہ دروسر کا باعث تھے" سکھوں کا مشہور مورخ کنگھم جو سید احمد کے نسبتی بھائی اور رفیق خاص سے ذاتی تعلقات رکھتا تھا، یہ معنی خیز فقرے لکھتا ہے: چار سال کی غیر حاضری کے بعد وہ دہلی لوٹے اور مسلمانوں سے کہا کہ کافروں کے خلاف جنگ میں ان کی متابعت کریں ان کے قیور سے ایسا ظاہر ہوا کہ کافروں سے ان کی مراد صرف سکھ ہیں لیکن واقعی مراد صحیح طور پر سمجھی نہ گئی۔"

سید احمد کا خلوص اور جاں نثاری: سید احمد کی زندگی میں تحریک کے بعض خاص پہلوؤں کا عام جائزہ کچھ تشنہ رہ جائیگا اگر ان کی شخصیت کا ایک اور اہم پہلو جو تحریک کی روش پر ایک حد تک اثر انداز ہوا سامنے نہ لایا جائے۔

مقصد کے ساتھ ان کا خلوص اور جاں نثاری ان کے قریب قریب تمام مکتوبات سے صاف نمایاں ہے وہ ایک مستحکم تنظیم اور تربیت یافتہ فوج کے مانے ہوئے بلا اختلاف قائد اور ایک معنابہ علاقے کے کماندار تھے۔ پھر بھی انھوں نے اپنے لئے کوئی دنیاوی اقتدار اختیار نہیں کیا انھوں نے ایک امام اندر ایک سلطان کے درجوں کے درمیان ایک خط امتیاز کھینچ رکھا تھا، وہ اپنے اس پختہ فیصلے کا بار بار اعادہ کرتے تھے کہ وہ اپنا تہذیبی اور مذہبی فرائض کو باہر کر کے تمام ہندوؤں کے لئے اپنے علاقے کے انتظامی اختیارات کو ٹھانڈا کرینگے۔ ہندوؤں کے نام ان کا منقولہ بالا مکتوب اس دعوے کی دلیل ہے۔ ایک اور خط میں جناب پشاوریا محمد کے بھائی سعید احمد کے نام ایک مکتوب میں لکھتے ہیں: "مجھے جاہ و ثروت اور چھوٹے دار کی

تمنا ہے کہ انتظامی اختیارات کی آرزو نہ کبھی دولت جمع کرنے کا خیال میرے دل میں آیا کہ یہ بار بار دہرایا جانے والا دعویٰ محض خالی خولی بجز وانگسار کی نمائش نہ تھی، فتح پشاور کے بعد ان کا کردار اس کی صداقت کی بین دلیل ہے۔ سلطان محمد صاف طور پر جنگ میں (وہابیوں سے) شکست کھا چکا تھا لیکن سید احمد نے حکومت اُس کو واپس کر دی۔ انھوں نے اپنا اقتدار یہیں تک محدود رکھا کہ قاضی اور اخلاق عامہ کے محتسب مقرر کئے۔ اس سلسلہ کی ایک اور مثال یہ ہے کہ کچھ پہلے رنجیت سنگھ نے جو پیشکش کی تھی کہ وہ اپنی مخالفانہ کشمکش ترک کر دیں تو تسلیم کے پار علاقے میں انکو آزاد ریاست عطا کر دی جائیگی۔ اسے انھوں نے ٹھکرا دیا تھا۔ ظاہر ہے کہ سید احمد کا عزم اپنے لئے کسی ریاست کا حصول نہ تھا بلکہ اس سے بہت اعلیٰ وارفع۔

سید احمد کے ریاست کا تخیل بھی ایک خاص رنگ کا تھا۔ ان کا خاص نقطہ نظر یہ تھا کہ سلطان کا دنیاوی اقتدار اور امام کے مذہبی نرائض ساتھ ساتھ چلیں۔ انھوں نے سلطان کے میدان عمل کی مبہم طور پر تعین کر دی تھی، مگر ساتھ ہی امام کے لئے ایک طور کے مجموعی نگران (گو غیر مُخل) کے تقرر کی سفارش کی۔ مگر یہ نظر یہ ان کی زندگی میں خوابیدہ سا رہا۔ نہ نافذ کیا جاسکا نہ پوری طرح عمل میں لایا جاسکا۔

سید احمد پر بعض سماجی مذہبی صورت حال اور غیر ملکی اقتدار کے روز افزون خطرات کا بہت سخت اثر تھا۔ وہ ان مفسدات کو دفع کرنے کے لئے اپنے نسبتاً اونٹنی و پست درجہ زندگی سے اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کا مقصد مخلصانہ اور بے غرضانہ تھا۔ وہ اپنے مشن کی تکمیل کے بعد شاید اپنے قدیم مشغلہ کی طرف لوٹ آنے کا قصد رکھتے تھے۔ واقعہ یہ ہے کہ وہ کئی اعتبار سے کسی قدر ایک ہندوستانی گیری بالڈی نظر آتے ہیں۔ مگر گیری بالڈی کے برخلاف زندگی میں اپنے مقصد کا کامیاب انجام دیکھنا ان کے نصیب میں نہ تھا۔

وہابی تحریک کا سیاسی پہلو: تحریک کے سیاسی حصے نے جو سید احمد کی زندگی میں صاف عیاں تھا بعد کے دور میں غلبہ پالیا۔ خالص مذہبی اور اخلاقی تعلیمات کا زور سیاسی تبلیغ میں میں منقذ ہو گیا۔ ہنٹر بھی اس غیر محسوس تغیر پر یوں تبصرہ کرتا ہے: ”احیاء میں مذہبی عنصر کا زور گھٹنے لگا۔ تحریک کے قدیم تر قائدین کے تحت ہی اس کے انحطاط کے آثار نظر آنے لگے

تھے پٹنہ کے داعیوں نے بھی اس کو صاف طور پر محسوس کر لیا تھا اور انہی تعلیمات کو زمانے کے نئے تقاضوں کے مطابق ڈھال لیا تھا۔ اس دور میں وہابی داعیوں کی تعلیمات سے متعلق رودادوں میں خالص مذہبی مباحث کا کوئی حوالہ مشکل سے ملتا ہے۔ بے شک اب بھی اسلام کے ان فرائض کا جیسے نماز، روزہ، زکوٰۃ وغیرہ کی بجائے آدری پر زور دیا جاتا تھا مگر وہابی کارکنوں کا اصل کام جذبے جمع کرنا اور سرکاری فوجوں میں سپاہ کا اغوارہ گیا تھا۔ ان کی تعلیمات کا پختہ غیر ملکی حکام سے جہاد کا فرض رہ گیا تھا۔ ۱۸۴۵ء سے لیکر غزوة امبیلہ کے اختتام تک انگریزوں کے خلاف لڑائیوں کے سلسلے میں شاید ہی کوئی مذہبی مسئلہ سامنے آیا ہو۔ اس کے برخلاف اس زمانے میں اور اس کے بعد تک بھی وہابی انگریزوں کے لئے مخالفت سیامی خطرہ بنے رہے۔ وہ مخالفت و محاصرت کے متعدد کارمحور بنے رہے اور ہمیشہ مقامی قبائل کی معمولی معمولی بے چینی کو ہوا دیکر انگریزوں کے خلاف عام جنگ کی شکل دے دینے کے لئے تیار رہتے تھے۔

یہ امر بھی قابل توجہ ہے کہ اس زمانے میں وہابیوں کی جدوجہد کا رقبہ اور ان کے اثر کی حدود بھی بہت کچھ وسیع ہو گئی تھیں۔ وہابیوں کی سازشوں کا جال جو کچھ پہلے ہٹرنے تمام بنگال تک پھیلا ہوا پایا تھا۔ اب ۱۸۶۹ء کی تحقیقات کے دوران میں ملک کے زیادہ حصوں پشاور سے بجا پور تک اور ڈھاکا سے پونا تک پر چھایا ہوا تھا۔

غیر وہابی عناصر کی شمولیت ظاہر ہے کہ ایسی وسیع الذیل تحریک بیشتر غیر وہابی عوام کی عملی اعانت و حمایت کے بغیر زیادہ دیر تک ٹھیر نہیں سکتی تھی۔ سرحد کو روپے کی خفیہ ترسیل کے کام میں ہندوستانی ساہوکاروں کا تعاون جو پہلے سے جاری تھا اس زمانے میں اور بڑھ گیا۔ اس زمانہ کی سرکاری رودادوں میں ہندو ساہوکاروں کے بارے میں اکثر حوالے ملتے ہیں جن کا کاروبار سارے شمالی ہند میں پھیلا ہوا تھا۔ اگر سب نہیں تو کچھ ساہوکاروں کو ضرور معلوم ہو گا کہ جن لین دین کے معاملوں میں یہ حصہ لے رہے ہیں وہ کوئی مددگارین کاروباری نہیں بلکہ ان کے پیچھے کوئی زیادہ گہرا اور شاید خطرناک مقصد پوشیدہ ہو گا۔ روپے کی ترسیل ہندوؤں کے بھاننے کے کمیشن اور زر مبادلہ کے حصوں کا محض لالچ اس خطرناک کام

میں اتنے ساہوکاروں کی مستعدی سے شمولیت کی توجیہ نہیں ہو سکتی۔

وہابی تحریک کا قومی رنگ: غیر وہابی عناصر کی زبردست اعانت اور اسی قسم کی دوسری تدبیروں نے اس تحریک کو قومی رنگ دے دیا۔ قدرۃً ان کو مذہبی جھگڑوں یا فرقہ وارانہ موٹہ گافیوں سے کوئی دلچسپی باقی نہیں رہی تھی۔ ہندوستان میں اس تحریک کا رونما سچہ نہیں رہا۔ اس غور طلب مسئلہ کی طرف ان الفاظ میں توجہ دلاتا ہے: "یغاوت کی یہ خبریں رفتہ رفتہ وہابیوں کی اصلی تعلیمات پر جیسے اخلاق، پاکبازی، مشرکانہ رسوم کا قلع قمع، جن کی شروع میں بڑے جوش و خروش سے تاکید کی جاتی تھی ایسی چھا گئیں کہ ان سب کو انہوں نے پس پشت ڈال دیا۔" ایسی مثالیں جہاں ان کے داعی و مبلغین صرف دینی امور پر بحث کرتے اور سیاسی مسائل سے اجتناب کرتے اب قریب قریب معدوم ہیں۔ ایسے مسائل پر گفتگو سے سماعین آہستہ آہستہ مجلس سے کھسک جاتے۔ بہتر بھی تحریک کی روش میں اس تغیر پر یوں تبصرہ کرتا ہے: "اخلاقیات کی تحسن ترویج سے آغاز کرنے کے بعد انہوں نے اپنے پیغام کے روحانی عنصر کو بتدریج ترک کر کے فطرت انسانی کے بدترین جذبے کو ابھار کر اپنے روبرو ال مقصد کو قوت دینا شروع کیا۔"

اس سے معلوم ہو گا کہ قدرۃً عوام کو تحریک کے مذہبی پہلو سے کوئی دلچسپی نہ رہی تھی۔ اس کی سیاسی اور مخالف حکومت اپیل ہی زیادہ عملی اور معقول دکھائی دی جس پر چلنے کے لئے وہ تیار ہو گئے۔ اس طرح تحریک کی روش میں تغیر نے عوام میں اس اپیل کو وسیع تر کر کے اس کی حمایت و مقبولیت میں اضافہ کر دیا۔

ایک جدید مصنف اٹھارہویں صدی کے نصف دوم اور انیسویں صدی کے اوائل میں ہندوستان میں انگریزوں کے خلاف مختلف شورشوں کی نوعیت کا جائزہ لیتے ہوئے وہابی تحریک کے متعلق رائے زنی کرتا ہے: "وہابی تحریک کی مقبولیت عام نے اپنی مضبوط

لے جرنل آف رائل ایشیاک سوسائٹی بمبئی جلد ۱۲ صفحہ ۳۶۲۔

۱۵ اور انڈین مسلمان صفحہ ۶۹

و مربوط تنظیم سے ملک کے طول و عرض میں ڈھاکا سے پشاور تک کے رننگروٹ اور روپے حاصل کر کے اپنا بول بالا کر لیا یہ بھی ماننا پڑتا ہے کہ ہندوستان میں برطانوی حکومت نے جن تحریکوں کو جنم دیا ان میں وہابی تحریک سب سے زیادہ بیدردی اور سختی سے مخالف انگریز تھی اور ان کی تمام جدوجہدیں یہ صورت قائم رہی..... لہٰذا

وہابی تحریک کے دو خاص پہلو تھے، سماجی مذہبی اور سیاسی۔ اول الذکر اسلامی معاشرے کی اصلاح سے متعلق تھا اور آخر الذکر کا تعلق انگریزوں کے ساتھ جہاد سے تھا۔ قابل توجہ امر یہ ہے کہ ان دونوں پہلوؤں نے نیز بعض اور حالات نے تحریک کی رفتار ترقی کو متاثر کیا۔ اس کی تمام مدت رفتار میں ان پہلوؤں کی علیحدہ علیحدہ افادیت بدلتی رہی۔ اس لئے مجموعی طور پر تحریک کی عام نوعیت پر رائے زنی گمراہ کن ہوگی۔ پھر بھی نمایاں طور پر صاف نظر آتا ہے کہ سید احمد کی شہادت کے بعد کے دور میں تحریک کا سیاسی پہلو رفتہ رفتہ غالب آ گیا اور اس کی تاریخ پر چھا گیا۔ زیادہ تر اسی دوسرے پہلو سے چشم پوشی کے سبب سے ہی عموماً اس کی نوعیت پر غیر متوازن نظر ڈالی جاتی ہے۔

دب، وہابی تحریک کی کچھ خدمات اور اس کی ناکامی کے اسباب

جیسا کہ پہلے کہا جا چکا ہے وہابی تحریک کے کئی رخ تھے۔ تحریک کے الگ الگ میدانوں میں اس کی کامیابی اور ناکامی کی مقدار بہت حد تک مختلف رہی ہے۔ اس لئے ان پر جدا جدا غور کرنا ہوگا، تحریک کی ناکامی پر عمومی طور پر یہ کہہ دینا کہ اس کا سبب سیاسی مقصد انگریزوں پر فتحیابی حاصل کرنے میں ناکام ہو جانا تھا، گمراہ کن ہے۔ سیاسی میدان میں اس کی ناکامی پر بحث کرنے سے پہلے بہتر ہوگا کہ غیر سیاسی عالم میں اس کی بعض خدمات کا محققانہ ذکر کر دیا جائے۔ سماجی مذہبی اصلاح: سماجی مذہبی میدان میں اس کی کامیابی کی مقدار بہت کچھ ہے اس تحریک کے ہندی مسلم معاشرہ اور مذہب کے ساتھ تضادم اور کشمکش کا مطالعہ ایک پر معنی

۱۵ اس بی چودھری مصنف CIVIL DISTURBANCES DURING THE BRITISH RULE

IN INDIA کلکتہ ۱۹۵۵ء صفحہ ۵۰

بحث ہے جو علیحدہ اور پوری طرح مذاکرہ اور استقصا کا متقاضی ہے۔ ہم یہاں اس کے بعض خاص پہلو پیش کرتے ہیں۔ ہندوستان میں اس تحریک کے نشوونما کے وقت جو سماجی مذہبی صورت حال تھی وہ مفصلاً بیان کی جا چکی ہے۔ بعد کی صورت حال پر ایک سرسری نظر وہابیوں کے اور وہ فرق ہی کو نہیں بلکہ ترقی کو نمایاں کر دیگی۔ بیواؤں کے نکاح ثانی کی ترویج و تبلیغ نمازی رسوم، بعض تیوہاروں اور تقریبوں میں تباہ کن فضول خرچی کا ترک، سیدھے سادے عوام کی گردنوں کو ملاؤں کے نیچے سے چھڑانا، قبروں کی پرستش، مردوں سے مرادیں مانگنے کے عام رواج کا ترک، اور پاک و صاف پیشہ اختیار کرنا یہ تھے وہابیوں کے اور وہ بعض اصلاحات کے کچھ درختاں پہلو۔

اردو کی خدمت: وہابی تحریک کا ایک اہم اور نظروں سے پوشیدہ ضمنی فیضان وہ زور دار جنبش ہے جو اس نے اردو زبان خصوصاً نثر نگاری کی رفتار ترقی کو دی۔ اپنے پیغاموں کو عوام تک پہنچانے کی کوشش میں اور تبلیغی تحریکوں کی طرح اس نے مقامی زبانوں کے استعمال پر بہت زور لگایا۔ اگرچہ اعلیٰ طبقہ کی عام زبان فارسی تھی، وہابی قائدین نے اردو کا زیادہ استعمال کیا اور اسی زبان میں بہت زیادہ رسالے لکھے۔

سیاسی تنظیم کا نمونہ: وہابی تحریک نے اپنے پیچھے انگریزوں کے خلاف دلیرانہ اور پایدار کشمکش کی ایک حوصلہ افزا روایت اور ایک مستحکم و مربوط عمومی ہندوستان گیر سیاسی تنظیم کا ایک نمونہ بھی چھوڑا۔ اکثر حکمت عملیاں اور سیاسی چالیں جن کی ابتدا اور عمل درآمد وہابیوں سے ہوئی بعد میں ابتدائی سیاسی جماعتوں خصوصاً انڈین نیشنل کانگریس نے اختیار کر لیں اور ترقی دی۔ بھول عدم نوالات یا عدم تعاون، پنچایت کی ترویج، وفادار عناصر کا سماجی بایکاٹ، حقہ پانی بند، جیسا کہ ریلی نے تعبیر کیا ہے، یہ تمام حربے آزادی کے لئے کش مکش کے دوران میں کمال کو پہنچا کر سیاسی احتجاج کے زبردست وسیلے بنائے گئے۔ مگر یاد رکھنا چاہیے کہ ان کی ابتدا وہابیوں ہی کے ہاتھوں ہوئی تھی۔ سرنیدرانا تھ بھنرجی نے ایک عام جلسے کی تقریر میں وہابیوں کے ایجاد کئے ہوئے چندوں کی تحصیل کے ایک غیر نمایاں اور موثر طریقہ کا ذکر خاص طور پر نمونہ کے طور پر کیا تھا۔ ضروری خبروں کے اعلان اور تمام ملک سے آدمی اور روپے کے بھیج بھیجاؤ کے لئے

وہابیوں کی پیچیدہ اور نہایت خفیہ تنظیم آج بالکل جدید اور نہایت موثر معلوم ہوتی ہے۔ انگریزوں کے خلاف کشمکش میں فوج کے رسی دستوں کی موثر کارگزاری کی اہمیت کا سب سے پہلے وہابیوں نے اور اک کیا اور ان کو ملا لینے یا جیسا کہ اس وقت کی سرکاری رپورٹوں سے ظاہر ہے، ان کو اطاعت سے منحرف کرنے کی معقول کوششیں کیں۔

وہابی تحریک کا سرسید پر اثر: وہابی تحریک کی ایک اور معنی خیز خدمت یہ تھی کہ سرسید کی مسلمانوں میں مغربی تعلیم اور ثقافت اختیار کرنے کی حمایت کی تحریک کے رد عمل کو متوازن بنا دیا۔ وہابی تحریک انگریزوں کے خلاف صرف سیاسی طور سے چلائی نہیں گئی تھی بلکہ دوسری جدت پسند تحریکوں کے ساتھ ساتھ اس کی تعلیم کا ایک لازمی عنصر و لنوا زانی کے اعادے پر زور دینا بھی تھا۔ لازمی طور پر اس کے معنی جدید طور طریقوں سے اغراض اور ان کا مقاطعہ بھی تھے۔ جہاں سماجی اور مذہبی میدانوں میں پاک صاف ماضی کی طرف لوٹنے کی ضرورت مسلمہ طور پر شدید تھی، وہاں وہابیوں نے معاشرہ جو وقت کی بہت سی اہم حقیقتوں سے روگردانی کی۔

انگریزوں کا سیاسی تفوق: ان حقیقتوں میں سے ایک انگریزوں کا سیاسی تفوق تھا جو مغرب کی مادی اور فنی تفوق کی محض ایک علامت تھا اور جو ہندوستان میں آ کر جم گیا تھا۔ اس کا مقابلہ کرنا تھا۔ مگر کیسے؟ اس کا مقاطعہ اور مخالفت کر کے یا جاپانیوں کی طرح جذب اور ہضم کر کے؟ وہابی تحریک نے اس اہم سوال کا کوئی صاف جواب تو نہ دیا لیکن مجموعی حیثیت سے معلوم ہوتا ہے کہ اول الذکر طرز عمل اختیار کیا۔ جس سے مدعا بر نہ آیا۔ سرسید کی تحریک جو مسلمانوں میں تمام جدید سماجی اور تعلیمی اصلاحات کا ہر اول تھی وہابی تحریک کے رد عمل کے طور پر ہی وجود میں آئی اور ایک حد تک اس کی بنا وہابی تحریک کی مرہون منت ہے۔

اسباب ناکامی قبائلیوں کی غداری: رہا اس تحریک کی ناکامی کا سوال تو سیاسی حیثیت سے اس کا خاص سبب قبائلیوں کی مسلسل غداری اور آٹے دن کی مخالفت تھا۔ میرا حمد نے بعض

۱۰ [کھو گیا، چھوڑ کے صحرا میں نشانِ منزل میں یہ میدان تو جیتا نہیں، مارا بھی نہیں] (مسلم)

ملفوظات سے جن کا ذکر ہو چکا سرحد کے علاقے کو اپنی کارروائیوں کا صدر مقام منتخب کیا تھا۔ ان میں سے اکثر ملفوظات فطری اعتبار سے بالکل معقول و مناسب تھے۔ مگر ان کے قیاسات کی ایک اہم کڑی، یعنی قبائلیوں کا صرف سہارا نہیں بلکہ عملی تعاون کے حصول کی امید بعد کے واقعات سے خاک میں مل گئی۔ قبائلیوں کی متوقعہ ہمدردی اور اعانت کے عوض انہیں ان کی پوشیدہ عداوت بلکہ کھلم کھلا مفادمت مزاحمت کا سامنا کرنا پڑا۔

وہابی تحریک کا سب سے بڑا المیہ یہ تھا کہ قبائلیوں نے تحریک کی اصل غرض و غایت کو نہ سمجھا اور اس کے سربراہوں سے حقیقی اور مستقل اعانت در یغ رکھی اس میں وہابیوں کا کوئی قصور نہ تھا۔ سید احمد کے دور سے ہی انہوں نے قبائلیوں کے ساتھ غیر معمولی تحمل اور رواداری کا برتاؤ کیا۔ قبائلیوں نے بار بار ان کے ساتھ بد عہدی و غداری کی جو جان و مال کی بربادی کا موجب ہوئی مگر وہ سب کو نظر انداز کرتے رہے۔ وہ نصف صدی سے زائد تک پند و نفاخ اور عمل سے اتحاد مقصد اور آزادی کے لئے قربانیوں کے جذبے کو ان کے ذہن نشین کرتے رہے مگر سب لا حاصل رہا۔ زیادہ تر انگریز مصنفوں نے اور ان کے تتبع میں بعض حالیہ مصنفوں نے بھی یہ خیال ظاہر کیا ہے کہ وہابیوں کے شدید دینی جوش نے قبائلیوں کی ہمدردی کھودی۔ لیکن اس فیصلے کی صحت میں کوئی دلیل پیش نہیں کی جاسکتی کہ اگر یہ مفروضہ (تقصیف عمل نہ آتا جب بھی قبائلیوں کی روش کچھ اور نہ ہوتی۔ اس کے برعکس شروع ہی سے، جب وہابی متشددانہ اصول نافذ کرنے کی طاقت نہ رکھتے تھے قبائلی وہابیوں کے ساتھ برتاؤ میں تلون و تنزل اور اکثر اوقات غداری کا ثبوت دیتے رہے، یہ زیادہ تر نتیجہ تھا تحریک کے متعلق وہابیوں اور قبائلیوں کے مختلف بنیادی نقطہ نظر کا۔ قبائلی صرف اپنے سردار کے وفادار ہوتے ہیں اور عموماً دین و مذہب یا کسی عظیم تر تخیل سے زیادہ نسلی رشتوں سے متاثر ہوتے ہیں، قبائلیوں میں کبھی وہ بے غرضانہ لٹھی گرجھی نہیں دیکھی گئی جس سے وہابی سرشار تھے۔ وہ ہمیشہ دل سے موقع پرست اور زبردست رہے۔ اگر وہ اس جدوجہد کی اصلی غرض و غایت کا ذرا کبھی احساس رکھتے تو وہابیوں کے نافذ کردہ تشدد و تقشف کے عام عائد کردہ الزام کو مان کر بھی یہ اپنے اوپر

تھوپے ہوئے منقشہ نامہ دیندارانہ اقدامات کے متعلق کچھ نہ کچھ تو کرتے۔ لیکن وہابیوں کی اصلی ناکامی یہ تھی کہ وہ اپنا وہ جوش اور بلند نظریہ جس نے خود ان کو متحرک کیا۔ قبائلیوں میں پھیلانے کے اور ان کو اپنے اعلیٰ معیار عمل تک اٹھانے کے بیشک سبب ہے کہ ہر تحریک میں عام افراد متعلقہ میں اتنا جوش و جذبہ نہیں ہوا کرتا جتنا ان کے قائدین میں ہوتا ہے۔ لیکن بصورت موجودہ ایک سادات ستھانہ کے تنہا اور درختناں کردار کے سوا قبائلیوں نے تحریک کی اصل روح کو کبھی کسی مدت کے لئے واقعی طور پر اخذ نہیں کیا۔ اسی صورت حال نے وہابیوں کو اپنے ہندوستانی مرکز کا زیادہ محتاج بنا دیا۔

امدادی مراکز سے دوری، داعیہ وہابیوں کی ہر قسم کے مادی سہارے کے لئے اپنے ہندوستان کے مرکزوں کی قطعی محتاجی، ان کی ناکامی کا دوسرا اہم سبب تھا۔ یہ مرکز بالکل انگریز حکام کے رحم و کرم پر مبنی تھا اور بلا زحمت دبا دیا یا بیخ و بن سے اکھاڑ بکھی دیا جاسکتا تھا۔

فوجی تدابیر کے ابتدائی اصول میں سے ایک یہ ہے کہ ذخیرہ اندوزی کی ایک محفوظ و مختصر راہ نکال لی جائے سامان و ذخائر کے بھیج بھجاء کا راستہ جو صرف یہی نہیں کہ ہزاروں ہزار میل طویل ہو بلکہ سیدھا دشمن کی سر زمین سے گذرنا ہو، لا بدی ہے۔ وہابیوں نے ایسے راستے کے خطرات کا اندازہ ضرور کر لیا ہوگا۔ صرف وفاداری اور رانداری (خواہ کتنی ہی احتیاط برتی جائے) زیادہ عرصہ تک اسے محفوظ نہ رکھ سکتی تھی۔ وہابی اسے محسوس تو بہت کرتے تھے مگر ان کے پاس کوئی چارہ کار کم سے کم اس وقت کچھ اور نہ تھا۔

وہابی تحریک نے ہر صحیح القومی فرد پر سرحد کو ہجرت کے فریضہ پر بہت زور دیا۔ قریب قریب سارے وہابی رسائل اس کی ترغیب و تاکید کے مضامین سے بھرے پڑے ہیں۔ ساتھ ہی انھوں نے ان لوگوں کو جو کسی عذر سے فی الوقت ہجرت نہ کر سکیں رخصت دی کہ جب تک وہ ہجرت کے قابل نہ ہوں تحریک کی مالی اعانت کرتے رہیں۔ اس طرح ہندوستان میں تحریک کے مالی معاونین کا ایک طاقور گروہ پیدا ہو گیا۔ وہابیوں کا مقصد شاید یہ تھا کہ جیسے ہی سرحد پر ان کے قدم مضبوط جم جائیں گے وہ ہندوستان کے مرکزوں

سے استمداد کے محتاج نہ رہیں گے۔ مگر وہ منزل کبھی نہ آئی۔

قدیم اسلحہ سے جدید آلات حرب کا مقابلہ: ہنرمیں وہابیوں کا مادی وسائل میں

اپنے حریفوں کے تقابل میں کچھ مہیا نہ کر سکتا ان کی ناکامی کا دوسرا اہم سبب تھا۔ خالی خولی جوشِ جاننازی کسی مقصد کی کامیابی کے لئے کتنی ہی ضروری ہو مادی وسائل کا کامل بدل نہیں ہو سکتا۔ اس اعتبار سے اٹھارہویں اور انیسویں صدیوں میں تمام مشرق کی طرح وہابی بھی حالات ماحول کے مجبور اور بے بس شکار ہو کر رہ گئے۔ صنعتی انقلاب اور پھر فنی ترقیات نے مغرب کو وہ مادی وسائل خصوصاً ایسے اعلیٰ درجہ کے آلات حرب مہیا کر رکھے تھے جن کے حصول کی اہل مشرق مستقبل قریب میں توقع نہ رکھ سکتے تھے۔ بلکہ میں وہابیوں کا بارود و قیالو کارخانہ اور اس سے بھی زیادہ دقیقاً نو می بالنس کے تلوں کی دستی توپیں، ٹوایجاد، انفیلڈ ریفیلوں کا کیا بدل ہو سکتی تھیں جو ۱۸۵۸ء کی مہم کاٹن میں پہلی بار سرحد پر استعمال کی گئی تھیں آخری جائزے میں مغرب کا یہی مادی تغویق وہابیوں کے خلاف محاربہ میں فیصلہ کن چیز تھا اور اور یہی چیز مشرق و مغرب کے درمیان چین کی راہ کشائی اور زوال پذیر سلطنت مغلیہ کی شکست سے لیکر ۱۸۵۷ء کی تحریک کی پامالی تک بہت سے بڑے بڑے اور مہتمم بالشان معرکوں میں بھی فیصلہ کن ثابت ہوا کی۔ وہابی بھی اسی کا نشانہ بن گئے۔ اس صورت حال کا سب سے بڑا المیہ یہ ہے کہ یہ زبردست حوادث جو اٹھارہویں صدی ہی سے بار بار رونما ہوتے رہے ان کے اسباب و نتائج کو نہ ۱۸۵۷ء کے قائدین پوری طرح سمجھے نہ وہابی۔ جب واقعات و حوادث کے اسباب و نتائج ہی نہ سمجھے جائیں تو ان کے خلاف علاج و تدبیر کے اقدامات کا سوال ہی نہیں اٹھتا۔

تمت

اخلاف مجاہدین صادق پور کا تاثر

آنکھ جب کھولی تو دیکھا سیکرہ لوٹا ہوا
 مے سوتے بہ چکی تھی اور خم ٹوٹا ہوا
 ہر طرف بکھرے ہوئے تھے پارو جام و سب
 مست رکھتی تھی آنکھیں ٹوٹے ہوئے ٹکڑوں کی بو
 پیچھے زنداں میں، ساتی غائب، اور محفل خموش
 غلب کے خوف سے سہمے ہوئے تھے بارہ نوش

ہائے وہ اک سید احمد کی شراب لالہ رنگ
 اور اک سر سید احمد خاں کی صہبائے فرنگ
 وہ جنوں ہنر و شہی اس نے سر سے دھو دیا
 دی نوانانی خرد کو، زور ایماں کھو دیا

ضمیمہ جات

بعض اہم ارکانِ صادقپور کے سوانحی خاکے

وہابی تحریک کی بنا و ارتقا میں خاندانِ صادقپور کے ارکان کا حصہ معتد بہ اور بہت قیمتی خیر تھا۔ ان میں سے سب کے نہیں قہرچند نمایاں ترین اصحاب کے نام جو اس سلسلہ میں بہت معروف و مشہور ہیں قابل ذکر ہیں وہ ولایت علی، عنایت علی، احمد اللہ، سحیحی علی، عبدالرحیم اور عبداللہ ہیں۔ ساتھ ہی خاندان کے بہت سے اور ارکان نے اس تحریک کی جو خدمات انجام دیں اگرچہ وہ کم معروف اور کم نمایاں ہیں مگر بے غرضانہ اور مخلصانہ جذبے میں کسی سے کم نہیں۔ ان کے زمانے مختلف تھے اور ان کی اعانت کی غایت اور نوعیت بھی مختلف۔ ان میں سے بعض کے سوانحی خاکے تذکرہ صادقہ پر ملنی پیش کئے جاتے ہیں۔

اہلی بخش اولہ شیخ ہدایت علی ساکن مہدادان (متصل منیر)۔ وہ ۱۲۰۱ھ (۱۷۸۵) میں متولد ہوئے۔ ان کی شادی بی بی لطیفہ دختر شاہ معز ساکن ننوہیاں شہر پٹنہ سے ہوئی۔ ان کے ماموں عمید العلی کی کوشش سے ان کو نواب مرشد آباد کی ملازمت میں ایک اعلیٰ عہدہ مل گیا۔ مگر کچھ عرصہ بعد متعفی ہو کر وطن واپس آ گئے۔ ان کی خدمات کے صلے میں ان کو دو بڑے بڑے مواضع بھوئی اور گوپالپور عطا ہوئے۔ انھوں نے سید احمد کو اپنے ہاں مدعو کیا اور اپنے بیٹوں کی امانت کے ہاتھ پر بیعت کرائی۔ مگر بعض اسباب سے خود بیعت نہیں کی۔ بعد میں انھوں نے ولایت علی کے ہاتھ پر بیعت کر لی۔ اپنی بیوہ بیٹی جمیلۃ النساء (زوجہ قمر الدین جو سرحد پر شہید ہوئے) کا عقد ثانی ولایت علی سے کر دیا۔ سید احمد کے رخصت کے وقت انھوں نے اپنے تین بیٹوں، فیاض علی، اور اکبر علی کو ان کے ہمراہ روانہ کر دیا۔ باقی دو احمد اللہ اور رفی اللہ پٹنہ میں رہ گئے۔ اہلی بخش کو کٹن پٹنہ ٹیلر ۱۸۵۷ء میں وہابیوں کا سردار بتانا ہے۔ وہ ۱۲۵۵ھ (۱۸۵۹ء) میں رحلت کر گئے اور مسجد ننوہیہ سے متصل مقبرے میں مدفون ہوئے۔

وہ شہر کی ایک اہم شخصیت، معروف محبت خلیق اور کتابوں کے شائق تھے۔ ان کو

ایک کتب خانہ ورثہ میں ملا تھا جس پر انھوں نے نقد اضافہ کر رکھا تھا۔ یہ کتب خانہ ان کے بیٹے بیٹے احمد اللہ کو ورثہ میں ملا۔ مگر ان کی گرفتاری کے موقع پر کچھ حصہ اور کچھ ضائع ہو گیا۔ آہی بخش ایک مشہور طبیب تھے مگر طبابت کو کبھی پیشہ کی طرح اختیار نہ کیا البتہ وہ دوامی مفت تقسیم کرتے تھے۔ وہ فوجی تربیت میں بھی مہارت رکھتے تھے۔

احمد اللہ آہی بخش کے بڑے بیٹے ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں متولد ہوئے۔ ابتدائی تعلیم ولایت علی اور خاندان کے دوسرے افراد سے پائی۔ محمد حسین کی ایک بیٹی سے ان کی شادی ہوئی اس پہلی شادی سے ان کے چھ بیٹے اور بیٹیاں ہوئیں۔ پھر دوسری شادی سے ایک بیٹا ہوا۔ ان کے بڑے بیٹے حکیم عبدالحمید اپنے زمانہ میں ہندوستان کے مشہور ترین اطباء میں سے تھے۔ اپنے باپ کی طرح عبدالحمید بھی شہر کے سماجی اور سرکاری حلقے میں بہت موقر تھے۔ پٹنہ میں مطبوعہ تصانیف اور علمی ذوق رکھنے والوں کی ایک فہرست جو حکومت ہند نے طلب کی تھی اس کے جواب میں پٹنہ کے کلکٹر اے ٹیل نے لکھا تھا کہ "میں شہر کے ایک فاضل ترین شخص سے ملا میں ان کو اس سلسلہ میں ایک اعلیٰ سند سمجھتا ہوں۔ اور میری رائے میں اب علم و فضل کا ذوق بہت کم ہو گیا ہے"۔ مقامی حکام اور عمائد شہر سے ان کے تعلقات دوستانہ تھے۔ مختلف سرکاری عہدوں پر فائز رہے، کچھ مدت تک ڈپٹی کلکٹر اور انکم ٹیکس کے ایسیرن کے بورڈ کے ممبر بھی رہے۔ وہ پٹنہ کی تعلیم عامہ (پبلک انشورنس کی کمیٹی کے ممبر بھی) مقرر کئے گئے تھے ۱۸۵۷ء میں ٹیلر نے ان کو اور عمائدین شہر شاہ محمد حسین اور واعظ الحق باشندہ گورنمنٹ (پٹنہ) کے ساتھ وہابیوں کے ایک قافلہ ہونے اور حکومت کے خلاف سازش کے شبہ میں گرفتار کر لیا۔ مئی ۱۸۵۷ء کی نظر بندی کے بعد رہا کر دئے گئے۔ یہ تمام واقعات اور آخر کار ان کی گرفتاری اور ۱۸۶۵ء کے مقدمہ کے حالات بیان ہو چکے۔

فیاض علی آہی بخش کے دوسرے بیٹے تھے جو ۱۲۲۳ھ (۱۸۰۸ء) میں پیدا ہوئے۔ ان کی شادی بھی شاہ محمد حسین کی ایک لڑکی ہوئی تھی۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم ولایت علی کی وفات کے بعد فرحت حسین نے ان کو پٹنہ بلا لیا۔ کچھ عرصہ تک بہار میں تنظیمی کام میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ فطرتاً وہ خاموشی پسند اور تنہائی پسند تھے۔ عام رخصت بہت کم کہا کرتے۔

کام ان کے چھوٹے بھائی بیجی علی کے سپرد تھا۔ فرحت حسین کی وفات کے بعد وہ پھر سرحد شمالی مغربی چلے گئے اور تادم حیات وہیں مقیم رہے۔ انھوں نے لا ولد انتقال کیا۔ بیجی علی آہی بخش کے سب سے چھوٹے بیٹے تھے۔ فیاض علی سے دس سال چھوٹے تھے۔ ان کا فزا وسط رنگ گورا، اور جسم گٹھا ہوا۔ ڈاڑھی چھوٹی اور چہرے پر چھپک کے چنڈ نشان تھے۔ ان کی شادی بھی شاہ محمد حسین کی ایک لڑکی حمیدہ سے ہوئی تھی۔ انھوں نے بھی ولایت علی سے بیعت کی تھی اور ان کے خلفا میں سے تھے۔ سرحد کے دونوں سفروں میں وہ ولایت علی کے ساتھ تھے اور ۱۸۵۲ء میں ان کی وفات کے بعد پٹنہ واپس آئے وہ ایک بڑے منچلے غازی تھے۔ اور بڑے بڑے خطروں کے مقابلے میں ان کی شجاعت و جرأت کے واقعات تذکرہ صادقہ میں مذکور ہیں۔

بارہ سال (۱۸۵۲-۶۳) پٹنہ کے قیام کے دوران میں انھوں نے اپنی زندگی کے سب سے بڑے کارنامے انجام دیے۔ شاہ محمد حسین کی وفات کے بعد انھوں نے پٹنہ کی زمام تنظیم اپنے ہاتھ میں لی۔ وہ ہر جمعہ کو تہو بہہ جاتے (جو محمد حسین کی جائے قیام تھا) اور صادق پور سے کھوڑی ہی دور واقع ہے۔ وہاں وہ نماز جمعہ پڑھاتے، مریدوں سے ملتے اور مختلف مسائل پر گفتگو کرتے۔ رات میں دیر سے صادق پور لوٹتے۔ ہر ننگل کو ولایت علی کے مکان میں وعظ کہنے۔ دور دور سے آنے والے رنگہ دوٹوں کو دینیات اور دوسرے مسائل پر درس دیتے۔ اس زمانے میں وہ سرحد کو آدمی اور سامان کی ترسیل کے لئے پٹنہ کی نہایت خفیہ اور پیچیدہ تنظیم کے سربراہ تھے۔ اس زمانہ میں احتیاط کے پیش نظر ان کے مراسلات محی الدین کے فرضی نام سے ارسال کئے جاتے۔ پہلی بیوی سے ان کے پانچ بیٹے اور ایک بیٹی اور دوسری سے ایک بیٹی تھا۔ تذکرہ حادثہ کا جو نسخہ میرے استعمال میں ہے اس میں ان کے ایک مکتوب مورخہ اتوار ۲۱ جمادی الاول ۱۸۶۶ء جو انھوں نے صادق پور کے گھر کے انہدام و بربادی کی خبر سنکر اپنی بیوی کو لکھا تھا منقول ہے۔ یہ اس نوع کا تنہا مکتوب ہے جو بچ رہا ہے اور انسانی نقطہ نظر سے

۱۰ تعجب ہے کہ مہینہ کا نام قمری تقویم کے مطابق اور سال عیسائی کی تقویم سے درج ہے

بڑی قدر و قیمت کا حامل ہے۔ معمولی سلام دعا اور سابقہ خطوط کے حوالے کے بعد لکھتے ہیں ایک اہم بات قابل تحریر یہ ہے کہ محمد حسن سلمہ ہی کے خط سے دونوں مکانوں کے انہدام کی خبر معلوم ہوئی۔ یہ معلوم کر کے میرے دل کو سخت کرب ہوا اس لئے کہ دونوں ہمارے آبائی مکان تھے اور زیادہ تر اس لئے کہ وہاں اللہ کا ذکر ہوتا اور ہمیشہ اس کے احکام بجالائے جاتے، اور اس لحاظ سے مومنین صادق ان کو اپنے اعزاء و اقارب کی طرح عزیز رکھتے تھے اس کے بعد خط میں وہ اپنے ایک خواب کا ذکر کرتے ہیں جس میں انھوں نے آنحضرت (صلی اللہ علیہ وسلم) کی زیارت کی آپ نے ان کو تسکین دی کہ اللہ تعالیٰ اپنے سچے مومنوں کی اطاعت اور ایمان کا امتحان کرتا ہے۔ جو اس میں پورے اترتے ہیں ان کو راحت جاوید نصیب ہوتی ہے۔ جیسے دشمنان خدا نے عارضی طور پر مسجد اقصیٰ کو تباہ کر دیا تھا مگر آخر اس کی دوبارہ تعمیر ہو گئی اور اس کے تباہ کرنے والے مغلوب ہو گئے اسی طرح ان کے (مومنوں) گھروں کے تباہ کرنے والے مغلوب و مقہور ہونگے اور گھر دوبارہ تعمیر ہو جائیں گے۔“

ولی اللہ! آہی بخشش کے دوسرے بیٹے تھے۔ مگر وہ اپنے تینوں بھائیوں کی طرح تحریک پر زیادہ کام نہ کر سکے، کیونکہ ابتدائے عمر میں ہی ان کا دماغ ماؤف ہو گیا تھا۔ پچاس سال کی عمر میں ان کا انتقال ہو گیا۔

فتح علی: آہی بخشش کی طرح جن کے یہ معاصر تھے ان کے بھی متعدد فرزند تھے، جنھوں نے تحریک کی تاریخ میں اعلیٰ امتیاز حاصل کیا وہ وارث علی کے بیٹے اور نانیال کی جانب سے بہار کے ایک مشہور ولی حضرت احمد چرم پوش کی اولاد میں سے تھے۔ وہ چودھویں صدی میں بہار کے مشہور ولی حضرت شرف الدین (مخدوم) سے نسلاً مربوط تھے۔ خانقاہوں کے عام دستور کے مطابق فتح علی کے مکان پر بھی پری مریدی کی بہت دھوم رہتی تھی۔ لیکن سید احمد کی پٹنہ میں تشریف آوری کے موقع پر انھوں نے سید احمد کو اپنے گھر دعوت دی اور اپنے تین بیٹوں کے ساتھ ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ اور یہ زیادہ تر ان کے بڑے بیٹے ولایت علی کی ترغیب سے انجام پایا۔ انھوں نے سید احمد کے ہمراہ سرحد کے سفر کی خواہش بھی ظاہر کی مگر ان کی گبرنی کی وجہ سے ان کو گھر ہی کی اقامت پر آمادہ کیا گیا۔ وہ غزوہ ہالاکوٹ (۱۸۳۱ء)

کے فوراً بعد رحلت کر گئے۔

ان کی پہلی بیوی دختر شیخ ہدایت علی مہدانوی شادی کے فوراً بعد لا ولد قضا کر گئیں۔ دوسری بیوی رفیع الدین حسین خاں کی دختر تھیں آخر الذکر مغلیہ دورہ پٹنہ سٹی کے ایک متمول رئیس سے ہوئی۔ اس محل سے ان کے چھ بیٹے ہوئے۔ ان میں سے دو کم سنی میں قضا کر گئے۔ پہلے دو ولایت علی، و عنایت علی کی زندگیوں پر بحث ہو چکی۔ تیسرے بیٹے طالب علی سرحد گئے اور وہیں وفات پائی۔ چوتھے فرحت حسین گھر کے مرکز پٹنہ کے سربراہ رہے اور ہمیشہ یہیں مقیم رہے۔ فتح علی کے پاس بھی کتابوں اور منظومات کا ایک گراں بہا ذخیرہ تھا جو ان کے پوتے عبدالرحیم کی گرفتاری کے زمانہ میں ضبط کر لیا گیا۔

طالب علی ولایت علی کے چھوٹے بھائی تھے۔ انھوں نے سید احمد کے ہاتھ پر بیعت کی اور انھیں کے ہمراہ سرحد چلے گئے۔ وہاں ابتدائی معرکوں میں شریک رہے اور جنگلانی میں بعارضہ ذات الجنب وفات پائی۔

فرحت حسین: ۱۲۲۶ھ (۱۸۱۱ء) میں متولد ہوئے وہ لپست قامت، لاغر اندام، اور رنگ کے گولے تھے۔ ڈاڑھی چوٹی، بھوئی جڑی ہوئی۔ اور ان کے درمیان پیشانی پر ایک سرخ تل تھا۔ ان کی شادی بھی شاہ محمد حسین کی ایک بیٹی سے ہوئی۔ جس کے بطن سے عبدالرحیم مولف تذکرہ صادق پیدا ہوئے۔ بعد میں انھوں نے دو اور شادیاں کیں۔ وہ ۱۲۷۲ھ (۱۸۵۷ء) میں ۸۸ سال کی عمر میں رحلت فرما ہوئے۔

وہ پٹنہ کے مرکز کی تنظیم کے سربراہ ہوئے اور وقتاً فوقتاً ولایت علی کی پٹنہ سے غیر ماضی میں ان کے خلیفہ کی حیثیت سے کام کرتے رہے۔ ان کے گھر میں روزانہ جلسے ہوتے جہاں سماجی مذہبی مسائل پر تقریریں ہوتیں۔ ان میں مستورات بھی حاضر ہوا کرتیں۔ ان سے علیحدہ تقریریں کی جاتیں اور کبھی ان کی بیوی بھی وعظ کہتیں۔ اس گھر سے مدرسہ کا مصروف بھی لیا جاتا۔ طلبہ کی ایک کثیر تعداد مختلف موضوعات پر درس لیتی۔ اکثر کلاسیں کھلی علی لیا کرتے۔ طلبہ کے طعام و قیام کے اخراجات بیت المال سے پورے کئے جاتے۔

پٹنہ کی شورش کے موقع پر پیر علی اور شورش کے دوسرے سربراہ، وہابیوں کے سربراہ

فرحت حسین کی خدمت میں حاضر ہوئے اور درخواست کی کہ ان کے ساتھ شریک ہو جائیں۔ ان کے انکار کے اسباب اور ۱۸۵۷ء کی تحریک میں وہابیوں کی عام روش پر اوپر بحث کی جا چکی۔ عبداللہ ولایت علی کی دوسری محل مراد النصار سے ۱۲۲۶ھ (۱۸۳۰ء) میں حیدرآباد میں پیدا ہوئے۔ وہ اپنے والد ولایت علی کے سرحد کے متعدد مسافروں میں ان کے ساتھ رہے اور وہاں مختلف معرکوں میں حصہ لیتے رہے۔ ۱۸۴۷ء میں پٹنہ کی مراجعت کے بعد وہ اپنی تعلیم میں مصروف رہے۔ اسی زمانے میں فرحت حسین کی بیٹی سے ان کی شادی ہو گئی۔

ان کے والد کی وفات کے بعد ان کے چچا عنایت علی سے ان کے تعلقات خوشگوارانہ رہے اور پٹنہ چلے آئے چند سال فرحت حسین کے پاس رہ کر تنظیمی امور میں ان کا ہاتھ بٹایا۔ فرحت حسین کے انتقال کے بعد اپنے دو بھائیوں اور دو بیٹوں کے ساتھ سفر حج کو روانہ ہو گئے۔ حجاز سے افغانستان آئے اور وہاں سے سوات میدا کبر شاہ کے پاس چلے گئے جو سرحد پر وہابیوں کے پرانے سرپرست اور میزبان رہے تھے۔ وہاں وہ وہابی نوآبادی کے سردار منتخب ہوئے۔ غزوة امبید انھیں کی قیادت میں لڑا گیا۔ ۱۳۲۰ھ (۱۹۰۲ء) میں ان کا انتقال ہو گیا۔ ان کے بھائی عبدالکریم ان کے جانشین ہوئے۔ قلعہ کی تعمیر، توپ اندازی اور سواری کے فنون میں ان کی مہارت مسلم تھی۔

عبدالرحیم فرحت حسین کے بیٹے تھے۔ ۱۲۵۲ھ (۱۸۳۶ء) میں متولد ہوئے ابتدائی تعلیم خاندان کے متعدد بزرگوں جیسے فیاض علی و عبدالحمید وغیرہ سے حاصل کی۔ ان کے والد کی وفات اور عبداللہ کی سرحد پر تعیناتی کے بعد گھر میں تنظیمی کاموں کا سارا بوجھ ان کے اور بھائی علی کے کاندھوں پر آ پڑا۔ انبالہ کے مقدمے میں بھائی علی کے ساتھ یہ بھی مدعا علیہ تھے اور جس دوام کے مزایا ہوئے۔ اٹھارہ سال سرا بھگت کے بعد ۱۹۱۳ء میں ان کی میعاد منرا ختم کی گئی، پٹنہ والیں آئے۔ اور اپنا آہانی مکان ایسا منہدم پایا کہ اس کی شناخت بھی ناممکن تھی، تمام افراد خاندان منتشر تھے۔ خاندانی مقبرہ بھی جو گذشتہ چودہ پشتوں سے منعمول تھا باقی نہ بھجڑا گیا تھا۔ رہائی کے بعد بھی ان کی نقل و حرکت پر سیاسی پابندیاں برقرار تھیں۔ ہر دو ہفتے پر پولیس میں حلفی دینا پڑتی تھی۔

قید میں بیس برس وطن سے غیر حاضری کے بعد انہوں نے اپنے عزیزوں اور تمام شہر کی زندگی میں ایسا انقلاب پایا کہ تمیز و شناخت ناممکن معلوم ہوتی تھی۔ اس نئی دنیا اور متغیر ماحول میں جوان کی نگاہ میں غیر دینی اور غیر اخلاقی ہو کر رہ گیا تھا۔ وہ اپنے آپ کو تنہا اور افسردہ پاتے تھے۔ اس لئے انہوں نے حکومت سے سفر حج کی اجازت طلب کی جو بڑی بڑی مشکلوں سے منظور ہوئی۔ بمبئی اور حجاز تک پابندیاں برقرار رکھی گئیں حجاز میں بھی ان کو برطانوی قنصل میں حاضری دینے کا حکم تھا۔ بعد میں ۱۹۲۱ء میں ایک اور حج کیا۔ انڈمان سے مراجعت کے بعد انہوں نے اپنی خانگی زندگی کے ٹوٹے ہوئے رشتوں کو پھر جوڑا۔ اس زمانے میں ان کے کچھ اولاد ہوئی اور اپنی کئی اولاد کی شادیاں کیں۔ اسی زمانے میں انہوں نے اپنے خاندان کے ارکان کی سوانحی رودادیں تیار کیں جو تذکرہ صادقہ کے نام سے زیادہ معروف ہیں اور جو تحریک کے اہم ترین مطبوعہ مآخذ میں سے ہے۔ وہ ۹۶ سال کی پختہ عمر میں ۱۹۲۳ء میں رحلت فرما ہوئے۔

باقر علی فتح علی کے بھائی بشارت علی کے بیٹے اور ولایت علی کے چچا زاد بھائی تھے۔ ان کی کم سنی میں ان کی والدہ کا انتقال ہو گیا اور چچا نے ان کی پرورش کی۔ سید احمد کے سرحد کے ابتدائی قیام کے دوران میں وہ رسد کی تقسیم پر متعین تھے۔ ذخائر کے حصول، تحفظ اور تقسیم کے عام کاموں میں محدودی پھولتی کے معاون تھے۔ ان کو یہ امتیاز نصیب تھا کہ وہ پہلے مجاہد تھے جس نے اپنے مقصد معینہ کے لئے جان دی۔ وہ ۳۰ دسمبر ۱۸۲۶ء کو معرکہ اکورہ میں لڑتے ہوئے شہید ہو گئے۔ اُس وقت ان کی عمر صرف انیس سال تھی۔

قمر الدین حسین رکن الدین حسین کے بیٹے اور مغلیہ (پٹنہ سٹی) کے رفیع الدین حسین خاں کے پوتے تھے۔ ان کی شادی احمد اللہ کی بہن سے ہوئی تھی۔ سید احمد کے ہم کاب سرحد گئے تھے۔ اور مظہر علی جب پشاور کے قاضی مقرر ہوئے تھے تو یہ بھی وہیں متعین کئے گئے تھے اور مظہر علی کے ساتھ سلطان محمد والے ناگہانی مسلح انقلاب کا شکار ہوئے۔ ان کی بیوہ کا اعتدالی ولایت علی سے ہوا۔

عبدالعلی ارادۃ اللہ ماہد قبوری کے بیٹے تھے۔ وہ بنگال کے نواب مظفر جنگ کے عہد نظامت

میں پٹنہ میں حج کے عہدے پر مامور تھے۔ وہ زاہدانہ فقیرانہ اور فیاضانہ طبیعت رکھتے تھے۔ نواب نے اُن کو اعزازی خلعت اور بہت کچھ انعامات بخشے، سب مسکینوں اور محتاجوں میں تقسیم کر دیئے خود قرآن مجید کی نقلیں لکھ کر ان کی فروخت سے گزارا کرتے۔ سید احمد جب پٹنہ میں وارد تھے تو انہوں نے بھی ان کے ہاتھ پر بیعت کی۔ صادق پور کے قائدین کے نام سید احمد کے مکتوبات میں ان کے نام بھی ایک مکتوب تھا۔ وہ ۱۲۲۵ھ (۱۸۲۹ء) میں تقریباً ایک سو سال کی عمر میں رحلت فرما ہوئے۔

منظہر علی اگرچہ خاندان صادق پور کے رکن نہ تھے مگر تحریک کے اہم مقامی قائدین میں سے تھے۔ اور ان کی ابتدائی زندگی کا ایک مختصر تذکرہ یہاں بے محل نہ ہوگا۔ انہوں نے غالباً سید احمد کے دورہ پٹنہ سے پہلے ان کے ہاتھ پر بیعت کر لی تھی۔ کہا جاتا ہے کہ سید احمد اپنے پٹنہ کے دورہ کے دوران میں کچھ دن ان کے ہاں رہے۔

منظہر علی تحریک کے ایک جوشیلے اور بہادر کار گزار تھے۔ ایک جلوس کے تعزینے کو نقصان پہنچانے کے الزام میں ان پر مقدمہ قائم کیا گیا تو بھاگ کر گورکھ پور چلے گئے۔ بعد میں جب سید احمد سے ان کی ملاقات ہوئی تو فرار ہو کر اپنے ضامنوں کو پریشانی میں ڈالنے پر اُن کو سرزنش کی اور واپس جانے کی ہدایت کی جس کی انہوں نے تعمیل کی، مگر ان کے پٹنہ پہنچنے سے پہلے مقدمہ اٹھا لیا گیا تھا۔

وہ سید احمد کے ہمراہ سرحد گئے اور بہت سے معرکوں میں حصہ لیا۔ شاہ اسماعیل نے غزوہ مردان میں ان کی بہادری کا ذکر خصوصیت سے کیا ہے، ۱۸۳۰ء میں جب پشاور پر قبضہ ہوا اور اس کے شکست خوردہ سردار سلطان محمد کو لوٹا دیا گیا تو سید احمد نے مظہر علی کو اپنے نمائندہ کی حیثیت سے وہاں بھجور دیا تھا۔ وہ قاضی اور اخلاق عامہ کے محتسب بھی مقرر کئے گئے تھے۔ وہاں ہوں نے جو ادھورا عارضی نظام حکومت قائم کر لیا تھا اس میں یہ عہدے کلیدی اہمیت رکھتے تھے۔ اُن کا یہ تقرر دلیل تھا ان کی پرہیزگاری و علمی فصیلت اور اس اعتماد کا جو سید احمد ان پر رکھتے تھے۔ پشاور کے قیام میں ان کو سلطان محمد کے عذارانہ منصوبے اور متوقع اچانک کی بھنگ ملی، شاہ اسماعیل کو پوری صورت حال لکھ بھیجی شاہ صاحب نے ایک

طوبیٰ مراسلے میں سلطان محمد کے طرفداروں کے متعدد اتہامات کا جواب دیا جن کی منظر علی نے ان کو اطلاع دی تھی۔ وہ اپنی جان بچانے کے لئے وقت پر پشاور سے نکل جاسکتے تھے لیکن وقت ہاتھ سے نکل جانے سے پہلے اس زبوں صورت حال کا پورا اندازہ کرنے اور اپنے سردار کو رپورٹ دینے کے لئے وہیں ٹھہر گئے۔ آخر وہ سلطان محمد کے اچانک غدارانہ حملے میں نہایت بے رحمی سے قتل کئے گئے۔

(۲)

سید احمد کا ایک نایاب غیر مطبوعہ مکتوب

سید احمد کے مکتوبات کے شائع شدہ اور مخطوطہ مجموعے بہت سے موجود ہیں۔ مگر یہ مکتوب کسی مجموعے میں موجود نہیں۔ یہ بالخصوص خاندان صادق پور کے ارکان کے نام ہے اور اسی کی ایک نقل اسی خاندان کے ایک رکن کے پرانے کاغذات سے دستیاب ہوئی۔ اس کے مکتوب الیہ خاندان صادق پور کے سارے اہم ارکان اور ضلع پٹنہ کے دو سرے مومنین ہیں۔ مور اتفاق سے اس میں تاریخ تحریر درج نہیں۔ مگر اس کے وقت کا کچھ اندازہ اس کے مضمون سے لگایا جاسکتا ہے۔ یہ سرحد سے ولایت علی اور عنایت علی کی رخصت کے کچھ بعد لکھا گیا۔ اور یہ واقعہ ۱۸۲۸ء کے بعد کا ہو سکتا ہے۔ ۱۸۲۶ء کے آخر کا۔ کیوں کہ ولایت علی کی محل ثانیہ حیدرآبادی سے عبداللہ کی پیدائش ۱۲۳۶ھ (۱۸۳۰-۳۱ء) کے کسی پہنچے پیر ہوئی۔ ولایت علی کے سرحد سے دکن پہنچے، حیدرآباد میں قیام کرنے اور شادی کرنے میں اس وقت کا اندازہ کر کے ہم حیدرآباد میں ان کے پہنچنے کا اندازی وقت دیر سے دیر وسطاً ۱۸۲۸ء قرار دے سکتے ہیں۔

۱۔ بہنوئی عبدالغفار صادق پوری متذکرہ بالا کے بیٹوں کے پاس ہے۔

پورے مکتوب کا انگریزی ترجمہ درج ذیل ہے۔

از امیر المؤمنین سید احمد بخدمت جامعین علم و فضل، مخازن صدق و ایمان مولانا
عبد العلی، فتح علی، آہی بخش، اکرم الحق، واعظ الحق، منعم الحق، محمد حسین، شیخ علی جان، سید جمال علی
و دیگرہ مؤمنین عظیم آباد
بعد تحیات سلام و دعائے حسنت واضح باد۔

آپ کے خطوط ملے اور ان کے مضامین سے تمام حالات مجھ پر منکشف ہوئے۔ الحمد للہ
میں مع الخیر ہوں، دن رات مقصد کی ترقی کے لئے مصروف کار رہتا ہوں۔ اللہ کے فضل و کرم
سے جہاد کے قیام اور کفار کے خلاف جنگ کرنے کے لئے بہت کچھ امداد حاصل ہو گئی ہے۔
اس ملک کے مؤمنین، شرفاء، عوام اور سادات، سب کے سب جہاد اور اپنی جانیں نثار کرنے
کے لئے تیار ہیں اور میری اطاعت کا عہد قبول کر لیا ہے، انشاء اللہ فتح کی خبر آپ کو جلد
مل جائیگی۔

ہر زندہ مخلوق، اللہ کی رضا جوئی اور خالق کے لئے جان سپاری میں مصروف ہے۔ اس
کی محبت ہر ماسوا کی محبت سے اعلیٰ و ارفع ہے۔ گو اس اعلیٰ درجے کے اخلاص و ایمان
اور اس بلند (روحانی) مرتبے کا حصول عوام الناس کے لئے دشوار ہے۔ مگر ہر شخص پر جو دین
(اسلام) کا متع ہے اتنا تو فرض ہے کہ نورِ ظلمت کے درمیان کشمکش اور کفر و اسلام کے
درمیان جنگ میں اسلام کی آبرو کے جذبے کو بروئے کار لائے۔ ہر وہ شخص جو ایسے نازک
موقع پر انصاری صف میں شامل نہ ہو وہ فسق کا مجرم ہے، اور جو شخص جان کے خوف سے
اس نازک گھڑی میں کتر اچھائے اپنی بد بخت پیشانی پر اللہ سے علیحدگی کا داغ لگانے کا مرتکب ہے۔

لہ مکتوب ایہم میں عبد العلی، فتح علی، آہی بخش اور محمد حسین خاندان صادق پور کے ارکان ہیں جن کے سوانح
پیش کئے جا چکے۔ اکرم الحق اور واعظ الحق پہلے باڑھ کے باشندے تھے۔ سید احمد کے باڑھ کے دوڑے کے موقع
پر اکرم الحق نے ان سے بیعت کی تھی۔ علی جان دانا پور کے باشندے تھے اور سید احمد کے دانا پور کے دورے کے موقع
پر ان سے بیعت کی تھی اور بہت بعد تک تحریک کے لئے کام کرتے رہے۔ لہ یہاں ایک خط کھینچا ہوا ہے۔ عبارت کا
تسلسل منقطع سا ہے کیونکہ اس کے بعد کی عبارت میں عام اصول کے بیان سے ہلکی بیک ایک خاص امر ترسیل کا ذکر
شروع ہوجاتا ہے۔

مجاہدین کی فتوحات مومنوں کے لئے ایمان افروز اور منافقوں کے لئے دل سوز ہیں اطمینان رکھئے۔ آپ نے ۲۱۶۸ روپے کی ہنڈی کے بارے میں جو لکھا تھا کہ شیخ عبداللطیف کو بھیج دی گئی ہے وہ مجھے پہنچا دی اس کی کیفیت یہ ہے کہ:- اسی مضمون کا شیخ عبداللطیف کا ایک خط مجھے ملا جس میں یہ بھی لکھا تھا کہ انہوں نے ایک سات ہزار کی ہنڈی بھی مجھے روانہ کی ہے۔ مگر یہ رقم اب تک مجھے نہیں ملی ہے۔ انشاء اللہ جلد ہی مل جائیگی۔ اس طرح جو رقمیں آپ حضرات نے ارسال کیں وہ معائنہ گئیں۔ مگر واضح رہے کہ اب سے پہلے روپے کی ترسیل بند رہی اور کچھ وصول نہ ہوا تھا۔ اب اللہ کے فضل سے ترسیل زر کا ایک آسان تر ذریعہ دریافت کر لیا گیا ہے۔ مومنین مخلصین کو چاہئے کہ روپے مولانا اسحاق کے نام دہلی بھیجا کریں۔ وہاں سے مجھے مل جایا کرینگے۔ میں نے ان کو (اسحاق کو) ایک آسان اور محتاط (آنکھوں میں خاک جھونکنے کا) طریقہ لکھ بھیجا ہے۔ چنانچہ مجاہدین کے اخراجات کے لئے دو یا تین ہزار روپے وصول بھی ہو چکے لہذا جو کوئی رقم بھیجنا چاہے وہ اس کی ہنڈی مولانا اسحاق کو دہلی بھیج دیا کرے، وہاں سے مجھے مل جایا کرینگے۔

مولوی ولایت علی، محمد زکی، شیخ باقر علی، قمر الدین حسین اور شیخ علی جان نے بھی خط لکھے ہیں۔ ان کی رسیدیں مرسلہ رقوم کی وصولی کے بعد بھیج دی جائیگی، اطمینان رکھئے۔ میں نے (پہلے) ولایت علی کو مفوضہ کام کے لئے دکن بھیجا تھا۔ مولوی عنایت علی بھی میرے کہنے سے اس ضلع (پٹنہ) کو روانہ ہو گئے۔ اس ضلع کے باقی لوگ مع اخیر ہیں، بجز مولوی طالب حسین کے جو طبعی موت سے انتقال کر گئے، (ان کے عزیزوں کے لئے) یہ صبر و تحمل کا وقت ہے۔ حافظ قطب الدین مومنین اور مخلصین کی تعلیم کے لئے ادھر (؟) تعینات کر دئے گئے ہیں۔ اگر وہ اس ضلع (پٹنہ) میں پہنچ جائیں تو ان کی اعانت و تعاون کی کوشش کرنا۔

والسلام

(۳)

دہائی مراسلات میں مستعمل اصطلاحات اور سازشیوں کے عربی ناموں کی

کلید

زنگر وٹوں کو جہادی، خدمتگار، بیوپاری، مسافر، نرگاؤ کہتے تھے۔ زنگر وٹوں کی ٹویوں کو قافلہ، ملکہ دستخانہ کو بڑا گودام اور پٹنہ کو چھوٹا گودام کہتے تھے۔

جھڑپ یا معرکے کو مقدمہ، خدا کو مختار۔ اشرفی کو بڑا سرخ نعل، بڑے سنہرے جوتے اور بڑی چڑیاں۔ نصف اشرفی کو چھوٹے سرخ دانے اور چھوٹے سنہرے جوتے کہتے۔

اشرفیوں کے ارسال کو سرخ دانوں کی تسبیح۔ ہنڈی کو سنگ سفید کہتے، اور رقوم کی تعداد کو تسبیح کے سفید دانوں کے عدد سے ظاہر کرتے۔

روپے کے ارسال کو کتابوں اور مودے کی قیمت ظاہر کرتے

پٹنہ میں صادقیہ کے مولویوں کی عمارات بالخصوص اس حصے کو جو ولایت علی اور عبدالرحیم کا تھا قافلہ کہتے تھے۔

اسمائے عربی : —

احمد اللہ کے : احمد علی، محمد علی، یا احمد خاں۔

عبداللہ کے : بابو صاحب، بابو جان، خاں صاحب، یا بابو، میاں جان، خاں صاحب۔

فیاض علی کے : بصیر الدین یا فیاض عالم

عیسیٰ کا : روح اللہ

حافظ عبدالمجید کا : حافظ صاحب۔

یحییٰ علی کا : محی الدین

محمد شفیع کا : شفاعت علی

عیسانی یا برطانوی سپاہ ورنائے حضرت روح اللہ (عیسیٰ مسیح) کہلاتے۔

غزوہ امبیلہ کے موقع پر عبداللہ اور سید عمران کا مشترک مکتوب ایک سرحدی قبائلی سردار کے نام

(انگریزی ترجمہ)

سلام کے بعد کفار کی ایک بڑی فوج سلیم خاں، یار حسین اور شیخ جانا پر اس ملک کی غارتگری کی غرض سے آئی ہے۔ اس لئے تم کو لازم ہے کہ اس خط کے ملتے ہی اپنی کمر کس لو اور چملا کی طرف روانہ ہو جاؤ، اور وہ (امبیلہ) کے دوسرے حلیفوں میں اعلان کر دو کہ سرٹھی اور لنڈانی یعنی وادی جنگلاتی پر قبضہ کر لیں، اور اپنی (دفاعی) طاقت کو مستحکم بنالیں۔ اس ہدایت کی تعمیل میں تمہیں ایک لمحہ بھی دیر نہ کرنا چاہئے۔ اگر اس میں تاخیر یا سستی ہوئی تو مفسد کفار تمام پہاڑی نخطے، خصوصاً چملا، بنیر، سوات وغیرہ کے صوبے لوٹ کر غارت کر دینگے اور اپنے علاقوں سے ان کا الحاق کرینگے۔ تب ہمارا دین و مذہب اور دنیاوی املاک سب کچھ تحس نخس ہو جائیگا۔ اس لئے اسلام اور ایمان کے تقاضے اور دنیاوی مفاد کو مد نظر رکھ کر تم کو اس موقع پر غفلت نہ برتنا چاہئے۔ یہ کفار انتہائی دھوکے باز اور غدار ہیں، جس طرح بھی ممکن ہو گا ان پہاڑوں پر آجائینگے اور ملک کے عوام میں اعلان کرینگے کہ ہمیں تم سے کوئی پر خاموش نہیں، ہماری لڑائی ہندوستانیوں سے ہے ہم تمہیں کوئی نقصان نہ پہنچائینگے اتنا بھی نہیں کہ کسی کے سر کا ایک بال بھی بیکا ہو، ہندوستانیوں کو فنا کر کے فوراً واپس چلے جائینگے اور تمہارے ملک میں ہم کوئی مداخلت نہ کرینگے، وہ عوام کو مال و دولت کا لالچ بھی دینگے اس لئے تمہیں واجب ہے کہ ان کے فریب میں نہ آؤ ورنہ جیسے ہی وہ موقع پائینگے وہ تمہیں بالکل تباہ و برباد کر دینگے آزار پہنچائینگے طرح طرح کی رسوائیاں دینگے۔ تمہارے تمام مال و املاک پر قبضہ کرینگے اور تمہارے دین کو بھی ضرر پہنچائینگے۔ اس وقت تمہیں یا اس وحشت کے سوا کچھ نہ بلیگا۔ ہم اس معاملے کو تمہارے ذہن نشیں کئے ریتے ہیں یہ

مہر سید عمران

مہر عبداللہ

لہ پیگٹ اینڈ سین متذکرہ بالا

(۵)
جے ایچ ریلی، این گھوش ڈی آئی جی اور سب انسپکٹر پولیس اسٹیشنل ڈیپارٹمنٹ
صوبہ جات زیریں کے عیارانہ اور من مانے طریق کار کی رواد

اگست ۱۸۶۷ء میں نو بوسٹو گھوش سب انسپکٹر پولیس کے خلاف ایک نالاش کی گئی کہ اُس نے
ایک شخص تنوک سنگھ پر کچھ تھاپیوں کی چوری کا الزام لگا کر مستغیث کو دق کرنے اور نقصان پہنچانے
کی غرض سے اور عداوت سے ناجائز طور پر فوجداری مقدمہ قائم کر دیا تھا۔ ای ڈرومنڈ مجسٹریٹ
پٹنہ کی عدالت میں نالاش کی سماعت ہوئی۔ اُس نے ۱۹ اگست کو ملزم گھوش کو عدالت سیشن کے
سپرد کر دیا۔

ڈپٹی ایڈیشنل سیشن جج کی عدالت میں اس کی سماعت ہوئی۔ جج کی اعانت کے لئے ایک
جوری بھی مقرر ہوئی۔ ملزم پر مستغیث کو نقصان پہنچانے کی غرض سے اس کے خلاف ناجائز
مقدمہ قائم کرنے کا الزام عائد کیا گیا۔

جوری نے بھی اسے مجرم قرار دیا اور اسے ایک سال کی قید سخت اور ایک سو روپے
جرمانہ کی سزا دی۔ جج نے بھی جیورسی کی تجویز سے اتفاق کیا۔

اس مقدمے میں انیلی کا فیصلہ اُس آزادانہ دیکر انہ طرز عدالت کی بہترین روایات
میں سے بے جن میں قانون کے آگے تمام انسان امیر و غریب کی مساوات یکساں قائم رکھنے
کے لئے نہایت مستعدی اور باریک بینی سے کام لیا جاتا تھا۔ اس فیصلے کے کچھ ضروری اقتدار
ذیل میں اس لئے پیش کئے جاتے ہیں کہ یہ ریلی اور اس کے ماتحت پٹھوؤں کے عیارانہ اور من مانے
طریق کار کی نشان دہی کرتے ہیں۔

”اس مقدمے میں کوئی حکم خواہ وہ حکومت ہی کا کیوں نہ ہو، کسی ایسے فعل کے لئے نہیں
ہو سکتا جو ملک کے تحریری قانون کے خلاف ہو چہ جی بیکہ وہ حکم کسی ادنیٰ حکم
کا ہو۔ اگر مسٹر ریلی نے ملزم کو بے داغ کھٹھرنے کا بیڑا اٹھا رکھا ہے تو وہ اسے پورا کرے اس

لہ حافظ خانہ عدالت ڈسٹرکٹ جج پٹنہ۔ ہندل عدالت ۱۸۶۷ء۔ مقدمات سیشن ۱-۵۶

سے مجھے کوئی بحث نہیں۔ مجھے جس چیز سے بحث ہے وہ یہ ہے کہ قانون کو اپنے راستے پر چلنا ہے، اور یہ کہ اس عدالت میں ملزم کے خلاف جو الزام پیش کیا گیا ہے وہ اس عدالت کے احاطہ اختیار میں ہے اور اس کی جانچ کو آخر حد تک پہنچانا ہے۔ مجھے اس سے کوئی شکر کار نہیں کہ مقدمہ کے زور یا کمزوری سے ملزم سزایاب ہو یا رہا ہو جائے۔ میرا فرض ہے کہ میں اس عذر کی جانچ کروں جس کی بنا پر اس عدالت کو کاروائی روک دینے کی درخواست کی گئی ہے۔ میں نہیں مانتا نہ کوئی ہوشمند انسان مان سکتا ہے کہ حکومت نے سٹریٹیجی اور ان کے ماتحتوں کو کبھی ہدایت کی ہوگی یا اختیار دیا ہوگا کہ وہ جس کو چاہیں لاکھادوسادھ جیسے مخبر کی اطلاع پر بے لاگ شہادت سے یہ اطمینان کئے بغیر کہ یقیناً غالب انزام درست ہے گرفتار کر لیں۔ اس کے بعد نہ کہ قبل، ایسا اقدام کریں جس میں ان کے ہی وطن رعایا کی جو قانون کے آگے کے برابر ہیں آزادی ہی نہیں بلکہ جان کا خطرہ بھی متصور ہو۔

اب میں اس کا جائزہ لیتا ہوں کہ اسپیشل پولیس قانون کے ان حصوں کی پابندی نہیں جن کا تعلق تھانے کے پولیس افسروں سے ہے۔ سٹریٹیجی کہتے ہیں کہ ان کے محکمہ کو کیا اختیارات ملے ہیں وہ نہیں بتا سکتے، نہ وہ حکومت کے کسی ایسے حکم کا حوالہ دے سکتے ہیں جس سے یہ اختیارات ظاہر ہوں۔ میں یہ نہیں مان سکتا کہ اگر وہ چاہتے تو مجھے اس سے آگاہ نہ کر سکتے تھے یا یہ کہ ان کا حافظ اتنا کمزور ہے جیسا کہ اس مقدمے کی سماعت میں معلوم ہوتا ہے۔ ایسے محکمہ کے صدر ہونے کے پیش نظر میں اسے باور نہیں کر سکتا۔

۱۵۔ یہ رواد سماعت سشن سے متعلق ہے جس میں گھوش سزایاب ہوا، لیکن بعد میں غالباً وہ رہا کر دیا گیا اور ۱۸۶۸ء اور بعد میں وہ ملازمت میں نہ ہوتا، مگر ان کاغذات میں اس کی رہائی کا کوئی ذکر نہیں۔

اس مقدمے کا کوئی تعلق وہابیوں سے نہ تھا۔ مگر یہ ۱۸۶۸ء میں ٹھیک وہابیوں کی تفتیشوں کے آغاز میں وقوع میں آیا۔ اس ڈراما میں دو ایکٹ تو وہی ہیں جو وہابیوں کی تحقیقات میں تھے۔ اس مقدمے میں ان کے جس من مانے اور انتقامی طریق کار پر جج نے اس سختی سے تازیانی لگائے ہیں وہ ان کی بعد کی کارروائیوں کا بھی ٹھیک نمونہ ہیں۔ یہ مقدمہ ریلی کے جاہلانہ مزاج کا کچھ پتہ دیتا ہے، جس کا خیال تھا کہ اس کا اسپیشل محکمہ ملک کے عام قوانین سے بلند ہے اور اس کو کامل اختیار حاصل ہے کہ جس کسی کو چاہے گرفتار کر لے اور اس پر مقدمہ چلا دے۔

یہ مقدمے پٹنہ کے ڈویژنل کمشنر کے غصے اور غیر معمولی برا فروختگی کی وضاحت بھی کرنا ہے کہ ریلی نے ایسے بدنام آدمی کو پٹنہ میں (جہاں وہ سزا یاب ہوا) وہابیوں کے خلاف تفتیشوں کے لئے متعین وفد پر مسلط کیا تھا۔

(۶)
سید احمد کے بعض مکتوبات شائع کردہ محمد حفیظ و مندرجہ نسخہ مخطوطہ
کی مختلف تعبیرات

(ترجمہ بہ انگریزی)

نسخہ مخطوطہ پلٹہ یونیورسٹی

سوانح احمدی

(۱) رنجیت سنگھ اور کپنی جیسی طاقت اور وسائل ہمیں
میسر نہیں مگر تم سے کس نے کہا کہ امام اس قلیل طاقت سے
لاہور پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے (بعد کی
عبارت وہی ہے۔ صفحہ ۹۹)

(۱) رنجیت سنگھ کی طرح ہمیں طاقت اور وسائل
میسر نہیں، مگر تم سے کس نے کہا کہ امام اس قلیل طاقت سے
لاہور پر چڑھائی کرنے کا ارادہ رکھتا ہے؟ اس کے برعکس
وہ دن رات مسلمانوں کے وسائل میں اضافہ کرنے کے
لئے کوشاں ہے۔ (صفحہ ۲۸۵-۹۰)

(۲) میرا اصل مقصد جہاد قائم کرنا اور جنگ کو ہندوستان
میں جاری رکھنا ہے اور مرزا مین خراسان میں بیٹھ رہنا نہیں چاہتا
(۳) عیسائی کفار جنہوں نے ہندوستان پر قبضہ کر رکھا ہے
بڑے عیار اور دغا باز ہیں (صفحہ ۳۹)

(۲) میرا اصل مقصد پنجاب کے سکھوں کے خلاف جہاد
قائم کرنا ہے اور افغانستان اور باغستان کے ملکوں
میں بیٹھے رہنا نہیں۔ صفحہ ۲۴۸

(۴) بدشاہ و عیسائیوں اور بدبخت مشرکین نے ہندوستان
کے بہت سے حصوں پر دریائے سند کے ساحل سے لے کر
کے سوا حل تک جو چھ مہینوں کی مسافت ہے تسلط جما
رکھا ہے (صفحہ ۳۹)

(۴) دراز مو کفار (سکھ) جو پنجاب پر مسلط ہیں وہ بڑے
کار آزمودہ، چالاک اور دغا باز ہیں صفحہ ۲۶۱
(۴) بدشاہ و سنگھ اور بدبخت مشرکین نے دریائے سندھ
کے سوا حل سے دار الحکومت دہلی تک ہندوستان کے
مغربی حصوں پر تسلط جما رکھا ہے (صفحہ ۲۵۷)

واضح رہے کہ نمبر ۱ میں دو معنی خیز الفاظ "کپنی" اور "کلکتہ" "رنجیت سنگھ" اور "لاہور" کے بعد حذف
کر دئے گئے ہیں۔ نمبر ۲ میں "ہندوستان میں جہاد" کے عوض "سکھوں کے خلاف جہاد" درج کیا گیا ہے نمبر ۳
میں عیسائی کفار کی جگہ "دراز مو کفار" (سکھ) درج کیا گیا۔ نمبر ۴ میں "سندھ کے سوا حل" کے عوض
"دہلی" درج کیا گیا ہے۔ اس کے بعد کا تو صیحی فقرہ "چھ مہینوں کی مسافت" بالکل حذف کر دیا
گیا ہے ورنہ عبارت میں تضاد واقع ہو جاتا۔

(۷)

وہابی اور خلاف وہابی نگارشات پر تبصرہ وہابی نگارشات :-

وہابی تحریک نے اردو نثر نگاری کی رفتار کو بالخصوص بہار میں بہت ترقی بخشتی کیونکہ بہار ایک مدت دراز تک برطانوی ہند میں اس کا صدر مقام رہا۔ تحریک اصلاً تبلیغی تھی اور ایسی تمام تحریکوں کی طرح اس نے عوام کے زیادہ وسیع حلقوں تک پہنچنے کے لئے زیادہ تر مقامی زبانوں سے کام لیا جن کو عوام زیادہ سمجھ سکیں۔ وہابی سربراہوں نے مختلف کثیر التعداد اور کتابچے تحریر کئے۔ ان میں سے زیادہ تر مذہبی اور سماجی موضوعات پر ہیں جن میں مختلف مذہبی نظریات کی تشریح آسان زبان میں کی گئی ہے تاکہ عوام الناس ان کو بلا امتداد غیرے سمجھ سکیں۔ انہوں نے اکثر مذہبی اور سماجی رسوم پر بھی لکھا ہے جن میں کچھ رسوم کی نمائندگی پیروی کے عوض ان کے حقیقی مفہوم اور روح معنی کو سمجھنے پر زور دیا گیا ہے۔

وہابی مصنفین اپنی تحریروں میں باعینانہ مضمون سے بہت احتیاط برتتے تھے۔ ایسے مضامین وہ دورہ کرنے والے واعظین کے لئے چھوڑ دیتے تھے۔ اس پر بھی بعض جوشیلے برکاری افسر خالص مذہبی رسالوں میں بھی غلط معنی پیدا کرنے کی کوشش کرتے تھے۔ تاہم بعض وہابی تصانیف جیسے جہاد نامہ اور حارق الاشرار میں دین اور آزادی کے لئے جہاد کی فضیلت کی تعلیم دی گئی ہے۔

اکثر وہابی رسائل اب ناپید ہیں۔ وہابی خود حکومت کے مخالف سمجھے جاتے تھے اس لئے ان کی تحریروں میں بھی مشکوک تصور کی جاتی تھیں۔ لوگ اس بات سے خوف زدہ رہتے تھے کہ یہ خطرناک تصنیفات ان کے پاس پائی جائیں اس لئے ان کو علیحدہ کر دینے کی کوشش میں رہتے تھے چنانچہ رفتہ رفتہ یہ ضائع ہو گئیں۔

اپنی اس کتاب کی تالیف کے دوران میں پٹنہ کے ڈوینرل کمشنر کے دفتر میں مجھے

لے پروفیسر اختر احمد انیسوی نے اپنی کتاب ”بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا“ میں اردو نثر کی ترقی میں وہابیوں کی خدمات کا مفصل جائزہ لیا ہے۔ مطبوعہ پٹنہ ۱۹۵۷ء

کچھ وہابی رسالے اور چند گناہ رسالے ملے جن پر یہ شبہ تھا کہ پھولاری شریف کے مجددہ نشین کے تحریر کردہ ہیں۔ ان سے متعلق کاغذات سے معلوم ہوتا ہے کہ حکومت نے ان کو قابل اعتراض قرار دیا اور غالباً ممنوع بھی رکھا اور رسالے مطبوعہ و مخطوطہ دونوں، پٹنہ اور دوسرے مقامات کے لوگوں کے نجی کاغذات سے دستیاب ہوئے۔ ان میں سے اکثر خاندان صادر پور کے اصحاب کے لکھے ہوئے ہیں اور کچھ بے نام ہیں۔

کچھ وہابی کچھ مخالف وہابی رسالوں کی مختصر توضیحی فہرست ذیل میں دی جاتی ہے۔

۴

۵۔ تیز ملاحظہ ہو اور انڈین مسلمان صفحہ ۶۶-۶۷ بعض وہابی رسالوں کی فہرست کے لئے۔

اکابر صادق پور کی تحریرات کا سب سے مشہور مجموعہ جو عام طور پر دستیاب ہے وہ رسالہ تسعہ مطبوعہ مکتبہ فاروقی دہلی ہے۔ صفحات ۵۶

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے یہ نو رسالوں کا ایک مجموعہ ہے جو ولایت علی، عنایت علی اور قیاض علی نے مختلف موضوعات پر لکھے تھے۔ ان میں سے کچھ اردو میں اور کچھ فارسی میں ہیں (جن کا اردو ترجمہ بھی شامل کر دیا گیا ہے) ایک عربی میں ہے۔ اس مجموعہ میں حسب ذیل رسالے ہیں :-

۱۔ رسالہ روئے فکر فارسی صفحات ۱-۲۹۔ یہ ولایت علی کی تالیف ہے مع ترجمہ از الہی بخش (بڑاگری) دونوں کے متن پہلو بہ پہلو ایک ہی ایک صفحے میں ہیں اور ان کے درمیان میں ایک خط کھینچا ہوا ہے۔ زبان آسان اور با محاورہ ہے۔ یہ شاہ اسمعیل کے مشہور رسالہ تقویۃ الایمان کا خلاصہ ہے جو ہدایۃ التوحید کے نام سے ۱۳۱۲ھ میں مطبع دارالسلطنۃ کلکتہ سے علیحدہ بھی شائع ہو چکا ہے۔ صفحات ۴۷

ب۔ رسالہ عمل بالحدیث فارسی۔ صفحات ۳۰-۴۵۔ مولف ولایت علی مع ترجمہ اردو از الہی بخش (بڑاگری) آسان اور شستہ اردو میں۔ دونوں کے متن کی طرح ایک ہی صفحے پر درج ہیں۔ یہ فقہ اسلامی کے مختلف مسائل پر ہیں۔

ج۔ اربعین فی المہدین۔ عربی مع ترجمہ اردو۔ صفحات ۳۰-۴۵۔ مولف ولایت علی۔ یہ مہدی یا مسیح کے ظہور سے متعلق احادیث کا مجموعہ ہے۔ یہ رسالہ سید احمد کے ظہور ثانی کے عقیدے کا اظہار ہے جو کچھ عرصے تک وہابیوں کے ایک گروہ میں پھیلا ہوا تھا۔

د۔ رسالہ دعوت اردو صفحات ۶۴-۸۸، مصنف ولایت علی۔ یہ ہندوستانی مسلمانوں کے مختلف فرقوں کو سید احمد کی تعلیمات قبول کرنے اور بیعت کرنے کی دعوت دیتا ہے اور ظہور ثانی کے عقیدے کا بھی کچھ بیان ہے۔

۴۔ رسالہ تیسیر القلوة، ۷۹-۸۷۔ مصنف ولایت علی۔ اس میں مختلف قسم کی

نمازوں کا ذکر ہے۔

اس رسالے کا ایک غیر مورفہ مخطوط نسخہ مجھے فی الحال سورج گڑھ کے ایک صاحب کے نجی ذخیرے سے دستیاب ہوا ہے۔ سورج گڑھ ضلع مونگیر بہار میں دہائیوں کا ایک اہم مرکز رہا ہے۔

۳۔ رسالہ شجرہ با شجرہ، اردو، صفحات ۸۸-۹۲، مصنفہ ولایت علی، بعض دروجہ صوفی طریقوں اور پیروں کی تعظیم میں غلو کے رو میں لکھا گیا ہے

۴۔ رسالہ بت شکن اردو، صفحات ۹۲-۱۰۶، مصنفہ عنایت علی، یہ طنزیہ طرز پر لکھا گیا ہے اور ان لوگوں کی تضحیک کی گئی ہے جو تعزیے نکالتے اور ان کی پرستش کرتے ہیں۔ اسی موضوع پر کچھ اردو اشعار بھی ہیں۔

۵۔ رسالہ منبع الفیوض، فارسی، صفحات ۱۰۶-۱۳۸، یہ مکالمہ ہے جس میں مختلف مذہبی مسائل پر فیاض علی سے سوالات اور ان کے جوابات ہیں پہلے یہ فیض الفیوض کے عنوان سے شائع ہوا تھا۔ بعد میں فارسی متن مع ترجمہ اردو از الہی بخش (بڑا کر می) منبع الفیوض کے عنوان سے شائع ہوا اور اس مجموعہ میں شامل کر لیا گیا۔

۶۔ تبیان الشریک، اردو، صفحات ۱۴۲-۱۵۶، مولفہ ولایت علی، یہ دراصل رسالہ کی نظر ثانی اور کچھ اضافہ ہے۔

مولوی عبدالغفار صادق پوری کے ذخیرہ کتب میں مختلف مسائل جیسے ادائے عبادات، نکاح، بیوگان، جہاد وغیرہ پر کچھ رسالے ہیں۔ افسوس ہے کہ ان میں سے بعض نام تمام ہیں اور ان کے لکھنے والوں کے نام اور مقام و تاریخ اشاعت کی دریافت ممکن نہیں۔ ان میں سے چند یہ ہیں۔

(۱) رسالہ نماز، اردو، صفحات ۱۴۱-۱۴۲، تفسیر سورہ فاتحہ، اردو، صفحات ۱۸-۲۸، دونوں

۱۷ [اب دستیاب نہیں] مترجم، ۱۸ شاید یہ شجر بے ثمر ہے] مترجم

ایک ساتھ مجلد ہیں اور محرم ۱۲۶۸ھ میں مصری گنج پریس کلکتہ سے شائع ہوئے۔
 (۲) رسالہ نماز بمعنی اردو۔ صفحات ۱۔ ۴ نماز ادا کرنے کے طریقے سے متعلق ہے،
 رسالہ جہاد یہ۔ اردو نظم صفحات ۵۔ ۷ اوکسلی نے اس نظم کا پورا ترجمہ انگریزی
 میں کر کے اپنے متذکرہ صدر مقالہ کے ساتھ کلکتہ ریپو بولڈ ۵۱ (۱۸۷۰ء) میں
 شائع کیا۔

رسالہ نکاح بیوگان۔ نا تمام، ایک صفحہ

(۳) حازق الاشرار مطبوع مطبع محمدی دہلی ۱۲۸۳ھ صفحات ۳۲۔ اس میں ۱۲۵۶ء کے
 خمسے ہیں۔ آڑی سطروں میں لکھے ہوئے ہیں اور ہر خمسے کے نیچے ایک سیدھی لکیر ہے،
 ہر صفحے پر چھو خمسے ہیں۔ ان کے موضوع مختلف ہیں، تو صیف جہاد شاہ اسماعیل
 کی شجاعانہ جنگ ادھو کے باز پیروں اور باطل مرشدوں کی مذمت وغیرہ بنائیا
 حکومت نے اس کتاب کی اشاعت کو ممنوع قرار دیا تھا۔ اس کا ایک نسخہ پٹنہ کے
 ڈونیزل کمشنر کے دفتر میں ممنوعہ دہلی رسالوں میں پایا گیا۔

(۴) ظہور الحق عنظیم آبادی کا ایک بے نام مخطوطہ رسالہ بھی ہے۔ یہ کوئی حرفہ یا
 پیشہ سیکھ کر اپنی روٹی آپ کمانے کی فضیلت پر زور دیتا ہے، یہ احادیث کی
 رو سے مسلمانوں میں پھیلے ہوئے اس خیال کی تردید کرتا ہے کہ بعض پیشے
 جیسے پارچہ بافی، خیاطی وغیرہ گھٹیا اور شرمناک ہیں۔ مصنف اس غلط خیال کی
 تردید کرتا اور دعویٰ کرتا ہے کہ خدا کی نگاہ میں سارے پیشے یکساں شریف ہیں۔
 واضح رہے کہ اس تحریک کی تاریخ میں بار بار یہ ذکر آتا ہے کہ دہلی تحریک
 کے متبعین کا بھاری اکثریت پیشہ وروں یا کاشتکاروں کے طبقے سے تھی۔ یہ
 رسالہ ان طبقوں کی حمایت میں نہایت دلچسپ تخریریں اور اپنی قسم کی ایک ہی ہے

لد نمبر جلد ۲ صفحہ ۴۷۹ میں ایک ہی نام کے دو رسالوں کا ذکر کرتے ہیں جو سید احمد
 کی تصنیف تھیں، مگر وہ ان کی کوئی تشریح نہیں کرتے نہ کوئی اقتباس دیتے ہیں
 اس لئے ان رسالوں کو عین وہی قرار دینا ممکن نہیں۔

وہابی اور خائف پھلوانی شریف

یہ نکتہ بھی دلچسپی سے خالی نہیں کہ قدیم اور مشہور و معروف مرکز صوفیہ پھلوانی شریف، بھی ۱۸۴۵ء-۸۳ کے دوران وہابیوں سے ہمدردی کے شبہہ میں مبتلا رہا۔ ترکوں کی اعانت کے لئے سجادہ نشین کے بعض اعلانات اور خالص مذہبی امور سے متعلق ان کی بعض مطبوعہ تصانیف بھی معرض اشتباہ میں آئیں یہاں تک کہ وہابیوں کے ساتھ علمائے پھلوانی کی ساز باز پر حکومت کے استعمال کے لئے ایک بسیط یادداشت تیار کی گئی۔ اس میں بتایا گیا کہ ”پھلوانی والوں کی روش وہابیوں کی روش سے بہت مشابہت رکھتی ہے اور یہ کہ پھلوانی نے بھی بالکل صادقانہ طور کے قدم بقدیم چلنا شروع کر دیا ہے“ اس نے یہ سفارش بھی کی کہ پھلوانی کو بھی ایک سب ڈویژن بنا دیا جائے۔ اور ایک تجربہ کار ڈپٹی مجسٹریٹ بابو ایشری پر مشاد جیسا (وہابیوں کا شمار کرنے والا) ”وہاں متعین کیا جائے۔“

علمائے پھلوانی کی بعض تصانیف جنہوں نے حکومت کو برا نگینہ کیا یہ تھیں:-

تحفہ محبت - فارسی - پہلے کسی ”سنی حنفی مسلم“ کی لکھی ہوئی ایک کتاب مستحقہ محبت میں وہابیوں کے خلاف کچھ مذہبی الزامات عائد کئے گئے تھے۔ یہ کتاب اسی کے رد میں لکھی گئی۔ اس کتاب کی اشاعت میں ایک دلچسپ بات یہ ہے کہ یہ ۱۸۶۶ء کی دفعہ ۲۵ کی خلاف ورزی تھی۔ اس پر نہ مصنف کا نام درج تھا نہ شائع کنندہ کا۔ لیکن حکومت نے پھلوانی شریف کے ایک بڑے عالم پر اس کے مصنف ہونے کا شبہہ کیا۔ اور ایک اعلان شائع کیا کہ جو کوئی کتاب کے مصنف اور شائع کنندہ کی اطلاع دیجائے اسے اشخاص متعلقہ کے جرمانہ کی (ایک ہزار روپے کی) رقم کا نصف عطا کیا جائیگا۔

معیار المذہب فارسی مصنف مولانا سید علی اعظم قادری پھلوانی پہلی بار ۱۲۵۵ھ میں اور دوسری بار

۱۲۹۱ء میں مطبع نظامی کانبور سے شائع ہوئی۔

اسوۂ حسنہ۔ فارسی۔ مصنفہ شاہ محمد علی جلیب پھلواروی۔ ۱۲۹۲ء میں مطبع محمدی سے شائع ہوئی۔

یہ ساری تصنیفیں خاص طور سے مذہب اور فقہ کے مسائل پر ہیں۔ لیکن یہ بات قابل اعتراض ٹھہرائی گئی کہ آخری دونوں کتابوں کے مصنفوں نے وہابیوں کے سرغنہ کو "آفتاب روحانیت" "عماد متقین" اور ماہتاب انہیں کی صفات سے یاد کیا تھا۔ وہابیوں کے خلاف نگارشات۔

انبارہ اور پٹنہ کے مقتدات کی سماعت کے دوران میں جن لوگوں پر وہابیت کا شبہہ ہوتا ان کی دھڑکے اور جستجو شروع ہو گئی۔ مستتبہ وہابیوں کی نشان دہی ایک زرخیز مشغلہ بن گیا۔ بعض لوگوں نے یہ شیوہ اختیار کر لیا کہ بظاہر وہابی تعلیمات پر سنجیدہ تنقید کے ساتھ کتابیں شائع کرتے مگر درحقیقت گندہ مذاق کے ساتھ وہابیوں پر دشنام طرازیوں ہوتی ہیں۔

اس قسم کی تحریرات کا ایک خاص نمونہ امداد علی بیج عداوت خفیہ تہرت و کمرہ سیری بہار سائینک سوسائٹی کی کتاب وہابیوں کی تاریخ کا خلاصہ ہے اس میں مصنف نے یہ ثابت کرنے کی کوششیں کی ہیں کہ "وہابی اسلام سے خارج ہیں" "اسلام سے ان کا کوئی واسطہ نہیں" اور "بے ایمان، شریک، دھوکے باز اور باغی" لوگ ہیں اس طبقہ کے مصنفین کی شامت یہ تھی کہ ان کی درپردہ نیت اتنی صاف اور نمایاں ہوتی کہ خود سرکاری حکام جن کی خوشنودی حاصل کرنے کے لئے یہ لکھی جاتیں ایسے لوگوں اور ان کی تحریروں کو حقارت کی نظر سے دیکھتے۔ پٹنہ کے کمشنر نے امداد علی کی وہابیوں کے خلاف مجسٹریٹ کو یادداشت لکھتے ہوئے رائے زنی کی "میرا اپنا خیال یہ ہے کہ امداد علی پھر فریب دے رہا ہے اور وہابیوں اور وہابیت کا پردہ کشا بنکر اپنے آپ کو نمایاں کرنے کی کوشش کر رہا ہے۔"

۱۸۶۱ء میں کمشنر پٹنہ کا نوٹ
۱۸۶۱ء میں کمشنر پٹنہ کا نوٹ
۱۸۶۱ء میں کمشنر پٹنہ کا نوٹ
۱۸۶۱ء میں کمشنر پٹنہ کا نوٹ
۱۸۶۱ء میں کمشنر پٹنہ کا نوٹ
۱۸۶۱ء میں کمشنر پٹنہ کا نوٹ
۱۸۶۱ء میں کمشنر پٹنہ کا نوٹ
۱۸۶۱ء میں کمشنر پٹنہ کا نوٹ
۱۸۶۱ء میں کمشنر پٹنہ کا نوٹ
۱۸۶۱ء میں کمشنر پٹنہ کا نوٹ

بعض مقامی اخبارات و رسائل نے بھی وہابیوں پر گزشتگی اچھالی۔ ایسا ایک اردو اخبار سورج مل ڈپٹی انسپکٹر پٹنہ نارمل اسکول نے چشمہ علم کے نام سے شائع کیا تھا۔ اس کے شمارہ مورخہ ۱۶ اپریل ۱۸۶۵ء میں ایک مضمون ”وہابیوں کی نئی چالیں“ کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس کی ابتدا اس جملے سے ہوئی ”آجکل وہابیوں نے چوہوں کی طرح بھوں سے سرنکالنا شروع کر دیا ہے۔۔۔۔۔“

ایک اور وہابیوں کا شکاری ایک مقامی رئیس نجم الدین پدیر قطب الدین اور (نواب) ولایت علی گزری پٹنہ سٹی کا عزیز دوست تھا۔ اس نے جواب دو اذہ گنا کے عنوان سے ایک کتاب لکھی تھی جو ۱۸۶۸ء میں محمدن پریس پٹنہ سے شائع ہوئی۔ اس میں وہابیوں کے دعویٰ کے رد میں بارہ جوابات درج ہیں۔ اس کا ایک نسخہ ما کوئی کمشنر پٹنہ کی نذر کرتے ہوئے مصنف نے دعویٰ کیا کہ اس نے اسے ”وہابیوں کی برائی کو روکنے کے لئے لکھا ہے“ اور کمشنر کو یقین دلایا کہ میں وہابیوں کے سردار کے متعلق سب کچھ معلوم کرنے کی کوشش میں کوئی کسر اٹھا نہیں رکھتا۔۔۔۔۔۔۔۔۔۔ (نواب) سید ولایت علی اور میں ہمیشہ ہی کرتے رہینگے“

(۸)

مکتوب سید احمد بنام راجہ ہندورا اور برادر نسبتی مہاراجہ دولت رائے سندھیا گوالیار

از امیر المؤمنین سید احمد بطلانہ عالی تبار، اعلیٰ جاہ، منبع جود و کرم، ماوے اہل
سیف و قلم، مالک خزانہ، دو فاتر، صاحب افواج و عشم، بانی مصالح و حکم ریاست و
نظام حکومت۔ خدا اس کی طاقت و اقتدار قائم رکھے اور اپنی زندگی میں خوش
و خرم رہے۔

حزبات اتحاد و وداد کے اظہار کے بعد واضح ہو کہ میں ایک غریب آدمی، عالمین
کے کچھ بندوں کے ساتھ پشاور کے اطراف میں دین اسلام کی خدمات کی بجائے اور
سید المرسلین کی امت کے مقصد کی حمایت میں مصروف ہوں۔ اور اپنی مساعی کے ثواب کا
منعم حقیقی کی بارگاہ سے متوقع و آرزو مند ہوں۔

آپ کی نظر عالی میں ظاہر ہے کہ دور دراز ممالک سے اجنبی لوگ زمان و مکان کے
فرمانروا ہو گئے ہیں، اور سوداگروں اور بینوں نے حاکمیت و سلطنت کا مرتبہ حاصل کر لیا
ہے۔ انہوں نے بڑے بڑے امراے ذی شان کی زمین اور عالی جاہ رئیسوں کی ریاستیں
بمباد کمردی ہیں اور ان کے وقار و اقتدار کو بالکل خاک میں ملا دیا ہے۔ چونکہ صاحبان
مملکت ریاست گوشہ و خمول میں جا بیٹھے ہیں اس لئے چند غریب اور عاجز لوگوں
نے مجبور ہو کر مکرہمت باندھ لی ہے۔ عاجزوں کی یہ جماعت رب العالمین کے دین کے
مقصد کی انجام دہی کے لئے اٹھ کھڑی ہوئی ہے، نہ کہ مال و دولت کے لالچ سے۔ جوں ہی
ہندوستان کی سرزمین ان اجنبی دشمنوں سے پاک ہو جائے اور اس جماعت کی مساعی
اس کے مقاصد کے حصول میں کامیاب ہو جائیں، ریاست اور نظام حکومت کے عہدے
اور دفاتر ان کے طلبکاروں کے حوالہ کر دئے جائیں گے اور ان کی طاقت و اقتدار
کی جڑیں مضبوط ہو جائیں گی۔ یہ عاجز جماعت عالی مرتبہ مقتدر و ساد امر سے صرف یہی
چاہتی ہے کہ وہ دل و جان سے اسلام کے مقصد کی اعانت و حمایت کریں اور اپنے

نحت حکومت پر قابض و برقرار رہیں۔

اگرچہ بظاہر درویشوں کا یہ گروہ سازو سامان سے قطعاً محروم ہے تاہم ربالعالمین کی ربوبیت و حفاظت سے جو اسے حاصل ہے راضی و مطمئن ہے۔ وہ جاہ و وقار کی خواہشوں اور آرزوں سے متنفر اور مال و دولت کی غرض و طمع سے آزاد ہے۔ وہ حال یا مستقبل میں ذاتی اور نفسانی خواہشوں کی تسکین کی ہوس نہیں رکھتا۔ وہ اُن تمام پرانے رُسوا و امرا کی جو اس کی اعانت و حمایت کر چکے، حکومت کی جڑیں مضبوط کر دینگا۔

چونکہ حامل مکتوب ہذا مقبول بارگاہ الہی حاجی بہادر شاہ اس عاجز کے رفقا سے قدیم ہیں سے ہے اس لئے ان معروضات کی تفصیلات عرض کرنے کی خدمت اس کی زباناً صادق البیان کے سپرد کر دی گئی ہے۔ اب کچھ عرض کرنا باقی نہیں بجز اس تاکید مکرر کے کہ آپ ان معروضات کی تہہ تک پہنچیں اور صورت حال کی اہمیت کا احساس کریں۔

مزید گزارش یہ ہے کہ حاجی صاحب، ایک مہوت سے اللہ تعالیٰ کے دین کی خدمت میں مصروف ہیں اس لئے اپنے گھر والوں کی ضروریات اور آسائش کی طرف توجہ نہیں کر سکے ہیں۔ انہوں نے مستقبل میں بھی اسلامی فوج میں شامل رہنے کا عزم مصمم کر لیا ہے اس لئے امید نہیں کہ وہ آئندہ بھی اپنے خاندان کی دستگیری کے لئے لوٹ سکیں گے۔ اس لئے خدمت عالی میں گزارش کی جاتی ہے کہ ان کے بھائی اور بیٹے کو آپ کی ریاست میں کوئی خدمت سپرد کی جائے تاکہ حاجی صاحب خدا کے کام میں دل جمعی سے مصروف رہ سکیں۔

تمام شد

ماخذ

مخطوطات :-

- ۱۔ امیر نامہ (سوانح نواب امیر خاں والی ٹونک) مولفہ بساوان لال۔ ۳ جلدیں۔ نسخہ کتب خانہ کلکتہ یونیورسٹی
- ۲۔ محزن احمدی مولفہ محمد علی اوپی آئی۔ منقولہ ۱۲۶۲ھ ہجری
- ۳۔ مشنوی شہر آشوب از حکیم عبدالحمید۔ میرا ذاتی نسخہ
- ۴۔ صراط مستقیم نسخہ صادق پور مورخہ ۱۲۳۳ھ
- ۵۔ تاریخ ہزارہ مولفہ مہتاب سنگھ مورخہ ۱۸۵۲ھ میرا ذاتی نسخہ
- ۶۔ مکتوبات سید احمد کابلی نام مجموعہ۔ نسخہ کتب خانہ پٹنہ یونیورسٹی۔ مورخہ ۱۲۶۲ھ
- ۷۔ وقائع احمدی۔ ۲ جلد۔ نسخہ کتب خانہ رامپور
- ۸۔ نیشنل آرکیو (قومی محافظ خانہ) خارجی سیاہی اور خارجی خفیہ محکمہ جات کے مجموعوں سے حسب ضرورت جلدیں۔ ۱۸۳۱ھ سے آگے۔
- ۹۔ سنٹرل ریکارڈز آفس کلکتہ۔ محکمہ عدالت کا مجموعہ دستاویزات ۱۸۳۱-۵۹ھ
- ۱۰۔ سنٹرل ریکارڈز آفس پٹنہ۔ محکمہ عدالت کا مجموعہ دستاویزات (مطبوعہ) ۱۸۵۹ھ سے آگے
- ۱۱۔ دفتر ڈویژنل کمشنر پٹنہ :-
 - (۱) مجموعہ منجانب و بنام مجسٹریٹیاں ۱۸۲۱ھ سے آگے۔
 - (۲) "غدر" اور اہم عدالتی کاغذات (بندلوں میں) ۱۸۳۵ھ سے آگے۔
 - (۳) کچھ غیر منسلک کاغذات ایک الماری میں علیحدہ رکھے ہوئے۔ یہ سب کاغذات ایک دفقی میں وہابی خفیہ کاغذات کے عنوان سے رکھے ہوئے ہیں۔
- مجموعے (۱) اور (۲) اب پٹنہ سنٹرل ریکارڈز آفس میں منتقل کر دیئے گئے ہیں۔

مطبوعات فارسی وارو

یہ علیحدہ اور اہم مگر فراموش کردہ مآخذ ہیں۔ ان میں سے اکثر کتابیں اور رسالے اشاعت کے فوراً بعد سے ممنوع الاشاعت قرار دئے گئے تھے۔ اور مختلف سرکاری دفاتر سے ان کی بازیابی کی گئی ہے۔ ان میں کچھ صوبہ کے مختلف مقامات خصوصاً سورج گڑھ (ضلع مونگیر سے جو تحریک کا ایک اہم مرکز رہا ہے) نجی ذخیروں میں پائے گئے تفصیل کیلئے ملاحظہ ہوتے

۱۔ اختر احمد آرٹھوی۔ بہار میں اردو زبان و ادب کا ارتقا۔ پٹنہ ۱۹۵۷ء

۲۔ اے احمد۔ ہندوستانی ماحول میں اسلامی ثقافت آکسفرڈ ۱۹۶۴ء

۳۔ مرزا حیرت۔ حیات طیّبہ۔ طبع ثالث۔ لاہور ۱۹۵۸ء

۴۔ مجد الحق۔ درمقال

۵۔ فضل حسین۔ حیات بعد المات۔ آگرہ ۱۹۰۸ء

۶۔ جعفر تھانیسری۔ سوانح احمدی دہلی ۱۳۰۹ھ۔ و تواریخ عجیب (کالا پانی) طبع ثانی انبالہ ۱۳۰۲ھ

۷۔ ایس آر۔ کوہلی (پبلشر) ظفر نامہ رنجیت سنگھ مولفہ دیوان امر ناتھ۔

۸۔ غلام رسول مہر۔ سید احمد شہید وغیرہ ۴ جلدیں۔ لاہور ۱۹۵۲-۵۲ء

۹۔ اے۔ ایچ۔ اے ندوی سیرت سید احمد شہید، طبع ثالث۔ لکھنؤ ۱۹۴۵ء

۱۰۔ ایم اے ندوی۔ ہندوستان کی پہلی اسلامی تاریخ۔ طبع ثانی۔ راولپنڈی ۱۹۵۸ء

۱۱۔ ایم عیاد اللہ۔ شاہ ولی اللہ اور ان کی سیاسی تحریک

۱۲۔ عبدالرحیم۔ تذکرہ صاڈتہ۔ طبع ثانی۔ الہ آباد (حکیم عبد الجبیر نے ۱۸۶۴ء میں مع تمہہ طبع جدید

شائع کیا)

۱۳۔ ایضاً۔ رسالہ تسعہ (مجموعہ مقالات)۔ فاروقی پریس۔ دہلی

نفیس ترین لٹریچر

نایاب و نادر کتابوں کا بیش بہا خزانہ

وہ کتابیں جن کے بغیر کوئی لائبریری مکمل نہیں کہلا سکتی

پروپرائیٹرز: ————— چوہدری محمد اقبال سلیم گاہندی

مہتمم: ————— چوہدری خالد اقبال گاہندی

نفیس اکیڈمی

اسٹریٹ ریلوڈ، بالمقابل ایس ایم آرٹس کالج کراچی نمبر ۱
فون: ۵۱۳۳۰۳

تاریخ الامم مصنف علامہ ابن جریر الطبری

تاریخ طبری

مکمل سیٹ ۲۲۷/۰

مکمل گیارہ حصوں میں

اس میں سلطنت کسری کے خاتمہ کا حال ہے اور مصر و شام، ایران و خراسان، ترکستان اور کابل کی وسیع فتوحات کے مجاہدانہ کارناموں کا تذکرہ ہے اور اس میں حضرت عمر فاروق اعظم کی بے نظیر تدبیر و سیاست، بحری جنگوں، انتظام سلطنت اور ان کی ایشیا و قربانی کے سبق آموز حالات مذکور ہیں نیز حضرت عثمان رضی اللہ عنہ کے دور خلافت کے نہایت اہم حالات بیان کئے گئے ہیں

صفحات ۵۱۲ - قیمت ۲۲/۰ روپے

تاریخ طبری - حصہ سوم کا حصہ سوم

خلافت راشدہ (حصہ سوم)

حضرت علیؓ، حضرت امام حسنؓ ۳۵ھ تا ۴۰ھ

ترجمہ: مولانا حبیب الرحمن کاندھلوی۔

جس میں حضرت علیؓ اور حضرت حسنؓ کے دور کے تمام واقعات مذکور ہیں۔ نیز جنگ جمل و صفین اور خراجیوں کی جنگوں کے تمام حالات بیان کئے گئے ہیں اور حضرت علیؓ اور امیر معاویہؓ کے باہمی اختلاف کے اسباب و علل بیان کئے گئے ہیں اور کیا گیا ہے۔ صفحات ۵۱۲ - قیمت ۲۲/۰ روپے

تاریخ طبری - حصہ چہارم

امیر معاویہؓ سے شہادت حسینؓ تک ۴۱ھ تا ۶۶ھ

ترجمہ: علامہ سید حیدر علی طباطبائی

حضرت امیر معاویہؓ کے بیس سالہ دور حکمرانی کے حالات جب مسلمان فاتحین

کابل اور افغانستان کو فتح کر کے درہ خیبر کے قریب پہنچے تھے۔ افریقیہ

تاریخ طبری حصہ اول سیرت النبی صلعم

ولادت رسولؐ سے وفات رسولؐ ۱۱ھ تک

ترجمہ: سید محمد امیر، ایم اے ندوی

زیر نظر حصہ میں آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی سیرت مبارکہ کی تمام تفصیلاً معبرا اور اصل دلیلوں تک مکمل سلسلہ اسناد کے ذریعہ بیان کی گئی ہے یہی وہ نایاب تاریخ ہے جو زمانہ قدیم سے لیکر عصر حاضر تک سیرت مبارکہ کی مستند اور معتبرا خذ رہی ہے اور تاریخ اسلام کے تمام مورخین نے اسی سے

خوشحسینی کی ہے۔ قیمت ۲۲/۰ روپے

تاریخ طبری - حصہ دوم

خلافت راشدہ حصہ اول ۱۰ھ تا ۱۶ھ

ترجمہ: سید محمد امیر، ایم اے ندوی، سید رشید احمد ارشد ایم اے اس میں عہد صدیقی کا مکمل دور خلافت اور عہد فاروقی کے ابتدائی دور (۱۶ھ) کے مفصل حالات، حضرت ابو بکرؓ کے عدل و انصاف اور نظام سلطنت کے حالات نہایت دلکش انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰/۰ روپے

تاریخ طبری - حصہ سوم

خلافت راشدہ حصہ دوم

خلافت حضرت عمر فاروق اعظمؓ و حضرت عثمان غنیؓ ۲۳ھ تا ۳۵ھ

ترجمہ: مولانا رشید احمد ارشد ایم اے

کے آخری فرمانروا کے حالات پر مشتمل ہے اور اموی خلفاء کی لغزشوں کے رد عمل کا ظہور ابو مسلم خراسانی کی فتنہ سامانیہ بنو امیہ اور بنو عباس کے نسلی تعصبات اور اموی دور حکومت کے حالات تفصیل سے بیان کئے گئے ہیں۔ قیمت ۲۰/۰ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ ہفتم

عباسی دور حکومت

خلیفہ ابوالعباس تا خلیفہ مہدی

۱۳۲ھ تا ۱۷۰ھ

ترجمہ: سید محمد ابراہیم ایم اے (ندوی)

قیمت ۲۲ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ ہشتم

ہارون الرشید اور اس کے جانشین

ہارون الرشید تا واثق باللہ

۱۷۱ھ تا ۲۳۱ھ

ترجمہ: سید محمد ابراہیم ایم اے (ندوی)

قیمت: ۲۲ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ نہم

خلافت بغداد کا دور انحطاط (حصہ اول)

صفحات ۴۰۰، قیمت ۱۵ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ دہم

جعفر المتوکل تا المقدار باللہ (حصہ دوم)

قیمت ۱۶/۰ روپے

مکمل سیٹ: ۲۲۳ روپے

میں قیروان فتح ہوا اور تونس و سوڈان میں فتح و کامرائی کا پرچم لہرایا یہ کشور کشائی و تمدن آفرینی کی حیرت انگیز تاریخ ہے۔ امیر معاویہؓ کی وفات کے سات ماہ بعد کربلا کا خونخوار حادثہ پیش آیا۔ اور تاریخ ۱۳۱ھ کے صفحات پر خون شہادت کی مقدس مہر ثبت ہوئی۔ حضرت امام حسینؑ اور حکومت یزید کے تفصیلی حالات۔ صفحات ۵۲۳، قیمت ۲۲/۰ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ سہم

اموی دور حکومت — ۶۷ تا ۹۶ھ

ترجمہ: سید محمد ابراہیم ایم اے (ندوی)

جس میں عبدالملک بن مروان، ولید بن عبدالملک اور سلیمان بن عبدالملک کے زریں عہد حکومت کی تفصیل ہے، اسی عہد میں موسیٰ بن نصیر، قتیبہ بن مسلم، محمد بن قاسم، طارق بن زیاد کی فتوحات ہوئیں خوارزم کی بغاوت، حجاج بن یوسف کی خون آشامیاں اور عبداللہ بن زبیر کی خلافت بھی اسی دور میں ظہور پذیر ہوئی۔

صفحات ۵۲۳، قیمت ۲۲/۰ روپے

تاریخ طبری۔ حصہ ششم

عمر بن عبدالعزیز سے مروان ثانی تک

۹۶ تا ۱۳۲ھ

ترجمہ: سید محمد ابراہیم ایم اے (ندوی)

تاریخ طبری کی چھٹی جلد عظیم الشان عہد بنو امیہ کے آخری ۳۴ سال کے عبرت انگیز حالات پر مشتمل ہے۔ یہ دور وسعت پذیری اور کمال عروج کے بعد والی کا دور ہے حضرت عمر بن عبدالعزیز، حسین بن جعفر بن ثانی، ابن الخطاب کہا جاتا ہے ان کے دور سے شروع ہو کر مروان ابن محمد سلسلہ مروانہ

کتاب العبر دیوان المبتداء والخبر من احوال العرب والجم والبربر ومن عاصر
ہم من ملوک التتر یعنی علامہ ابن خلدون کی کتاب التواریخ کا اردو ترجمہ

تاریخ ابن خلدون (مکمل گیارہ حصے)

اردو ترجمہ: علامہ حکیم احمد حسین الہ آبادی — مکمل سیٹ ۱۹۲/۰ روپے

بنو حمیر، بنو کہلان بنو قضاہ، ملوک حیرہ و کندہ و غسان
اور اوس و خزرج ملوک، یثرب اور قبائل بنو عدنان
ومضر، قیس، الیاس قریش وغیرہ کے انساب اور احوال
اور آنحضرت صلعم کا نسب نامہ نہایت تحقیق سے لکھا گیا ہے
بڑا سائزہ۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ صفحات ۳۰۴

قیمت: گیارہ روپے پچاس پیسے

تاریخ ابن خلدون حصہ اول

رسول اور خلفائے رسول

قبل ولادت باسعادت نبوی صلی اللہ علیہ وسلم
سے لے کر ۴۰ھ تک کے حواریت و واقعات حیات
طیبہ کے مبارک حالات، خلفائے راشدین کی تانباک
زندگیاں مسلمانوں کے حوصلہ مندانہ کارنامے اور اس عہد زریں کے
تمام واقعات پوری تفصیل و توضیح کے ساتھ۔

بڑا سائزہ، اعلیٰ سفید کاغذ، صفحات ۵۶۰ قیمت ۲۲ روپے

تاریخ ابن خلدون حصہ دوم

خلافت معاویہ و آل مروان

۴۱ھ میں حضرت حسن کی صلح اور حضرت معاویہ کی خلافت
عامر سے لیکر ۱۳۲ھ تک کے مکمل حالات اسلامی تاریخ کے

مقدمہ ابن خلدون حصہ اول

اردو ترجمہ: مولانا راغب رحمانی۔ قیمت ۱۸/۰ روپے

مقدمہ ابن خلدون حصہ دوم

اردو ترجمہ: مولانا راغب رحمانی، قیمت ۱۸/۰ روپے

تاریخ ابن خلدون قبل اسلام

تاریخ الانبیاء (حصہ اول)

اس میں حضرت نوح علیہ السلام سے جناب عیسیٰ ابن مریم علیہ السلام
کے بتقریباً چھٹی صدی عیسوی تک کے حالات اور انساب
درج ہیں۔ انبیاء بنی اسرائیل و عرب اور ملوک مین و بابل و فنون
و موصول و فراغہ مہر و عمالغہ وغیرہ کے انساب و حکومت اور
ان کے سچے اور صحیح واقعات بیان کئے گئے ہیں۔

بڑا سائزہ۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔ صفحات: ۳۰۴ جلد

قیمت: گیارہ روپے پچاس پیسے

تاریخ ابن خلدون قبل از اسلام

تاریخ الانبیاء (حصہ دوم)

اس میں دولت فارس و یونان و روم و لاطینی و ملوک قیصرہ
کیتم و قیصرہ قنصرہ، قسطنطنیہ و شام و قوم قوطہ، ملوک ادریس کے
حالات و انساب اور عرب کے طبقہ ثانیہ (یعنی عرب مستعربہ)

ہلاکو خاں کی صورت میں بغداد میں نمودار ہوا اور خواجہ نصیر الدین طوسی کی آتش انتقام بھڑک کر سو پانچ سو سال کے پرانے تمدن و تہذیب کو خاک سیاہ کر گئی۔ بڑا سا نثر۔ اعلیٰ سفید کاغذ۔

صفحات ۲۲۲ مجلد۔ قیمت ۱۶/۰ روپے

تاریخ ابن خلدون - حصہ پنجم

امیران انیس اور خلفائے مصر

امیر عبدالرحمن الداخل سے لیکر آخری دور زوال تک گلستان اندلس کی کہانی ایک بہتال تہذیب کی ابتدا و انتہا اور شرعی خلافت کے تیز فرقوں کی پیداوار ترکوں کی یلغار اور فاطمیوں کے عروج و زوال کی غیرتناک داستان سفید کاغذ، صفحات ۵۸۲۔ قیمت ۲۲/۰ روپے

تاریخ ابن خلدون - حصہ ششم

غز، لوزی اور دور سلاطین

فاتح سومنات سلطان محمود غزنوی اور ہندوستان میں پہلی سلطنت کے بانی شہاب الدین غوری کی فتوحات کے مستند حالات۔ بڑا سا نثر۔ اعلیٰ سفید کاغذ، صفحات ۵۶۸۔ قیمت ۱۸/۰ روپے۔

تاریخ ابن خلدون - حصہ ہفتم

سلجوقی اور خوارزم شاہی سلاطین

سلجوقی و خوارزم شاہی خانوادوں کے حالات و کوائف خانہ جنگیوں عیسائیوں کا مقابلہ، کفار کرج اور قفقاز کی جدوجہد ترکوں کی ترقی تاجرانہ سلجوقیہ و درملوک خوارزم کی مدافعت کوشش جنگیں خاک کا خروج تاتاریوں کا مالگیر طوفان، ممالک اسلامیہ کی تباہی و بربادی کی غیرتناک داستان، بڑی سا نثر۔ اعلیٰ سفید کاغذ، صفحات ۴۳۲۔ بہترین کتابت و طباعت مجلد ۲، ۱۶/۰ روپے

سب درخشاں دور حکمرانی و کشور کشائی کا پورا نقشہ ۲۱ھ میں زمام خلافت اپنے ہاتھوں میں لینے کے بعد سے رجب ۶۰ھ تک حضرت معاویہ حکمراں رہے۔ انہوں نے کس شان سے حکمرانی یہ کتاب میں دیکھیے۔ حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ صلی اللہ علیہ وسلم کے انتہائی معتد علیہ سیکرٹری اور وحی الہی کے کاتبوں میں سے تھے۔ یہ حضرت امیر المؤمنین بی بی حبیبہ کے حقیقی بھائی ہیں یہ میدان جنگ میں بہترین فوجی، میں ان سیاست میں شہسوار دانش و تدبیر، انتظام مملکت میں بے مثال منظم اور سب سے بڑھ کر وہ ایک بہترین مسلمان ہیں اور آخری صحابی حکمراں ہیں

صفحات ۵۱۲۔ قیمت ۲۲/۰ روپے

تاریخ ابن خلدون - حصہ سوم

خلافت بنو عباس (حصہ اول)

خلافت عباسیہ کے بانی المنصور السفاح کی سفاکی اسلامی سلطنت کے نئے دار الخلافہ عروس البیاد بغداد کی تعمیر ابو مسلم خراسانی کی سرکشی، نبوت کے دعویدار بن مقفع کا خروج، مشرقی دنیا کے نامور خانوادے املہ کی تباہی ہارون کے بیٹوں امین اور مامون کی کشمکش سے لیکر المعتضد مکتفی باللہ تک مسلمانوں کے تہذیبی آفرین دور کے حالات و واقعات۔ بڑا سا نثر، صفحات ۲۵۲۔ قیمت ۱۲/۰

تاریخ ابن خلدون - حصہ چہارم

خلافت بنو عباس (حصہ دوم)

اس جلد میں علامہ ابن خلدون نے زوال بغداد کی ابتدا سے اس وقت تک کے واقعات اور حوادث کو اپنی خداداد قابلیت اور حقیقت شناسی سے بیان کیا ہے جبکہ زوال اپنی انتہا کو پہنچنے



تاریخ اسلام کا قدیم ترین ماخذ

طبقات ابن سعد

کامل آٹھ حصوں میں

مصنف: علامہ محمد ابن سعد المتوفی ۲۳۰ھ

اردو ترجمہ: علامہ عبداللہ العماوی

یہ شہرہ آفاق کتاب چند قدیم ترین کتابوں میں سے ایک متمم بالشان کتاب ہے۔ مصنف نے بڑی تحقیق کے بعد تمام واقعات و حالات کو مختصراً طور پر بیان کیا ہے اور ایسے جزئی واقعات بھی تحریر کیے ہیں جو کسی تاریخ میں نہیں ملتے۔ ابن سعد کے معاصرین کے علاوہ علماء مشرق و مغرب کے

مورخین کے لئے یہ تاریخ مشعل راہ ہے

حصہ اول اخبار النبی صلعم

ترجمہ: علامہ عبداللہ العماوی قیمت ۲۰/۰ روپے

حصہ دوم اخبار النبی صلعم

ترجمہ علامہ عبداللہ العماوی قیمت ۲۰/۰ روپے

حصہ سوم سیرت خلفائے راشدین

مصنف علامہ عبداللہ العماوی قیمت ۱۶/۰ روپے

حصہ چہارم مہاجرین و انصار

ترجمہ علامہ عبداللہ العماوی قیمت ۳۰/۰ روپے

حصہ پنجم تابعین و تبع تابعین

ترجمہ عبداللہ العماوی قیمت ۲۰/۰ روپے

حصہ ششم اصحاب کوفہ

ترجمہ مولوی نذیر الحق میرٹھی قیمت ۱۸/۰ روپے

حصہ ہفتم دور آخر کے صحابہ تابعین و فقہاء

ترجمہ مولانا راغب رحمانی قیمت ۲۰/۰ روپے

حصہ ہشتم صالحات و صحابیات ترجمہ مولانا راغب رحمانی قیمت ۲۰/۰ روپے

ہماری عظمت پارینے کے زرین اوراق

تاریخ اسلام

کامل تین حصوں میں

مصنف: مولانا اکبر شاہ خاں نجیب آبادی

یہ عظیم شاہکار تین حصوں پر مشتمل ہے

پہلا حصہ: یہ عہد رسالت سے لیکر خلافت راشدہ تک ہے اس کے مطالعے سے معلوم ہوگا کہ ایک آن پڑھ اور غیر تمدن قوم جب ہلاکت کے سرچشمے سے سیراب ہوتی ہے تو وہ کس طرح فلاح عالم بن کر ساری دنیا کو باغ و بہا بنا دیتی ہے قیمت ۲۲/۰ روپے

دوسرا حصہ: عہد بنی امیہ سے لے کر خلافت بنی عباس

مصر پر ختم ہوتا ہے یہ جلد مسلمانوں کے دور کشائی تمدن آفرینی

اور قیادت علمی کے عروج کی مکمل تاریخ ہے اور زوال اسباب

کی عبرتناک داستان بھی ہے اس کا مطالعہ سینکڑوں سالوں

تک بصیرت اور درس عبرت رکھتا ہے قیمت ۲۲/۰ روپے

تیسرا حصہ: بنو امیہ اندلس و دولت معاویہ سلجوقیہ عثمانیہ

مغولان چنگیزی و خوارزم شاہیہ اور اس دور کی تمام مسلمان

حکومتوں کے تفصیلی حالات پر مشتمل ہے اس طرح مصنف نے

مصر میں دولت مملوکیہ کے اختتام اور سلطان سلیم خاں کی فتح

مصر اور خلافت تک ۹۲۳ھ کے حالات شرح و بسط کے ساتھ

لکھے ہیں۔ یہ ہماری عظمت پارینے کی درون ناک داستان ہے۔

آج جب کہ مسلمان قوم ساری دنیا میں زندگی کی انگڑائیاں

لے رہی ہے ماضی کی یہ تاناک داستان مستقبل کے لئے راستہ

کو روشن کرنے کا کام دینی قیمت ۲۲/۰ روپے

صفحات: حصہ اول (۹۵۲) حصہ دوم (۶۷۲)

حصہ سوم (۶۰۸) مکمل سیٹ: ۲۶۶ روپے